حالات کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ایک نوجوان کی داستان

سب رنگ ڈائجسٹ کا مقبول عام سلسلہ

بازی گر

حصہ سوم

"مجھے آپ کو دیکھنے کی آرزو تھی، واقعی جیسا میں نے سنا تھا، آپ ویسے ہی ہیں۔" وہ آدمی انگریزی آمیز ہندوستانی میں بولا۔
میں پلکیں پٹ پٹا کے رہ گیا۔
"سونیا کو آپ پہچان گئے ہوں گے۔"
مجھے جواب دینے میں تامل ہوا۔ "آپ کے ساتھ سونیا بھی ہیں؟"
"وہی ہے۔" وہ گہری سانس لے کے بولا۔
"مجھے شبہ تو ہوا تھا۔"
"میں آپ سے اسی کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔" ایک لمحے توقف سے وہ بولا۔ اس کے ہونٹوں میں لرزش تھی۔
"کیا؟ کیا؟" میں نے سٹ پٹا کے کہا۔ "میں سن رہا ہوں۔"
"سونیا نے مجھے سب بتا دیا ہے۔ اس نے بہت پہلے بتا دیا تھا اور میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اگر آپ کبھی لوٹ کے آ گئے تو میں چلا جاؤں گا۔" وہ دھیمی دھیمی آواز میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔
"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"
"بہتر یہی ہے کہ میں کسی لاگ لپیٹ کے بغیر آپ سے بات کروں، میری صاف گوئی آپ کو گراں گزرے تو مجھے معاف کر دیجئے گا۔ مجھے آپ اپنا دوست اپنا بھائی ہی سمجھئے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ سونیا کو آپ کا بہت انتظار تھا۔"
"میرا انتظار؟"
"آپ ہی کا انتظار۔ اور اس نے مجھ سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ کبھی آپ لوٹ آئے تو..." اس کی آواز حلق میں پھنس گئی۔
"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔"
"سونیا کی خوشی کے لیے میں اپنی جان تک قربان کر سکتا ہوں۔ میں نے اسے اپنی زندگی سمجھا ہے۔ وہ بھی مجھے بہت پسند کرتی ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ سونیا صرف آپ کو اپنا دیوتا سمجھتی ہے۔"
مجھے لگا میرے کان سن سنانے لگے۔
"شاید آپ کو اس کا اتنا احساس نہ ہو۔ سونیا نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ اپنی زبان سے کچھ نہیں کہتے تھے۔ آپ ایک قیدی تھے، آپ کہہ بھی کیا سکتے تھے۔ اسے آپ کی بہت فکر تھی کہ جیل سے نکلنے کے بعد نہ معلوم آپ کو کیسی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے۔ جو جیل سے نکلے ہوئے آدمی کو دنیا بہت ستاتی ہے، اچھوت سمجھتی ہے۔ وہ طرح طرح سے سوچتی تھی۔ اسے ایک اور بات کا اندیشہ تھا کہ کہیں سونیا کا مذہب آپ کو اس کے دروازے پہ آنے سے نہ روکتا ہو۔ مگر یقین کیجئے سونیا صرف آپ کی منتظر تھی۔"
میرا سارا جسم منجمد ہو گیا۔

"وہ مجھ سے بہت قریب رہی ہے، بہت زیادہ۔" وہ تیزی سے بولا۔ "لیکن وہ ویسی ہی آئینہ ہے جس طرح آپ سے جدا ہوئی تھی۔ آپ وقت پر مل گئے، کچھ دیر سے ملتے تو پتہ نہیں کیا ہوتا، شاید میں اپنا وعدہ پھر بھی نبھاتا۔"
میں اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا گیا۔
"مجھے خوشی ہے اب سونیا کو چین آ جائے گا۔"
"بس کیجئے۔" میں نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔
کچھ دیر وہ خاموش رہا پھر اس کی دھیمی آواز میرے کانوں میں گونجنے لگی۔ "میں نے خود کو سدا آپ کی امانت سمجھا ہے۔ وہ روز جاپ کرتی تھی، بھگوان سے آپ کے لیے پرارتھنا کرتی تھی۔"
میرا سر چکرا رہا تھا۔ "معلوم نہیں آپ... آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" میں نے ہانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔
"آپ کے لیے یہ سب کچھ عجیب ہو سکتا ہے لیکن ہے ایسا ہی جو میں کہہ رہا ہوں وہی سچ ہے۔" وہ اٹک اٹک کے بولا۔ "یقین کیجئے مجھے کوئی دکھ نہیں ہے۔ کوئی بھی نہیں... میں، میں..." وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا اور حلق تر کر کے بولا۔ "مجھے نہیں معلوم کہ جیل سے رہا ہونے کے بعد آپ کے ساتھ زندگی کا کیا برتاؤ رہا اور آپ نے اس سے کیسا سلوک کیا۔ آپ کہاں ہیں، کیا کرتے ہیں، کیسے جھنجھٹوں میں الجھے ہوئے ہیں، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ میرا سوچنا ہے، میرا کام نہیں... یہ سونیا کا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس کے لیے دوسری باتیں اتنی اہمیت نہیں رکھتیں جتنی اہمیت صرف آپ رکھتے ہیں۔ آپ جیسے بھی ہیں اس کے بھاگیہ ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ سونیا کا آدرش ایسا ویسا نہیں ہوگا۔ آپ اتنے ہی اچھے ہوں گے جتنے اس کے تصور میں بسے ہیں جیسا اس نے آپ کو دیکھا تھا۔ آپ کے لیے اس کی پرارتھنا میں بھگوان نے ضرور دلچسپی لی ہوگی۔"
مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں مگر وہ خواب نہیں تھا۔ نوجوان میرے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔ وہ سب کچھ خود ہی بولتا رہا۔ مجھے اس نے کچھ نہیں کہنے دیا یا خود میری زبان گنگ ہو گئی تھی۔ میں کسی بت کی طرح بیٹھا سن رہا تھا۔ مگر آدمی اتنا ہی سن سکتا ہے جتنا وہ اس کا اہل ہے۔
"آپ... آپ چپ کیوں ہیں؟" وہ بے تابی سے بولا۔
"میں... میں کیا کہوں۔" میں نے ہذیانی انداز میں کہا۔
"آپ ذرا جا کے سونیا کو دیکھئے تو سہی۔ اس نے رات آپ کو دیکھا تھا۔ نہ جانے یہ رات اس نے کس طرح کاٹی ہوگی۔" میری نظریں غیر ارادی طور پہ سونیا کی طرف بھٹکیں۔ نوجوان کے ہونٹوں پہ

مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی لیکن اس کی ترچھی آنکھیں اس مسکراہٹ کی چغلی کھا رہی تھیں۔ مجھے شبہ ہوا تھا کہ وہ مجھ سے مذاق تو نہیں کر رہا ہے یا اسے میری کوئی آزمائش تو مقصود نہیں ہے۔ اس کی ہندوستانی شستہ اور انگریزی رواں تھی۔ کبھی وہ تیز تیز بولنے لگتا، کبھی اس کی آواز ڈوبنے لگتی۔ میں نے اپنے حواس مجتمع کرنے کی کوشش کی۔ مجھے یہ بھی احساس نہیں رہا تھا کہ ابا جان کی آنکھ کسی وقت بھی کھل سکتی ہے یا اوپر سے کوئی بچہ آ سکتا ہے۔ "آپ کیا سوچ رہے ہیں؟" وہ سراسیمگی سے بولا۔
میں نے سر جھکا لیا۔ میرا سینہ پھٹنے لگا تھا۔
"شاید آپ کے ذہن میں میرے بارے میں سوال گونج رہے ہوں۔ میں کون ہوں اور سونیا سے اپنے کس رشتے، کس حوالے سے بات کر رہا ہوں۔ میں اس کا کوئی بھی نہیں ہوں اور سب کچھ ہوں۔ شاید اس کے لیے میں کچھ بھی نہیں ہوں پر وہ میرے لیے سب کچھ ہے۔ میرے لیے وہ ایک دیوی کے مانند ہے۔ میری بھگوان! اس کے لیے میں ایک تہی دست پجاری، ایک بھکاری سے زیادہ کچھ نہیں۔ دیوی کو اپنے پجاری پر ترس آ گیا تھا اس لیے وہ اس پر مہربان ہو گئی مگر اس کے من میں آس اپنے دیوتا ہی کی بندھی تھی۔ سو بھگوان نے اس کی سن لی۔ ہو سکتا ہے آپ کے دماغ میں یہ بات بھی ہو کہ رات آپ کو دیکھنے کے باوجود سونیا آپ سے چھپ گئی تھی۔ اس کی جھجک فطری تھی۔ اتنے عرصے کی تمنا کے بعد اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا ہوگا۔ کسی کو بھی نہیں آ سکتا کہ اتنی بڑی خوشی ناگہاں کیسے مل سکتی ہے۔ شاید آپ کو بھگوان نے اس کے پاس بھیجا ہے۔ ہمارا کہیں اور جانے کا پروگرام تھا۔ اچانک حیدرآباد کا ارادہ ہو گیا اور ہم اسی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گاڑی بھی وقت پر مل گئی ورنہ ہمیں تو خاصی تاخیر ہو گئی تھی۔ کاش سونیا کی دعاؤں کی گھڑی لکھی تھی۔ آپ کو دیکھ کے سونیا ایک اضطراب سے دوچار ہو گئی ہوگی۔ میں بھی یہاں موجود تھا۔ اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ اسے میری دیوار کا خیال آ گیا ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں میرے لیے یہی کافی ہے کہ اسے میرا اتنا احساس تھا۔ میری بھگتی کا حاصل اتنا ہی ہے۔ مجھے سب کچھ مل گیا ہے۔ رات اس نے مجھے نہیں بتایا تھا۔ مجھے صبح معلوم ہوا۔ وہ رو رہی تھی۔ مجھے کہہ رہی تھی بس اپنے تک رکھنا، پوری کی پوری ہو جانے دے۔ مجھے کیا سمجھ کے روک رہی تھی؟ میں آپ کے پاس اس کی اجازت کے بغیر آیا ہوں کیونکہ سونیا کی محرومی میری بھی محرومی ہے۔ رات جس وقت آپ کو اس نے پچھلے ڈبے میں اترتے دیکھا تھا، وہ ایک اور بات سے بھی ہراساں تھی۔ ہم چار دن سے اپنے سائے سے بھی بھاگتے پھر رہے ہیں۔ پولیس ہمارے پیچھے ہے۔"
"پولیس!"
"ہاں!" وہ ٹھنڈی سانس لے کے بولا۔ "لکھنؤ میں ہم تقریباً پکڑے گئے تھے۔ پٹنے میں بال بال بچے۔ لکھنؤ میں اتفاق سے ہمیں وقت پہ گاڑی مل گئی اور ہم آن کی آن میں وہاں سے دور ہونے میں کامیاب ہو گئے۔"
"کیا بات ہے؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔
"میں آپ کو کیا بتاؤں!" وہ شرمندہ لہجے میں بولا۔ "مگر شاید آپ سے کچھ چھپانا نہیں چاہیے۔ لمبی کہانی ہے۔ آپ سونیا کے پتا جی کشور بابو سے واقف ہی ہیں۔ ویسے ہر کسی کے لیے وہ دل کے بہت اچھے ہیں لیکن میرے اور سونیا کے لیے بہت کٹھور بن گئے تھے۔ ہم نے انہیں منانے کے بہت جتن کیے لیکن وہ [illegible] تھے۔ وہ پولیس کے ایک بڑے افسر ہیں۔ ان کے آگے میری حیثیت ہی کیا ہے۔ میرے پتا میرے بچپن ہی میں مجھے چھوڑ گئے تھے۔ ماتا جی نے جیسے تیسے مجھے اور میرے چھوٹے بھائی کو پڑھایا ہے۔ چھوٹا بھائی تو بی اے میں ہے۔ میں نے ایم اے کے بعد بھی ملازمت حاصل کرنے کے لیے دوڑ دھوپ کی لیکن نوکری آسانی سے کہاں ملتی ہے۔ کشور بابو سونیا کے لیے کسی اور طرح کا شخص پسند کرتے تھے۔ کئی جگہ سے بات آئی، بڑے بڑے گھرانوں سے۔ سونیا ہی تیار نہیں ہوتی تھی۔ ہم دونوں برسوں سے ساتھ پڑھتے تھے۔ میں نے سونیا کو پہلی بار دیکھا تھا تو عزت سے دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ سونیا سے جب ہمت کر کے کہا تو اس نے اسی وقت مجھے بتا دیا تھا کہ اس کا دل کہیں اور بندھا ہوا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ سونیا مجھ سے کنارہ کر لیتی۔ ہم ایک دوسرے کو جاننے سمجھنے لگے۔ ہمیں ایک دوسرے کو دیکھے بغیر چین بھی نہیں آتا تھا۔ میں کبھی کالج نہیں جاتا تو وہ مجھے پوچھنے چلی آتی تھی۔ میں نے سونیا سے دوبارہ کبھی کچھ نہیں کہا۔ میں جان گیا تھا کہ میرا کہنا لاحاصل ہے۔ سونیا اپنی دنیا بسا چکی ہے۔ میں تو اس کی بھگتی کرتا رہا۔ شروع شروع جب ہمیں معلوم ہوا کہ آپ جیل سے رہا ہو گئے، بار بار میں آپ کو ڈھونڈنے بھی گیا۔ وہاں استاد جمیل نامی ایک شخص کے گھر جا کے بھی آپ کو پوچھا۔ معلوم ہوا کہ آپ وہاں آئے ہی نہیں۔ ان سب کو آپ کے نہ آنے پر حیرت تھی۔ سونیا کا خیال تھا کہ آپ کے لیے اس کا کھوج لگانا کچھ ایسا مشکل نہیں ہوگا۔ کشور بابو کے بارے میں آپ کسی سے بھی پوچھ سکتے تھے۔ اسے امید تھی ایک دن آپ ضرور آئیں گے۔ جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے تھے اس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔

"سونیا!" آبل نے میرے بجائے اُسے ٹوکا۔ سونیا کی گھٹری میں لرزش سی ہوئی۔ "دیکھو کون بیٹھا ہے۔"

"ہاں میں نے تمھیں پہچان لیا۔" میں نے حواس باختگی سے کہا۔

اُس نے جھٹکے سے سر اُٹھایا۔ مجھ سے اُس کا چہرہ نہ دیکھا جا سکا۔ اُس کے گالوں کا شہابی رنگ جیسے جل رہا تھا۔ آنکھیں انگارا تھیں یا ہونے ڈوبے ہوئے تھے۔ نتھنے اور ہونٹ پھڑپھڑا رہے تھے۔ پھر اُس نے اپنا منہ چھپا لیا۔

"وہاں دوبارہ سے نکل کے مجھے ایک دن بھی چین نہیں ملا۔" میں نے دو لفظ آواز میں کہنے کی کوشش کی۔ "کتنی ہی بار تمھارا خیال آیا لیکن کچھ ایسی ہی رکاوٹیں تھیں جو میں نہیں آ سکا۔ میں تمھیں بھولا نہیں تھا۔ تمھیں کون بھول سکتا ہے۔ تم اتنی اچھی اتنی......"

میری زبان لکنت کر رہی تھی۔ "مجھے یقین تھا کہ تم میرے آنے کی توقع کر رہی ہوگی۔ چلتے وقت میں نے تم سے وعدہ بھی کیا تھا۔ مجھے سب کچھ یاد ہے۔ وہاں کی ایک ایک بات۔ گھر کا سارا نقشہ، یہاں تک کہ دیواروں کا رنگ بھی۔ تمھارے ہاتھ کے کھانوں کا ذائقہ، تمھارے کپڑوں کے رنگ۔ مجھے سب کچھ یاد ہے۔ اتنے دن ساتھ رہا تھا۔" لفظ میرے منہ میں گڈمڈ ہو گئے تھے۔ نہ جانے میں کیا کہنا چاہتا تھا اور کیا کہہ رہا تھا۔ اُس کی سسکاری سن کے میرے حواس اور منتشر ہو گئے۔ بہت ہمت کر کے میں نے صفائی کے لہجے میں کہا۔ "قسمت نے ہمیں پھر ملا دیا ہے۔ میں اب تمھارے سامنے موجود ہوں۔ سمجھو آج سے سارے دُکھ ختم ہو گئے۔ سمجھو مجھے آج ہی جیل سے رہائی ملی ہے۔ مجھے سب معلوم ہو گیا ہے۔ بیل بابو نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔" یکایک مجھے خود بخود احساس ہوا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ میں نے اپنا خشک حلق تر کرنے کے لیے چند لمحے توقف کیا۔ "میں نے ان سے بیل بابو سے کہا ہے کہ یہ بمبئی چلے جائیں۔" میری آواز جھجکی ہوئی تھی۔ "چند دن بعد مجھے بھی وہاں پہنچ جانا ہے۔ پھر ابا جان کو تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم سب ساتھ رہیں گے۔ وہاں اور لوگ بھی ہیں۔ میں تمھیں اپنے ساتھ حیدرآباد لے چلتا لیکن میں اکیلا نہیں ہوں۔ سامنے کی برتھ پر میرے ابا جان سو رہے ہیں۔ اوپر کی برتھوں پر جو لوگ ہیں وہ بھی غیر نہیں ہیں۔ عمران کی موجودگی میں تم گھٹن محسوس کرو گی اور پھر میں تو آ ہی رہا ہوں۔ تمھیں شاید زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے۔ وہیں تم سے ٹھیک طرح باتیں ہوں گی۔ وہاں وقت ہی وقت ہوگا۔"

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بیل کے ٹوکنے پر بھی نہیں۔ ڈبے میں بھی بھنبھناہٹ سی ہو رہی تھی۔ وہ اپنے آپ میں سمٹی بیٹھی رہی۔ مجھے کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا کہ اُس سے اور کیا کہوں۔ اُس کے سامنے میں خود کو بھی اجنبی لگ رہا تھا۔

"سونیا! سونیا!" آبل نے آہستگی سے اُسے دوبارہ مخاطب کیا۔ اُس کی لمبی لمبی انگلیاں آپس میں پیوست تھیں۔ وہ کسمسانے لگی۔

"یہ کیا؟" بیل شکایتی لہجے میں بولا۔ "تم نے سنا، ظہیر صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟ ٹھیک ہے نا؟"

وہ ڈھنوں کی طرح سر ہلا کے رہ گئی۔

"تم نے جیسا مجھے بتایا تھا یہ بالکل ویسے ہی ہیں۔ میں نے اپنے دماغ میں ان کی جو تصویر بنائی تھی یہ اُس سے بہت ہی ملتے جلتے ہیں۔ کسی اسٹیج کے اداکار یا شہزادے کی طرح۔ ان کا چہرہ مجھے اجنبی محسوس نہیں ہوا۔" وہ تیزی سے بولا۔

سونیا کے سراپا میں ایک آئینے کے لیے کوئی چمک سی اُٹھی اور ماند پڑ گئی۔ بے اختیار میرا جی چاہا کہ اُسے اپنے بازوؤں میں بھر لوں۔ اُسے خوب پیار کروں۔ اُس کے تمام آنسو پی لوں لیکن میرے بازو اُٹھے رہے۔ پھر بیل بھی چپ ہو گیا۔ دیر تک سکوت طاری رہا۔ یہاں تک کہ گاڑی کی رفتار مدھم پڑنے لگی۔ میں نہیں اُٹھا۔ سونیا کو اس حالت میں چھوڑ کے اُس کے پاس سے اُٹھ جانا ٹھیک نہیں معلوم ہوتا تھا۔ میں اپنے ذہن میں وہ لفظ ڈھونڈ رہا تھا جو سونیا سے کہہ سکوں اور اُسے تسلی دے سکوں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو اور میرا کہا سب رائیگاں گیا ہو یا میری زبان سے کوئی لغزش ہو گئی ہو۔ بیل کہتا تھا، آنکھوں کی روشنی اتنی ضروری نہیں جتنی سر کی ضروری ہے۔ سر میں اندھیرا ہو تو آنکھوں کو بھی نظر نہیں آتا۔ اسی لیے بیل مجھ سے معذرت کر کے اُٹھ کھڑا ہوا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھے سونیا سے بات کرنے کا موقع دینا چاہتا ہے۔ میری زبان سے ایک لفظ نہیں پھوٹا۔ چند منٹ بعد بیل واپس آیا۔ گاڑی آہستہ آہستہ رُکنے لگی تھی۔ کوئی اسٹیشن آ رہا ہوگا۔ ابا جان کی آنکھ کھل جانے کا اندیشہ تھا لیکن میں وہاں سے نہیں اُٹھا۔ میں نے سوچ لیا تھا، ابا جان بیل کی جگہ سونیا کے پاس مجھے بیٹھا دیکھ کے چونکیں گے تو میں اُن سے کوئی بھی بہانہ کر دوں گا۔ کہہ دوں گا کہ سونیا میرے ایک محسن کی بیٹی ہے۔ گاڑی ٹھہری تو ابا جان آنکھیں ملتے اُٹھ بیٹھے اور وہی ہوا۔ اِدھر اُدھر بھٹکتی ہوئی اُن کی نظریں مجھ پر پڑیں تو ٹھٹک سی گئیں لیکن دوسرے ہی لمحے وہ مسکرانے لگے۔ انھوں نے ہیرو کو آواز دی۔ ہیرو پہلے ہی جاگ گیا تھا اور نیچے اُترنا ہی چاہتا تھا۔ گاڑی کسی غیر معروف اسٹیشن پر ٹھہری تھی۔ اسٹیشن پر چہل پہل نہیں

تھی۔ ہیرو کے ساتھ زہرا اور مارتی بھی یکے بعد دیگرے نیچے آ گئے۔ وہ تینوں بھی مجھے سونیا کے پاس اتنے قریب بیٹھے دیکھ کے حیران ہوئے لیکن منہ سے کچھ نہیں بولے۔ میرا بیٹھنا اُن کے لیے اتنا عجیب نہیں ہوگا جتنا ہم تینوں کا گم صم ہونا۔ بیل ہی کو اس کا احساس ہوا۔ وہ مجھ سے مارتی، زہرا اور ہیرو کے مشاغل کے بارے میں پوچھنے لگا۔ اُس کی آواز اُچٹتی ہوئی تھی۔ مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا تو میں نے کہہ دیا، یہ سب بمبئی میں تجارت کرتے ہیں۔ بیل نے زیادہ پوچھ گچھ نہیں کی۔ مارتی نے ڈبے سے اُتر کے تحقیق کر لی تھی کہ آگے لائن کلیر نہیں ہے۔ گاڑی کے دوبارہ حرکت میں آنے میں دیر لگ گئی۔ میں کچھ دیر وہاں بیٹھا رہا اور بیل کو اپنے امتحانات اور مصروفیات کے بارے میں اُلٹے سیدھے جوابات دیتا رہا۔ پھر میں نے اُٹھنے کا ارادہ کیا اور کن انکھیوں سے سونیا کی طرف دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ پہلے ہی سر جھکائے ساکت بیٹھی تھی۔ "میں بس دو دن بعد وہاں پہنچ جاؤں گا۔" میں نے جاتے جاتے کہا۔ سونیا نے ضرور سن لیا تھا۔ اُس کے بدن میں اچانک ایک تلاطم سا نمودار ہوا۔ اُس کی آنکھوں میں جنون آ گیا تھا۔ میں تیزی سے پلٹ کے سامنے کی برتھ پر آ بیٹھا۔ میری سانس اکھڑ گئی تھی۔ یہاں آ کے مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں بہت دور سے بھاگتا ہوا آ رہا ہوں اور میرا جسم ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔ سونیا کی آنکھوں میں کوئی سمندر اُبھر رہا تھا۔ اُس کی نظریں میرے سارے جسم میں سوئیوں کی طرح چبھی ہوئی تھیں۔ ہیرو کو کچھ اندازہ ہو گیا تھا۔ اُس نے میرا سر اپنی آغوش میں چھپا لیا اور میری کمر کو آہستہ آہستہ تھپکنے لگا۔ میرا سینہ اُمڈ رہا تھا لیکن میں رو بھی نہیں سکتا تھا۔ میں نے اپنے آنسو آنکھوں ہی میں گھونٹ رکھے تھے۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ گاڑی کسی اسٹیشن پر رکی تو وہ کچھ کھانے پینے کا سامان لے آئے۔ میں نے صاف منع کر دیا تھا۔ سونیا اور بیل نے بھی کچھ نہیں کھایا حالانکہ ابا جان نے اُن سے بہت اصرار کیا تھا۔ مارتی اور ہیرو کی باتوں سے مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ اگلا اسٹیشن ناگ پور ہے۔ بمبئی جانے کے لیے بیل کو ناگ پور ہی پر اُتر جانا چاہیے تھا۔ بیل سے اس کا ارادہ پوچھتے یا اُسے ٹوکتے ہوئے مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔ اگر اُس نے میری بات مان لی ہے تو اُسے خود احساس ہوگا۔ بہتر یہی تھا کہ وہ بمبئی چلے جائیں۔ مجھے یقین تھا، وہاں جولین کے ساتھ سونیا کا دل کچھ بہل جائے گا۔ شبو باجی بھی وہاں موجود ہے۔ سونیا مولی اکرام کے ہاں تریسا اور فری لی وغیرہ کے ساتھ بھی خوب گھل مل سکتی تھی۔ پھر ہیرو دادا کا گھر بھی تھا جہاں گیتا اور اُس کی ماں ہمہ وقت اُس کا خیال رکھتیں لیکن ناگ پور آنے سے پہلے بیل کو کچھ روپے دے دینے چاہیئے تھے۔ میری جیب میں چیک بک تھی، نقدی نہیں تھی۔ بمبئی کے بینک میں ساٹھ ہزار روپوں کے تقریباً تمام روپے محفوظ تھے۔ میں چیک کاٹ کے دے سکتا تھا لیکن انھیں وہاں کسی اچھے ہوٹل میں رہنے کے لیے روپوں کی ضرورت پڑے گی۔ چیک کی وصولی میں دیر لگ سکتی ہے۔ اچھا تھا کہ نقد رقم اُن کے ساتھ ہو اور چیک کا یہ تھا کہ بعد میں بیل کے کام آئے۔ پھر خیال آیا، وہ چیک بھنانے سے گھبرانے لگے۔ مجھے معلوم تھا کہ ہیرو کے پاس بھی بڑی رقم نہیں ہے۔ البتہ ابا جان کے بیگ میں لکھنؤ میں تیجوری کی فروخت سے حاصل کی ہوئی ڈھائی لاکھ روپے کی رقم موجود ہوگی۔ اُس میں سے انھوں نے زیادہ سے زیادہ خرچ کیا ہوگا۔ ابا جان سے رقم مانگنے کی مجھے ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ ہیرو کے ذریعے ہی اُن سے منگوایا جا سکتا تھا لیکن ہیرو کے لیے اُن کے آگے ہاتھ پھیلانا مناسب نہیں تھا۔ ابا جان فوراً سمجھ جاتے کہ ہیرو کو اُن کے پاس میں نے بھیجا ہے اور رقم کی ضرورت اصل میں مجھے ہے۔ وہ اگر پوچھیں گے نہیں تو سوچیں گے ضرور کہ آخر ریل کے ڈبے میں رقم کی یہ ضرورت اچانک کیسے پیش آ گئی۔ میں سوچ رہا تھا کہ ابا جان سے کس طرح کہوں۔ اگر انھوں نے منع کر دیا! منع کر دیا تو بہرحال میرے پاس چیک بک موجود ہے۔ شاید وہ منع نہ کریں۔ جب میں نے اُن سے بات کرنے کا عزم کر لیا، میں جھجکتا ہوا اُن کے پاس اُن کی برتھ پر جا بیٹھا۔ پھر میں نے آہستگی سے کہا کہ مجھے کچھ روپوں کی ضرورت ہے۔

انھوں نے چونک کے مجھے دیکھا مگر دوسرے ہی لمحے سر جھکائے رکھا۔ اپنا چرمی تھیلا میری طرف بڑھا دیا۔ دوسرے ہاتھ سے انھوں نے جیب سے چابی نکالی اور میرے حوالے کر دی۔ میں نے چرمی تھیلا بالائی برتھ پر کھولا۔ اُس میں کئی گڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔ یہ ساری رقم نہیں تھی۔ یقیناً ابا جان نے باقی رقم کہیں اور بھی رکھی تھی۔ میں نے سو سو کے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی۔ میرے اندازے کے مطابق دس ہزار روپے ہوں گے۔ گڈی پتلون کی جیب میں رکھ کے میں نے چرمی تھیلا بند کیا اور ابا جان کے حوالے کر دیا۔ روپے جیب میں آنے سے بڑی تسلی ہوئی۔ کچھ دیر تک میں اپنی جگہ چپ بیٹھا رہا۔ پھر میں نے بیل کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ اُس کے میرے پاس آنے سے ابا جان کا ماتھا ٹھنکا ہوگا کہ میں نے یہ رقم کس کے لیے لی ہے لیکن مجھے اس بات کی اتنی فکر نہیں تھی کہ بیل کے آ جانے پر ابا جان نے جھانکا

وقت نظر نہیں کی۔
"ٹرین بہت لیٹ ہو رہی ہے۔" میں نے بل سے سرگوشی میں کہا۔ "یہاں سے بمبئی کے لیے گاڑی مل جائے گی؟" وہ اثبات میں سر ہلانے لگا۔
"مجھے شاید زیادہ وقت نہ لگے۔ اس عرصے میں تم بمبئی کے کسی اچھے ہوٹل میں ٹھہر جانا۔ میرا خیال ہے تاج محل ہوٹل مناسب رہے گا، وہ سب سے بڑا ہے اور بڑے ہوٹلوں میں مسافروں کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ میں کوئی وقت نہیں دے سکتا لیکن میری کوشش یہی ہوگی کہ جلد سے جلد پہنچ جاؤں، تمہیں میرا انتظار کرتے رہنا ہے۔ ہو سکتا ہے مجھے دو دن سے زیادہ لگ جائیں، شاید ایسا ہو نہیں۔"
وہ خاموشی سے سنتا رہا۔
"کسی قسم کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں، میرے آنے کے بعد سب مسئلہ حل ہو جائے گا۔" میں نے گڈی اپنی نشست کے نیچے دبا رکھی تھی۔ "یہ رکھ لو۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے گڈی تھماتے ہوئے کہا۔
"یہ کیا ہے؟" گڈی دیکھ کے اس کی آنکھوں میں وحشت اتر آئی۔
"کچھ نہیں ہے، بس اسے رکھ لو، تمہیں وہاں ضرورت پڑے گی۔"
"میرے پاس ابھی کچھ پیسے ہیں۔" وہ سراسیمہ لہجے میں بولا۔
"پھر بھی احتیاطاً انہیں رکھ لینا چاہیے۔"
"نہیں نہیں۔" وہ کسی قدر پیچھے ہٹ کے بولا۔
"منع کرو گے تو مجھے دکھ ہوگا۔ کیا میں تمہیں یاد دلاؤں تم نے ابھی ابھی مجھے کیا کہا ہے۔ سب کچھ ہے، انکار مت کرو۔"
"مگر..." وہ کسمسانے لگا۔
"مگر کچھ نہیں۔" میں نے ترشی سے کہا۔ "پھر کیا میں یہ سمجھوں کہ جو تم نے کہا تھا، سب غلط تھا۔"
"لیکن اس کی شاید ضرورت نہ پڑے، دو دن بعد تو آپ بھی آ جائیں گے۔" وہ کمزور سے انداز میں بولا۔
"پھر بھی رکھ لینے میں کیا حرج ہے۔"
اس نے بہت انکار کیا لیکن میری ضد پر آخر اس نے لے لی۔ گڈی جیب میں ڈال کے وہ ندامت کا اظہار کرتا رہا اور کچھ دیر تک میرے پاس بیٹھا پھر اسباب سمیٹنے کے لیے اٹھ گیا۔ وہ پہلے سے زیادہ شکستہ اور آزردہ نظر آ رہا تھا۔ اپنی برتھ پر جا کے اس نے سونیا سے کچھ کہا۔ سونیا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ان کے پاس زیادہ سامان نہیں تھا۔ ایک بستر بند، دو سوٹ کیس، چمڑے کا ایک تھیلا، ہینڈ بیگ۔ انہیں سامان سمیٹتے دیکھ کے اباجان یہ پوچھے بغیر نہ رہ سکے کہ کیا وہ ناگ پور اترنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

"ہاں۔" بل نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "کچھ پروگرام بدل گیا ہے۔"
"اچھا! ہمارا خیال تھا، سفر ساتھ کٹے گا۔"
"ہم سوچا، پہلے بمبئی کہیں نہ چلے جائیں۔"
اباجان تذبذب میں پڑ گئے لیکن وہ بل سے اور کیا پوچھ سکتے تھے، چپ ہو گئے۔ سونیا برتھ پر بیٹھا ہوا گدا اٹھانے کے لیے ایک بار اٹھی تھی پھر پاؤں لٹکائے بیٹھ گئی۔ اس کا رخ میری ہی طرف تھا لیکن اس کا سر جھکا ہوا تھا اور ساری کے پلو کے گھونگھٹ نے اس کا آدھا چہرہ اوجھل کر رکھا تھا۔ ساری کی شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ ہوا کا تیز جھونکا آتا تو اس کا گھونگھٹ اڑا دیتا اور اس کے چہرے پر بالوں کی لٹیں بکھر جاتیں۔ سونیا کا قد چھوٹا ہی تھا، ساری میں وہ اور بھی چھوٹی ہو گئی تھی۔ اس نے [illegible] ہوئے [illegible] رخساروں کا سونے جیسا رنگ نکھرا ہوا تھا۔ [illegible] متعدد بار دیکھی تھی۔ ایک زمانے میں تو روز ہی دیکھتا تھا لیکن اس وقت وہ مجھے کوئی مجسمہ لگ رہی تھی، ترشا ہوا جو [illegible] نے جیسے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہو، شائستہ اور [illegible]۔ بل ٹھیک ہی کہہ رہا ہوگا کہ بڑے بڑے لوگوں کے دل اس کے [illegible] ہوتے تھے۔ سونیا کسی کی بھی ہو [illegible] جب ہی آتے چڑھانے [illegible] اس کی عجیب [illegible] لوگوں سے الگ تھی۔ [illegible] کرتی تھی۔ میں نے کبھی اس کے لباس پر ایک دھبا نہیں دیکھا [illegible] تھی۔ کتابوں، گھر کی آرائش اور کھانے [illegible] سے اس کی [illegible] جھلکتی تھی۔ جتنی وہ نازک ہے اتنے ہی اس کے احساسات بھی نازک ہیں۔ سونیا کو اداس دیکھ کے میرا دل بہت گھبرا رہا تھا۔ بار بار میری نظریں اس کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ [illegible] تھی اس دوران کسی بار وہ مجھے نظر بھر دیکھے گی مگر اس نے اپنی جگہ سے جنبش نہیں کی۔ پتا نہیں بل نے اسے کیا بتایا تھا۔ گاڑی کی رفتار سست پڑنے کے ساتھ ساتھ بل کا اضطراب بڑھ گیا۔ ناگ پور شہر کے آثار کھڑکیوں سے نظر آنے لگے تھے۔
تھوڑی دیر میں وہ چلے جائیں گے، چھوڑ کے [illegible] جائیں گے۔ میں نے ان سے جانے کا کہہ تو دیا تھا لیکن اب کچھ عجیب معلوم ہو رہا تھا [illegible] وہ مسلسل سفر کرتے رہیں گے۔ انہیں تنہا [illegible] نہیں جانا چاہیے [illegible] پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ [illegible] سے پیچھے ہے [illegible] ہو سکتی ہیں [illegible] تو وہ پہلی [illegible]

ہے بمبئی کا ہنگامہ دیکھ کے دونوں ویسے ہی اکتا جائیں گے۔ میرے جی میں آئی، انہیں روک لوں۔ جیسے اباجان، چوہدری، زورا اور مارتی وغیرہ ساتھ جا رہے ہیں، یہ بھی کہیں نہ چلیں، جس طرح وہ سب وہاں رہیں گے یہ بھی رہ لیں گے۔ اسی اثنا میں گاڑی ناگ پور اسٹیشن میں داخل ہو گئی۔ مارتی نے دونوں کے سوٹ کیس اور بستر بند اٹھا کے دروازے کے قریب رکھ دیے تھے۔ اب میرا انہیں روکنا ٹھیک نہیں تھا۔ میں بھلا ان سے کیا کہوں گا اور اباجان کیا سوچیں گے۔ درمیان کا یہ مختصر وقفہ وہ کسی طرح گزار ہی لیں گے۔ آخر گھر سے بھی تو یہاں تک آئے ہیں۔ ناگ پور سے بڑودہ زیادہ دور ہے، آگے وہ اور قریب ہو جائیں گے۔ جیمز صاحب نے تمام حفاظتی [illegible] میں [illegible] تو انہیں کرا دی ہوگی۔ بل ایک ہوش مند [illegible] نوجوان ہے [illegible] کے بھی [illegible] گا، میں انہیں روکتے روکتے ٹھہر گیا۔
سونیا بھی کھڑی ہو گئی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی پہلے مارتی اترا اور اس نے زورا کی مدد سے دونوں سوٹ کیس اور بستر بند نیچے اتار دیے۔ بل نے اباجان کو سلام کیا۔ میرا خیال تھا، سونیا بھی مجھے سلام کرے گی مگر اسے تو جیسے اپنی کوئی سدھ بدھ نہیں تھی۔ وہ بل کے پیچھے سہمی ہوئی ایک طرف کھڑی رہی۔ اس کا چہرہ میرے مقابل تھا۔ جھکی جھکی آنکھیں، رخساروں پر ویرانی چھائی ہوئی۔ وہ بکھری بکھری گری گری سی نظر آتی تھی۔ بل نیچے اتر گیا تو وہ دروازے تک چلی۔ اباجان بھی انہیں رخصت کرنے کے لیے کھڑے ہو گئے تھے۔ میں نے ارادہ کیا تھا، جتنی دیر گاڑی ٹھہرے گی، میں انہی کے پاس رہوں گا اور جو میں سونیا سے نہیں کہہ سکا تھا اس دوران کہنے کی کوشش کروں گا۔ سونیا کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ دروازے تک پہنچ کے وہ ٹھہر گئی اور اس نے پلٹ کے میری جانب دیکھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی پھٹی تھیں۔ میرے سارے جسم میں ایک سنسنی سی اٹھی۔ سونیا کی سانس چل رہی تھی، اس نے اپنے ہونٹ بھینچ رکھے تھے۔ اباجان قریب ہی کھڑے تھے۔ میں نے سونیا کو سہارا دینے کے لیے قدم آگے بڑھائے اور مجھے ایسا لگا کہ وہ مجھ سے گلے ملنے کی آرزو مند ہے، اس کی آنکھیں یہی کہہ رہی تھیں۔ بے اختیار میں نے اپنے بازو پھیلا دیے۔ سونیا جیسے ٹوٹ کے گر پڑی۔ دوسرے ہی پل وہ میرے بازوؤں میں سمٹی ہوئی تھی اور اس کا دل اس کے سینے کی زنجیریں توڑ کے نکلنے لگا۔ میرا جسم لرزنے لگا۔ میں نے اسے اور زور سے دبوچ لیا۔ سونیا چند لمحوں تک کسمساتی رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ میرے اندر جذب ہو جانا چاہتی ہے، جیسے میرے جسم کا جزو بن جانا چاہتی ہے مگر یکایک اس کی گرفت ڈھیلی پڑی اور اس کی گردن میرے شانوں پر ڈھلک گئی۔
اس نے مجھے اباجان کی [illegible] دی۔

مجھے نہیں معلوم کیا ہوا، میرا جسم منجمد ہو گیا تھا۔ اباجان نے جھپٹ کے سونیا کو مجھ سے چھین لیا تھا۔ انہوں نے اسے فوراً برتھ پر لٹا دیا۔ ان کی چیخ سن کے مارتی، زورا اور بل اوپر چڑھ آئے تھے۔ میں گنگ نظروں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ آتے ہی انہوں نے دروازہ بند کر دیا اور سب سونیا کے گرد گھیرا ڈال کے بیٹھ گئے۔ اسی دم چوہدری میری طرف لپکا۔ "راجا!" اس کی سنسناتی آواز میرے کانوں میں گونجی اور مجھے جھنجھوڑ رہا تھا۔ "جلدی بول، کون ہے یہ؟"
"یہ... یہ سونیا!" میری زبان لڑکھڑا گئی۔
"سونیا! کون سونیا؟ اپنی کہو، جلدی بول۔"
"یہ جیمز صاحب کی لڑکی سونیا ہے۔" "تم جانتے ہو، اسے کیا ہو گیا ہے؟"
"تو کیسے جانتا ہے اسے؟"
"وہ... وہ... میں اور وہ..." مجھ پر جیسے گھومتی لرزا رہی تھی۔
"ویری ناگ!" وہ غصے سے بولا اور مجھے جھٹکنے لگا۔
میں نے اسے نہ جانے کیا بتایا۔
"ٹھیک ہے راجا!" وہ میری تڑپ چھپاتے ہوئے بولا۔
"اسے کیا ہو گیا ہے دادا؟"
"کچھ نہیں راجا! ابھی ہوش آ جائے گا، ایک ذرا صدمہ ہے۔"
وہ تیزی سے بل کی طرف پلٹ گیا۔ بل سونیا پر جھکے پاگلوں کی طرح اسے پکار رہا تھا۔ زورا نے یکایک تمام [illegible] کے سونیا کے پاس سے ہٹایا۔ بل مجھ سے آ کے لپٹ گیا اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ میری آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں، میں بے حس و حرکت کھڑا انہیں دیکھتا رہا۔ مارتی نے ساری کھڑکیاں گرا دی تھیں۔ اباجان نے سونیا کو چادر سے ڈھانپ دیا۔ مجھے اباجان اور چوہدری اس کے سرہانے بیٹھے سرگوشیاں کرتے رہے۔ اباجان کے چہرے کا رنگ سفید پڑ گیا تھا۔ کسی تاخیر کے بغیر انہوں نے اپنا سامان اور جیبیں ٹٹولنا شروع کر دیں۔ نوٹوں کی بہت سی گڈیاں انہوں نے چوہدری کے حوالے کر دیں۔ چوہدری نے انہیں اپنی جیبوں میں ٹھونس دیا اور کچھ زورا اور مارتی کی طرف پھینک دیں۔ زورا دروازے سے پشت

کر کے جنیٹل تھامے کھڑا تھا۔ فوراً بعد ہی سامان کھینچ لیا تھا۔ اسی
وقت چپڑ بل کے پاس آیا: "اپنی بات دھیان سے سنو۔" اس نے
بل کا بازو تھامے تیز لہجے میں کہا: "ابھی اپنے کو باندھ کے رکھو بابو
صاحب! وہ چلا گیا ہے۔ پر تم کو ابھی اپنے کو ٹھیک رکھنا ہے۔ ابھی
پولیس آئے گا۔ ابھی ادھر پولیس آئے گا۔" وہ اس کی آنکھوں میں
آنکھیں ڈال کے کہہ رہا تھا: "جیسا بولا ہے اُن کو ویسا ہی بولنا۔
ان لوگ سے کچھ مت چھپانا۔ ایک بھی بات نہیں۔ اِن لوگ ایدھر
سے نکل رہا ہے۔ اپنا اپنے رستے سے اور الگ ہو جائے گا اور۔۔۔
اور ایک دم فکر نہیں کرنا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سب ٹھیک
ہو جائے گا اور تم بھی بڑا ہو جائے گا۔" وہ میرے گالوں میں انگلیاں گاڑ کے بولا۔
"مرزا صاحب اپنا اکیلا ہے اس کو پریشان مت کرنا۔" وہ یہ کہتا ہوا
سامان اٹھا کے نیچے اتر گیا۔ چلتے چلتے بھی وہ ہاتھ کے اشارے سے
مجھے اور بل کو تلقین کرتا رہا۔ اُن کے جاتے ہی ابا جان سسکیاں
لے کر وہیں بابو بل کے پاس آ کے بیٹھ گئے۔ انھوں نے اس کے ہاتھ
پکڑ کے سینے سے لگا لیے۔ بل ان کے شانے سے لگ کے بلکنے لگا۔
کچھ ہی دیر میں گاڑی رینگنے لگی اور پچھلے ڈبے ابھی پلیٹ
فارم کے کنارے تک آئے ہوں گے کہ ابا جان نے اٹھ کے زنجیر
کھینچ دی۔ اچانک پہیے گھسٹنے کا شور بلند ہوا۔ گاڑی جھٹکے لیتی
ہوئی رک گئی۔ جیسے ہی گاڑی ٹھہری، ابا جان نے دروازہ کھول
کے چلانا شروع کر دیا: "ڈاکٹر! ڈاکٹر! کسی ڈاکٹر کو بلاؤ۔" وہ مسلسل چیخ
رہے تھے۔ مجھے کچھ نہیں سوجھ رہا تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ انھیں
چیختے دیکھ کے میں بھی دروازے کی طرف لپکا۔ میں نے غیر ارادی
طور پر نیچے اترنے کے لیے [illegible] بڑھائے ہی تھے کہ ابا جان نے
مجھے روک لیا اور کھینچ کے [illegible] کی جانب دھکیل دیا۔

سورج ڈوبنے کے قریب تھا۔ بہت سے مسافر نیچے اتر آئے
تھے۔ ایک طرف سے گارڈ اور اس کے ساتھ کچھ سپاہی ہمارے
ڈبے کی طرف تیز قدموں سے چلے آ رہے تھے۔

تھوڑی دیر میں ہم ریلوے تھانے میں پولیس افسر کے سامنے
بیٹھے تھے۔ ہمارے ارد گرد سپاہی کھڑے تھے۔ تھانے کے گیٹ پر
لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا۔ قریب ہی اسٹریچر پر سونیا لیٹی تھی اور
بینچ کے اس طرف بیٹھا ہوا بھاری جسم گندمی رنگت کا ایک ادھیڑ
پولیس افسر ابا جان سے سوالات کر رہا تھا: "یہ کس کے ساتھ ہے؟"
اس نے اسٹریچر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے درشتی سے پوچھا۔
"اپنے ہی ساتھ سمجھیے۔" ابا جان نے اٹکتے ہوئے جواب دیا۔
"کیا ہوا ہے؟"

"خدا جانے کیا ہو گیا! اچانک بالکل اچانک۔۔۔" ابا جان
کی آواز ڈگمگا رہی تھی۔
"نام؟" پولیس افسر نے سرد لہجے میں پوچھا: "آپ کا نام؟"
"صفدر علی۔" ابا جان بے تابی سے بولے: "مگر آپ یہ سب
پھر بعد میں پوچھ لیجیے گا۔ پہلے کسی ڈاکٹر کو بلا لیجیے۔"
"ڈاکٹر بھی آ رہا ہے۔" پولیس افسر کی متجسس نظریں ابا جان کے
چہرے پر چل رہی تھیں: "اس بیچ ادھر کی کارروائی بھی ہو جائے۔"
"جیسا آپ بہتر سمجھتے ہوں لیکن ڈاکٹر کب آئے گا؟"
"آدمی بھیج دیا گیا ہے۔" وہ تندی سے بولا: "کیا کرتے ہو آپ؟"
"تھوڑی بہت زمیں داری ہے۔"
"کون سی جگہ رہتے ہیں؟"
"بمبئی میں۔" ابا جان نے جواب دیا۔
"زمیں داری بھی بمبئی میں ہے؟"
"جی وہ فیض آباد میں ہے۔" ابا جان ناگواری سے بولے۔
"یہ لڑکی آپ کی کون ہے؟"
ابا جان کو جواب دینے میں دشواری پیش آ گئی۔ انھوں نے
پہلے بل کی طرف پھر میری طرف دیکھا مگر ہم دونوں کو درمیان میں
دخل دینے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اسی دوران ایک سپاہی ہاتھ
میں ڈاکٹر کا بیگ سنبھالے اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے ایک [illegible]
پوش ادھیڑ شخص بھی تھا جو یقیناً ڈاکٹر ہوگا۔ پولیس افسر اپنی نشست سے
اٹھ گیا۔ ہم بھی کھڑے ہو گئے۔ ڈاکٹر سونیا کے اسٹریچر کی طرف
پلٹا تو میرا دل دھڑکنے لگا۔ مجھ سے اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہوا جا
رہا تھا۔ پولیس افسر نے سونیا کے بدن سے چادر ہٹا دی۔ سونیا کا
چہرہ پھر میرے سامنے تھا۔ پہلے سے بدلا ہوا پُرسکون مسکراتا ہوا۔
ابا جان نے شاید اس کے بال کھول دیے تھے۔ سرخی مائل سے
بالوں کی اوٹ میں اس کا چہرہ کسی پھول کے مانند کھلا ہوا تھا۔
چاند کی طرح روشن تھا۔ لگتا تھا ابھی اس نے آنکھیں موند لی ہیں۔ ابھی
ابھی کھول دے گی۔ اے کاش یہ آنکھیں کھول دے۔ میرا دل [illegible]
کر رہا تھا۔ اے خدا! یہ آنکھیں کھول دے۔ میں اس سے ایک [illegible]
کہہ سکوں جو اس کی مرضی ہو گی۔ جو یہ کہے گی میں وہی کروں گا۔
[illegible] نے آنکھیں نہ کھولیں۔ ڈاکٹر چند ثانیوں تک ٹکٹکی باندھے [illegible]
دیکھتا رہا۔ اس نے جھکتے ہوئے سونیا کی کلائی ٹٹولی اور سینے [illegible]
رکھ کے دیکھا۔ بل کا منہ کھلا ہوا تھا۔ وہ دہشت زدہ آنکھوں [illegible]
ڈاکٹر کو دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر کو چند لمحوں سے زیادہ نہیں لگے۔ وہ [illegible]
افسر کو اشارہ کرتا ہوا وہاں سے ہٹ گیا۔ سونیا کا بدن [illegible]

سے چھپا دیا گیا۔
ابا جان نے ڈاکٹر سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی مگر وہ
سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا اور ابا جان کا کندھا تھپتھپاتا
ہوا اٹھ گیا۔ بل گڑگڑاتا ہوا کچھ دور تک ڈاکٹر کے پیچھے چلا، دھکا
لگا کے آگے سپاہیوں نے تھام لیا۔ بل منہ چھپا کے سسکیاں
بھرنے لگا۔
ڈاکٹر کو دروازے تک پہنچا کے پولیس افسر واپس آیا تو اس
نے سپاہیوں کو اسٹریچر اٹھانے کا حکم دیا۔ ہم بھی ساتھ جانے کیلئے
بڑھ گئے تھے مگر پولیس افسر کی بھاری آواز نے ہمیں روک
دیا: "آپ ابھی یہیں ٹھہریے۔"
"پر اسے آپ کہاں بھیج رہے ہیں؟" ابا جان لپکتے ہوئے
بیچ میں [illegible]
"ڈاکٹر کا کام ابھی باقی رہ گیا ہے۔" پولیس افسر نے خشونت
سے کہا۔
"لیکن لیکن۔۔۔" ابا جان اس کی تند نظریں دیکھ کے چپ ہو گئے۔
"تسلی سے بیٹھو۔" وہ تلخی سے بولا: "جو کچھ آپ سے پوچھا جائے
اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دیجیے۔ آپ تجربہ کار آدمی معلوم ہوتے
ہیں معاملے کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ ہمیں آپ سب کے بیانات
کی ضرورت پڑے گی۔"
"مجھے اندازہ ہے۔" ابا جان سر جھکا کے بولے: "مجھے خوب اندازہ ہے۔"
"اچھی بات ہے۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا: "ڈاکٹر کہتا
ہے یہ آدھ گھنٹے پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔"
"ہو سکتا ہے تقریباً اتنے ہی وقفے سے یہ بے سدھ تھی۔"
"کیا بیماری تھی اس کو؟"
"کوئی بھی نہیں۔ کچھ دیر پہلے اچھی بھلی تھی۔"
"پھر ایک دم یہ کیا ہوا؟" وہ جھنجھلاتی آواز میں بولا۔
"کیا کہا جا سکتا ہے۔"
"یہ کوئی معقول جواب نہیں ہے۔"
"اس کے سوا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔"
"بیٹھو۔" وہ ٹھیک اپنے برابر بیٹھے ہوئے سپاہی کو سرگوشی
میں کوئی ہدایت دینے لگا۔ سپاہی کاغذ پہ تیزی سے کچھ لکھ رہا تھا۔
دیکھتے دیکھتے میاں، پولیس افسر کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ اس کے تخاطب سے
ابا جان پر اضطراری کیفیت طاری ہونے لگی۔ "اپنے بارے میں تم
کچھ نہیں بتاتے۔" وہ منہ بنا کے بولا: "ہم نے اب تک بہت لحاظ
کیا ہے لیکن ہم سیدھے آدمیوں کے ساتھ سیدھے ٹیڑھوں کے ساتھ

پھر بہت ٹیڑھے ہیں۔ ایسی ویسی کوئی بات ہے تو ابھی بول دو۔"
"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟" ابا جان کپکپاتے ہوئے بولے۔
"ہم ایک صاف بات کر رہے ہیں۔ ہم سے الٹا سیدھا
بولو گے تو سب الٹا ہو جائے گا۔ اپنی بزرگی کا خیال کرو، ٹھیک
ٹھیک سب بول دو۔"
"آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟"
"جو ہم پوچھنا چاہتے ہیں وہ تم خود بتا دو تو اچھا ہے ورنہ
ہم پوچھیں گے تو شکایت مت کرنا۔"
"آپ کو کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے۔"
"ایسے کیسوں میں ہم کو یہ غلط فہمی ہو جایا کرتی ہے۔ ہم کو
غلط فہمی ہو گئی ہے تو تم اسے دور کر دو۔"
"مجھے وہ طریقہ بتا دیجیے۔"
پولیس افسر کی پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئیں: "تم لوگ کہاں جا رہے
تھے؟" وہ تحکمانہ لہجے میں بولا۔
"حیدرآباد۔"
"حیدرآباد کیوں؟"
"کام سے۔"
"کس کام سے؟"
"ذاتی کام سے۔"
"آ کہاں سے رہے ہو؟"
"فی الحال دلی سے لیکن کل صبح ہم فیض آباد سے چلے تھے۔"
"یہ دونوں کون ہیں؟"
"ایک میرا بیٹا ہے دوسرا۔۔۔" ابا جان کہتے کہتے رک گئے۔
"دوسرا کون ہے؟" وہ تیزی سے بولا۔
"اسے بھی بیٹا سمجھیے۔"
"سمجھے کیا، صاف صاف بتاؤ۔"
"یہ میرا ہم سفر ہے۔"
"ہم سفر ہے۔" وہ چونک کے بولا: "تمھارا اس کا بس سفر
کا ساتھ ہے؟"
"میں یہی کہہ رہا ہوں۔" ابا جان دھیمی آواز میں بولے۔
"لڑکی تمھاری کون ہے؟" وہ ترش روئی سے بولا۔
"لڑکی بھی میری ہم سفر تھی۔"
"میں پوچھتا ہوں لڑکی سے تمھارا رشتہ کیا ہے؟" وہ اونچی
آواز میں بولا۔
"آدمیت کا رشتہ تھا۔"

"بہر وا خدا کے لیے خاموش رہو" ابا جان میری منت کرنے لگے۔

میری آنکھوں میں گھٹن ہونے لگی۔ ایک مدت بعد میں نے ابا جان کی زبان سے بہروا سنا تھا۔ جنت میں ملنے کے بعد سے اب تک انھوں نے مجھ سے اس طرح بات نہیں کی تھی۔

"اپنی جگہ بیٹھو بڑے میاں" پولیس افسر نے دھتکارتے لہجے میں ابا جان کو مخاطب کیا۔ "یہ ٹھیک کہتا ہے۔ تم چپ رہو۔ ابھی اس سے بھی کرو دو باتیں کر لینے دو۔"

"جناب! اس کا کہا درگزر کر دیجیے۔" ابا جان نے فریاد کی۔ "میں آپ سے پھر درخواست کرتا ہوں آپ میڈیکل رپورٹ کا انتظار کر لیں۔" ابا جان میرے پاس ہی کھڑے رہے۔

"وہ تو جب آئے گی دیکھیں گے۔ میں اس کے لیے چائے منگواتا ہوں۔ ابھی اس نے کیا اعتراف کیا ہے۔" وہ طیش میں بولا۔

"آپ کے پاس اس کے سوا کیا رکھا ہے۔"

"تجربہ کار معلوم ہوتا ہے۔"

"بہت زیادہ۔ آپ سے زیادہ۔" میں نے اونچی آواز میں کہا۔ "مگر میں نے زندگی میں آپ جیسا شخص نہیں دیکھا۔ شاید آپ کو پہلی بار ایسا تماشا دیکھنے کو ملا ہے۔ مجھے آپ ایک پولیس افسر سے زیادہ مداری معلوم ہوتے ہیں۔ ان دونوں کو چھوڑ دیجیے۔ مجھے گرفتار کر لیجیے۔ میرے اعتراف کے بعد انھیں روکنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اپنی رپورٹ مکمل سمجھیں اور اسے فریم میں لگا کے اوپر بھیج دیں۔"

ابا جان دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کے بیٹھ گئے۔

"قاعدہ قانون کچھ ہم بھی جان سکتے ہیں۔ ہم آپ کے پاس اس لیے نہیں آئے تھے کہ آپ اس طرح کی باتیں کریں گے اور پچھتائیں گے، بغیر سوچے سمجھے بغیر جو منہ میں آئے گا کہتے رہیں گے۔ اگر آپ کی کوئی لڑکی ہوتی اور یہ سب کچھ آپ کے ساتھ پیش آتا؟ ہماری جگہ آپ ہوتے تبھی کچھ جان سکتے تھے کہ بہت سی باتیں زبان پر نہیں لائی جا سکتیں۔ نہ معلوم کون کس عالم میں آپ کے پاس آتا ہے، کون سے کانٹے اس کے سینے میں چبھے ہوتے ہیں۔ آپ کو اس لڑکی کے بارے میں الٹی سیدھی باتیں کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، نہ سوچنے کا ہے۔ وہ چلی گئی ہے لیکن اس کے پوچھنے والے موجود ہیں۔ جو باتیں آپ کی سمجھ میں نہیں آسکتیں، انھیں آپ کیوں جاننا چاہتے ہیں۔ آپ کے پاس ایک ہی لاٹھی، ایک ہی پیمانہ ہے۔ یہ کچھ نہیں جانتے۔" میں نے ابا جان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "انھوں نے جو کہا ہے اس سے زیادہ انھیں معلوم نہیں ہے۔ پر میں جانتا ہوں کہ وہ کون تھی۔ وہ میرے ساتھ تھی۔ میں اسے برسوں سے جانتا ہوں۔ وہ ایک ایسے گھر کی لڑکی تھی جہاں سر اونچے رکھے جاتے ہیں۔ وہ کسی گھر کی ناموس تھی۔ وہ اتنی پاک اتنی اچھی تھی کہ اس کے متعلق بدگمانی کرنا گناہ ہے۔ اس کی اجازت آپ کو نہیں دی جا سکتی۔ آپ مجھ سے کم از کم اتنا کر سکتے ہیں کہ خاموش رہیں۔ آپ کو ایک مجرم کی تلاش ہے۔ میں سامنے موجود ہوں۔ کیا اتنا کافی نہیں ہے کہ مجرم آپ کی دسترس میں ہے۔ ایسی ویسی غیر ضروری باتوں سے آپ کو کیا ملے گا۔ وہ میرے بازوؤں میں ختم ہوئی تھی۔ میرے لیے سب کچھ میرے لیے۔" میری آواز بھرانے لگی۔ "کسی کا قصور نہیں ہے، میرا قصور ہے۔ مجھے اس کی سزا دے دیجیے۔ ان کو رہا کر جانے دیجیے۔ وہ میں ہی تھا۔ یہ نہیں تھے۔ ضرورت پڑی تو میں آپ کو اپنا ریکارڈ بھی بتا دوں گا۔ اس سے آپ کی کچھ تسلی ہو جائے گی کہ آپ نے ٹھیک آدمی کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈالی ہیں۔"

میرے خاموش ہو جانے کے باوجود پولیس افسر دیر تک مجھے گھورتا رہا۔ سپاہی ہتھکڑی لیے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے اس کے آگے ہاتھ بڑھا دیے۔ ابھی سپاہی نے مجھے ہتھکڑی نہیں پہنائی تھی۔ وہ پولیس افسر کے حکم کا منتظر تھا کہ بل بڑبڑانے لگا۔ "نہیں نہیں چھوڑو، چھوڑو۔" وہ چیختے ہوئے بولا اور سپاہی پر جھپٹ پڑا۔ اس نے اپنے ہاتھ اس کے آگے کر دیے۔ "میرے ہاتھوں میں، میرے ہاتھوں میں۔" وہ دہاڑتے ہوئے بولا۔ "انھیں میرے ہاتھوں میں ڈال دو۔ وہ ان کے ساتھ نہیں میرے ساتھ آئی تھی، بردوان سے۔ میں اسے بردوان سے لایا تھا۔ ہم دونوں حیدرآباد جا رہے تھے۔ یہ لوگ تو بس اتفاقاً، بالکل اتفاقاً ہمیں مل گئے تھے۔ میں تمھیں بتاتا ہوں۔ وہ بردوان کے ایک بڑے گھر کی لڑکی ہے۔ اس کے باپ بہت بڑے افسر ہیں۔ وہ میرے ساتھ اپنے گھر والوں کی اجازت کے بغیر جا رہی تھی۔ ہم دونوں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ہم گھر ہی چھوڑ دیں۔ یہ لوگ ہمیں دلی میں ملے تھے، گاڑی میں، اسٹیشن پر۔" بل سانس لیے بغیر کہتا رہا۔ "سب میرا قصور ہے۔ نہ میں اسے گھر سے لاتا، نہ وہ اس طرح روٹھ کے جاتی۔"

وہ بین کرنے لگا۔ میں نے اس کی زبان بند رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن بل اپنے آپے میں نہیں رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے بے تحاشا آنسو ابل رہے تھے۔ آواز بھی بھری ہوئی تھی۔ اسے جیسے خود معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ نہ جانے کیا کیا بکے جا رہا تھا۔

"بیٹھو بیٹھو شور مت مچاؤ۔" پولیس افسر نے گرج کے

سپاہیوں کو حکم دیا کہ اسے قابو میں رکھیں۔

"انسپکٹر صاحب! یہ سب غلط کہہ رہے ہیں۔ مجھے پھانسی دے دیجیے۔ مجھے سولی پر لٹکا دیجیے۔ میں زندہ رہنا نہیں چاہتا۔ اس کے بغیر میں زندہ رہ بھی نہیں سکتا۔ ان کا کوئی دوش نہیں ہے، کوئی دوش نہیں ہے۔ یہ نہ جانے کہاں جا رہے تھے۔ ان سے کچھ مت پوچھیے۔" سارا کمرہ اس کی بلکتی آوازوں سے گونج رہا تھا۔

"بیٹھو۔" پولیس افسر نے خود کرسی سے اٹھ کے اسے بٹھانے کی کوشش کی۔ "اوسان میں رہو۔ جو کہنا چاہتے ہو ترسان سے کہو۔"

"مجھے کچھ نہیں کہنا آپ سے۔ میری صرف ایک بنتی ہے۔" وہ گڑگڑاتے ہوئے بولا۔ "مجھے اس کے ساتھ ہی جلا دیجیے۔ میں اس کے ساتھ ساتھ....."

"دھیرج رکھو۔" پولیس افسر نے ٹھہر ٹھہر کے کہا۔ "تم کہتے ہو کہ وہ تمھارے ساتھ تھی۔"

"ہاں ہاں میرے ساتھ۔" بل سینے پر ہاتھ مار کے بولا۔ "ہم بردوان سے آ رہے تھے، بردوان سے۔"

"تم بردوان میں رہتے ہو؟"

"جی جی۔" وہ ہچکیوں کے درمیان بولا۔ "پانچ دن پہلے ہم بردوان سے چلے تھے۔"

"ان دنوں میں کہاں رہے؟"

"پہلے لکھنؤ، دلی۔ دلی سے ہم حیدرآباد جا رہے تھے۔"

"پھر کیا ہوا؟"

بل نے اپنے بال کھسوٹ لیے۔ "مجھے اس کے سامنے رہنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ مجھے اسی وقت ہٹ جانا چاہیے تھا جب اس نے اپنے دیوتا کو دیکھا تھا۔ میں نے ہی اس کے لیے مشکل پیدا کر دی تھی۔ مجھے اس کا خیال رکھنا چاہیے تھا کہ میرے سامنے ہونے کی وجہ سے وہ کتنی الجھن میں گھر گئی ہو گی۔ میں چلا جاتا تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ میرا کیا کام رہ گیا تھا جو میں اس کے سامنے موجود رہا۔"

"تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"یہی بات تھی انسپکٹر صاحب! یہی بات تھی۔ میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں، میری بات کا یقین کیجیے۔"

"تمھاری باتیں بالکل سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں۔ کھل کے بتاؤ۔"

"آپ کی سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔ آپ کچھ مت پوچھیے۔" وہ دیوانوں کے مانند چلانے لگا۔ "وہ کہاں ہے؟ اسے آپ نے کہاں بھیج دیا ہے؟ مجھے اس کے پاس لے جائیے، صرف ایک بار، ایک بار کے لیے۔ میں اس سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ وہ کہاں ہے انسپکٹر صاحب، مجھے اس کے پاس لے چلیے۔"

"لے چلیں گے، تمھیں اس کے پاس بھی لے چلیں گے۔" پولیس افسر نے معنی خیز انداز میں اسے پچکارتے ہوئے کہا۔ "مجھے بتاؤ تم نے اس کے ساتھ کون سی زیادتی کی تھی؟ کس بات کی معافی مانگنا چاہتے ہو؟"

"میں نے اس کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔ سب سے بڑا دوشی میں ہوں۔ میرے عمل میں ضرور کوئی کھوٹ آ گئی تھی انسپکٹر صاحب!"

"کیسی کھوٹ؟" پولیس افسر متجسس لہجے میں بولا۔ "تم نے اسے دھوکا دیا تھا؟"

"نہیں نہیں۔" وہ وحشت سے اپنا سر جھٹکنے لگا۔

"پھر..... پھر تم نے کیا کیا؟" پولیس افسر نے چلتے چلتے بل سے پوچھا۔ "تم کہتے ہو کہ تم اسے بھگا کے لائے تھے!"

"ایسا مت کہیے۔" بل جذباتی انداز میں بولا۔ "وہ دیوی تھی۔"

"پانچ دن تک تم اس دیوی کے ساتھ رہے، تنہا۔ تم نے اس کے ساتھ ضرور کوئی....." پولیس افسر اپنی ادھوری بات پوری نہیں کر سکا تھا کہ بل نے اس کا گریبان پکڑ لیا اور اس کے منہ پر طمانچے مارنے لگا۔ قریب کھڑے ہوئے سپاہیوں نے اسے کمر سے پکڑ لیا تھا مگر اس کی پچھاڑوں سے وہ ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس کے جسم میں نہ جانے کہاں سے اتنی طاقت آ گئی تھی کہ وہ کسی کے ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ چند لمحوں تک وہ دیوانہ وار کمرے میں منڈلاتا شور مچاتا رہا۔ وہ سامنے کے دروازے سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ وہاں سپاہیوں کی دیوار دیکھ کے پلٹ پڑا۔ پیچھے ہی اس نے پولیس افسر کے گریبان پہ ہاتھ ڈالا تھا۔ میں بھی بڑھ گیا تھا مگر ایک طرف سے ابا جان میرے بازو سے چمٹ گئے تھے، دوسری طرف سے سپاہیوں نے مجھے روک لیا تھا۔ پولیس افسر ایک کونے میں ہو گیا تھا اور چیخ چیخ کے سپاہیوں کو حکم دے رہا تھا۔ اتنی دیر میں بل نے پولیس افسر کی میز پہ رکھا ہوا چاقو اٹھا لیا۔ جیسے ہی میں نے اس کے ہاتھ میں چاقو دیکھا، ابا جان اور سپاہیوں کی گرفت سے خود کو چھڑا کے میں نے اس کی جانب جست لگائی۔ میں اسے ضرور تھام لیتا لیکن مجھے دیر ہو گئی۔ چاقو اتر چکا تھا۔ میں نے جب تک سنبھالا دیا اور اس کے سینے سے باہر نکالا تو وہ اتنا ہی کہہ سکا کہ اسے سوبھنا کے ساتھ ساتھ جلایا جائے۔ اس کے سوا اسے کچھ کہنے کا وقت نہیں ملا۔ اس نے میرے

اب ..... کہیں جانے کو نہیں چاہتا۔ وہاں جانے سے کچھ بھی نہیں ہوگا، کہیں بھی، کہیں بھی جانے سے کچھ نہیں ہوگا، بس واوا! گھر لوٹ چلو۔ ادھر بھی کوئی نہیں ہوگا۔"

"کیسے نہیں ہوگا۔" وہ تنک کے بولا۔ "اور تو نے اپنی آنکھوں سے پتہ دیکھا تھا۔"

"دیکھا تھا لیکن ....."

اس نے مجھے گلے سے چمٹایا اور کہنے لگا کہ لیں حوصلہ نہیں ہارتے۔ آدمی کو آخری دم تک امید باقی رکھنی چاہیے۔

"واوا! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" میں نے ڈوبتی آواز میں کہا۔

"کاہے کا ڈر؟" وہ میرے بازو پکڑ کے جھنجوڑنے لگا اور بے قراری سے بولا۔ "اپن یہ کیا سن رہا ہے راجا بھائی! تم سے چل جائی اپیدر ہو تا تو ابھی تیرے کو اُٹھا کے ہاتھ کا اور کھاتا۔"

"میری بات مان لو واوا!" میں نے عاجزی سے کہا۔

"ابھی سب کچھ اپن کو چھوڑنے راجا! اپنے پہ آتا بوجھ مت ڈال، اپیدر اپن کا کچھ ٹھیک چلتا ہے۔" وہ آنکھیں مٹکا کے بولا پھر نرمی سے کہنے لگا۔ "اپن سمجھتا ہے ابھی تیرے ملنے سے اور تاگ پورہ والا پری کا نشہ نہیں اترتا ہے ایسا تو بھی نہیں سکتا راجا! وہ مجھ کو جاسمنی بائی والا بات یاد ہوگا اور بھی سالا ایسا ہی کچھ ہوا تھا۔ اور پھر جا کے جاسمنی بائی ابھی تک اپن سے منتی کرتی ہے۔ جا تو وہ اپنے کو مار کے نہیں گیا تھا۔ اپن کی چھاتی پہ جونک کے گیا تھا پر راجا! تیرے دادا نے ترڈ اپن کے بھی جاسمنی بائی کا واؤ جھٹکا یا ہے۔ جاسمنی بائی کے تیئں اپن ابھی تیری عمر والا تھا۔ سوچ اپن کو بھی ....." اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ ایک دم دیوی کے مانند بھرا جسم چھلانے لگا تھا۔

پیر مجھے دھکیلتا ہوا تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ "ابھی چل کے اور دیکھتا ہے۔" وہ تھکی لہجے میں بولا۔ "سالا اب نہیں تو سویرے کو گاڑی پکڑنے لگا۔ ابھی تو اپنے سن ہیا۔ پھیر راکھ کے ہی جس زیادہ سے زیادہ لوٹ آئے گا، پھیرا اور کیا ہونے گا۔" وہ ہوٹل سے باہر آ گیا تھا۔ گیٹ کے سامنے ہی ہمیں ہاتھ کا رکشا مل گیا۔ آتے یاد تھا کہ مراد آباد کے مسافر خانے کے رجسٹر میں مولوی صاحب نے حمایت نگر کا پتہ لکھوایا تھا۔ عابد شاپ روڈ سے وہاں کا فاصلہ اتنا زیادہ نہیں تھا۔ روشنیاں جل چکی تھیں لیکن ابھی اندھیرا گہرا نہیں ہوا تھا۔ سڑکوں پر ہر جانب راہ گیریں اور سواریوں کا زور تام متحرک تھا۔ ساری دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ تانگہ کوٹھی سے گزرتا ہوا رکشا جلد ہی حمایت نگر کے علاقے میں داخل ہو گیا۔ پیر نے جلے ہی رکشا پرانے چھوڑ دیا اور اندر جوڑی گلی میں کچھ قدم تک پیدل ہی چلتا رہا۔ اس کی تیز رفتاری کا مجھے بھی ساتھ دینا پڑ رہا تھا۔ پیر کو پہلا پتہ از بر تھا۔ راستے میں ایک راہ گیر کو متوجہ کر کے اس نے خرم منزل کا پتہ پوچھا۔ وہ شخص خود نو وارد تھا مگر کچھ آگے چل کے پوچھ پان کی ایک دکان سے ہمیں خرم منزل کا راستہ معلوم ہو گیا۔ حمایت نگر کے سارے علاقے میں بڑے بڑے مکانات تھے اُن کی طرز تعمیر ہی سے ظاہر تھا کہ وہاں بڑے لوگ بستے ہیں۔ یہاں مولوی صاحب کے رہنے کا دیسے بھی کوئی امکان نہیں تھا لیکن پیر دکان دار کے بتائے ہوئے راستے پر آگے بڑھتا رہا۔ چند منٹ کی مسافت کے بعد ہم خرم منزل کے سامنے تھے۔ لمبی چوڑی چار دیواری کے اندر وہ ایک جدید طرز کی کوٹھی تھی چار دیواری میں ہر طرف اونچے اونچے درخت اُٹھے ہوئے تھے۔ یہاں آ کے جیسے مجھے کچھ ہوش آ گیا تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ مسافر خانے کے رجسٹر میں یہی پتہ لکھا تھا۔ کیا عجب وہ ہمیں یہاں کوئی تو بات ہوگی جو مولوی صاحب نے یہاں کا پتہ لکھوایا تھا کیا معلوم ابھی وہ میرے سامنے کھڑے ہوں۔ میرے سارے جسم سے پسینہ پھوٹنے لگا تھا۔ لوہے کے بڑے گیٹ پر ..... دربان کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ وضع قطع سے وہ کوئی عرب معلوم ہوتا تھا۔ پیر نے اُسے سلام کیا اور تصدیق کی کہ خرم منزل یہی ہے۔ دربان نے اثبات میں جواب دیا۔ پیر نے اس سے مولوی صاحب کا نام لیا۔

"نکو بابا!" دربان اُلجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "یہاں اس نام کا کوئی آدمی نہیں رہتا۔ یہاں نواب خاور شوکت یار جنگ بہت ..... ہیں۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔ یہ سن کے مجھے کچھ سکون سا ہوا تھا۔

"ابے مولوی محمد شفیق نام کا کوئی آدمی نہیں رہتا؟" پیر نے تکرار کی۔

"ابھی کیا بولا آپ کو؟" دربان نے تلخی سے کہا۔ "کبھی رہتا بھی نہیں تھا؟"

دربان نے اسے بتایا کہ جب سے کوٹھی تعمیر ہوئی ہے یہاں یہی خاندان رہتا ہے، نواب قدرت یار جنگ کا خاندان۔

پیر اس کا جواب سن کے چند لمحے وہیں سامنے کھڑا رہا۔ پھر نے یہ کہہ کر وہیں نہیں دیا۔ "کیا اپن نواب صاحب کو مل سکتا ہے؟" پیر نے اس سے التجا کی۔ "اپن بہت دور سے آئے ہیں، ہو سکے تو اپنے سے تھوڑا مہربانی کرو۔"

دربان کسمسانے لگا اور آخر پیر کے اصرار پر آمادہ ہو گیا۔ وہاں ٹھہرا کے اور دروازہ بند کر کے وہ کوٹھی میں گیا اور چند ہی منٹ بعد واپس آ گیا۔ نواب صاحب نے اجازت دے دی تھی۔ دربان ہمیں عمارت کے ایک آراستہ کمرے میں سلیقے سے بٹھا دیا۔ ذرا دیر بعد ایک ملازم نے آ کے ہمارے آگے خشک میوہ و میوے کے پیالے رکھ دیے۔ کچھ دیر بعد شیروانی میں ملبوس اور بیلے قد، مضبوط کاٹھی کا ایک شخص اندر داخل ہوا۔ عمر پچپن سال کے قریب ہوگی۔ رنگ سرخی، آنکھیں بڑی بڑی اور لال لال تھیں۔ ہم دونوں کھڑے ہو گئے۔ پیر نے بیاز مند کو قوت یاد رکھنے ہیں۔ وہ بھاری آواز میں بولا اور ہمیں بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ وہ ہمیں دیکھ کے کچھ متذبذب سا ہو گیا تھا لیکن متانت سے پوچھنے لگا کہ وہ ہماری کیا خدمت کر سکتا ہے۔

"اپن کو ایک آدمی کی تلاش ہے نواب صاحب!" پیر نے جھجکتے لہجے میں زبان کھولی۔ "اپن کو پتہ لگا تھا کہ وہ ادھر ہی رہتا ہے۔"

"کون سے آدمی کی؟" نواب نے تردد سے پوچھا۔

"اس کا نام مولوی محمد شفیق ہے۔"

"مولوی محمد شفیق!"

"ہاں جی!" پیر نے اضطراب سے کہا۔ "اپن کو مراد آباد سے پتہ چلا تھا کہ وہ ادھر ہی رہتا ہے۔ اپن نے اس واسطے آپ کو تکلیف دیا ہے اگر وہ ادھر نہیں رہتا تو شاید آپ کو پتہ ہو گا اس کا۔"

"آپ مراد آباد والے مولوی شفیق صاحب کو پوچھ رہے ہیں؟" میرے کان کھڑے ہو گئے۔ پیر کے بجائے میں نے تیزی سے کہا۔ "جی ہاں وہی، وہی مولوی شفیق صاحب! کیا آپ انہیں جانتے ہیں؟"

اس کے ماتھے پر سلوٹیں پڑ گئیں۔ "ہاں!" وہ پلکیں پٹ پٹاتے ہوئے بولا۔ "مجھے ان سے کسی قدر نیاز حاصل ہے لیکن آپ ....."

یک دم وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا اور متوحش نگاہوں سے ہمیں گھورتا ہوا بولا۔ "معاف کیجیے مجھے آپ حضرات کے تعارف کا موقع نہیں مل سکا۔"

"اس کا نام..." پیر نے مجھے بتایا۔ "اس کا نام بابر زماں ہے اور اپن کا اسم مقصد علی" پیر نے بڑی جلدی میں کوئی اور نام یاد نہ آیا تو اس نے اپنا اصلی ہی نام لے لیا۔

"خوب!" نواب نے سر ہلا کے کہا۔

وہ کچھ اور پوچھنا چاہتا تھا کہ پیر نے اُسے بولنے نہیں دیا۔ "اپن کا مولوی صاحب کی کھوج میں ہے۔ بہت دنوں سے اس کا کوئی پتہ نہیں چلا ایسے ہی اپن کو مراد آباد میں ادھر کا معلوم ہوا۔ اپن یہ معاملہ بتا دیا گیا۔ اپن بہت مجبوری میں آپ کے پاس آیا ہے۔ اگر آپ کو معلوم ہے تو اپن کو بتا دو، آپ کا بڑا احسان ہوگا۔" پیر نے ایک ہی سانس میں کہنے کی کوشش کی۔

"ضرور، ضرور!" نواب جھجکتے ہوئے بولا۔ "مگر ایسی کیا بات ہے جو آپ کو ان کی اس قدر تلاش ہے؟"

"ایسا ہی کچھ ہے نواب صاحب!" پیر نے اضطراری لہجے میں کہا۔

"اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے کچھ بتائیں۔"

"ابھی اپن آپ کو کیا بولے، سمجھو اپن کو اس کا کوئی چیز لوٹانا ہے۔" نواب غور سے سنتا رہا، پیر کا جواب اُن کے اُس کی آنکھوں کی بے چینی کم نہیں ہوئی۔ شائستگی سے بولا۔ "آپ کی آمد کا مقصد واضح نہیں ہوا، شاید آپ کی مراد ہے کہ آپ کو ان کی کوئی امانت لوٹانی ہے اور وہ آپ کو نہیں مل رہے ہیں؟"

"ایک دم ایسا ہی۔" پیر اُچک کے بولا۔

نواب مولوی صاحب کے بارے میں مزید کچھ جاننا چاہتا تھا۔ میں نے سوچا، اُس سے وضاحت کر دوں لیکن میری زبان حلق میں اٹکی ہوئی تھی۔

"آپ مولوی صاحب قبلہ کے کوئی عزیز ....."

نواب کی بات ادھوری رہ گئی۔ پیر نے عجلت کی۔ "ایسا کوئی بات نہیں ہے نواب! کچھ اور سمجھو، ابھی اپن کا بات خود دھیان سے سنو نواب صاحب! یہ مولوی صاحب کا لڑکا ہے اور ان کا اس سے بچھڑے بڑا عرصہ ہو گیا ہے۔ اپن کا بچہ ماتنگ کے بلکہ ہیں بعد بمبئی میں اُن کے بارے میں ساتھ کام کرتا ہے۔" پیر اب ایک لفظ پہ زور دیتے ہوئے بولا۔ "ابھی کچھ سمجھا نواب صاحب! مولوی صاحب آٹھ نو سال سے مراد آباد میں نہیں رہتا۔ یہ اُن کے بہت پریشان ہے۔" پیر نے رک کے پوچھا۔ "ٹھیک ہے؟" نواب نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔

"اپن یہ بمبئی میں تھا کہ مولوی صاحب سالوں بعد اُن کی اولاد اپنا مکان نیچ کے جو کہیں چلے گیا۔ بمبئی سے گھر آ گئے پاس کے پتہ چلا کہ مولوی صاحب مراد آباد آیا تھا اور مسافر خانے میں ایک لڑکا قد کا تھا اپنا پتہ لکھا تھا، ابھی آپ نہیں بتے ہو تو اپن کو بولو۔"

"نہیں نہیں!" نواب نے کسی قدر خجالت سے کہا۔ "میں سمجھ گیا آپ کو یہی محبت بلا دوری ہے تو مجھے افسوس ہے آپ اتنی دور سے تشریف لائے ہیں، آپ کے کسی کام آتے ہوئے مجھے مسرت ہوگی مگر ایک بات تو طلب ہے، آپ فرما رہے ہیں کہ مولوی صاحب سالوں بعد مراد آباد آئے تھے اور وہاں سے چل کے چلے گئے۔ لا محالہ مراد آباد میں شرکت دوستوں اور عزیزوں سے ملنے جلنے گئے ہوں گے۔ یہ بات ..... شاید تمہیں وہیں جانا چاہیے کہ کس کی امانت کی

گئی تھی کوئی دس منٹ ہوں گے کہ دفعتاً پیرو نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے بدحواسی سے اُسے دیکھا۔ "چلو نا دادا! ابھی باہر چلتے ہیں۔"

وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔

"کہاں دادا؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"ابھی ذرا باہر کی سیر کرتا ہے۔"

"ابھی اپن بھی ساتھ چلے دادا؟" منی بیگم نے تیزی سے [illegible]

"تمہارا پڑھائی کا ہے گا اسٹر؟" پیرو نے تنک کے کہا۔

"مگر تم کہاں جا رہے ہو دادا؟" میں نے سراسیمگی سے پوچھا۔

پیرو نے جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ میرا بازو پکڑ کے اُس نے جھٹکے سے مجھے اٹھا لیا۔ وہ دالان سے نکلنے ہی والے تھے جب اُس نے تنک کے آپا جان سے کہا کہ وہ دوپہر کے کھانے پر ہمارا انتظار نہ کریں، ہمیں دیر بھی ہو سکتی ہے تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ آخر اتنی دیر کے لیے وہ کہاں جانے کا ارادہ رکھتا ہے؟ باہر آتے ہی میں نے اُس سے پھر پوچھا۔

"ابھی ذرا اور گھوم کے دیکھتا ہے۔" وہ نرمی سے بولا۔

"اب اور کیا دیکھنا رہ گیا ہے دادا!"

"ابھی شہر بہت بڑا ہے۔"

"نہیں دادا!" میں نے اُس کے آگے تن کے راستہ روک لیا۔

"واپس چلو دادا! کہیں مت جاؤ۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ ٹھوکریں کھانے سے کیا فائدہ؟ مجھے اب کسی کو نہیں ڈھونڈنا، مجھے کسی کی تلاش نہیں ہے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں دادا! بعد میں بھی میں تم سے... کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔ اب گھر چلو، وقت ضائع کیوں کرتے ہو۔"

وہ مجھے اپنے سامنے سے ہٹاتے ہوئے بیزاری سے بولا۔

"ابھی ضعیف حرکت چل، ادھر ہوٹل کا سارا لوگ دیکھتا ہے۔"

"دادا! میری بات مان لو۔"

"ابھی ایک دن سے سالا تم میں کون سا بل آجائے گا۔ اُدھر جا کے بھی اپن کو تمیم کا کون سا حساب چکانے کا ہے؟"

"ایک دن میں تم کہاں کہاں جا سکو گے؟ میں اس شہر میں خوب گھوم چکا ہوں، جگل بھائی کے ساتھ بھی، اکیلا بھی۔ یہ شہر دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔ سیدھے بمبئی چلو۔ مولوی صاحب کے دل میں کبھی خدا ڈال دے گا تو وہ خود مجھے ڈھونڈ لیں گے۔"

"ابھی اڑی مت کر رے بابا!" وہ تندی سے بولا اور آگے ہی بڑھتا رہا۔

"اُدھر بمبئی میں گیتا منی لے کے بیٹھی ہوگی۔ بھابی الگ راہ تکتی ہوں گی۔ آپا جان بھی اُن سب سے ملنے کے لیے بے چین ہوں گی۔ ایسا ہی ہے تو بمبئی سے ہو کے پھر یہاں آجائیں گے۔"

"پھر بھی آجائے گا۔ ابھی ایدر آیا ہے تو اس بہانے تھوڑا سیر بھی کرلے۔"

"مجھے معلوم ہے تم سیر کرنے نہیں جا رہے ہو۔"

"سیر بھی ساتھ ساتھ ہو جائے گا جانی!"

"پتہ نہیں دادا! میں تمہیں کس طرح سمجھاؤں۔ ہو سکے تو میری بات سمجھنے کی کوشش کرو، دادا! مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا۔ انھیں ڈھونڈنے کے خیال سے میرا دل اب بہت گھبرا رہا ہے۔" میں نے الجھ کے کہا۔ "اچھا ہے کہ ثروت بھیا [illegible] اس وقت ہمارا بمبئی جانا ہی ٹھیک ہے۔ دیر بھی ہو سکتی ہے، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ہوتا وہ ہے اس لیے میں کہہ رہا ہوں، راستہ کیوں کھوٹا کرتے ہو۔"

اُس نے پلٹ کے مجھے گھور کے دیکھا اور منہ اٹھائے چلتا ہی رہا۔ ہوٹل سے چند قدم آگے عابد شاپ روڈ کے چوراہے پر میں نے اُس سے ایک بار پھر منت کی تو وہ ناراض ہونے لگا۔

"ابھی ایسا کیا ہے رے بابا! اپن بولتا ہے ابھی ایک دن اور ٹھہر جا، تو سارا دُنیا اُلٹ جائے گا کیا۔ کوئی ڈھونڈنے کے لیے کھوٹ کھوٹ ہی کرنا پڑتا ہے، سمجھا جانی! ابھی کچھ بولے گا [illegible] اُدھر اُوپر والے کو ایک طرف دھیان لگا! ابھی نہیں ہوگا، دو تم پاؤں چھوڑ کے بیٹھ جائے گا تو وہ بھی منہ پھیر لے گا۔"

وہ سب ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر اپنی زبان بند ہی رکھی۔ اُسے کوئی جلدی نہیں تھی تو مجھے بھی اس قدر اصرار تکرار کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اُس نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا جیسے میں کہیں بھاگ جاؤں گا۔ اس نے رکشہ نہیں کیا، پیدل ہی عابد شاپ روڈ کے چوراہے سے دائیں طرف مڑ گیا اور سو ڈیڑھ سو قدم چلنے کے بعد جیسے ہی کسی مسجد کے مینار نظر آئے اُس کے قدم رکنے لگے۔ مسجد کے [illegible] پرچون کی ایک دکان پر جا کے اُس نے مولوی صاحب کا [illegible] اور حلیہ بتایا۔

رات نواب ثروت یار نے خیال ظاہر کیا تھا کہ شاید مولوی صاحب حیدرآباد ہی میں ہوں اور اب تک کسی وجہ سے اُن سے ملنے نہ آسکے ہوں۔ پیرو کے من میں یہی بات [illegible] ہو سکتا ہے کہ ایسا ہی ہو۔ مولوی صاحب نے تھک ہار کے حیدرآباد میں مستقل طور پر بسنے کا ارادہ کر لیا ہو ورنہ وہ نواب

ثروت یار سے اس کا تذکرہ کیوں کرتے۔ وہ ایک عالم آدمی ہیں، حیدرآباد میں ایسے لوگوں کی بہت قدر کی جاتی ہے۔ یہاں انھیں روپے پیسے کی اتنی مشکل پیش نہیں آسکتی تھی جتنی اور شہروں میں۔ یہیں نواب ثروت یار جیسے ان کے اور شناسا بھی ہوں گے۔ کسی زمانے میں ان کی بہن بھی یہاں بیاہی گئی تھی، میں نے انھیں ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن ناکامی کے سوا کچھ نہیں ملا۔ بہرحال مولوی صاحب تو اپنی بہن کے سسرالیوں سے خوب واقف ہوں گے، اگر وہ لوگ واقعی حیدرآباد ہی میں موجود ہیں۔ مولوی صاحب روپے پیسے سے اتنے ہی تنگ ہوگئے تھے جو انھیں مرادآباد میں اپنا مکان بیچنے کی ضرورت پڑی اور پیدل یہاں اپنے واقف کاروں کے سہارے کی۔ اب تک وہ اپنے جاننے والوں سے دور دور رہے تھے، کاش انھیں معلوم ہوتا، انھیں کسی کی مدد، کسی کا سہارا لینے، کسی کے سامنے اپنا ہاتھ پھیلانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرے پاس [illegible] اتنے روپے ہیں کہ وہ ساری زندگی شاہوں کی طرح بسر کریں تو بھی بچ جائیں اور [illegible] سب چھوڑ دے [illegible] تھے۔ میں نے [illegible] کمال ہی کیا تھا جو باہر آنے کے بعد کام آسکتا تھا۔

پہلے ہم عابد شاپ روڈ کے نزدیک ترین علاقوں میں گھومتے رہے، پھر پیدل اور آگے بڑھ گئے۔ پیرو ہر گلی، محلے اور [illegible] ضروریاتِ زندگی کی دکانوں پر جا کے مولوی صاحب کا نام لے کے پوچھتا رہا۔ پیرو اُن سے یہ وضاحت بھی کر دیتا تھا کہ مولوی صاحب ایک ڈیڑھ ماہ پہلے ہی اس علاقے میں آئے ہوں گے۔ یہ مدت محلے والوں اور دکانداروں سے شناسائی کے لیے بہت کم تھی لیکن یہ بھی ہے کہ محلے میں آنے والے کسی اجنبی پر فوراً ہی نظر پڑ جاتی ہے۔ دوپہر ہوتے ہوتے [illegible] ہم چارمینار کے نزدیک آگئے۔ سب بے سود رہا، کہیں کوئی شخص مولوی صاحب کے نام اور حلیے پر نہیں چونکا۔ ہر جگہ سے ایک ہی جواب ملا تھا۔ چنچل گوڑہ، افضل گنج، حسینی علم، شاہ گنج، پتھر گٹی، چار کمان، [illegible]، لاڈ بازار، محبوب گنج، [illegible]، مارکیٹ، بیگم بازار، [illegible] جہاں جہاں بھی ممکن ہو سکا ہم اِدھر سے اُدھر چکر کاٹتے [illegible] مارکیٹ سے نکل کے پیرو نے دن بھر کے لیے [illegible] لے لیا تھا جسے ہم نے چارمینار پر چھوڑ دیا اور آگے پیدل چلتے رہے۔ راستے میں صرف ایک جگہ چند منٹ ٹھہر کے ہم نے [illegible] پیٹ ایک ہی دن میں سارا حیدرآباد چھان لینے کا [illegible] نظر آتا تھا۔ [illegible] وہ اِدھر اُدھر کے مدرسوں اور مسجدوں کے بارے میں بھی پوچھتا تھا چنانچہ ہم انھی راستے میں پوچھتے جاتے تھے۔

جس وقت ہم پتھر گٹی کے علاقے سے گزر رہے تھے تو دوپہر ڈھل چکی تھی۔ بازاروں میں بھیڑ بھی بڑھ گئی تھی، سائیکل [illegible] والوں کا ہجوم ہر طرف رواں دواں تھا۔ دکانوں پر بھی خوب رونق ہو گئی تھی [illegible] بند ہو گئے تھے، وہ سب بھی ظہر کے وقت بند ہو گئے تھے لیکن مسجد کے مدرسے میں کوئی ذکر [illegible] ایسا فرد مل جاتا جو وہاں پڑھنے والے اُستادوں کے بارے میں واقفیت رکھتا ہو۔ ابھی ہم پتھر گٹی میں تھے اور [illegible] ہم نے [illegible] پار ہی کیا تھا کہ اچانک ایک جگہ پیرو نے میرا بازو تھام لیا اور دھیرے سے بولا۔ "بابا! ابھی لگتا ہے اپن لوگ کا پیچھا کیا جارہا ہے۔"

میں نے بے اختیار پلٹ کے دیکھنا چاہا لیکن پیرو کے ہاتھ دبانے پر میں ٹھٹک کے رہ گیا اور مجھے بے چینی محسوس ہونے لگی۔ دو قدم آگے بڑھ کے میں ایک دکان کے سامنے رک گیا۔ پیرو کا اندازہ درست تھا۔ ایک شخص ہم سے کچھ فاصلے پر [illegible] قدموں سے ہمارے پیچھے آرہا تھا۔ [illegible] کہ اس کی رفتار ایک دم [illegible] تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ وہ ایک دبلا پتلا، [illegible] تیس سال کے قریب عمر کا شخص تھا۔ رنگ سیاہ اور وضع قطع سے مقامی معلوم ہوتا تھا۔ میں اور پیرو کپڑے کی دکان پر مختلف چیزوں کے نرخ پوچھتے رہے مگر ہماری نگاہیں اُسی پر مرکوز تھیں۔ کچھ آگے جا کے وہ پان کی ایک دکان پر ٹھہر گیا۔ اس نے پان کا بیڑا منہ میں رکھا، سگریٹ سلگائی اور بے نیازی کے انداز میں ہماری طرف بھی کنکھیوں سے دیکھتا رہا۔ اسی دوران میری نظر سڑک کے پار ایک اور شخص پر پڑی۔ مجھے اُس پر بھی وہی شبہ ہوا۔ میں نے آنکھوں آنکھوں میں پیرو کو اشارہ کیا تو وہ مسکرانے لگا۔ "کون لوگ ہو سکتا ہے؟" وہ دبی ہوئی آواز میں بولا۔

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"تُو پہلے بھی ایدر کئی بار آچکا ہے نا!"

"ہاں!" میں نے تذبذب سے کہا اور اسی لمحے مجھے شاہ کبیر کا خیال آیا۔ میں نے مختصراً اُسے شاہ کبیر کا واقعہ بتایا۔ "ہم پہلے اُن سے پوچھتے ہیں دادا!"

"نہیں!" اُس نے کچھ سوچتے ہوئے انکار کیا۔

"پھر سیدھے ہوٹل واپس چلو اور بمبئی جانے کی تیاری کرو۔ ضروری نہیں کہ مولوی صاحب نے جو ثروت یار سے کہا تھا وہی ٹھیک ہو۔ ممکن ہے مرادآباد سے وہ کہیں اور چلے گئے

بھوں کچھ اور دماغ میں سما گیا ہو۔"
"ابھی دو تین جگہ پل کے دیکھتا ہے۔ ہوٹل کی طرف جانا
بھی ابھی ٹھیک نہیں ہے۔" وہ کھنچی ہوئی آواز میں بولا۔
چھتر گنج سے آگے پل عبور کرکے ہم نے تین چار جگہ اور بھی
مولوی صاحب کو پہچاننے کی کوشش کی مگر سرسری طور پر اس
طرح ہیں۔ پیچھا کرنے والے دونوں آدمی بھی ساتھ ساتھ آتے
رہے حالانکہ ہم نے رفتار کم کرکے اُنھیں اپنے پاس آنے اور
بات کرنے کا کئی بار موقع دیا تھا۔ وہ نہ ہمارے قریب آتے تھے
نہ ہم سے کچھ پوچھنا یا اُلجھنا چاہتے تھے۔ میں نے بہت غور کیا مگر
شاہ گجرال کی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اور ظاہر ہے کہ جس سبب
اُنھوں نے ہمیں اپنی نگاہوں کا مرکز نہیں بنائے رکھا ہوگا، صورت
شکل سے وہ سادہ لباس والے بھی نہیں معلوم ہوتے تھے اور یہ
امکان بھی نہیں تھا کہ اُنھیں ہم پر کسی اور کا دھوکا ہو گیا ہو۔ اتنی
پختہ غلط فہمی بھی قرینِ قیاس نہیں تھی۔ چھتر گنج سے ہم نے خاصا
راستہ پیدل طے کیا تھا، کہیں بھی وہ ہمارے راستے کی رکاوٹ
نہیں بنے اور نہ کہیں اُنھوں نے ہمیں اپنی آنکھوں سے اوجھل
ہونے دیا۔ عابد شاپ روڈ سے ہم رکشا میں بیٹھ سکتے تھے لیکن
یہ یقین نہیں تھا کہ وہ ہمارے پیچھے دوسرے رکشا میں نہیں آئیں گے
پل عبور کرنے کے بعد ہم نے ایک تنگ گلی سے نکل کے کسی اور
طرف نکلنا چاہا، راستہ ہمیں معلوم نہیں تھا، ہم گلی میں گھستے گئے۔
بہت دور چکر کاٹنے کے جیسے ہی ہم باہر نکلے وہ موجود تھے ایک
دوسرے سے دور کھڑے ہوئے اور وہاں ہمیں احساس ہوا کہ وہ صرف
دو نہیں ہیں۔ جتنے اردگرد ہماری نظروں میں آسکے اُن کی تعداد
پانچ سے کم نہیں تھی۔ اُن میں ایک سائیکل سوار بھی تھا۔ چلتے چلتے
پیرو نے کہنی مار کے بظاہر پُرسکون لہجے میں مجھ سے پوچھا: "ابھی
پہچاننے کی کوشش کر۔"
"مجھے کچھ یاد نہیں پڑتا کہ میں نے انھیں پہلے کہیں دیکھا ہے۔"
"... پاڑے کے لوگ دکھائی دیتا ہے۔"
"مجھے بھی کچھ یہی لگتا ہے۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔
"ابھی دیکھتے ہی رکھنا۔" اُس نے مجھے تحمل کی تاکید کی۔
میں خود اس سے یہی صحبت کرنا چاہتا تھا۔ ہمیں اپنی جانب
سے کوئی پیش قدمی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ بہتر یہی تھا کہ ہم کسی
طرح راستہ کاٹ کے ہوٹل واپس پہنچ جائیں۔ میں نے پیرو کو مشورہ
دیا۔ "اگر ہمارا ہوٹل جانا مناسب نہیں ہے تو ہم انھیں
تھکانے بھٹکانے کے لیے اِدھر اُدھر گھومتے رہیں، دیکھتے ہیں وہ
کہاں تک چلتے ہیں لیکن میں نے کہنے کو کہہ دیا تھا، مجھے خود اپنی بات
کی بے وزنی بے یقینی کا احساس تھا۔ پہلے ہمیں اُن کے مقصد کا
کوئی اندازہ ہونا چاہیے تھا، اس کے بعد ہی کوئی اقدام مناسب تھا۔
اُس وقت ہم ایک بڑی سڑک سے گزر رہے تھے کہ ایک
بس آکے رکی۔ وہ سکندرآباد جا رہی تھی۔ سکندرآباد شہر حیدرآباد سے
ملا ہوا ہی ہے۔ صرف ایک ندی درمیان میں پڑتی ہے۔ سکندرآباد
سے ہم کسی دوسری بس میں واپس آسکتے تھے۔ بس کچھ آگے جاکے
رک گئی تھی۔ ہم نے اپنی رفتار سست کر دی اور جیسے ہی بس چلی
ہم بھاگ کے پائدان پر چڑھ گئے۔ اُن میں سے کوئی بس میں نہیں
آسکا تھا لیکن ایک اسٹاپ چھوڑ کے دوسرے اسٹاپ پر جو
شخص دوسرے مسافروں کے ساتھ بڑبڑاتا ہوا بس میں داخل ہوا،
وہ اُن پانچوں میں سے ایک تھا جنھیں ہم نے موسیٰ ندی کے پل
پار آکے دیکھا تھا۔ بس شہر میں چل رہی تھی اس لیے اُس کی رفتار
تیز نہیں تھی، فاصلہ بھی کم تھا اور دو اسٹاپوں پر رکنے کی وجہ سے
اُس شخص کو خاصا وقت مل گیا تھا۔ اتنی دیر میں کوئی بھی تیز سائیکل
چلاتا ہوا بس پکڑ سکتا تھا۔ وہ پائدان کے قریب ایک نشست
پر بیٹھ گیا اور خاموش رہا۔ بس معظم جاہی مارکیٹ سے آگے
جاکے عابد شاپ روڈ پر آئی تو پیرو اتر گیا۔ پیچھے وہ بھی اتر گیا۔
نیچے اُتر کے کچھ دور چلنے کے بعد ہم نے دیکھا کہ وہ سب موجود
ہیں۔ ضرور کسی دوسری سواری سے وہ بس کا پیچھا کر رہے تھے۔
پیرو کی آنکھوں کی دُول بڑھ گئی تھی۔ ہمیں جلد ہی کوئی تدبیر
کرنی چاہیے تھی مگر اتنی آسانی سے کوئی بھی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا
تھا۔ اُنھوں نے اب تک ہماری جانب کوئی کنکر نہیں پھینکا تھا
اور اُن کے تیوروں سے آگے بھی کوئی ایسا امکان نظر نہیں آتا تھا
تاہم ہر طرف سے ہم اُن کی نظروں کے حصار میں تھے۔ یہ نتیجہ اخذ
کرنا اب مشکل نہیں تھا کہ انھیں کسی بھی وجہ سے ہماری ضرورت
ہے اور فی الحال انھیں ہمارا ٹھکانا جاننے کی بے چینی ہے۔ ہوٹل
قریب ہی تھا، زیادہ سے زیادہ آدھ فرلانگ کے بقدر فاصلہ
ہوگا۔ ہم ہوٹل پہنچ کے آبا جان، زہرا اور مادری کو لے کر دوسرے راستے
کی طرف نکل سکتے تھے اور کسی بھی ریل گاڑی میں بیٹھ سکتے تھے۔
وہ تب بھی ہمارا پیچھا کرتے تو کہاں تک۔ بمبئی تک۔ بمبئی میں
اُن سے نمٹا جا سکتا تھا لیکن کوئی ضمانت نہیں تھی کہ وہ ہمیں وہاں
برقرار رکھیں گے۔ محض تعاقب ہی اُن کا مقصد ہے۔ وہ ہمیں سکون
سے ہمیں حیدرآباد سے جانے دیں گے۔ اُن سے یہاں بھی نمٹا
جا سکتا تھا لیکن جو بات میرے ذہن میں تھی، وہی پیرو کے لیے
رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔ ایک ذرا سی جلد بازی سے کوئی بھی بڑی
اُلجھن کھڑی ہو سکتی تھی۔ بمبئی پہنچنے میں زہرا، مادری اور رنگ سکتی تھی۔
آبا جان بھی ہمارے ہم سفر ہونے کی وجہ سے لازماً متاثر ہوتے
زہرا، مادری۔ پیرو اور میری بات ہوتی تو یہ آنکھ مچولی اتنی دیر جاری

رہتی۔ بار بار یہ اندیشہ میرا جسم بھی جھنجھنا رہا تھا کہ کہیں پیرو کا پیمانہ
نہ چھلک جائے۔ اُس کی زندگی میں شاید یہ پہلا موقع ہوگا کہ اُسے
ذلت کی حد تک یہ سب کچھ برداشت کرنا پڑ رہا تھا۔ وہ پیرو کو
نہیں جانتے تھے۔ وہ کس سے یہ مذاق کر رہے ہیں، کون اُن کے
سامنے ہے۔ بمبئی شہر کا سب سے بڑا دادا، بمبئی کے سامنے پاڑے
جس کی ملکیت ہیں۔ پیرو کی پیشانی پر شکنوں کا جال بچھا ہوا تھا۔
میری رگوں میں بھی خون جل رہا تھا۔ انھیں مزید وقت نہیں دینا
چاہیے تھا اور نہ اپنی کشمکش اور تردد کا کوئی تماشا، رفتہ رفتہ وہ
پانچ ہو گئے تھے، آگے اور بڑھ سکتے تھے۔ عابد شاپ روڈ پر
ہوٹل کی طرف جانے کے بجائے پیرو ساڑیوں کی ایک دکان میں
داخل ہو گیا تھا۔ وہ وہاں مختلف رنگوں کی ساڑیاں دیکھتا پرکھتا
رہا اور اس نے کوئی سو ساڑیوں میں سے دو قیمتی ساڑیاں منتخب
کیں یقیناً ایک گیتا کے لیے، دوسری اس کی ماں کے لیے۔
پیکٹ بغل میں دبائے ہم دکان سے باہر نکلے تو انھیں
اپنا منتظر پایا۔ وہ اِدھر اُدھر منتشر تھے۔ پیرو نے جیسے اُن کی طرف
نہیں دیکھا اور دکان سے نکلتے ہی گزرتا ہوا ایک رکشا روک
کے اُس پر بیٹھ گیا۔ شام ہو گئی تھی اور دھیرے دھیرے اندھیرا
بڑھ رہا تھا۔ ہم نے کہیں پیچھے مڑ کے نہیں دیکھا کہ وہ ہمارے
ساتھ آ رہے ہیں یا نہیں۔ اب اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی
انھیں تو آنا ہی چاہیے تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہم پھر موسیٰ ندی کے
پل کی طرف آگئے تھے لیکن ہم نے پل پار نہیں کیا۔ اس سے پہلے
ہی اتر گئے اور ایک سنسان سی گلی میں داخل ہو گئے جہاں ہم شام
کے ابتدائی وقت آ پہنچے تھے۔ گلی کے ایک طرف خشک ندی
کا پاٹ تھا، دوسری جانب مکانات۔ ہم مسلسل اندر گلی میں
بڑھتے رہے اور ایک نسبتاً خاموش اور کم آباد مقام پر پیرو نے
مجھے ٹھہرنے کا اشارہ کیا۔ وہاں سے چند قدم بعد دوسری گلی کا نکڑ
تھا۔ اس طرف گلی کے کھمبے نہیں تھے لیکن دور کی پرشعب
روشنیاں جل گئی تھیں اور اندھیرا اتنا گہرا نہیں ہوا تھا کہ ہم اپنے
تعاقب کرتے ہوئے لوگوں کو نہ دیکھ سکیں۔ وہ دو آدمی تھے جو
ہمیں بظاہر دیکھ کے پہلے کی طرح ٹھہرے نہیں، آگے آتے رہے۔
اُن کی چال البتہ مدھم پڑ گئی تھی۔ ابھی وہ ہمارے مقابل نہیں
آئے تھے کہ گلی کے قریبی نکڑ سے ہم نے اُن کے علاوہ تین لوگ
آتے دیکھا۔ وہ سبھی تنہا تھے۔ پہلے دو آدمی ہم سے ذرا سا فاصلہ
رکھتے ہوئے جیسے ہی بے نیازانہ ہمارے مقابل سے گزرنے لگے، پیرو نے
روک لیا، انھیں آگے نہیں جانے دیا۔ ساڑی کا بنڈل میری طرف
اچھالتے ہوئے وہ جست لگانے کے مانند آگے بڑھا۔ دوسرے ہی
پل اُن دونوں کی گردنیں اس کے پنجے میں دبی ہوئی تھیں۔ "بولو
سالا! ابھی تم کیا مانگتا ہے؟"
"کچھ نہیں، کچھ نہیں۔" وہ بری طرح سٹ پٹا گئے تھے۔ "تو کیا
کیا؟ تم......"
پیرو نے اُن کی گردنیں پکڑے پکڑے جھٹکے کے بعد دیگرے اُن
کے گھٹنوں کے اوپر ریڑھ کی ہڈی کے کنارے گھٹنے مار کے ضرب
اتنی شدید تھی کہ اُن کی چیخ بھی نہیں نکل سکی۔ "ابھی تم سور کا
جنا اپُن لوگ کا پیچھا کیوں کرتا ہے؟"
"نہیں نہیں۔" وہ بمشکل تمام کراہتے ہوئے بولے۔ "تم کو دھوکا
ہوا ہے۔ ہم لوگ تو اپنی راہ جا رہے تھے۔"
"اپنا راہ جا رہا تھا۔" پیرو نے جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ "ابھی تم جس
جگہ چلا جائے گا، ایک دم اپنا ٹھکانے پر۔"
"ہم کو معاف کر دو۔" ہر گز وہ گھگھیاتی ہوئی آواز میں بولے
"ہماری کوئی غلطی نہیں ہے، ہم کو معاف کرو۔"
"ابھی تم کو معلوم کیسے پتا ٹھیک ٹھیک پتا ہے؟"
پیرو نے اُن کی گردنوں پر پنجے کی گرفت سخت کر دی تھی۔
وہ تڑپتے، گڑگڑاتے ہوئے بولے "ہماری بات سنو، ہم سب
بول دیتے ہیں، ابھی ہم کو کچھ انکار نہیں ہے، ذرا صبر کرو۔" درد کی
شدت سے اُن کی آنکھیں اُبل آئی تھیں۔ پیرو نے اُن کی گردن
پر دباؤ بڑھا دیا۔ "مائی باپ، بھول دھوکا ہو گیا تھا۔" وہ زمین پر
پاؤں پٹخنے لگے۔ "ہماری آنکھیں نکل پڑیں گی۔ تم وہ نہیں
جس کی ہم کو تلاش تھی۔"
پیرو کا غصہ اور بڑھ گیا۔ "ابھی تم کو پتا لگا کہ اپُن وہ نہیں
ہے۔ اپُن تم کو بولتا ہے کہ اپنی زبان ایک دم دبی۔"
"نہیں دادا، بالکل نہیں۔ بہت بڑی غلطی ہو گئی۔ تم کو اپنی
ماں کا، اپنی بہن کا واسطہ، ہم کو چھوڑ دو۔" وہ دونوں گڑگڑا
رہے تھے اور ساتھ ہی اپنے آپ کو گالیاں دیتے جاتے تھے۔
اُن کی آہ و بکا سن کے اُن کے دوسرے تین آدمی جو چند
قدم آگے گلی کے نکڑ سے داخل ہوئے تھے اور اب تک وہیں
ساکت کھڑے دیکھ رہے تھے آہستہ قدموں سے آگے بڑھ آئے۔
اُنھوں نے جان بوجھ کے اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہونے
میں دیر لگائی ہوگی لیکن پھر اور دیر نہیں لگی، وہ ہماری جانب لپکے
اور اجنبیوں کے لہجے میں پوچھنے لگے۔ "کیا بات ہے؟" وہ
پیرو کے بازو پکڑ کے اُس کی گرفت سے اُن دونوں کی گردنیں
چھڑانے کی کوشش کرنے لگے اور ساتھ ہی نرم و سخت لہجے
میں اُسے سمجھا رہے تھے۔ "تم کیا کر رہا ہے، آخر ٹھوکر تو غلطی
آدمی سے ہوتی ہے۔"
اُن کی زبانی مداخلت بے اثر تھی۔ رحم دلانہ لہجے کے اعتماد میں

ہم سے مخاطب تھے جیسے پیرو کی گرفت میں بلکتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے اُن کا کوئی تعلق نہ ہو۔ اب جانے وہ انھیں چھوڑ دو، اتنا بست ہے، سمجھتے ہیں کہ انھیں کوئی مزاحمت ملی ہے۔ انھوں نے پیرو کو دونوں جانب سے کھینچنا شروع کر دیا تھا۔ ایک دو لمحوں تک تو میں اس خیال سے الگ خاموش کھڑا دیکھتا رہا کہ پیرو کے اشارے کے بغیر میری مداخلت ٹھیک نہیں ہے۔ ہم اچھا ہے بات طول کھینچنے سے پہلے یہیں ختم ہو جائے لیکن وہ پہلے بن رہے تھے۔ میں نے پھر بھی توقف کیا اور مجھے لگا کہ وہ پیرو کے بازو جکڑ کے اپنے دونوں ساتھیوں کو چھڑانا ہی نہیں چاہتے، پیرو دونوں کی جانب سے ترنت کے ہاتھ اٹھانے کا متوقع بیٹے کی تاک میں بھی ہیں یہ اُن کی نادانی تھی یا کسی حکمت سازی ہیں انھیں پیرو کے متعلق کوئی اندازہ قائم کر لینا چاہیے تھا۔ کاش کوئی انھیں بتا سکتا کہ اُن کی دگنی تعداد کے لیے بھی اکیلا پیرو کافی ہے اور پیرو کو اتنا وقت بھی یوں لگا ہے کہ ثبوت اُن سے کچھ جاننا مقصود ہے۔ پیرو نے اُن کے دونوں ساتھیوں کو تقریباً معطل کر دیا تھا۔ اُن کے ہاتھ کھلے ہوئے تھے لیکن اُن سے کام لینے کا انھیں یارا نہیں تھا۔ اُن کی گردنوں میں پیرو کے پنجوں کی انگلیاں اس طرح پیوست ہو گئی تھیں کہ جسم کی ذرا سی حرکت بھی اُن کی اذیت دو چند کر جاتی تھی۔ پیرو نے بعد میں آنے والے آدمیوں کی دخل اندازی پر اتنا دھیان نہیں دیا تھا جتنا پیچھے آدمیوں کی گرفت پر۔ جب وہ دونوں کی کھینچا تانی میں شدت آگئی تو پیرو نے اُن کی ٹانگوں پر پیروں سے ضرب لگائی اور وہ بالکل بے بس ہو گئے اور ایک نے پیرو کی کمر پر پوری قوت سے سر مارا، سر وار لڑکھڑا گیا تھا لیکن اس کے پنجے اُن کے ساتھیوں کی گردن سے نہیں ہٹے بلکہ اس کش مکش میں پیرو کی انگلیوں کی پیوستگی اُن کے لیے اور کاری ہو گئی تھی اُن کے حلق سے گھٹی گھٹی غرغراتی آوازیں نکلنے لگی تھیں۔ ادھر میں نے ساڑی کا پلیٹ جھٹک کے کھلے ہوئے دونوں آدمیوں سے نمٹنے کے لیے قدم بڑھا دیے تھے لیکن مجھے ٹھٹکنا پڑا۔ میری توقع کے خلاف پیرو نے اچانک پہلے والوں کو جھٹکا دے کے چھوڑ دیا تھا۔ اسی لمحے وہ پچھاڑ سا کھاتا ہوا دو قدم پیچھے ہٹ گیا تھا جس طرح مجھے توقع نہیں تھی اسی طرح پیرو کو کھینچنے گھسیٹنے والے آدمیوں کو بھی اس کی اس ناگہاں دست برداری یا پینترے کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ وہ پیرو کو پیچھے ہٹتا دیکھ کے اپنی دانست میں اُسے قابو میں کرنے اور کوئی دوسرا موقع نہ دینے کے خیال سے بے تحاشا اُس پر جھپٹے۔ پیرو کو جیسے اُن کے اس ردعمل کا یقین تھا۔ اُن کے دوبارہ قریب آنے سے پہلے اُن دونوں کی گردنیں اپنے بازوؤں میں جکڑنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔

پہلے والے آدمی آزاد ہو گئے تھے لیکن پیرو کے جھٹکے سے ابھی توازن قائم نہیں رکھ سکے تھے۔ اندھوں کی طرح ڈگمگاتے ہوئے زمین پہ اوندھے گرے۔ میری آنکھیں اُٹھی پر بھی ہوئی تھیں اور ہر قدم ان کے اٹھنے کے منتظر تھے۔ وہ نیم جاں ہو گئے تھے مگر ہوش و حواس کچھ قائم تھے۔ گرتے ہی انھوں نے اٹھنے کی کوشش کی اور بھاگنا ہی چاہتے تھے کہ انھیں اپنے ساتھیوں کی چیخیں سنائی دیں جن کے سر پیرو کے بازوؤں کے شکنجے میں جکڑے ہوئے تھے اور جن کے جسم بری طرح پھڑپھڑا رہے تھے۔ پیرو نے مجھے اشارہ نہیں کیا تھا پر مجھے ایک ایک پل کاٹنا دوبھر ہو رہا تھا۔ یہیں زیادہ وقت بالکل نہیں لگانا چاہیے تھا۔ گو گلی میں آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی مگر اندھیرا بھی بڑھ رہا تھا۔ ہم جس جگہ تھے وہ شاید کوئی گودام تھا۔ پچیس پچاس گز کے لگ بھگ ادھر اور آگے گلی کے قریبی نکڑ تک اُدھر ایک شکستہ دیوار سی ہوئی تھی۔ درمیان میں لکڑی کے لمبے چوڑے دروازے پہ بھاری تالا لگا ہوا تھا۔ پیرو نے یہ جگہ اسی لیے منتخب کی تھی ہمیں مقابل مدی کے پیچھے کی چھریلی دیوار کے باوجود نزدیک ہی گلی کے ساتھ ٹوٹے پھوٹے کچے پکے مکانات کی تعداد دور تک چلی گئی تھی۔ اُن کی چیخیں جن سے دو دو کے کہیں اور راہ گیر متوجہ ہو سکتے تھے۔ یہ بھی طے نہیں تھا کہ جتنے لوگ ہماری نظروں میں آئے ہیں اُن کی تعداد اتنی ہی ہو۔ گلی کے دونوں جانب اور بھی لوگ ہو سکتے تھے۔ سائکل سوار کا نہ ہونا بھی بے سبب نہیں ہوگا۔ میرے ذہن میں یہی خدشے منڈلا رہے تھے، پیرو بھی ان سے بے خبر نہیں ہوگا۔

ویسے ہی میں اُٹھتے ہوئے اُن دونوں آدمیوں کو اُن سے سنبھلنے سے پہلے تھامنے کے خیال سے آگے بڑھی۔ وہ اُٹھے تو دونوں یکا یک پیچھے کی طرف جھکے۔ انھوں نے جیب کھول کے مجھے متذبذب کر دیا تھا۔ اسی اثنا میں انھیں چاقو نکالنے کی مہلت مل گئی تھی اور چاقو ہاتھ میں آ جانے کے بعد اُن میں دوبارہ جان سی آگئی تھی۔ ایک میری طرف، دوسرا پیرو کی جانب ہاتھ پھیلا، چاقو لہراتا آنے لگا۔ اُن کی حد سے زیادہ جیتی جھکیاں اور چھلانگیں میرے لیے اُن کے خوف کا مظہر تھیں۔ دوسرے کا رخ پیرو کی طرف تھا۔ پہلے مجھے اُسے روکنا چاہیے تھا پیرو نے بھی دیکھ لیا ہوگا۔ وہ پلٹ کے اُن کے ساتھیوں ہی کو اُس کے آگے کر سکتا تھا مگر مناسب یہی تھا کہ اُسے پیرو کی طرف جانے ہی نہ دیا جائے۔ ہم دونوں میں سے وہ مجھی کو پہچانتے ہوں گے۔ پیرو پہلی بار حمید آباد آیا تھا۔ وہ میں ہی ہو سکتی تھی کہ وہ

مجھے پہچانتے تھے تو انھیں شاہ کبیر والا واقعہ بھی یاد ہوگا۔ چاقو ہاتھ میں آجانے کے باوجود اُن کی احتیاط اور جھجک بھی بے مطلب نہیں تھی اور یہی وجہ ہوگی کہ اُن کی نظریں میری طرف اُٹھتی رہی تھیں۔ اسی بوکھلاہٹ میں وہ کوئی بھی اوچھا پن کر سکتے تھے۔ میں نے جب پیرو کی طرف بڑھنے والے آدمی کو روکنے کے لیے اُس کے راستے میں آنا چاہا تو وہ گھبرا گیا اور اس کا رخ میری ہی طرف ہو گیا۔ پھر خطا ایک ہی مدبھیڑ سے دماغ میں آئی کہ کسی توقف کے بغیر میں اُسے منتشر کرنے کے لیے بے تصرف ہاتھ پیر چلاؤں اور گرد میں ہلتا رہوں۔ یہ ایسا بے مقصد بھی نہیں تھا۔ مجھ نے بھی جیل میں ایک تربیت کے اور لانے کے ساتھ ہی کہا تھا اسی طرح اُن کے فیصلے کی قوت مدھم پڑ سکتی تھی اور کسی بھی لمحے اُن کا ہاتھ میرے شکنجے میں آ سکتا تھا۔ ایک کا آنا ہی کافی تھا اور یہی ہوا۔ مجھے آنا فانا کئی زاویے بدلنے پڑے کہ اُن ہی سے ایک کا ہاتھ میرے پنجے میں جکڑا ہوا تھا۔ دوسری طرف سے بھی میری نظریں غافل نہیں تھیں لیکن مجھ سے بس ایک پل کی چوک ہو گئی۔ مجھے خیال نہیں رہا تھا کہ دوسرے پر اتنی دہشت طاری ہو سکتی ہے۔ اُس نے اپنے ساتھی کو میرے قبضے میں دیکھ کے دیوانہ وار مجھ پہ چاقو تان لیا۔ اب مجھے لازماً اُس کے ساتھی کو اُس کے سامنے کر دینا چاہیے تھا۔ میں نے کچھ جلدی کی تھی مگر وہ اپنا بڑھا ہوا ہاتھ کھینچ نہیں سکا۔ اُس نے روکنے کی بھی کوشش کی لیکن چاقو اُس کے ساتھی کی پسلی سے گزر گیا تھا۔ دوسرا اُس نے حواس باختگی سے چاقو کھینچا، اُدھر چشم زدن میں میں نے اُس کے زخمی ساتھی کو ایک جانب دھکیل کے اُس کی قدر ترچھا ہو کے اُس کے جبڑے پہ ضرب لگانا چاہا۔ اُس کا ہاتھ ڈھیلا ہوا۔ چاقو والا ہاتھ جتنی دیر میں دوبارہ میری طرف گھومتا اتنی دیر میں ضرب لگا کے میرا ہاتھ واپس آ سکتا تھا۔ وہ ایسا ہی تاثر کیا تھا کہ چاقو اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ جبڑے پکڑ کے چیخنے اور ٹھوکریں مارنے میں مجھے کسی وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ زخمی ہونے والا آدمی زمین پہ لوٹ رہا تھا اور دھاڑیں مار رہا تھا۔ چاقو اُٹھانے کی تو کیا، اُس میں اپنا جسم سنبھالنے کی سکت بھی نہیں تھی میرے اندازے کے مطابق اُسے گہرا زخم نہیں لگا چاہیے تھا۔ لگا بھی ہوگا تو صرف ایک جگہ میں اُسے مہلت نہ کھینچنے لگا تو وہ اب تک تڑپ رہا ہوتا۔

مجھ سے قریب ہی پیرو نے اُن دونوں کی گردنیں جکڑی ہوئی تھیں۔ انھیں ایک سبب یہ بھی ہو ذہنی زخم کرنے کے لیے جھنجھوڑنے کا تھا۔ وہ اُن سے بار بار کچھ پوچھ رہا تھا کہ وہ سب کچھ صاف صاف بتا دیں۔ اس خوف میں سے بھی ایک آدمی کو دبوچ کے اُس کے نرغے پہ چپل جما رکھی تھی۔ انھیں اصل پتا دینا چاہیے تھا، مزید انھیں مدد کے لیے کسی اور ساتھی کے آنے کی امید ہوگی، یہی انھوں نے اتنا وقت بھی لے لیا تھا مگر اب اُن کے پاس کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ اُن کا ایک ساتھی زمین پہ پڑا سسک رہا تھا۔ خون سے اُس کے کپڑے تر بتر ہو گئے تھے۔ پہلے تو وہ اپنی پرانی رٹ لگاتے رہے پھر انھوں نے جھجکتے، اٹکتے ہوئے زبان کھولی کہ انھیں آکا نے ہمارا پیچھا کرنے کے لیے بھیجا ہے۔

"آکا کون؟" پیرو نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"آکا بھائی ادھر شہر کا سب سے بڑا دادا ہے۔"

"کیا بولا تھا، اُس گینڈے کا ادا لاوے؟"

"اُس نے ہم کو صرف تمھارا پیچھا کرنے کو بولا تھا۔"

"کیوں؟ اور اُس کا ماں کو نیند نہیں آ گیا؟"

"ہم کو کچھ پتا نہیں معلوم، ہم تو حکم کے غلام ہیں۔"

"تم آکو کا پتا ہے کیدر رہتا ہے وہ؟"

"اُس نے ابھی بازار میں ٹھکانا کر رکھا ہے۔"

"بازار میں!" میں نے تندی سے پوچھا۔ "بازار میں تو تم شاہ کبیر کو نکال کے کاٹے ڈال کر چھوڑ کے ....."

دفعتاً گلی میں بائیں جانب سے بھاگتے ہوئے آدمیوں کی چاپ سنائی دی۔ میری آواز حلق میں گھٹ گئی۔ میں نے گھوم کے دیکھا تو وہ کئی آدمی تھے۔ ہم سے زیادہ دور نہیں تھے اور ایک دوسرے کے پیچھے شور مچاتے ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔ وہی ہوا جس کا اندیشہ مجھے بے چین کیے ہوئے تھا۔ اُن تینوں اور اُن کے زخمی ساتھی کی چیخ پکار نے آخر گلی کے مکینوں اور راہ گیروں کو متوجہ کر لیا۔ پیرو نے بھی انھیں دیکھ لیا تھا لیکن اُس نے اپنے بازوؤں میں جکڑے ہوئے آدمیوں کی گردنیں نہیں چھوڑی تھیں۔ میں نے اپنے دبوچے ہوئے آدمی کے نرغے سے ہاتھ ہٹا لیا۔ ہم انھیں یوں کیسے چھوڑ سکتے تھے۔ بھاگنے کا سوال بھی نہیں تھا۔ درمیان میں آنے والوں کا اتنا ہی احساس تھا تو کہیں کسی ایسی جگہ انھیں نہیں کھینچ لانا چاہیے تھا لیکن وہ کوئی جگہ تو ہوتی۔ ہم نے اُن سے جلد از جلد نمٹنے کی پوری کوشش کی تھی۔ چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے ہوں گے۔ اتنی دیر بھی اُن کے لیت و لعل کی وجہ سے ہوئی۔ وہ اڈے کے آدمی تھے اور اتنی جلدی زبان نہیں کھول سکتے تھے۔ کسی کی دخل اندازی کا تو ہر لمحے امکان تھا۔ وہ اگر نہیں نہ بچاتے تو بھی یہاں کوئی کسی وقت بھٹک سکتا تھا۔ جیسے ہی گلی کے لوگ بھاگتے نزدیک آئے، پیرو کے اشارے پر میں نے اپنے قابو میں کیے ہوئے آدمی

"معلوم تھا بھی اور نہیں بھی۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ "استاد نے بڑی ڈال رکھی تھی سالی! ملی مجھ کو استاد آئے نہیں ہوتا تو تیرا بھائی وہیں بس کر ٹھکانے لگ کے ہی تو رستا پر استاد!" وہ جھنجھلا ہو کے بولا۔ "استاد کو کر تو جانتا ہے کبھی بالکل سٹی کا بن جاتا ہے۔"

"گویا تم جان گئے تھے کہ ہم کہاں ....."

میری بات منہ میں ہی رہ گئی۔ کالے داوا اڈے کے چند آدمیوں کے ساتھ دوڑتا ہوا میرے پاس آ گیا تھا۔ کلنتے بھی ہونٹ بھینچ کے رہ گیا۔ اس دوران گلی میں اور بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ ہم کالے داوا کی معیت میں اندر دالان سے ابھی باہر آئے تھے کہ دروازے سے کچھ اور لوگ مشعلوں کے ٹوکرے اُٹھائے شور مچاتے اندر داخل ہوئے۔ وہ بادشاہ بھی ساتھ تھے جیسے ہی میں چوک کے پاس پہنچا مجھے دیکھ کے پیرو اچھل گیا اور پٹر پٹر تالیاں بجانے لگا۔ "استاد! ابھی کچھ دیکھتا ہے۔" اس نے جھجل کر شور کو ڈپٹتے ہوئے کہا۔

جھجل کی آنکھیں بھی چھلکنے لگی تھیں۔ "ہاں داوا!" وہ وُسریلا سا ہو بولا۔ "ابھی کچھ وہی لگتا ہے۔"

پیرو نے لمبی سانس کھینچی اور دونوں ہاتھ سے کان پکڑ کے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "اپن کو آخری تم ابھی ضرور کچھ آسانی ہو جائے گا۔"

"ہم کو معلوم تھا داوا۔ یہ کس کے ساتھ ہے۔" جھجل نے نسبتہً اونچی آواز میں کہا۔

"یہ اپن کا مغز بھی اُودو جا کے ایک دم پھر گیا تھا جھجل بھائی! آنکھ کھلا تو اپن تہ خانے میں پڑا تھا۔ شروع میں تو اپن سب مزل جانا پر جلدی آتا سیدھا سمجھ میں آ گیا۔ اُودو کا کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ پل میں رُت بدل جاتا تھا۔ اپن ادھا تھا کہ سوچتا تھا ابھی جھجل بھائی کے سامنے آنے کا سبب کا بھی کہ نہیں۔ وہ اُودو رسالا نواب کا اولاد ....."

"جانے دو داوا!" جھجل نے پیرو کا شانہ دبا کے بھجن بھناتے لہجے میں اُسے روک دیا۔ کالے داوا نے مٹھائی اور ہار پھولوں کے ٹوکرے جھجل کے آگے رکھ دیے تھے۔ میں، کلنتے، عمرو، شاہسوار اور زورا بھی چوکی پر جھجل اور پیرو کے پاس آ کے بیٹھ گئے تھے۔ کالے داوا نے جھجل کے گلے میں ہار ڈال کے مٹھائی کا پہلا دانہ اُس کے منہ میں رکھا۔ ہر طرف نعروں جیسی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ وہ سب جھجل کو مبارک باد دے رہے تھے۔ عمارت میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ ابھی کالے داوا ہار لے سینے سے نہیں ہٹا تھا کہ ایک دراز قد، تنومند، عمر رسیدہ شخص تیزی سے چوکی کی طرف بڑھا اور جھجل کے مقابل آ کے بیٹھ گیا۔ اس نے سر جھکا کے پہلے جھجل کے گلے میں گوٹے کا ہار ڈالا اور اس کے پیر پکڑ کے زیرِ لب کچھ کہنے لگا۔ جھجل نے اس کا جھکا ہوا سر اپنے سینے میں بھینچ لیا اور اس کے لمبے کھچڑی بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا۔ "اپنے لیے تو تمھارے یہ پھول ہی بہت ہیں سردار! تم کو اس کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔" جھجل کا اشارہ اُس تھیلی کی طرف تھا جو آنے والے شخص نے چپکے سے اُس کے قدموں میں رکھ دی تھی۔

وہ شخص ہاتھ جوڑے جھجل کے سامنے بیٹھا رہا۔ "منع مت کر مائی باپ!" اس نے لجاجت سے کہا۔ "اپن پھر کیا جانے کہ استاد نے بیٹے کو کسی قابل نہیں سمجھا۔ استاد اپن سے خفا ہے۔"

"نہیں نہیں۔" جھجل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"پھر انکار کا ہے کو ہے استاد؟" وہ آزردگی سے بولا۔ "اپن اپنی اُس کو خوشی سے لایا ہے اور یہ تمھارا ہے تمھارا ....."

"جانتے ہیں سردار! اپنا حق ہم خوب جانتے ہیں۔ اس کو ابھی تم پاس ہی رکھو۔ ضرورت پڑی تو آدمی بھیج دیں گے۔"

کلنتے نے مجھے ٹھوکا دیا اور سرگوشی میں بتایا۔ "یہ دل برائے بوھرسا ہے۔ بازار کا مچھلے دار ہے سالا۔ بازار کا سارا بھتہ پہلے اسی کو جاتا ہے پھر اڈے پہ آتا ہے۔"

شکل و صورت سے وہ کسی اڈے کا استاد نظر آتا تھا۔ ہم کی طرح چوڑا سر، بڑی بڑی چپٹی چپٹی آنکھیں، ابھرا ہوا سا سانولا چہرہ۔ بادل ناخواستہ اس نے تھیلی اٹھائی اور اُلٹے قدموں چوکی سے اتر گیا۔ وہ اترا ہی تھا کہ اڈے کا ایک اور آدمی لپک کے چوکی پر آ گیا اور جھجل کے پیروں پر سر رگڑنے لگا۔ "نمبر ایک کا نقشے باز ہے حرامی!" کلنتے نے بدبداتے ہوئے مجھ سے کہا۔ "آگے بہت پچھاڑی مارا تھا سالا!"

میں نے اسے پہلے بھی دیکھا تھا۔ شاہ کبیر کے ساتھ خانم کے بالاخانے پر آنے والے آدمیوں میں یہ بھی شامل تھا اور اس وقت بھی شاہ کبیر کے پہلو میں کھڑا تھا جب میں اور وہ بازار کے چوک میں ایک دوسرے کے سامنے ہوئے تھے۔ بعد میں اس شخص نے اڈے پہ "کام دینے" کے لیے جھجل سے درخواست کی تھی اور جھجل نے اسے کالے داوا کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ مجھے یاد ہے اس کا چہرہ کچھ بجھ گیا تھا لیکن اس نے جھجل سے تکرار نہیں کی۔ اُس زمانے میں یہ چاقو ہمیشہ اوپر کی جیب میں رکھتا تھا اس طرح کہ صاف نظر آئے۔ جیسے ہی اڈے پر جھجل نے اس کا چاقو اوپر کی جیب سے نکال کے نیچے نیفے میں جیب میں ڈال دیا تھا۔ پھر جب تک ہم حیدرآباد میں رہے ہم نے دوبارہ اسے اوپر کی جیب میں چاقو رکھتے نہیں دیکھا۔ اب بھی نہیں تھا۔ چلتے وقت جب نواب عالم کا بہ اسٹیشن پر آیا تھا تو یہ بھی ہمیں رخصت کرنے کے لیے وہاں موجود تھا۔ میں کلنتے سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اس نے اس کے

راستے میں آخر کون سی رکاوٹ کھڑی کی تھی لیکن مجھے کلنتے سے بات کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ جھجل اور پیرو کے پاس سے ہٹ کے وہ شخص سیدھا میرے پاس آیا۔ میرے سر پہ چپت کے اس نے میرے گالوں کو بوسہ دیا اور پھولی ہوئی سانسوں سے بولا۔ "تمھارے بنا استاد بالکل آدھا لگتا تھا۔" پھر خود چونک پڑا اور جھجل سے بولا۔ "اپن کا مطلب ہے ایسے استاد سو، ہزار سے بڑا ہے پر تمھارے بنا کوئی کتا سا لگتا تھا۔ اس میں صرف اپنے کو نہیں، یہاں سبھی کو۔ اپن بول نہیں سکتا کہ تم کو یہاں دوبارہ دیکھ کے کتنی خوشی ہوتی ہے۔ ناٹھو کو اپنا نوکر سمجھو داوا اور لپیٹ کر ختم کرو۔"

میں نے اپنے پیروں سے اُس کے ہاتھ ہٹائے اور اُس سے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن کہہ نہ سکا۔ اچھا ہوا کہ کلنتے نے اُسے اپنی جانب گھسیٹ لیا اور یوں میری مشکل حل کر دی۔

دل برا اور ناٹھو کے پیچھے اُترنے کی دیر تھی، لوگ ہر طرف سے چوکی کی طرف آ پڑے بلکہ ہر ایک کا ارادہ یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ سب ایک دم اوپر آ جائیں گے مگر کالے داوا اور اڈے کے دوسرے آدمیوں نے انھیں روک لیا اور سختی سے تاکید کی کہ وہ تحمل سے کام لیں۔ اُس وقت میری سمجھ میں آیا کہ ان کا کیا مقصد ہے۔ وہ جھجل کو ناٹھو اور دلبرا کی طرح بالمشافہ مبارک باد دینے کے لیے بے قرار نظر آتے تھے۔ اچھا خاصا ہجوم تھا اور لوگ مسلسل اندر آ رہے تھے۔ گویا اگر یہی سلسلہ چلا تو ساری رات گزر جائے گی اور ہم یوں ہی بیٹھے رہیں گے۔ میں نے وحشت سے جھجل کی طرف دیکھا لیکن وہ پیرو سے باتوں میں مصروف تھا۔ وہ چاہتا تو انھیں روک دیتا لیکن لگتا تھا جیسے کچھ خبر نہیں تھی۔ مٹھائی اور پھولوں کے ٹوکرے جھجل کے سامنے سے ہٹا کے ایک طرف رکھ دیے گئے تھے۔ اُن میں سے ہر شخص چوکی پہ چڑھنے کی جستجو میں لگا ہوا تھا۔ بہرحال دیکھتے دیکھتے ان کی ایک قطار سی بن گئی۔ ایک ہٹتا نہیں تھا کہ دوسرا لپک کے چوکی پر چڑھ جاتا۔ اوپر آ کے پہلے وہ جھجل کے گلے میں ہار ڈالتا۔ کوئی چیز ساتھ ہوتی تو پیش کرتا۔ اس کے بعد پیرو کو اور مبارک باد دیتا ہوا یا تو پیرو کی طرف جاتا یا پہلے میرا رخ کرتا۔

میرا اندازہ کسی قدر غلط تھا۔ اُن کا مقصد میری اور پیرو کی اچانک آمد کے سلسلے میں اپنی مسرت کا اظہار کرنا ہی نہیں تھا۔ اڈے کے نئے استاد کو سلامی پیش کرنا بھی تھا۔ گویا جھجل کے اڈہ سنبھالنے کے بعد انھیں یہ رسم ادا کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ حیدرآباد میں نئے استاد کی تبدیلی پر یہ رسم باقاعدہ انجام پاتی تھی۔ پہلے بھی یہی ہوا تھا جب جھجل نے کالے داوا کو یہاں کا استاد مقرر کیا تھا۔ بمبئی اور کلکتے میں بھی اڈے سے باہر کسی نئے استاد کے آنے پر یہ رسم ادا کی جاتی ہے مگر کوئی لازم نہیں ہے اور اتنی باقاعدگی کے ساتھ نہیں ہوتی۔ وہ اپنے چاقو جھجل کے پیروں میں رکھ رہے تھے۔ ان میں صرف اڈے سے وابستہ لوگ نہیں تھے، بازار کے لوگ بھی تھے۔ جن کے پاس چاقو نہیں تھے، وہ اپنی توفیق کے مطابق مختلف نذریں پیش کر رہے تھے۔ بعض کے پاس مٹھائی کے دونوں اور ہار پھولوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ بعض کے پاس صرف پھول تھے۔ سلامی کے لیے نذر ضروری نہیں تھی۔ استاد کے سامنے ایک مرتبہ آ کے سلام کرنا کافی سمجھا جاتا تھا۔ وہ لپکتے ہوئے قدموں سے جھجل کے پاس آتے اور آگے بے اختیار سے ہو جاتے۔ یوں کہنا چاہیے کہ شٹ پٹا جاتے۔ میرے سامنے آ کے بھی ان کا یہی حال ہوتا۔ کسی کے منہ سے کچھ نکلتا اور کسی کے ہونٹ لرز کے رہ جاتے۔ آنکھیں جل بجھ کے رہ جاتیں۔ میری حالت بھی اُن سے مختلف نہیں تھی۔ مجھ سے کوئی جواب نہ دیا جاتا۔ میں گنگ نظروں سے انھیں دیکھتا رہتا۔ پھر یکا یک ایک آدمی میرے سامنے آیا کہ میں سیدھا بیٹھا رہ سکا۔ اسے پہچانتے ہی مجھے ایک جھٹکا سا لگا ہوگا۔ وہ مُلا تھا۔ وہی مُلا جو ہر سال گرو کو سلام کرتا تھا اور کئی بار کی درگزری کے بعد بھی باز نہیں آیا تھا، جو مجھے سمجھا اُس سے اور اُس کے دو ساتھیوں سے نمٹنا پڑا تھا۔ اسی کے سبب سے کنا اُو گیرا میری طرف متوجہ ہوا تھا۔ مُلا بھی مجھے زندگی بھر نہیں بھول سکتا تھا۔ اُس کے چہرے پر چاقو کی کئی لکیریں بنی ہوئی تھیں۔ بھوری بھوری مونچھیں بھی خاصی ابھری ہوئی تھیں۔ پہلے سے بڑا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ یکا یک میرے سامنے آ کے ہاتھ جوڑ کے بیٹھ گیا۔ میں نے اُسے پہچانا تو میری رگوں میں چمک سی اُٹھنے لگی۔ ایک بار تو میرے جی میں آیا کہ اُسے یہیں طمانچے مارنا شروع کر دوں۔ میرا ہاتھ اُٹھا بھی لیکن رک گئی۔ مُلا نے سر اُٹھا کے مجھے ویرانہ نگاہوں سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں بھری ہوئی نہیں، وہ بیت سے ہر قدم کے گڑگڑانے لگا۔ "مُلا کو معاف کر دو داوا! تم کو خدا رسول کا واسطہ! اپن آپ کو بالکل نہیں پہچانتے تھے۔ اپن کا دماغ ایک دم خراب ہو گیا تھا۔ میں سنتا ہوں مُلا بالکل بدل گیا ہے۔ اِدھر پوچھو کسی سے! اپن اب کسی کو ....." اُس کی آواز لرز رہی تھی۔ میں نے کچھ نہیں کہا۔ وہ جھکتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "دولہا بھائی کیسا ہے؟" تڑپتے اُس کی راہ جہان گر تھا۔ خانم یہاں لے اسی نام سے پکارتی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

اُسے باتیں بنانا بھی خوب آ گیا تھا۔ زبان اب کسی قدر [illegible] تھی۔ بچپن اُس کا خانم کے بالاخانے پہ گزرا تھا۔ لمحہ بھر تک وہ میرے سامنے بیٹھا میری زبان سے کچھ سننے کا منتظر رہا پھر میرے ہاتھ چوم کے جھجکتا ہوا اُٹھ گیا۔

طرح طرح کے لوگ تھے۔ ہر ادا ہر چہرے کے لوگ، اڈے کے نئے اور پرانے آدمی، بڑے بالاخانوں کے نگران اور بازار کے بڑے دکان دار۔ بہت کم لوگ میرے دیکھے ہوئے تھے۔ لا

سکے بعد ان پانچ آدمیوں میں سے وہ دو بھی میرے سامنے آئے جنھوں
نے میرا اور پیرو کا پیچھا کیا تھا اور موسیٰ ندی کے قریب جن سے
بات کرنے کے لیے مجھے جانا پڑا تھا۔ دونوں یکے بعد دیگرے میرے
سامنے آکے بیٹھ گئے۔ اُن کے کترائے ہوئے جسموں پر کپکپی طاری
تھی جیسے پکڑ کے لائے گئے ہوں۔ جھبل اور پیرو سے انھوں نے کچھ
کہا ہو تو کہا ہو میرے پاس آکے بول ہی نہیں سکے بیٹھے رہے۔ میری،
پیرو اور جھبل کی گردنیں پھولوں سے چھپ گئی تھیں اور جھبل کے
پہلو میں سلامی کے طور پر آنے والی چیزوں کا ڈھیر لگ گیا تھا جب
کہ چاقو انھیں اسی وقت واپس کیے جاتے رہے تھے۔

یہ سلسلہ سویرے تک جاری رہتا اگر کالے دادا نئے آنے
والوں پہ پابندی نہ لگا دیتا۔ عمارت میں جو لوگ پہلے سے موجود تھے
وہی اوپر آ سکے۔ ان کی تعداد کم نہیں تھی پھر بھی جتنا میرا خیال تھا،
اتنی دیر نہیں لگی۔ ایک تو جھبل نے چند لوگوں کے سوا کسی سے بات
نہیں کی، سر ہلاتا اور مجھیں ملان کرتا رہا۔ دوسرے کالے دادا نے الگ
شور مچا رکھا تھا۔ میں نے سکون کی سانس لی۔ کالے دادا نے نئے آنے
والوں کو منت سماجت کے باوجود قطعی انکار کر دیا تھا۔ اس سے پیشتر
کہ کوئی اوپر آنے کی کوشش کرتا، وہ چوکی پہ چلا آیا لیکن اس کے
اوپر آتے ہی عمارت میں ایک لمحے کے لیے سکوت چھا گیا۔ کالے
دادا نے پلٹ کے دیکھا اور مضطرب سا ہو گیا۔ ہمارے مقابل لوگوں کے
بیچ میں ایک بوڑھا شخص دونوں ہاتھ اٹھائے کھڑا تھا۔ بھویں اور بے
بڑھی ہوئی داڑھی، چوڑا ماتھا، جھکے ہوئے کندھے، وہ میانہ قد اور دھنسی
ہوئی آنکھیں۔ چہرے کی ہڈیاں نمایاں تھیں اور ٹھوڑی کا گوشت
لٹک رہا تھا۔ ٹخنوں کے سفید بال دور سے دکھائی دے رہے تھے۔
وہ ڈھیلا ڈھالا لباس پہنے ہوئے تھا۔ کسی زمانے میں جو اچھا آدمی
ہوگا۔ اس کی عمر ستر سے کم نہیں تھی۔ کالے دادا نے ایک نظر جھبل
کی طرف دیکھا پھر تیزی سے چوکی سے اتر گیا۔ کورنش کے انداز میں
اس نے بوڑھے آدمی کا دامن پکڑا اور سلام کیا اور آگے ہاتھ پکڑے
ہوئے چوکی پہ لے آیا۔ ادھر اُدھر کھڑے ہوئے لوگوں نے اس کے لیے
راستہ چھوڑ دیا تھا۔ چوکی پہ آکے بوڑھا دوسرے آدمیوں کی طرح جھبل
کے پیر چھونا چاہتا تھا مگر جھبل نے کھڑے ہو کے اسے گلے سے لگا لیا۔
بوڑھا آدمی دیر تک اس سے لپٹا رہا۔ جدا ہوا تو اس کی آنکھیں بھیگی
ہوئی تھیں۔ پیرو بھی کھڑا ہو گیا تھا۔ ان دونوں سے گلے مل کے وہ
میری طرف پلٹا اور میرا سینہ دھڑکنے لگا۔ پھر میرے گال تھپتھپا
کے اس نے مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ اس کے بازوؤں میں
ابھی تک زور تھا۔ "اپن سب سنا ہے۔" وہ بھرائی آواز میں بولا۔
"اپن ایک بات کہتا ہے، ووئی تم داداؤں میں وہ سگتے کا بادشاہ

کیلیاں بول رہا تھا۔ اُن وقتاں میں اپن ادھر شہر میں نہیں ہوتے تھے،
گیسو والے پیر کے پاس گلبرگہ گئے تھے ورنہ شہزادوں کے قتل
کر کیسے ہوتے۔"

اس کی آواز میں ایک گونج تھی۔ میں نے تذبذب سے اسے سلام
کر کے، بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ اس اثنا میں جھبل نے اس کا
شانہ تھام کے اسے اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ میں نے اسے پہلے نہیں
دیکھا تھا، وہ خود بھی یہی کہہ رہا تھا لیکن وہ اڈے سے وابستہ کوئی
شخص ہو سکتا تھا۔ اب نہیں تو کبھی کسی وقت اڈے سے اس کا
واسطہ ضرور رہا ہوگا۔ چہرے بشرے سے بھی یہی ظاہر تھا اور یہاں
سبھی اس کے واقف معلوم ہوتے تھے۔ ایسے واقف کہ اس کے آنے
پر بے چین ہو گئے تھے اور اب اس کے چوکی پہ بیٹھ جانے کے بعد
وہ بہت خوش اور پُرجوش نظر آ رہے تھے۔ جھبل سے بھی اس کی قربت
نئی نہیں لگ رہی تھی۔ مجھے جستجو تھی کہ وہ کون ہو سکتا ہے۔ وہ مجھ
سے اس قدر قریب تھا کہ اس کے بارے میں کالے دادا سے کچھ
پوچھنا مناسب نہیں تھا۔ اس کے بیٹھتے ہی کالے دادا نے مٹھائی
کا تھال لا کے اس کے آگے رکھ دیا۔ بوڑھا ہنسنے لگا۔ جیتی ہوئی ہنسی۔ اس
کی آنکھیں روشن تھیں۔ عمارت میں خاموشی چھانے لگی جیسے
سہمی ہوئی پھر قبرستان جیسی کیفیت طاری ہو گئی۔ آخر یہ خاموشی اس
وقت ٹوٹی جب جھبل نے اپنا چاقو جیب سے نکالا اور اپنی جگہ سے
اٹھ کے بوڑھے کے قدموں میں ڈال دیا۔ ایک کہرام سا مچ گیا۔ اس
کی صداؤں سے عمارت کے در و بام لرزنے لگے۔ وہ جن کے
ساتھ چھوٹے دادا کے نام کا نعرہ بھی لگا رہے تھے۔ چھوٹے دادا بوڑھے
کا نام ہوگا۔ وہ منہ چھپائے بری طرح لرز رہا تھا۔ میری طرح
پیرو اور زورا کی آنکھیں بھی حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ [illegible]
سے جھبل کے ساتھ تھا مگر ایسا منظر اس نے زندگی میں پہلی بار دیکھا
ہوگا۔ پیرو بھی دم بخود بیٹھا تھا۔ جھبل کا چاقو چھوٹے دادا کے قدموں
میں پڑا تھا اور جھبل کے [illegible] پر سکوت چھایا ہوا تھا۔ چھوٹے
دادا کی حالت اضطراری ہو گئی تھی۔ دیکھتے دیکھتے وہ فرش سے اپنا ماتھا
رگڑنے لگا۔ جھبل نے اس کے شانے پکڑ کے اسے اٹھایا اور اپنے ہاتھ
سے مٹھائی کا ایک ٹکڑا اس کی طرف بڑھایا۔ چھوٹے دادا کا
چہرہ آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ اس نے ڈبڈبائی نظروں سے جھبل کی
جانب دیکھا اور اس کے ہاتھ تھام کے مٹھائی اسی کی طرف لوٹا دی۔
جھبل نے ٹکڑا اپنے منہ سے لگایا۔ چھوٹے دادا نے ایک دم اس کے
ہاتھ دوبارہ اپنی طرف کھینچ کے بچی ہوئی مٹھائی منہ میں رکھ لی۔
معاً اسے اپنے پیروں میں پڑے ہوئے چاقو کا خیال آیا۔ اس نے
اسے جذباتی انداز میں اٹھا کے چومنے اور آنکھوں سے لگایا۔ پھر کچھ

دادا آسمان کی طرف منہ کیے کچھ سوچتا رہا۔ میرا خیال تھا کہ وہ
چاقو جھبل کو واپس کر دے گا لیکن اس نے اسے بوسہ دے کے جیب
میں رکھ لیا۔ لوگ پاگل سے ہو گئے۔ ان کی بے ہنگم آوازوں نے
ہذیانی انداز اختیار کر لیا۔ گرد و نواح میں دور دور تک شور گونج
رہا ہوگا۔

کالے دادا اور اس کے ساتھ اڈے کے دوسرے آدمیوں
نے ہاتھ اٹھا اٹھا کے لوگوں کو خاموش ہو جانے کی تلقین کی۔ یقیناً
انھیں کسی حد تک کامیابی ہوئی لیکن اڈے کا رنگ ہی بدل گیا تھا۔
پیرو نے کالے دادا کو اشارہ کیا کہ وہ ہجوم میں مٹھائی تقسیم کرنا شروع
کر دے، اسی کی ہدایت پر ٹوکرے کھلے رکھے گئے تھے۔ لوگ ان پر
بے تحاشا ٹوٹ پڑے حالانکہ انھیں معلوم تھا کہ مٹھائی افراط سے
موجود ہے مگر چھینا جھپٹی میں جو لطف تھا وہ اطمینان سے کھانے
میں نہیں تھا۔ پیرو نے دانستہ کالے دادا کو یہ مشورہ دیا ہوگا۔ لوگوں
کا دھیان بٹانے اور فضا بدلنے کی خاطر۔ کالے دادا چوکی کے اس
سرے سے اس سرے تک [illegible] گھوم رہا
تھا کسی پھیری والے کی طرح۔ کسی کے منہ میں وہ گلاب جامن
رکھتا کسی کے منہ میں برفی۔ پیرو کے پاس پہنچا تو جانے پیرو کے جی
میں کیا آئی کہ اس نے اپنے سامنے پڑا ہار کالے دادا کی گردن
میں ڈال دیا۔ یہی کرنے کی جیسے ایک شوشہ مل گیا۔ سب نے بڑھ بڑھ کے
پیرو کی تقلید کی۔ چند لمحوں میں کالے دادا کا چہرہ اور سینہ پھولوں میں
چھپ گیا اور وہی سب کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ ادھر اُدھر سے اڈے
کے آدمیوں نے آوازے کسنے شروع کر دیے۔ کسی نے کالے دادا پر
[illegible] کی تو ہر طرف سے فقروں کی بارش ہونے لگی۔ اڈے
کا ایک [illegible] شخص آگے کالے دادا کی باقاعدہ نظر اتارنے لگا۔ سب
نے اسی کو نشانہ بنا لیا۔ کہنے لگے کہ دادا میں اب گلے کی کسر رہ گئی
ہے۔ کوئی شخص کسی چنبیلی بائی کا نام لے کے [illegible] آہیں
بھرنے لگا۔ کسی نے کہا کہ آج وہ دادا کی ایک جھلک دیکھ لے تو غش
آ جائے۔ کالے دادا پھولوں کے ڈھیر میں لپٹ کے عجیب لگ رہا
تھا ویسے بھی اس کا رنگ روپ سب سے جدا تھا۔ سیاہ کوئلے جیسے
کھردرے چہرے پر چیچک کے داغ اور چاقو کے نشانات، پیچھے لوٹے ہوئے
لمبے لمبے بال، کان میں دُر، آنکھوں میں سرمہ تھپا ہوا۔ گینڈے کے
مانند کاٹھی۔ عمر چالیس سے زیادہ نہیں ہوگی لیکن چہرے کے مقابلے میں
اس نے ڈیل بہت پھیلا لیا تھا۔ لگتا تھا۔ دونوں کے عرصے میں اسے
چاقو چلانے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ بس بیٹھا اینٹھتا رہا۔ یہی وجہ
ہو گی کہ اڈا آقا کے پاس چلا گیا یا پھر اڈا نکل جانے کی اصل وجہ چنبیلی
بائی ہو گی، اسی لیے اس کا نام ہر ایک کے ورد زباں تھا۔ ان کی

باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ کالے دادا نے چنبیلی بائی کی خاطر کوئی
قسم کھا رکھی ہے وہ اسے قسم توڑ دینے پہ اکسا رہے تھے۔ کالے دادا
کا خاص آدمی چاندو پیش پیش تھا۔ کہہ رہا تھا "اپن سے ذرا
باہر نکل کے دیکھو دادا، سارا بازار لُٹ جائے گا۔"

کالے دادا نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں ہنستا رہا۔ لوگوں کی
ہستی میں کچھ کالے دادا کی اپنا کا دخل بھی تھا۔ وہ ان کی چھبتی ہوئی
لوے بازیوں سے اتنا لطف لیتا رہا، اس کے تیوروں سے لوگوں
کو شبہ ملتا رہی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہی کالے دادا [illegible]
کا کرتا دھرتا رہ چکا ہے۔ اب بھی جھبل کے بعد سب سے نمایاں آدمی
وہی دکھائی دے رہا تھا مگر آج رات جیسے وہ خود کو بھول گیا تھا یا
دانستہ بھلا دینا چاہتا تھا۔ وہ سبھی جیسے خود کو یاد نہیں رہے تھے،
بھول گئے تھے کہ کہاں ہیں۔ جھبل نے بھی کچھ نہیں کہا۔ زندگی میں پہلی بار
مجھے کا سماں ہو گیا جیسے کل عید ہو یا شادی کی کوئی تقریب جیسے
بہت دنوں بعد ان کی زندگی میں ایسی رات آئی ہو اور جیسے بہت
دنوں بعد کالے دادا اور وہ سب ایک بار پھر مل بیٹھے ہوں۔ یہاں
تک بھی ٹھیک تھا مگر پھر تو کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ عمارت میں
کوئی بجلی سی چمکی، نہ جانے کس جانب سے چشم زدن میں ایک نوجوان
نمودار ہوا۔ عمارت چیخوں سے گونج اٹھی۔ لوگ ایک دوسرے کو دھکیلتے
ہوئے پیچھے ہٹ گئے۔ درمیان میں ایک گول دائرہ بن گیا۔ نوجوان
دائرے میں تتلی کے مانند چھوٹ گئے۔ تھرکنے اور ہاتھ پیر چلانے لگا۔
اس کے جسم میں پارا بھرا تھا۔ کمر لچیلی تھی اور ہاتھ پیروں میں غیرمعمولی
لچک تھی۔ لوگ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ میرا دھیان کسی اور
طرف تھا لیکن بعد میں میں نے غور سے دیکھا۔ مجھے بھی ہنسی
آئی۔ نوجوان کالے دادا کی نقل اتار رہا تھا۔ ایسی صفائی اور مشاقی
سے کہ یقین نہیں آتا تھا۔ کالے دادا کو دونوں ہاتھ پیچھے باندھ
کے اور سینہ پھیلا کے بازار میں چلنا، پتلیاں چڑھا کے [illegible]
ہونٹ دبا کے غصہ کرنا اور بار بار کندھا جھٹکنا۔ بڑبڑاتے ہوئے گالیاں
بکنا اور گنڈیری کے مانند گوری چبانا، پھدک پھدک کے چاقو چلانا
اور نخرے میں منہ پھلا کے بیٹھنا۔ خود کالے دادا کا ہنسی کے مارے
برا حال تھا۔ اس کے مقابل گویا آئینہ رکھا ہوا تھا۔ آئینے میں بھی اس
نے اپنے اتنے جلوے نہ دیکھے ہوں گے۔ تعجب یہ تھا کہ نوجوان کو ذرا بھی
ہنسی نہیں آ رہی تھی۔ اس نے مجنوں کے انداز میں "ہائے چنبیلی،
ہائے چنبیلی" کی فلک شگاف صدا لگائی، لوگ اچھل اچھل پڑے۔
ضرور ان کے پیٹ میں بل پڑ گئے ہوں گے۔ کالے دادا بھی پاگل
ہو گیا۔ وہ گلے میں پڑے ہوئے ہار نوچ نوچ کے نوجوان پہ دیوانہ وار
نچھاور کرنے لگا۔

کالے دادا کے علاوہ اُس نے دو مرتبہ کے بہروپ بھی بھرے
میں کسی کو جانتا نہیں تھا لیکن نوجوان کا انداز ایسا چٹکی بھرنے والا
تھا کہ آدمی بے اختیار ہو جائے۔ تجمل بھی مسکرا رہا تھا۔ پیرو تو بے حال
ہو رہا تھا۔ نوجوان ہی کیا کم تھا کہ لڑکوں نے اصرار کر کے ایک دو
شخص کو درمیان میں دھکیل دیا وہ بہت کترا رہا تھا۔ لوگ اسے تقریباً
گھسیٹتے ہوئے سامنے لے آئے۔ پہلے والے کی نسبت اس کا جسم کچھ بھدا
تھا، قد بھی زیادہ تھا۔ ایک اور ایک گیارہ کے مصداق دونوں نے مل
کے حشر برپا کر دیا۔ دونوں یقیناً کسی نوٹنکی سے متعلق ہوں گے۔ انھیں
ناچنا بھی آتا تھا۔ مختلف بولیوں اور لہجوں میں بولنا بھی۔ انھوں نے
شاہ کبیر کا بہروپ بھی بھرا۔ ایک اور بہروپ آغا کا ہو گا۔ آغا کو میں نے
کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن بہروپ سے اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔
تماشا کرتے کرتے وہ دونوں دفعتاً میرے سامنے آ کے ہاتھ جوڑ کے
کھڑے ہو گئے۔ میں کچھ نہیں سمجھا لیکن وہ مجھ سے کسی بات کے طالب
تھے۔ میں نے بدحواسی سے کلتے کی طرف دیکھا۔ میرے بجائے اس نے
انھیں کوئی اشارہ کر دیا۔ انھوں نے درمیان میں لوٹ کے چاقو ہاتھوں
میں اٹھائے اور ایک دوسرے کے خلاف معرکہ آرا ہو گئے۔ میری رگیں
سنسنانے لگیں کیوں کہ کسی اور کا نہیں اس مرتبہ وہ میرا سوانگ بھرے
ہوئے تھے۔ میں اپنے سامنے خود تھا۔ ایک طرف میں تھا۔ دوسری طرف
چاقو تولے ہوئے شخص کو پہچاننا بھی میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ وہ شاہ کبیر
تھا۔ دونوں لڑکے نوجوان ہیں جیسے شاہ کبیر کی روح حلول کر گئی تھی۔ وہ
بالکل اُسی کی طرح چاقو ہاتھ میں لہرا لہرا کر ابلی ابلی آنکھوں کے
ساتھ جھپٹ رہا تھا۔ سب کچھ وہی تھا۔ بازار کے تماشائی کی طرح یہاں
بھی گرم جوش ہی لوگ تھے۔ اس وقت بھی سب کے ہونٹوں پر
مہر لگی ہوئی تھی جیسے ابھی شاہ کبیر کا فیصلہ ہونا باقی ہو۔ کئی بار تو مجھے
دھوکا ہوا کہ میں کہاں ہوں۔ پہلے تو میں درمیانی حصے کے کنارے کنارے
گھومتا رہا اور اس کے نیچے سے نکلنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ ادھر
آتا تو میں اُدھر چلا جاتا۔ اتنے دن گزر جانے کے بعد بھی انھیں ایک
ایک بات یاد تھی۔ کس طرح میں دیوانگی شاہ کبیر سے کر کے مرلا
بچا رہا تھا۔ وہ کبھی دائیں طرف ہاتھ مارتا کبھی بائیں طرف اُس کا
غصے میں آگ بگولا ہو جانا، منہ سے کف نکلنا اور غرانا۔ دونوں
نوجوانوں سے لوگوں کے اصرار کا مطلب یہی تھا کہ وہ آج پہلی مرتبہ
نہیں یہ ناٹک پہلے بھی کئی بار دیکھ چکے ہیں۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ
نقالی میں اتنے ماہر تھے جیسے دست ہیں اپنے جسم پر انھیں کس
قدر قدرت ہے جدھر چاہیں مڑ سکتے ہیں اور پل بھر میں چہرہ بدل
سکتے ہیں۔ نقل میں یہ عالم ہے تو اصل میں دونوں کمال حاصل کر سکتے
ہیں۔ انھوں نے اصل کی طرف کوشش کیوں نہیں کی۔ یہ سب کچھ کسی
تصویر کے مانند تھا۔ وقت کی گردش جیسے تھمنے لگی ہو۔ آخر وہ لمحہ بھی

آ گیا جب شاہ کبیر بالکل کنارے پر چلا گیا اور میں نے اپنا چاقو جھٹک
دیا۔ وہ کچھ بدحواس ہو گیا اور چیخنے لگا۔ میں نے آناً فاناً پینترے
بدلے ہوں گے کہ اس کا چاقو میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے دونوں
ایسے کھینچے اور کھٹے ہوئے انداز میں اس کی طرف بڑھایا کہ زمین پر بیٹھ
جانے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہیں رہا۔ اس کے بیٹھتے ہی
عمارت کی دیواروں اور در سے شور کا سوتا پھوٹ پڑا۔ انھوں نے
شاہ کبیر والے نوجوان کو اُوپر اٹھا لیا۔ اس کا نچلا حصہ برہنہ تھا اور
وہ اپنے کرتے سے ستر پوشی کی کوشش کر رہا تھا۔ لوگ اس کی
حواس باختگی پر بُری طرح قہقہے لگا رہے تھے۔ اسے چاقو تھمانے کا
سوال ہی نہیں تھا۔ بیٹھنے کے بعد ہی اس نے ڈرامے میں حقیقت
کا رنگ بھرنے کے لیے خود کو اس بے شرمی پر تیار کیا ہو گا یا دوسروں
نے اسے مجبور کر دیا ہو گا۔

پرانے صحن میں اگربتیوں اور پھولوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ ایک
طرف کونے میں لگے سماوار میں چائے کھل رہی تھی لوگ ابھی تک
اُلجھے تھے۔ صحن میں پہلے سے بہت بڑا مجمع ہو گیا تھا۔ یہ محلے، بستی
اور بستی کے پیروں کے اڈے کے آدمی نہیں تھے مگر ان کی آنکھوں
اور چہروں سے اُبلتی خوشی دیکھ کے محسوس ہوتا تھا جیسے عام بھی کے
اڈے سے وابستہ ہیں اور تجمل ریمنڈ واڑ سے یہاں کھینچ لائے ہیں۔ پہلی
مرتبہ شاہ کبیر کو بے دخل کر کے تجمل حویلی چند دن یہاں رہا تھا۔ اب
ایک مدت گزرنے کے بعد اس کا دوبارہ آنا ہوا تھا۔ اس مرتبہ بھی اسے
یہاں آئے کتنے دن ہوئے ہوں گے زیادہ سے زیادہ چھ سات دن
لیکن وہ یوں کھلتے سے اڈے کی طرح گھل مل گیا تھا۔ اڈے کے بھی
آدمی اس کے شناسا معلوم ہوتے تھے۔ اس مختصر عرصے میں یہی ہو سکتا
تھا کہ انھیں تجمل کو جاننے اور تجمل کو انھیں اچھی طرح خود سے متعارف
کرا دینے کا کوئی غیر رسمی غیر معمولی موقع مل گیا ہو۔ ان میں سے کسی نے
وہاں آغا کا نام نہیں لیا۔ یہ آغا کو اڈے سے نکالنے ہی کا کوئی جشن
ہو گا جب انھوں نے تجمل کو قریب سے دیکھا اور جانا بوجھا ہو گا
اور یہ ان کے لیے نہایت مسرت انگیز واقعہ ہو گا۔ مسرت کا اظہار
وہ اس سے پہلے کھل کے نہیں کر سکے تھے۔ ہماری آمد کے بعد ہی یہ
ممکن تھا۔ سو اب انھیں کوئی روک ٹوک نہ رہی۔ جانے وہ کب سے اڈے
پر تبدیلی کے منتظر تھے۔ ان کے شور شرابے کی بے ساختگی سے اندازہ
کا تصور کیا جا سکتا تھا۔ آغا کوئی ایسا شخص تھا جس کے جانے پر اڈے
کے کسی آدمی کی آنکھ بھیگی ہوئی نظر نہیں آتی تھی۔ وہ آدمی جنھوں نے
حیدرآباد آتے ہی ہمارا تعاقب کیا تھا ان کے انداز و اطوار سے بھی
یہی معلوم ہوتا تھا کہ آغا کی ہیبت اُن کے دلوں پر بیٹھی ہوئی ہے۔
اڈے کے اُستاد کا خوف ضروری چیز ہے لیکن ساتھ ہی اس کی
بھلائی کا بھی کوئی احساس لازم ہے منصفی اور دلاوری کا یقین۔

تجمل کو اکثر میں نے کلتے سے کہتے سُنا تھا کہ اُستاد کو ہاتھ کا صاف
آنکھ کا نرم اور سینے کا کھلا ہونا چاہیے۔ آغا کو شاید ایک ہی زبان آتی
تھی چاقو کی۔ اُستاد کے لیے کبھی اچھی نہیں ہوتی۔

میری نگاہیں ان کے کھیل تماشوں پر مرکوز تھیں وہ کچھ دیر
کے لیے سب کچھ مجھ سے اوجھل ہو گیا تھا لیکن یہ بس چند لمحوں کا
پردہ تھا۔ آغا جان کا چہرہ میری آنکھوں میں منڈلانے لگا۔ کلتے،
زودار، جمرو یا شامو سے کچھ پوچھنے کا محل نہیں تھا۔ میں نے کسی کو
نہیں ٹوکا۔ کچھ دیر بعد یہ ہنگامہ ختم ہو جاتا تھا۔ رات آگے ہی بڑھ
رہی تھی۔

لیکن انھیں گزرتے ہوئے وقت کا احساس نہیں تھا۔ وہ دونوں
نوجوان ابھی گئے تھے اور چائے تقسیم کی جا رہی تھی کہ نوجوانوں کی جگہ
ایک شعبدے باز نے لے لی۔ پہلے اس نے سکوں سے بھرا ہوا ہاتھ
سب کو دکھایا اور مٹھی بند کر کے اُچھالنے کے انداز میں کلائی کو جھٹکا
دیا پھر مٹھی کھول دی۔ سکے گرنے کی آواز نہیں آئی۔ ہاتھ بھی خالی تھا۔
اس نے ادھر اُدھر چکر لگانا شروع کیا اور کسی کے کان مروڑ کے،
کسی کی بغل کو ٹٹول کے اور سینے میں چٹکی بھر بھر کے سکے برآمد کرنے لگا۔
ایک آدمی کا سر ٹھونک کے اُس نے کئی بار اُس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا
آدمی کے سر سے سکے بارش کی طرح ٹپاٹپ گرنے لگے۔ اس نے
اسی قسم کے اور کرتب بھی دکھائے۔

شعبدے باز کے بعد ایک سلسلہ بندھ گیا۔ ایک جاتا نہیں
تھا کہ دوسرا آ جاتا تھا۔ شوقیوں کی طرح ساز بجانے اور تان اُٹھانے
والے کوئی سامنے آتے ہوئے ہچکچاتا تو وہ اس کے پیچھے پڑ جاتے۔
کوئی انھیں بے لطف کرتا یا زیادہ تاخیر کے اکتاہٹ کا سبب
بننے لگتا تو وہ نعرے کستے۔ وہ شخص اگر پھر بھی رکا رہتا تو اسے باقاعدہ
گھسیٹ کے اپنی نگاہوں سے دور کر دیتے۔

میں کن انکھیوں سے بار بار تجمل کی جانب دیکھتا تھا کہ شاید
اس کے چہرے پر کچھ نظر آ جائے۔ مجھے یقین تھا کہ کسی وقت بھی
تجمل کالے دادا کو بیٹھک سے اٹھنے کا اور باقی کسی وقت
بچا کچھا کو اشارہ کرے گا۔ میری اور پیرو کی تھکن کے علاوہ
اسے یہ احساس بھی ہو گا کہ یہاں آنے کے بعد مجھے کتنی باتیں جاننے
کی بے تابی ہو گی۔ خود اسے بھی ہم سے باتیں کرنے اور حویلی میں پیش
آنے والے اسرار جاننے کی کچھ کم بے چینی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ
سب کچھ تو پھر کسی وقت بھی ہو سکتا ہے۔ تجمل نے کل ہی صبح حیدرآباد
سے نکل جانے کا ارادہ نہیں کر رکھا ہو گا۔ ایسا ہوتا تو اس بزم آرائی
کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔ اس نے کسی سے کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ
تجمل بالکل ویسے سب کچھ دیکھتا رہا۔ مسکراتا رہا، جھومتے دادا اور پیرو
سے باتیں کرتا رہا۔ اس کی دلچسپی دیکھ کے اُن کے حوصلے اور بڑھ گئے

ورنہ اُس کے چہرے کی ایک شکن ہی ان کے بے کلی ہوتی۔ کلتے،
جمرو، زودار اور شامو بھی آنے جانے والے ہر آدمی کی باتوں میں
کھوئے ہوئے تھے کسی دلچسپ منظر پر وہ بے ساختہ قہقہے لگانے
لگتے۔ پیرو نے غسل کیا تھا، نہ کپڑے بدلے تھے بلکہ ابھی
گندے کپڑوں میں بیٹھا جھونکے مار رہا تھا۔ آٹھ دس آدمی اپنے جوہر
آزما چکے تھے اور ابھی کچھ طے نہیں تھا کہ دوسرے کتنے ہنرمند بچے ہوئے
ہیں۔ یہ سلسلہ صبح تک جاری رہنے والا تو نہیں؟ اچانک مجھے خیال آیا۔ یہ
سب کچھ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا، ابھی لوٹنے لگتا تو پیچھے لوگ
ٹس سے مس نہیں ہو رہے تھے کبھی کبھی تو دادا زور زور سے آنکھیں نیچی کر دیتے
تھے۔ میرے لیے تو بہت کچھ نیا تھا۔ اس سے پہلے میں نے ایسے کرتب
کبھی نہیں دیکھے تھے۔ بستی میں ایک مرتبہ کرشنا جی کے مرگھٹ پر دکھانے
لگے گئے تھے۔ ایسا دلچسپ زندگی میں پہلی بار اس کے سوا مجھے کبھی موقع
نہیں ملا۔ حویلی میں کبھی کبھار بہت شعبدے باز آ جاتے تھے۔ میں
نے بھی ہر طرف سے دھیان ہٹا کے انھی پر نگاہیں مرکوز رکھنے کی
کوشش کی لیکن مجھے بیٹھے بیٹھے جانے کیا ہو رہا تھا۔ میرا سارا جسم
دھڑکنے لگا تھا۔ ایک بار تو میں نے اٹھنے کا ارادہ کر لیا۔ میں نے
سوچا، کوئی بھی بہانہ کر دوں۔ کہہ دوں کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں
ہے۔ یقیناً کلتے بھی میری وجہ سے اٹھ جاتا لیکن میں یہ سوچ
کے چپ بیٹھا رہا کہ میرے اس طرح چلے جانے سے کہیں سب کچھ
درہم برہم نہ ہو جائے۔ ایک میری وجہ سے اتنے بہت سے آدمی کیوں
متاثر ہوں۔ حویلی میں بھی تو اتنے دن گزر گئے ہیں مگر حویلی کی بات
اور تھی۔ وہاں کسی طرح صبر آ جاتا تھا۔ یہاں تو سبھی پاس بیٹھے تھے۔
مجھے تجمل اور کلتے کے چہروں پر چھپا ہوا سکون اضطراب سا محسوس
ہو رہا تھا۔ دیر ہو گئی تو آخر مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ کھسکتا ہوا میں
کلتے سے اور قریب ہو گیا تھا۔ میں اُس سے کچھ کہنے کے لیے لفظ ڈھونڈ رہا
تھا کہ وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیا سوچ رہے ہو؟
کیا بات ہے؟"

"کلتے بھائی!" میں نے ڈوبتی آواز میں کہا۔ "یہ... یہ لوگ
کب جائیں گے؟"

"کیوں بھائی؟" وہ پلکیں پٹپٹاتے ہوئے بولا۔ "کیا نیند آ رہی ہے؟"

"نہیں۔"

"دیکھو نہیں رہا ہے سالے ایک سے ایک چھٹے ہوئے ہیں۔ ایسی باتیں
کب آتی ہیں۔ اس کن کٹے کو دیکھا، اپنے شول سے کچھ بھی تان
نہیں اُٹھاتا۔"

میں سر ہلا کے رہ گیا۔

"گھر اچھا نہیں لگ رہا ہے کیا؟" وہ ہنسی سے بولا۔
"معلوم ہوتا ہے سب سے زیادہ تجمل یہاں رک گیا ہے"

سے وہاں تک پھیلا دیں۔ سازندے چوکی کی طرف پشت کر کے بیٹھ گئے۔ تارا بائی نے دیر نہیں لگائی، لے اٹھانے لگی۔۔۔۔ پہلی ہی تان سے اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ اس کی آواز کتنی اچھی ہو سکتی ہے۔ بھاری آواز تھی۔ شروع میں وہ بس سُر لگاتی رہی اور لگ سی ہو گئی۔ لمبی تان کھینچی جیسے سانس ٹوٹ گیا۔ عمارت میں ہر طرف اسی کی آواز گونج رہی تھی۔ چوکی سے کچھ دور وہ میرے سامنے مقابل بیٹھی ہوئی تھی۔ دونوں لڑکیاں اس کے دائیں بائیں تھیں۔ وہ خرانٹ شرابی کسی قدر حیران حیران اور کچھ سہمی ہوئی بھی نظر آ رہی تھیں۔ ممکن ہے اتنے بڑے ہجوم اور ایسے لوگوں کے سامنے آنے کا پہلا اتفاق ہو۔ ویسے بھی وہ نئی نئی لگ رہی تھیں جیسے کسی گھر سے اٹھ کے آ گئی ہوں۔ ایسے گھر سے جہاں لڑکیاں چار دیواری میں بند رہتی ہوں۔ کوئی بھی انھیں کسی اور جگہ دیکھے تو یہی سمجھے کہ ان کا تعلق کسی اچھے اور بڑے گھرانے سے ہو گا۔ یہ حقیقت تصور میں بھی نہ آئے کہ ان کا تعلق بازار سے ہو سکتا ہے۔ مگر بازار کے جھمکڑے الگ کب بنائے جاتے ہیں۔ بھلا کوئی دیکھ کے کون کہہ سکتا تھا کہ اس کا تعلق بھی تو بازار سے تھا۔ شہر یار بھی انھی کی طرح تھی نیساں بھی۔ تارا بائی انھیں اپنی بیٹیاں بتا رہی تھی۔ چھپ بھی تھی سے اپنا یہ رشتہ ظاہر کرتی تھی اور اپنی بیٹی کو کھلے عام گھماتی پھراتی تھی۔ ہو سکتا ہے تارا بائی بھی ان کی ایسی ہی ماں ہو۔ ہو سکتا ہے لڑکیاں آسے پاس ہی مل گئی ہوں جیسے چمپا بائی کو نیتی مل گئی تھی۔ انھیں بھی کسی نے کسی اپنے گھر سے لے جا کے تارا بائی کے ہاں پہنچا دیا ہو گا جس کے مرد مر گئے ہوں یا اندھے ہو گئے ہوں۔ جس گھر کا کوئی بھائی سب کو چھوڑ کے چلتا بنا ہو اور کوئی باپ پاگل ہو گیا ہو۔ اسی گھر کے لوگ مارے مارے پھرتے ہیں جہاں پاسبان ٹھیک نہیں ہوتے۔ میں نے گھر سے چلتے وقت سب کچھ آپا جان پر چھوڑ دیا تھا کہ بھائی جان تو موجود ہی ہیں۔ مجھے اس وقت یہ خیال کیوں نہ آیا کہ میرے پیچھے آپا جان کو خدانخواستہ کچھ ہو جائے تو باقی گھر والوں کو کون پوچھے گا۔ بے شک گھر میں میرے رہتے ہوئے بھی مجھے کچھ ہو سکتا تھا۔ آدمی کسی وقت بھی معذور ہو جاتا ہے، مر جاتا ہے لیکن ایسے میں ایک قرار آ جاتا ہے کہ جو کچھ اپنے بس میں تھا اس میں تو کوتاہی نہیں کی۔ میرے بس میں اتنا تو تھا کہ گھر میں رہ سکوں مگر یہ بھی کہاں تھا۔ گھر سے چلتے وقت میں اپنے ہوش میں کب تھا۔ میں تو اسی وقت سب کے لیے مر گیا تھا۔ بے اختیار آدمی اور مُردہ آدمی میں کیا فرق ہے۔ پنجرے میں بند پرندے کے پر دکھائی دیتے ہیں؛ آدمی بھی تو پنجروں میں بند ہوتے ہیں۔ یہ پنجرے کسی کو نظر نہیں آتے۔ اپنے آپ کو بھی نہیں مگر ہوتے پنجرے ہی ہیں۔ میں گھر سے اپنا اختیار حاصل کرنے کے لیے نکلا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ آگے جا کے کیا ہو جائے گا۔

کچھ دیر تک تارا بائی خود گاتی رہی گویا اپنی آواز جگاتی رہی۔ پھر لڑکیوں نے اس کی لے میں لے ملانی شروع کی۔ لوگوں کی خاموشی اور آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ وہ تارا بائی کا گانا سننے کے لیے بے قرار ہیں۔ میں نے مخمل، پیرو، جاسوا اور کانتے وغیرہ کو اکثر گانے کے بارے میں باتیں کرتے سنا تھا۔ گانے کی جو خوبیاں وہ گنوایا کرتے تھے؛ آواز کا اتار چڑھاؤ، گداز، رس، نشہ اور گونج وغیرہ، تارا بائی کی آواز میں اتنا کچھ تو نہیں تھا پھر بھی اس کی آواز میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ سب ہمہ تن گوش تھے۔ سویرا ہو جانے میں اب کوئی کلام نہیں تھا مگر لوگ تارا بائی کی آواز سے بیدار اور تازہ دم نظر آ رہے تھے۔ دیر تک وہ تینوں ایک دوسرے کی آواز میں آواز ملا کے گاتی رہیں۔ پھر لڑکیاں اٹھ گئیں۔ گھنگرو انھوں نے پہلے سے باندھ رکھے تھے۔ تارا بائی نے ستار سنبھال لیا اور لڑکیاں اس کی آواز کے ساتھ ناچنے لگیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے تارا بائی کی آواز ان کے ہاتھ پیروں میں گئی ہے، ان کے بدن میں تحلیل ہو گئی ہے۔ وہ گویا تتلیاں ہیں جن کی ڈوری تارا بائی کی تحویل میں ہے۔ تارا بائی جدھر چاہتی ہے انھیں گھماتی رہتی ہے۔ تارا بائی گا رہی تھی ــــ

بھویں تنی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں
کسی سے آج بگڑی ہے جو وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں

ساز بھی اس کی آواز کے ساتھ رَل مل گئے۔ لوگ بُری طرح پھڑکنے پھڑکنے سے لگے۔ لڑکیاں کھلے دائرے میں ہر طرف ناچ رہی تھیں مگر ان کی بیشتر توجہ چوکی پر بیٹھے ہوئے لوگوں کی جانب تھی۔ پہلے ہی شعر پر لوگ نوٹ اور چاندی کے روپے لٹانے لگے۔ لڑکیوں نے ناچنے کے ساتھ تارا بائی کے سُر میں سُر ملا کے گانا شروع کیا تو ساری عمارت میں آگ سی لگ گئی۔ ہر جانب سے لوگ انھیں اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے نوٹوں اور سکوں کی جھلک دکھانے لگے۔ وہ تھرکتی ہوئی کبھی ادھر جاتیں کبھی ادھر۔ لڑکیاں جس کے سامنے بھی پہنچتیں وہ انگلیوں میں تھما ہوا نوٹ اوپر نیچے دائیں بائیں گھماتا رہتا۔ لڑکیاں اس وقت تک اس کے سامنے ناچتی رہتیں جب تک وہ اپنے روپے سے دست بردار نہ ہو جاتا۔ پھر ابھی لڑکیاں ہٹتی نہیں تھیں کہ پھر وہی شخص یا قریب کا کوئی اور شخص نوٹ نکال کے جھٹ ان کے آگے کر دیتا۔ انھیں دیکھ کے بار بار مجھے اپنی نیتی کا دھیان آ جاتا جیسے نیتی روپ بدل کے میرے سامنے آ گئی ہو۔ وہ بھی ایسے ہی لہک لہک کے اور ٹھمک ٹھمک کے ناچتی، ہنس ہنس کے روپے لیتی ہوگی، ان کے فقروں اور طرح طرح کی حرکتوں پر اسی طرح مسکرا کے رہ جاتی ہوگی۔ وہ نواب جو نیتی کو مستقل اپنے گھر لانا چاہتا تھا، اس نے مجھے بتایا تھا کہ نیتی سب سے الگ تھی۔ بہت خوبرو، حسین اور کھوئی کھوئی سی اپنے بالاخانے تک محدود رہتی تھی، ہو سکتا

پہلی گرہوں میں ایسے ہی ناچتی گاتی ہو مگر گھر تو اس کا بالاخانہ ہی تھا۔ گلی کوچوں کے لوگ جہاں جاتے ہیں اسی طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ اس کے بارے میں جاسو کے کہے ہوئے لفظ بھی مجھے اچھی طرح یاد تھے۔ جاسو میں زین کی حویلی والے کا جشن منانے چمپا بائی کے بالاخانے لے گیا تھا۔ راستے میں اس نے نیتی کے لیے کیا کچھ کہا تھا، ایک ایک لفظ میرے سینے میں پیوست تھا۔

لوگوں کا بس نہیں چلتا تھا کہ انھیں کھا جائیں۔ وہ ایسی ہی نظروں سے انھیں دیکھ رہے تھے۔ تارا بائی نے دوسری غزل چھیڑی۔ یک بیک کالے دادا ایک طرف سے اچھلتا ہوا میرے پاس آیا۔ اس نے جیب سے مٹھی بھر نوٹ نکال کے میرے سر پر رکھ دیے۔ مجھے بالکل اچھا نہیں لگا۔ میرے جی میں آئی کہ اٹھا کے چوکی سے نیچے پھینک دوں لیکن اس کا چہرہ دیکھ کے میرا جسم اندر ہی اندر چور چور ہو گیا۔ کالے دادا کھِلا جا رہا تھا۔ دونوں لڑکیاں سیدھی چوکی پر چلی آئیں۔ سب لوگ ادھر ادھر ہو گئے۔ چوکی پر بس ہمی لوگ تھے۔ پل بھر میں دونوں میرے سامنے آ کے بیٹھ گئیں۔ میں سر تا پا پسینے میں نہا گیا۔ وہ مجھ سے کوئی ایک قدم کے فاصلے پر بیٹھیں مسکرا مسکرا کے گانے لگیں۔ اتنے قریب سے میں نے انھیں اب دیکھا تھا۔ دونوں کے چہروں پر شرم کا رنگ دہک رہا تھا۔ آنکھوں میں چنگاریاں سی لپک رہی تھیں۔ وہ نرم نرم شوخی سے بھری ہوئی تھیں۔ ان کے بدن پارا پارا سے تھے۔ گانے کے ساتھ بیٹھے بیٹھے ناچ بھی رہی تھیں۔ ان کے بازو جیسے ہوا میں بہے جا رہے تھے اور میری ہی طرف چلے آ رہے تھے۔ میرے حواس منتشر ہو گئے۔ میں نے خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی لیکن ہر لمحے گمان ہوتا تھا کہ نیتی میرے سامنے آ کے بیٹھ گئی ہے۔ یہ لڑکیاں نیتی کی ساری اداسی جانتی ہیں اور انھیں میرے پاس دانستہ بھیجا گیا ہے۔ مجھے اپنا چہرہ دہکتا، تیز شعلہ بار لگا۔ لفظوں سے چھپانے کے سوا کچھ سجھائی نہ دیا۔ جلدی مجھے اپنے سر پر ان کے ہاتھوں کا لمس محسوس ہوا۔ انھوں نے روپے اٹھا لیے تھے لیکن میرے پاس سے اٹھی نہیں تھیں۔ کالے دادا کے بعد معلوم نہیں کون شخص تھا۔ میں نے اس کے ہٹتے ہی روپے جیب کے حوالے کر دیے۔ جھک کیا تھا کوئی میرے گالوں پر، کوئی ٹھوڑی پر، کوئی ہونٹوں پر علاوہ کوئی سینے پر روپے رکھنے لگا۔ لڑکیاں بیٹھے تو اچکتے ہوئے اداؤں سے انگلیوں سے روپے کھینچتی رہیں۔ پھر انھوں نے چٹکیاں بھرنی شروع کر دیں۔ لوگوں نے شور مچایا۔ وہ با قاعدہ مجھے نوچنے لگیں جیسے میرے روپے لینے کے لیے ان کے ہاتھ دراز ہوتے ہوئے مجھ تک پہنچ گئے۔ گانے کی آواز شور میں دب جاتی۔ میرا سارا جسم اینٹھا جا رہا تھا کے باوجود مجھ میں اتنی سکت نہیں تھی کہ انھیں جھٹک دوں۔ خود کو سکون دے سکوں اور یہاں سے بھاگ نکلوں، اپنا گریبان چاک کر

لوں، اپنے آپ کو نوچنا کھسوٹنا شروع کر دوں، چیخیں مار کے سارے جہاں کو جگا دوں۔ یہ جو نہیں ہوا اور میری رگوں میں خون سنکتا رہا۔ پھر آگے ہی سے کوئی اور شخص آیا۔ اس نے میرے سر پر سکوں سے بھری ہوئی تھیلی الٹ دی۔ سکے کھن کھناتے ہوئے میرے چاروں طرف بکھر گئے۔ میں نے وحشت سے تھیلی کو دیکھا۔ وہ سر جھکائے لگ بیٹھا تھا۔ اللہ جانے کی نظروں سے پر مرکوز تھیں اور اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ اس نے کالے دادا سے کچھ کہا ہو گا مگر کوئی بھی پاس نہیں آیا۔ جس شخص نے سکوں کی تھیلی الٹی تھی وہ بازار کا چودھری تھا جس کی نذر تھیلی نے واپس کر دی تھی۔ دونوں لڑکیاں تھوڑی دیر تک بیٹھی گاتی رہیں پھر چوکی سے اتر کے لوگوں کے درمیان چلی گئیں۔

چوکی پر سکوت چھا گیا لیکن مجمع ان کی واہ واہ سے چھلنے کرنے لگا۔ دائیں طرف کھڑا ہوا ایک شخص کچھ اور بے کل ہو گیا۔ وہ دونوں ہاتھ اٹھا اٹھا کے ستانے لگا۔ اس کے ہاتھوں میں گڈیاں تھیں۔ کچھ دیر پہلے بھی اس نے لڑکیوں پر بہت سے روپے نچھاور کیے تھے۔ اس طرح لڑکیوں کو دیر دیر تک اپنے پاس روکے رکھا تھا۔ اب بھی اس کے مضطرب تیوروں میں یہی تڑپ مجھے معلوم ہوتی تھی کہ وہ کسی اور طرف نہ جائیں اسی کے سامنے ناچتی گاتی رہیں۔ دو ایک مرتبہ اس نے لڑکیوں کے بڑھے ہوئے ہاتھ پکڑنے کی کوشش بھی کی تھی اور انھیں طرح طرح کے اشارے کر رہا تھا۔ کبھی سینے پر ہاتھ مارتا، کبھی ٹھنڈی آہیں بھرتا، کبھی دیوانوں کی طرح سر جھکا لیتا۔ اس کی آنکھوں کے خمار اور اضطراب سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ وہ کوئی نشہ کیے ہوئے ہے۔ شاید وہ تارا بائی کے پیچھے پیچھے آیا تھا اس لیے کہ ابتدا میں اسے میں نے کہیں نہیں دیکھا۔ یا ممکن ہے میری نظروں سے وہ اوجھل رہا ہو۔ اس نے اچانک آگے آ کے روپے لٹانے شروع کیے تھے، تبھی میں نے اسے دیکھا تھا۔ اس کے ارد گرد کے لوگ اس کا خیال کر رہے تھے۔ ڈیل ڈول میں وہ چوڑا چکلا تھا۔ ہاتھ پیر کا سجیل، چہرہ بڑا اور رنگ دو آسا، عمر تیس کے قریب۔ اڈے سے متعلق معلوم بھی ہوتا نہیں تھا۔ چوکی سے واپس چلنے کے بعد لڑکیاں اس کی طرف جانے کے بجائے کسی اور طرف چلی گئیں۔ وہاں کچھ اور لوگ روپے ہاتھ میں لیے منتظر تھے۔ یہ بات اسے ناگوار گزری۔ اس نے تلملاتے ہوئے انھیں اپنی طرف آنے کا ایک طرح سے حکم دیا۔ لڑکیوں نے بیچ سے مسکرا کے اور آنکھوں آنکھوں میں تحمل کا اشارہ کیا مگر اس کی بے چینی کم نہیں ہوئی۔ وہ پھلانگتا ہوا بڑھتا آ رہا۔ لڑکیوں کو دوسری طرف سے بڑھنے سے فرصت نہیں مل رہی تھی۔ وہ شخص انتہائی بے تاب ہو گیا۔ خود ان کے پاس جانے کے لیے رسیاں تڑانے لگا۔ بہ مشکل اس کے قریب کھڑے ہوئے لوگوں نے کسی نہ کسی طور اسے روکے رکھا۔

مل دے۔
ہم چوکی سے اُترے تھے تو جوئے والا ہمارے ساتھ نہیں آیا
وہیں کھڑا رہ گیا تھا۔ ہمیں خیال بھی نہیں تھا کہ کون ہمارے ساتھ
ہے، کون رُک گیا ہے۔ ہمیں بڑھتا دیکھ کے تیجے کی نگاہ واز ہم
پر مرکوز ہو جانی چاہیے تھی جوئے والا یہ نہیں جوئے والا نے ہی
کا انتظار کیا ہوگا۔ ہم نیچے اُتر جائیں اور اُس کے مقابل صرف
رہ جائے۔ جتنی دیر میں ہم نے چوکی سے نیچے قدم رکھا، اتنی دیر
جوئے والا نے چاقو نکالا اور نشانہ لے لیا۔ وہ اس سے پہلے چاقو
کی نقل نہیں کر سکتا تھا۔ ہمارے نیچے اُترنے میں اور جوئے
کے چاقو نکال کے نشانہ لینے میں لمحوں ہی کا فرق تھا۔ جوئے
نے اس اثنا میں اتنی پھرتی اور احتیاط سے کام لیا تھا کہ تیجے
بھٹ نہ مل سکی۔ اگر اُسے اُوپر دیکھنے کی فرصت مل جاتی تو تیجے
بھی کوئی جوئے والا ہی کر گئتی۔ چاقو سامنے سے جاتا تو تیجے سے
سکتا تھا۔ تیجے کی انگلیوں اور ہاتھ کا بڑا حصہ تیجے سے لپٹا ہوا
ہوا تھا تیجا آگے تھا۔ تیجے کا ہاتھ اُس کی اوٹ میں، جوئے
نے چاقو اُوپر اُٹھنے کے اور کسی قدر ترچھا کر کے پھینکا تھا۔ وہ
تیجے کے ہاتھ پر جا کے گرا تھا۔ اُس کی رفتار بہت تیز تھی اور
ہونے کی وجہ سے نشانہ بڑی حد تک قطعی ہو جاتا تھا۔ تیجے
بیٹ میں اپنا ہاتھ دائیں طرف کرتا یا بائیں طرف دونوں صورتوں
تھا۔ البتہ وہ ہاتھ کٹ بھی سکتا تھا تب چاقو سیدھا پری جان
بھی جا کے پیوست ہوتا لیکن جوئے والا کو پہلے یقین تھا کہ چاقو
کے ساتھ وہ جیتے گا یا اُسے یقین تھا کہ تیجے کا ہاتھ اُس
نہیں بچے گا۔ جا سکے گا اگر جوئے والا سے ذرا بھی چوک ہو
تیجے کے غضب کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ امکان تھا سر سے
جوئے والا کے جسم میں چاقو نظر نہیں آتا تھا۔ جتنی بھی عمر کے ساتھ
ہوئی ہوگی۔ بولتے ہوئے اُس کی آواز بھرا جانے لگتی تھی مگر جیسا کہ لوگ
کرتوا اُس کی ہوتی ہے۔ جب تک ارادہ نہ ہو اتنا ہی آدمی
بتا ہے جوئے والا نے خاص طور پہ تیجے کے سمیٹے والے ہاتھ کو نشانہ
ہے اور تیجے چاقو پھینکنے میں اتنی مہارت تھی تو وہ تیجے
کے سامنے نہ رُکنے والے کسی اور تیجے کا نشانہ بھی لے سکتا تھا تیجے
ہاتھ پری جان کے بدن پہ جما ہوا تھا۔ اُس کا نشانہ لینا نسبتاً آسان
بھی جب سمیٹنے والے ہاتھ کا نشانہ لیا جائے۔ یہ ضروری بھی
اور جگہ کا نشانہ لینے میں تیجے ہی کے قبضے میں رہتا ہیں پری
ایک لمحے تیجے کو دیکھ سکا اس لیے کہ ہم فوراً پلٹ کے جوئے
پیچھے آئے تھے لیکن میرا اندازہ ہے کہ تیجے کا ہاتھ بےاختیار اٹھا
سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو چکا ہوگا۔ اُس کی چیخیں اور خون کی

چھوٹی چھوٹی تیاری تھیں کر ترچھا چاقو ہاتھ کا بڑا حصہ کاٹتا ہوا اندر
تک گھسا ہے۔
چوکی پر بہت سے لوگ آ گئے تھے۔ سب نے جوئے والا کو گھیرے
میں لے لیا تھا۔ بڑی مشکل سے کالے والا نے انھیں واپس کیا اور تیجے کا
تیغا اور چاقو جوئے والا کو پیش کیا۔ چاقو تیجل کا تھا۔ جوئے والا
نے اُسے آنکھوں سے لگا کے تیجل کے آگے کر دیا۔ تیجل نے انکار کیا تو وہ
اُس سے لپٹ گیا۔ "بس دلا ہیں۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "یہ تمہارا
ہے اور سدا تمہارے پاس رہے گا۔ قسم سے اپن کا دل بڑا ہے، اس کو تم
سے کبھی کوئی نہیں چھین سکتا۔"
"یہ تم نے کیسا جادو کرا تھا دادا؟" پیرو نے حیرت اور اشتیاق
سے پوچھا۔ "اپن نے پہلے کبھی ایسا نہیں دیکھا۔"
"سب تیسو والے کا کیا ہے اپن نے کچھ نہیں کیا۔ کچھ نہیں کیا۔"
جوئے والا نمی بھری آواز میں بولا۔ "لگتا ہے اُس نے اپنے غلام کو
معاف کر دیا ہے۔"
"بیٹھو دادا ابھی آرام سے بیٹھو۔" پیرو نے اُس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے
والہانہ انداز میں کہا۔ "اپن کا سمجھ میں نہیں آتا ابھی تم کو کس طرح بولے کیا
بولے۔" پیرو کی آواز گلے میں پھنسنے لگی اور اُس سے کچھ نہ کہا جا سکا۔ وہ
اپنا سر جوئے والا کے سینے سے رگڑنے لگا۔
پری جان پہ سکتہ سا طاری تھا۔ تیجے اب محفل میں موجود نہیں تھا۔
تیجل نے تارا بائی کو جلانے کے سکوں سے بھری ہوئی ایک تھیلی دی اور
آہستگی سے بولا۔ "بالیاں ابھی ادھوری ہیں تارا بائی۔ ان کو ابھی محفل میں
نہیں لانا چاہیے۔"
"بندی کہاں لے جاتی ہے استاد؟" تارا بائی ابھی تک لرز رہی
تھی کپکپاتی آواز میں بولی۔ "آج پہلی بار گھر سے قدم نکالا تھا۔ اِدھر
محفل جماتی ہیں یا کبھی کبھی خاص محفلوں میں گئی ہیں۔ بندا بندی انھیں
آپ کی وجہ سے اِدھر لائی تھی۔ اتنی عمر دنیا دیکھتے گزر گئی لیکن ایسا...."
اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔
"اتنا سمجھ لیا ہے تو کچھ آنکھ کی پہچان بھی کرائی ہوتی۔ ہر تال سے
پہلے کی چیز ہے یہ۔ معلوم ہوتا ہے تم نے اپنا دودھ نہیں پلایا ہے۔"
تارا بائی نے حیرت سے اُسے دیکھا اور سٹ پٹا گئی۔ "بندی...
بندی کی کیا مجال ہے کہ اُستاد کے سامنے لب کشائی کرے۔" وہ ڈوبتی
آواز میں ہی کہہ سکی۔
"پہلی بار یہ کسی گھرے گاہک سے ان کی بات کر لینا تارا بائی۔"
تیجل نے جھنجھلاتے لہجے میں کہا۔
تارا بائی اُسے دیکھتی رہ گئی۔
"میں سمجھتے میں اب کچھ ہی دیر رہ گئی ہوگی۔" تارا بائی کے پیچھے

چاٹ پر خواب لوگ چلے گئے لیکن جو رہ گئے تھے وہ وہیں ہم کے پیچھے
پیچھے بیٹھے انھیں کسی اور بات کا انتظار ہو۔ سب حیرت زدہ اور گم سے
تھے۔ ان میں سے چند مختلف ٹولیوں میں اِدھر اُدھر بکھرے سرگوشیاں
کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد عمارت میں سکون چھا گیا۔ وہ سکون جو عموماً جل
میں ہوتا ہے۔ بہت زیادہ ہنسنے کے بعد جو اُداسی ہوتی ہے کسی کی آنکھوں
میں نیند نہیں تھی۔ جوئے والا، پیرو، کالے اور کالے والا بھی تیجل کے
پاس چوکی پہ بیٹھے تھے۔ اڈے کے آدمیوں نے تیجل کے لیے حقہ تازہ کر دیا
تھا اور چائے دوبارہ تقسیم کی جانے لگی تھی۔ تیجل کے جلد اُٹھنے کا امکان نظر نہیں
آ رہا تھا۔ مجھے بھی وہاں سے اُٹھنے اور کاٹنے سے مزید کچھ جاننے کی کوئی
جلدی نہیں تھی۔ تیجے کا چہرہ ابھی تک میری آنکھوں میں کھبا ہوا تھا۔ معلوم
نہیں اب اُس کو کیا حال ہو۔ جوئے والا نے صرف اُس کے ہاتھ کا نشانہ
لیا تھا۔ دل کا نہیں۔ تیجے مر نہیں سکتا تھا لیکن اب وہ واقعی زندہ رہے گا۔
وہ مجھے کوئی پاگل معلوم نہیں ہوتا تھا۔ شاید اپنے بس میں نہ رہا ہو۔
پہلے بھی پاگل پن تو نہیں ہوتی مگر پھر پاگل پن کیا ہوتا ہے اپنے بس میں نہ رہنا۔ جوئے
والا بر وقت چاقو نہ اُٹھاتا تو کون جانے کیا ہو جاتا۔ نہ معلوم ہم میں سے کون
تیجے ہوتا۔ اُسے ایک یا دو بار تنچا چلانے کا وقت مل سکتا تھا۔
مل دوسری بار....۔ کوئی چلاتے وقت کسی بھی طرف سے کوئی اُس
تک پہنچ جاتا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ نہ ہوتا۔ تیجل چوکی سے اُس کی جانب
بڑھا تھا تو اُس کے ذہن میں تیجے کو زیر کرنے کی کوئی.... پھر ہو گی۔
بھی ہو سکتا تھا کہ تیجل کے قریب پہنچ جانے پر تیجے کا جسم ٹھنڈا ہو جاتا۔ کسی
دوسرے کو ختم کرنے سے اُسے کیا حاصل ہو سکتا تھا۔
نہ جانے کیوں اتنی دیر بعد مجھے اب کوئی بات اوجھل ہو جانے
کوئی کمی رہ جانے کا احساس ہو رہا تھا جیسے تیجے کی بات لوگوں نے نظر
سے نہیں تھی۔ سب کی نظریں اُس کے تیجے سے اُٹھی رہیں۔ اُس کی نظر
بچتی تو لوگ بچھا اور دیکھ پاتے۔ اُس پہ سے منظر سب کچھ تو خود سے سامنے
ہوا تھا۔ مجھے کہاں سے نہ دیکھے ہوئے، کہاں سے نہ سنے ہوئے کی کمی
محسوس ہو رہی تھی۔ تقریباً سبھی نے طرح طرح تیجے کو بچانے کی کوشش
کی تھی۔ شاید اُسے خود بھی ٹھیک سے معلوم نہیں تھا۔ جوئے والا نے ہر
امکان سے مایوس ہو کے یہ قدم اُٹھایا تھا۔ خود میں تیجے کی کسی فضیلت کو
منتظر تھا کیونکہ اُس کی دیوانگی میں کیا کسر رہ گئی تھی۔ یہ پاگل پن نہیں تو
اور کیا ہے کہ اتنے لوگوں کو پریشان کیا جائے۔ ایسا کہاں ہوتا ہے اُسے
اگر پری جان مطلوب تھی تو پری جان کو حاصل کرنا اُس کے لیے کیا مشکل تھا۔
وہ کہیں بھاگ تو نہیں گئی تھی۔ اُس کے گھر سب کو اُسے علم تھا۔ وہ چیزیں
حاصل کرنا کیا مشکل ہے جن کی کوئی قیمت مقرر ہے۔ قیمت ہی ادا کرنے
کے لیے تو جنگ نے دُور کوئی چوٹی ہے مگر یہ کون سا طریقہ تھا۔ بھلا کوئی اس
طرح فیل ہوتا ہے۔ تیجے نے پری جان کا کچھ خیال بھی نہیں کیا جس کا وہ
دعوے دار تھا۔ اُس نے اُسے کتنی اذیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ اتنے

بہت سے لوگوں میں اُس کا تماشا کیوں بنایا تھا اور پری جان کس سے
اتنی سہمی سہمی دُور دُور کیوں نظر آتی تھی۔ تیجے نے اُس سے رویے کی
کچھ ایسا دکھا ہوگا ورنہ کبھی تو ایک شخص کسی کے لیے دُنیا بھر کے مال و
متاع سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔
بیسک پرسٹل بھی بے ربط باتیں کر رہی تھیں۔ ان کی بے
سروپائی کی تائید اُن سب کے لب و لہجے سے بھی ہوتی تھی۔ وہ تیجے کی
باتیں نہیں کر رہے تھے۔ دنیا جہان کے قصے دہرائے جا رہے تھے۔ ٹھنڈی
ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی۔ اڈے کے آدمی سماوار سے کیتلیاں بھر بھر کے
چوکی پہ لا رہے تھے۔ مٹھائی کے ٹوکرے بھی کھول دیے گئے۔ چائے پینے
سے وہ اور بیدار ہو گئے تھے۔ اڈے پر چھایا ہوا تکدر چھٹ چکا تھا۔
رفتہ رفتہ سے اُن کے قہقہے گونجنے لگے تھے۔ میں بھی ابھی کے دوسرے پیچھا
ان سب کو دیکھ رہا تھا۔ اُن کی باتیں سن رہا تھا لیکن میرا دماغ بہک
بہک جاتا تھا اور اُن کی ہنسی ہی میں چونک چونک پڑتا تھا۔ اندھیرا
کب تک طاری رہتا۔ دھیرے دھیرے رنگ چھٹنے لگا اور عمارت
میں جلنے والی روشنیاں پھیکی پڑنے لگیں۔ جوئے والا کو احساس ہوا۔ وہ
حیرانی سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔ "سالی پوری رات نکل گیا بابا!"
اُس کے اُٹھتے ہی سبھی اُٹھ گئے۔ تیجل بھی۔ گویا اُسے جوئے والا
کے اشارے کا انتظار تھا لیکن تیجل نے اُسے اڈے سے نہیں جانے دیا
بلکہ اُسے اور پیرو کو اپنے ساتھ لے کے نچلی منزل کے ایک کمرے میں چلا
گیا۔ کاٹنے کا ارادہ باہر جانے کا تھا لیکن شامو نے مجھے اور زورا بھائی کے پیچھے
پیچھے آنے تو کاٹنے اُوپری منزل پر آ گیا۔ یہاں سائبان میں کئی چارپائیاں
برابر برابر پڑی تھیں اور اُن پر سفید چادریں بچھی ہوئی تھیں۔ سب
اُنھی پر بکھر گئے اور چپ چاپ گہری گہری سانسیں کھینچنے لگے۔ اندھیرا
تیزی سے دُور ہو رہا تھا۔ کاٹنے میرے ساتھ ہی چارپائی پر لیٹا ہوا
تھا۔ خاصی دیر بعد کاٹنے نے زبان کھولی اور غنودہ آواز میں بولا۔ "کچھ
دیر پلک سے پلک لگا لے!"
"نیند بالکل نہیں آ رہی ہے کاٹنے بھائی!"
"نیند سالی پہلے ہی اُس کتیا کے بچے نے سب اُٹھا کے
رکھ دیا۔ سالا ایک دم کٹ کھنا ہو گیا تھا۔" وہ تیجے کو گالیاں بکنے لگا۔ "میں
نے پہلے ہی تو وہ مچلتے لہجے میں بولا۔ "مجھ کو تو یہ سب کچھ بہت بدلا ہوا
میرا مطلب ہے بہت اُلٹا لگ رہا ہوگا۔ اندھیرا ختم ہونے پر تو
کدھر تھا اور اندھیرا....؟"
"ہاں کاٹنے بھائی! خواب میں تو سب کچھ مجھے اپنی آنکھوں کا
جھوٹ لگ رہا تھا۔"
"پر تم لوگ اُدھر سے نکل کیسے آئے؟" وہ تجسس سے بولا۔
"بس کسی وقت نکل آیا تھا۔ ایک دم دماغ میں بات آئی میں نے
پیرو والا سے کہا۔ وہ چپ ہو گیا میں سمجھا، شاید میں نے کوئی اُن ہونی

بات کہہ دی ہے۔ دن بھر اس نے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی لیکن
رات ہونے پر اچانک وہ دادا نے جانے اوپر کہاں سے ہمارے پیرے سوار سے
کیا کہ نواب سے کچھ بات کرنا چاہتا ہے۔ کوئی آدھے گھنٹے سے کم
کے عرصے میں نواب اندر آ گیا۔ بس اس کے آنے کی دیر تھی۔ میں نے مختصر
اُسے حویلی سے نکلنے کا سارا واقعہ سنا دیا۔

وہ اُچھل کے بیٹھ گیا: "کانتے بھی تجھ کو کیا ہوئے۔" وہ دولتی آواز
میں کہنے لگا: "ادھر ہم لوگ بالکل چوپٹ ہو گئے تھے تم لوگ کر گئے
پورے چھ دن ہو چکے تھے، ہر کے چھ دن سوچتے سوچتے دماغ بھی نے
گھوم گیا تھا، سالی ایسی کیا بات ہو سکتی ہے کہ اتنے دن میں تم دونوں پلٹ
کے نہیں دیکھے۔ نہ کوئی نام نشان۔ ترجمان کیسی کیسی باتیں دماغ میں آ
سکتی ہیں ہر طرف اندھیرا بھرا تھا، کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کدھر کو جائیں
کہاں جا کے سر پھوڑیں۔ سالا کس کا گریبان پکڑیں۔ پھر کچھ دوڑ بھاگ کے بعد
تھوڑی بہت تحقیق ملی لیکن اُس سے بل نکلنے کے بجائے اور بڑھ گئے
استاد کو دیکھ کے اور سالا بھی اُلٹا ہوتا تھا۔ یقین مان استاد کو کبھی ہم لوگ
نے ایسا ... اب تجھ سے کیا بولوں۔" اُس نے تلخی سے کہا: "اس کو
دیکھ کے ہاتھ پیر اوسان کو جاتے تھے، ادھر ہم لوگ آپس ہی میں جوڑ توڑ کرتے
رہتے تھے، اتنا سمجھ میں آ گیا تھا کہ کوئی بڑا چکر ہے ورنہ پیرو دادا کے
ہوتے اتنی دیر نہیں لگنی چاہیے۔"

"پیرو دادا بھی کیا کرتا، وہاں سے نکلنا ممکن ہی نہیں ہو رہا تھا۔
میں نے تمہیں بتایا نا کہ کتنی بار کوشش کی اور ناکام ہو گئے اب کے
بھی کچھ ٹھیک نہیں تھا مگر کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔ ہم نے سوچا
زیادہ سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے۔"

"تم لوگ ایک دن اور رُک جاتے تو شاید تمہیں اپنے آپ کو
یوں داؤ پر لگانے کی ضرورت نہ پڑتی۔"

"ایک دن؟" میں نے حیرت سے کہا: "کیا مطلب؟"

"ہو سکتا تھا کہ آج ہم کسی طرح تم تک پہنچ جاتے۔"

"آج؟" میں نے متذبذب سے کہا: "کیا کہہ رہے ہو؟"

"ہاں وہ لوگ آج دوپہر کی گاڑی سے آپی ادھر پہنچ جائیں
گی ہم نے سب کچھ اُن کے آنے پر اٹھا رکھا تھا۔"

"آپی؟" مجھ سے لپٹا نہیں گیا: "خانم آ رہی ہیں؟"

"ہاں ہاں ویسے اُن کو اب تک آ جانا چاہیے تھا مگر اُدھر کوئی
بات ہو گئی ہوگی جبھی دیر ہو گئی۔ کل شام اپنے کرتار دلالے کہ وہ اُدھر
سے چل پڑی ہیں۔"

"آپی؟ آپی کو کس نے بلایا؟"

"استاد نے تار بھیجا تھا۔"

"تو، تو اس کا مطلب ہے کہ تم سب کچھ جان گئے تھے؟" میں
نے سٹ پٹاتے ہوئے کہا: "تفصیل سے بتاؤ۔"

"کیا بتاؤں! اُستاد کا تجھ کو پتہ ہے آدھی بات منہ میں رکھ کے
آدھی اُگلتا ہے۔" وہ ترشی سے بولا: "اب کے آدھی بھی کھا گیا تھا۔
اپنے کو زیادہ نہیں معلوم لیکن ایسے اندھے بہرے ہم بھی نہیں ہیں۔"

خانم کے آنے کی خبر سن کے میرا سر گھومنے لگا تھا، اس کے
کیا معنی ہو سکتے ہیں، یہی کہ تجمل بڑے نواب کے لپیٹ چکا تھا یا ہمیں نے
کے بعد اس نے بڑے نواب سے کوئی رابطہ قائم کیا تھا۔ میں گم صُم نظروں
سے کانتے کی صورت تکنے لگا۔

"پھر کیا بتاؤں۔" کانتے خود بولا: "ادھر آ کے کیسی خواری ہوئی
ہے، ہم کو فیض آباد میں تیسرے دن تار ملا تھا۔ دو دن تک باباجان زورا
اور مادی تم کو ادھر ہوٹلوں شہر میں ڈھونڈتے رہے۔" زورا نشا ہوا اور پھر
تینوں اُٹھ کے ہمارے ساتھ والی چار پائی پر چلے آئے تھے۔ زورا نے
بولنا چھوڑا اور مجھے بتانے لگا کہ شام تک تو کچھ نہیں ہوا لیکن جب رات
ہونے لگی تو سب کو تشویش شروع ہوئی۔ وہ اور مادی بار بار ہوٹل سے باہر
جا جا کے دیکھتے تھے۔ دس بج گئے تو باباجان بھی نکل کھڑے ہوئے، رات گئے
تک سڑکوں پر اور ہوٹلوں میں ہمیں دیکھتے رہے، ساری رات یوں ہی گزر
گئی۔ صبح بڑی مشکل سے زورا اور مادی نے باباجان کو ہوٹل میں روکا اور
خود دن بھر گلی کوچوں کے چکر کاٹتے رہے۔ وہ کسی سے کچھ پوچھ بھی نہیں
سکتے تھے، ایک تو باباجان نے انھیں منع کر دیا تھا، دوسرے کسی نتیجے
پر پہنچنے سے پہلے یہ مناسب بھی نہیں تھا۔ مگر یہ کیسی تلاش تھی کہ وہ نہ
کسی سے پوچھ سکیں نہ تھانے میں جا کے دو گمشدہ آدمیوں کی رپورٹ
کر سکیں۔ پورا دن گزر گیا۔ زورا اور مادی گویا سارے شہر کی خاک چھانتے رہے
درمیان میں بار بار ہوٹل جا کے دیکھتے رہتے تھے اور ہر بار زورا کے بقول
انھیں باباجان کی سوالی آنکھوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ زورا کہہ رہا تھا کہ
اُن سے نظریں نہیں ملائی جاتی تھیں۔ گو باباجان نے اُن سے ایک لفظ
بھی نہیں کہا تھا بلکہ اُلٹا انھیں صبر و ضبط کی تلقین کرتے رہے تھے۔ دوپہر
کو زورا نے انھیں مشورہ دیا کہ تجمل کو مطلع کر دیا جائے مگر باباجان نے
کچھ اور توقف کر لینا بہتر سمجھا۔ تجمل کا دشمنی پیرو وہ خود دیکھ کے آئے
تھے، اس حالت میں اُسے بلانا انھیں اچھا نہیں لگتا تھا لیکن کوئی اور
صورت بھی سامنے نہیں تھی۔ دوسری رات ابھی پوری طرح نہیں گزری
تھی کہ انھوں نے مادی سے تار گھر جانے کو کہا اور پھر خود بھی اس کے
ساتھ چل دیے۔ تار انھوں نے اپنے ہاتھ سے لکھا اور صرف اتنا لکھا کہ
کسی تاخیر کے بغیر تجمل حیدرآباد آ جائے۔

اس دوران اُن تینوں نے طرح طرح کی تدبیروں پر غور کیا تھا
اور پھر ہر پھیر کے ایک ہی فیصلہ کر پاتے تھے کہ ابھی کچھ اور انتظار کر لیا
جائے۔ تار بھیجنے کے بعد وہ اور پابند ہو گئے تھے تجمل کے آنے تک

کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے تھے۔ چلتے وقت میں اور پیرو باباجان سے
کوئی خاص بات کہہ کے نہیں چلے تھے، پیرو نے صرف اتنا کہا تھا کہ
کھانے پر وہ ہمارا انتظار نہ کریں یعنی ہمیں دیر بھی لگ سکتی ہے۔ زورا
بتا رہا تھا کہ باباجان اُس سے اور مادی سے کرید کرید کے پوچھتے تھے
کہ تم انھیں کچھ اور تو بتا کے نہیں گئے؟ زورا اور مادی کو اُن سے زیادہ
کیا معلوم تھا۔ جو باباجان کو کسی ایک سمت سوچنے کا موقع ملتا۔ وہ خود
محوری جیسی باتوں سے تانے بانے ملاتے رہے ہوں گے۔ نکتہ طرازی
اُن کی عادت ہے۔ آٹھ سال تک وہ کو لکے لٹے ہوئے نقشوں اور
ناکاموں سے نکتے ٹٹولتے رہے تھے۔ سفر کے دوران اچانک
ملاقاتوں میں ہمارا قیام اور بمبئی جانے کے بجائے حیدرآباد کا ارادہ یہاں
آ کے ہی فوراً نکل کھڑے ہونا سوچنے کے لیے اُن کے پاس بہت
کچھ تھا۔ نتیجہ اخذ کرنے کے لیے کچھ نہیں، ظاہر ہے پیرو نے انھیں سب
کچھ بتانا ضروری نہیں سمجھا ہوگا کہ کسی مولوی محمد شفیق کی تلاش میں
انھوں نے بمبئی جاتے جاتے حیدرآباد کا ارادہ کر لیا ہے، مولوی محمد شفیق
کی حویلی میں وہی لڑکی ہے جو وہ کرا جو بھی اُن کے گھر رہی تھی اور
جسے ایک رات اُن کا بیٹا گھر سے لے کے چلا گیا تھا۔ اتنی جزئیات
شاید پیرو کے علم میں بھی نہ ہوں اور نہ باباجان نے بوجوہ انھیں
بتانا مناسب سمجھا ہو کہ بزرگی کی مروت وضاحت سے اجتناب
کرتی ہے یا اس کو بتانے والا خود وضاحت نہ کرے مگر پیرو نے یکا یک
حیدرآباد جانے کا کوئی ذکر کوئی عذر تو انھیں پیش کیا ہوگا معلوم نہیں
وہ کیا تھا، بہرحال باباجان سے اب بھلا اتنا تو ڈھکا چھپا نہیں رہا تھا،
وہ خوب جانتے تھے کہ اُن کے بیٹے کے ساتھی کون لوگ ہیں کون لوگ
جنت میں اُن کے ہم سفر تھے۔ فیض آباد میں زیب کی حویلی میں انھیں
اُنگلی کے بہت سے لوگ ملے تھے، انھوں نے جنت میں مجھے جاتے
جاتے ہوئے بھی دیکھا تھا اور ابھی تک پولیس اسٹیشن پر سونیا کے سامنے
واقعے کے وہ شاہد تھے وہاں انھیں یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ ان کا بیٹا
سات سال جیل میں رہا ہے اور سونیا کون تھی، کلکتہ جیل کے سابق
جیلر کی لڑکی۔

ایسے لوگوں کی گمشدگی کی رپورٹ کرنے میں انھیں اتنی
جلدی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ یہ حقیقت بھی اُن کے پیش نظر ہو گی کہ
اگر واقعی پولیس نے ہمیں کہیں گھیر لیا ہے تو ہم نے پولیس کے سامنے
اپنے اُن ساتھیوں کی نشان دہی نہیں کی ہے ورنہ ہوٹل میں پیرو کے
علاوہ زورا، مادی اور باباجان تک پولیس کے پہنچنے میں کتنا وقت لگتا۔
پولیس کا نہ آنا اُن کے لیے ہماری طرف سے خاموشی کا اشارہ بھی ہو
سکتا تھا۔ اس طرح اُن کے پاس ہوٹل میں بیٹھے انھیں گھنٹے بھر اور
گھنٹوں ان کے سڑکوں پر تاک جھانک کرتے رہنے کے سوا کوئی کام
نہیں تھا۔ ایک گلی سے دوسری گلی، ایک علاقے سے دوسرا علاقہ۔
زورا اور مادی پہلی بار حیدرآباد آئے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ایک لمبا
راستہ طے کرنے کے بعد وہ وہیں آ نکلتے جہاں سے چلے تھے۔ سلطی
نے سرسری ایسے لوگوں سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کی جن پر
اُن کے تعلق ہونے کا شبہ ہوتا تھا۔ وہ انھیں ایک حد تک ہی
ٹٹول سکتا تھا۔ دو ایک پولیس والوں سے بھی اس نے سن گن لینے
کی کوشش کی لیکن اس طرح کیسے کوئی انھیں اُن کے مطلب کی
بتا سکتا تھا۔ تار بھیجنے کے بعد تو اُن کے لیے ایک ایک پل کا ٹنا
دوبھر ہو گیا۔ انھوں نے ارجنٹ تار دیا تھا، یعنی اُسے حیدرآباد
کے سفر میں زیادہ سے زیادہ دو راتیں اور دو دن لگتے، یہاں پہنچ کے گاڑی
لیٹ ہو جانے کا وقت بھی شامل ہے۔ انھیں یقین تھا کہ تار ملتے
ہی تجمل پہلی گاڑی سے سوار ہو جائے گا۔

دو دن پہلے اس کا آنا ممکن نہیں تھا لیکن تار کے دو دن بعد
وہ اس کی راہ اس طرح تکنے لگے تھے جیسے تجمل ہوا کے گھوڑے پر
سوار ہو کے آ جائے گا۔ اُمید کی یہ کرن بھی اُن کے علاوہ اشتیاق تھی کہ
تجمل سے پہلے کہیں ہم بھولے بھٹکے ہوٹل نہ پہنچ جائیں، ہم نہ پہنچے، نہ
دو دن گزرنے کے بعد تجمل آ سکا۔ اُن کے حواس معطل ہونے لگے۔ علی
اور زورا اسٹیشن جا جا کے مایوس لوٹتے رہے۔ زورا کے کہنے کے مطابق
پہلی بار انھوں نے باباجان کا چہرہ بدلتا ہوا محسوس کیا، ہر ایک کے ہی
تھے جوان کے لیے تشویش بنے ہوئے تھے۔ وہ اُن دونوں کو بہ اصرار
کھانا کھلاتے تھے۔ دو دن بعد باباجان نے دوسرا تار دیا۔ پھر احتیاطاً
تیسرا تار گھر والوں سے اُن کی کسی قدر تسلی بھی ہو گئی۔ وہ تیسرا دن تھا
تار دیے ہوئے تیسرا دن۔ باباجان نے زورا کے ساتھ جا کر شاپ روڈ
کی ایک دکان سے اعلیٰ قسم کا کپڑا خریدا اور قریبی درزی کو بہ عجلت
سینے کی ہدایت کی۔ اس کے علاوہ وہ پوچھتے پوچھتے شہر کی نظامت
کے دفتر گئے اور مختلف لوگوں سے وہاں کے اعلیٰ عہدے داروں کے
متعلق پوچھ گچھ کرتے رہے۔ کون کیا ہے کیا کرتا ہے۔ وہ کسی عہدے دار
سے نہیں ملے تیسرے روز ہی فیض آباد کی طرف سے آنے والی گاڑی نکل
گئی، ہمیں ہوٹل سے گئے پانچواں دن ہو گیا تھا۔ آپ باباجان نے مفتی کے ساتھ
پہلی مرتبہ ہوٹل سے نزدیک عابد شاپ روڈ کے تھانے کا رخ کیا اور
اندر جاتے جاتے لوٹ آئے۔ اس دوران زورا اور مادی نے محبوب کی
منڈی کے علاقے کا بھی چکر لگایا اور وہ مختلف بالاخانوں پر بھی گئے
حالانکہ یہ ایک فضول سی بات تھی کسی سے کچھ پوچھے بغیر جلدی تلاش
کا کیا حاصل نکل سکتا تھا لیکن کوئی اور راہ بھی انھیں سجھائی نہیں دے رہی تھی۔
ہوٹل میں رہتے انھیں خفقان سا ہونے لگتا تو وہ سڑکوں پر نکل آتے
اور راہ چلتے آدمیوں کے چہرے گھورتے رہتے۔ انھیں اپنا بھی خیال

لکھا تھا کہیں ان کی نقل و حرکت سے ہوٹل والے یا ہوٹل کے باہر بازار والے مشکوک نہ ہو جائیں۔ اس کے علاوہ انھیں یہ اندیشہ بھی لاحق تھا کہ جو لوگ ہماری گمشدگی کا سبب بنے ہیں، وہ ہمارے ساتھیوں کی تلاش میں بھی ہو سکتے ہیں، سو انھیں خود کو بھی محفوظ رکھنا تھا۔ خط والے مجھے وہی کچھ بتا رہا تھا جو میرے لیے نیا نہیں تھا۔ حویلی کی جیل میں یہ ساری باتوں کے تصور سے میرا دل ہولنے لگتا تھا۔ زور لگانے لگا رہے تھے۔ دن جب وہ اسٹیشن پہنچے تو انھیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ جگل گاڑی میں موجود تھا۔

"دونوں کے سر پر سوال ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔" کالتے بیچ میں بولا۔ "لگتا تھا ابھی بھوت کے آئے ہیں۔ کہیں ان لوگ نے کوئی خاص بات نہیں کی تھی، بس اتنی کہ جلدی بیٹھو تم سے راستے میں کچھ سوئیاں مانتے ہیں۔ گاڑی بھی سنتی ہوئی آئی۔ شروع میں ہی کنفیٹ ہو گئی تھی۔ آدھے دن کا بل ڈال دیا۔ پہلے تھرا اسٹیشن پر پہنچے جہاں چھ بولنے لگے پھر لگ پورے ادھر گزر ہو گئی تھی۔ جب بیل گاڑی کے مانند گھسٹتی رہی۔ ادھر جب نال پہنچا تو بڑے صاحب (منیر علی) استاد کو زمینوں کی طرف لے گئے تھے۔ بلور سے ایک دن بعد پہنچا تھا۔ رات کو ملا زری میں نے پڑھ کے فوراً آدمی گھوڑا دوڑا دیا۔ استاد کو واپس آتے آتے صبح ہو گئی۔ گاڑی کا وقت نکل گیا تھا لیکن گیارہ بجے کھتری کی طرف ایک گاڑی جاتی تھی۔ استاد نے اسی سے سفر کا ارادہ کر لیا۔ وہاں سے پھر وہی بیل گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اپنی طرف سے ہم نے وقت بچا لیا تھا مگر آگے نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ گاڑی بدلنے کا اب کوئی سوال نہیں تھا بس جیسے تیسے ادھر پہنچے۔" کالتے گہری سانس لے کے بولا۔

"اور اسٹیشن پہ استاد اور کالتے بھائی کو دیکھ کے اپن کا تو برا حشر، جیسے اپن کو اپنا گھر یا آنکھ ہاتھ چھپل گیا ہو۔" زورا آہستہ آواز میں بولا۔ "کچھ امید نہیں سالا بالکل اینٹ کے نیچے دیا تھا۔ سوچتا تھا ابھی استاد کے آگے کیا بولے، کیسے بات شروع کرے۔"

میرے ذہن میں بے شمار سوال جنگ کر رہے تھے لیکن میں چپ رہا۔ کالتے نے بیڑی سلگانے کے لیے چند لمحے توقف کیا۔ مجھے یہ جاننے کی بے چینی تھی کہ جگل نے ہمارے بارے میں کوئی اطلاع کس طرح فراہم کی۔ پہلے وہ کہاں گیا، کیا سیدھا اڈے؟ مگر سیدھا اڈے چلے جانے سے اُسے اتنی آسانی کے ساتھ کیسے کچھ معلوم ہو سکتا تھا۔ وہ پانچ آدمی جنھوں نے ہمارا تعاقب کیا تھا، اڈے کے آدمی تھے۔ کیا ضروری ہے کہ جگل کی نظر پہلے انھی پر گئی ہو۔ جگل کے استفسار پر اڈا ہمارے بارے میں صاف انکار کر سکتا تھا۔ اس نے اُن پانچ آدمیوں کو بھی زبان کھولنے میں محتاط کر دیا ہوگا لیکن ان ہی میں سے ایک شخص زخمی بھی ہو گیا تھا۔ اڈے کے کسی آدمی کے زخمی ہو جانے کے بعد یہ ممکن نہیں جبکہ اصل بات انھی پانچ آدمیوں تک محدود رہی ہو، کسی اور کے علم میں کچھ نہ آیا ہو۔ پھر یہ حقیقت بھی ان سے روپوش نہیں رہنی چاہیے کہ ان کے ساتھی کو زخمی کرنے والوں میں سے ایک شخص وہ تھا جس نے شاہ کبیرا کو محبوب کی منڈی کے اڈے سے بے دخل کر دیا تھا۔ ویسے بھی ان دو آدمیوں کے بارے میں ان کا تجسس فزوں ہونا چاہیے جنھوں نے چار چار تو دست آدمیوں کے سامنے حوصلہ نہیں ہارا تھا اور خود ان کے زخمی ہو جانے کی کوئی اطلاع انھیں نہیں ملی تھی۔ اڈے کے آدمیوں سے شہر میں پیش آنے والے ایسے واقعات مجھے نہیں لگتے۔ اس واقعے کی تو پوری منڈی کے علاقے کی ایک خلقت گواہ تھی۔ واقعے رونما ہوتے رہتے ہیں لیکن یہ خبر اڈے کے آدمیوں کے سر سے گزر جانے والی نہیں تھی کہ شاہ کبیرا کو اڈا بدر کرنے والا شخص پھر ان کے شہر میں دکھائی دیا ہے۔ دوسروں کی نسبت یہ اطلاع کالے دادا کو جلد مل جانی چاہیے تھی۔ اکا کی وجہ سے اس نے زیادہ بے کلی ظاہر کی ہوگی لیکن یہ ان کے کالے دادا کا قرار چھن گیا ہوگا۔ وہ آدمی دوبارہ آ گیا تھا جس کے سبب وہ محبوب کی منڈی جیسے اڈے کا مالک بنا تھا۔ کالے دادا کے وہ تمام زخم تازہ ہو گئے ہوں گے جو اکا نے اڈا چھیننے کے لیے اس پر لگائے تھے۔ ہو سکتا ہے کسی ایسے ہی دن کے انتظار میں اس نے اڈے پر اکا کی بالادستی قبول کی ہو یا کسی اور موقع کے انتظار میں مفاہمت کر لی ہو۔ عام طور پر ایسا نہیں ہوتا کہ اڈے پر نئے استاد کے قبضہ جمانے کے بعد پرانا استاد موجود رہے۔ بہرحال ہم اندھیرے میں تھے۔ جگل کو اڈے کی سمت ہی روشنی کی کوئی کرن دکھائی دی ہوگی جہاں سے اُسے کچھ مل سکتا تھا۔

کالتے بتا رہا تھا کہ باقی سب کو ہوٹل سے دور رکھ کے اور صرف اسے ساتھ لے کے جگل ہوٹل میں داخل ہوا۔ آغا جان اسے دیکھتے ہی سینے سے لپٹ گئے۔ کالتے نے کہا تھا کہ ان کی آنکھیں بھرائی ہوئی تھیں، ان کی طرف دیکھا نہیں جا رہا تھا کہ کہیں وہ بکھر نہ جائیں، بکھر نہ جائیں۔ جگل نے بھی انھیں سمیٹے ہی رکھا۔ خاموشی سے ان کی روداد سنتا رہا، وہی کچھ جو راستے میں زورا اور مارتی اسے بتا چکے تھے اور اس نے آغا جان سے نہ کوئی تبصرہ کیا، نہ دو لفظ تسلی کے کہے۔ تسلی و تشفی دینے کے لیے اس کے پاس تھا بھی کیا۔ آغا جان بچے نہیں تھے جو یوں ان کی سیری ہو جاتی۔ خود جگل کو بھی تسلی کی ضرورت ہوگی اور آغا جان ایسے موقع پر اپنا منصب بھولے نہیں ہوں گے۔ کالتے کے مطابق وہ سکون سے سب کچھ بیان کرتے رہے۔ ان کے ہونٹوں پر کوئی لرزش اور ان کی آنکھوں میں کوئی نمی دکھائی نہیں دی۔

جگل وہاں سے فوراً نہیں اُٹھا۔ اس نے چائے منگوائی، غسل کیا اور لباس تبدیل کرنے کے باوجود وہیں صوفے پر بیٹھا رہا۔ کالتے کو اس کی خاموشی سے بہت الجھن ہو رہی تھی لیکن جگل ایسے کس

رہ سکتا تھا۔ آغا جان کی بیان کی ہوئی روداد اس کے سوا کیا ہو سکتی تھی کہ ہم صبح صبح ہوٹل سے نکلے تھے پھر واپس نہیں آئے۔ جگل کو وہی قیاس کرنا تھا جو آغا جان نے انھیں سنایا تھا۔ مزید کسی پیچیدگی سے بچنے کے لیے اسے پہلے وجہ کا تعین کر لینا چاہیے تھا اور وجہیں دو ہو سکتی تھیں کہ ہم کسی خاص سبب، غصے یا نفرت کے باعث کسی کو مطلوب تھے یا پھر ہمارے ساتھ خود اپنی کسی کوتاہی کے سبب کوئی افتاد پیش آ گئی تھی۔ کوئی ارضی و سماوی قسم کی افتاد جس پر ہمارا بس نہ چلا ہو۔ جگل نے اسے یکسر نظر انداز کر دیا ہوگا اور پہلی ہی وجہ پر توجہ رکھی ہوگی اور اس کی روشنی میں اپنے آئندہ اقدام کے لیے مختلف امکانات پر غور کیا ہوگا۔ پہلا امکان مولوی محمد شفیق کے کسی سلسلے سے متعلق ہو سکتا تھا۔ آغا جان نے سفر کرتے کرتے اچانک جالنے، مراد آباد پھر جالنے اور وہاں سے چلنے پر ممبئی جانے کے بجائے حیدرآباد کا ارادہ کر لینے کا ذکر ضرور اس سے کیا ہوگا۔ جگل کے لیے یہ نتیجہ اخذ کرنا دشوار نہیں تھا کہ مراد آباد کے مسافر خانے سے مولوی صاحب کا کوئی نشان ہمیں ضرور ملا تھا جیسے آباد آ کے اس نشان پر ہم پہلے دن شام کو ناکام ہوئی تھی کہ پھر ہم دوسری صبح ہوٹل سے پھر نکل گئے تھے۔ لیکن یہ مولوی صاحب کے حوالے سے کئی بدگمانیوں نے جگل کے ذہن میں سر اُٹھایا ہو۔ دوسرا امکان حیدرآباد کے اڈے سے متعلق ہو سکتا تھا۔ جگل کی یادداشت سے حیدرآباد میں گزشتہ سفر کے سارے نقوش مٹ نہیں گئے ہوں گے۔ ہولا اور جگل گرو کا قصہ، شاہ کبیرے اور کالے دادا کا واقعہ۔ کیا شاہ کبیرا اڈے پھر لوٹ آیا ہے یا اڈے سے دور رہ کے ابھی تک سینے پہ داغ لیے پھر رہا ہے؟ حالانکہ یہ ایک نہایت حیران کن بات ہے کہ وہ کس منہ سے اڈے واپس آیا ہوگا۔ بازار میں اس کی واپسی ممکن معلوم نہیں ہوتی لیکن یہی بات کہ اس کے پیچھے کون ہو سکتی ہے۔ جگل نے اپنے پیچھے اڈے پر ہونے والی غیر معمولی تبدیلیوں کا امکان رد نہیں کیا ہوگا۔ اس عرصے میں اڈے پر نیا استاد آ سکتا ہے۔ نئے استاد کو تو خاص طور پرانی الجھنوں سے چوکنا رہنا چاہیے جو اچانک شہر میں وارد ہو کے شاہ کبیرے کی رسوائی کا سبب بن گئے تھے۔ وہ دوبارہ بھی کسی وقت اُسے اور اڈے پر اپنے تعینات کیے ہوئے آدمی کالے دادا کے بجائے کسی اور کو دیکھ کے برہم ہو سکتے ہیں اور نئے استاد کے لیے مسئلہ بن سکتے ہیں اور خود کالے دادا۔ آدمی کی نیت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ کوئی عجب نہیں کہ کالے دادا ہی حیدرآباد میں اُن لوگوں کی واپسی پسند نہ کرتا ہو جو اُسے اڈا بخش گئے تھے۔ کوئی بھی بات ممکن تھی۔

مولوی صاحب اور اڈے سے متعلق ان پہلوؤں کے علاوہ ایک امکان ہماری گرفتاری کا بھی ہو سکتا تھا۔ جگل نے اس پر بھی غور کیا ہوگا کہ ہم کسی انجانے معاملے میں ملوث ہو کے جیل نہ چلے گئے ہوں۔ جیل میں ہم باہر سے رابطہ رکھنے کا موقع نہیں مل سکا! ہم سے خود آغا جان، زورا اور مارتی پر ترک آنے سے قبل یہ سوچتی کی۔

حیدرآباد میں گزشتہ مرتبہ کے واقعات اور وہاں سے متعلق لوگوں کے چہرے ذہن میں تازہ کرتے ہوئے جگل کے سامنے نواب عالم تاب کا نام بھی آیا ہوگا۔ وہ شخص جو صبح اُڑن کھٹولا دستے کے عین وقت پہ اسٹیشن آ کے ہمارے رستے کی دیوار بن کے آ گیا تھا جب ہم خانم کو مستقل فیض آباد لے جا رہے تھے اور خانم نے ہمارے حق میں بلکہ اپنے حق میں فیصلہ دے دیا تھا۔ اُس رات نواب چلا گیا تھا لیکن بعد میں خانم کے اس فیصلے سے کسی بڑی غم اور رنج نے تو نواب پر غلبہ نہیں کر لیا۔ کالے دادا سمیت شہر کا کسی کو ہمارے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا کہ ہم کون تھے، کہاں سے آئے تھے اور کہاں لے گئے۔ نواب عالم تاب کے نام پر ممکن ہے جگل نے اپنے خون کی گردش میں فرق محسوس کیا ہو۔ نواب کو اس سے بھی خفا یاد ہوگا خانم کے انکار پر وہ کیسا حواس باختہ نظر آتا تھا۔ اُس کا بس چلنے لگا تھا۔

کالتے کہہ رہا تھا کہ وہ سب پہر کو ہوٹل میں آئے تھے۔ جگل شام تک خاموش بیٹھا رہا۔ اُسے آنکھ کے ناک کی سیدھ میں چلنا پڑا تھا۔ تار ملنے کے بعد ان کے ذہن میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہوئے تھے لیکن کہیں دور دور تک ان کے سان و گمان میں نہیں تھا کہ یہاں پہنچ کے انھیں ایسی ہی [illegible] تھیں جب جگل اپنی نشست سے اُٹھا۔ چند لمحے اس نے آغا جان سے دھیمے لہجے میں کوئی بات کی جسے کالتے نہیں سن سکا، پھر آغا جان کو سلام کر کے وہ ہوٹل سے رخصت ہو گیا۔ ہوٹل سے کچھ دور ایک مقام پہ شامو، ججو اور سنگرام اُن کے منتظر تھے۔ مارتی کو جگل نے ہوٹل میں چھوڑ دیا اور زورا کو ساتھ لے لیا تھا۔ سب کو اپنا تعاقب کرتے رہنے کی ہدایت دے کے وہ آگے ہو گیا۔ اس کا رخ شہر کے اندرونی علاقے کی طرف تھا۔ کالتے اس کے ساتھ تھا۔ جلد ہی وہ تھانے کی عمارت کے نزدیک پہنچ گئے۔ جگل نے اپنے پیچھے آنے والوں کو اشارے سے وہیں روک دیا اور تھانے میں داخل ہو گیا۔

تھانے کے ذکر پہ مجھے حیرت ہوئی۔ کالتے کے بقول وہ بھی شش و پنج میں پڑ گیا تھا لیکن اس نے جگل سے کوئی استفسار نہیں کیا اور چپ چاپ اس کے ساتھ چلتا رہا۔ جگل اندر ہی میں بیٹھے ہوئے حوالدار محرر کے پاس جا کے ٹھہر گیا اور اس نے کہا کہ ہم لوگ فلاں آئے ہیں۔ کوئی بیس دن پہلے ہمارے دو آدمی یہاں شہر میں پہنچے تھے۔ گھر سے نکلنے کے بعد ان کی کوئی خیر خبر ہمیں معلوم نہیں ہو سکی۔ ہم نے اسٹیشن پہ پان سگریٹ کی ایک دکان سے اُن کے یہاں آنے کی

تصدیق ہو چکی ہے۔ اس کے بعد وہ دوبارہ دکھائی نہیں دیے۔ انھیں چھ سات دن میں واپس گھر پہنچ جانا تھا اور اتنے دن گزر جانے کے بعد اب تک وہ نہیں پہنچ سکے ہیں۔ حوالدار نے اس کی بات توجہ سے سنی اور کوئی ایک سوال کیے۔ جھل نے گم شدگان کے نام مختلف بتائے۔ عمریں بھی بیری اور بیرو کی نہیں تھیں۔ وضع قطع بھی کسی قدر مختلف تھی۔ حوالدار کچھ سوچتا رہا اور اس نے سرسری طور پر روزنامچہ الٹ پلٹ کے دیکھا۔ اس دوران جھل نے کہا کہ اس کے کھو جانے والے عزیز مزاج کے ذرا تیز واقع ہوئے ہیں، یہاں ریاست کے طور طریق سے ایسے واقف نہ تھے، اس لیے اُسے اندیشہ ہے کہ کہیں اُن سے کوئی ایسی ویسی حرکت تو سرزد نہیں ہو گئی ہے۔ حوالدار ایک دردمند آدمی تھا۔ اس نے اس سے ہمدردی ظاہر کی، پوچھا، کہاں ٹھیرے ہو۔ جھل نے کہا، اسٹیشن سے ادھر ادھر پوچھتے ہوئے یہاں آ گئے ہیں۔ اب جا کے نام پلی کی کسی سرائے میں ٹھیر جائیں گے۔

وہ عابد شاپ روڈ کے تھانے کا علاقہ تھا۔ وہاں سے نکل کے جھل بازار آگے بڑھ گیا۔

کانتے کی زبانی یہ سب سن کے میری سمجھ میں کچھ آیا، میری پٹ پٹاتی نظریں دیکھ کے اس کے ہونٹوں پر پہلی بار مسکراہٹ ابھری۔ مصنوعی ہوئی بجھی ہوئی سی مسکراہٹ۔ اس نے بتایا کہ باقی فاصلہ انھوں نے اکٹھے کے زینے طے کیا اور اندھیرا گھرے زیادہ وقت نہیں ہوا تھا جب وہ ایک دوسرے تھانے پہنچے۔ مجھے فوراً اس تھانے کا گمان ہوا جہاں مجھے اور بیرو کو لے جایا گیا تھا لیکن وہ کوئی دوسرا تھانہ تھا اور اتنا بڑا نہیں تھا۔ جھل نے وہاں بھی وہی کہانی دہرائی اور وہاں سے بھی اُسے وہی جواب ملا۔ اس وقت اس کا شبہ کسی حد تک دور ہو گیا ہوگا کہ ہم شہر میں کسی بڑے حادثے سے دوچار نہیں ہوئے ہیں ورنہ تھانے میں اس کا چرچا ضرور ہوتا لیکن کوئی چھوٹا موٹا واقعہ بھی ہو سکتا ہے جو کسی ایک علاقے کے تھانے تک محدود رہا ہو۔ یقیناً یہی کچھ سوچ کے جھل نے تیسرے تھانے کی چار دیواری میں قدم رکھا ہوگا۔ پہلے دو تھانوں میں جہاں اُس کی کوئی الجھن دور ہوئی تھی وہیں بہت سی الجھنیں بڑھ بھی گئی ہوں گی۔ تیسرے تھانے میں اس نے اپنی روداد میں کسی قدر ترمیم کی اور متعلقہ حوالدار سے کہا کہ وہ اپنے دو آدمیوں کی گم شدگی کی رپورٹ کرانا چاہتا ہے۔ حوالدار نے اسے چونک کے دیکھا اور پہلی دفعہ کانتے کے بقول اس کے کان کھڑے ہوئے۔

میں نے اپنی بے چینی خود تک محدود رکھی اور کانتے سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ موسیٰ ندی کے پاس والا تھانہ تو نہیں تھا۔ میری مداخلت سے وہ اٹک سکتا تھا۔ کہنے لگا، حوالدار نے وضاحت چاہی۔

"کیسے آدمی؟"

جھل نے کم و بیش ہمارا وہی حلیہ اُسے بتایا جو پہلے دو تھانوں میں بتا چکا تھا۔ حوالدار نے روزنامچے کی ورق گردانی کی اور بولا، ایسے آدمیوں کا کوئی اندراج گزشتہ بیس دن میں نہیں ہے۔ جھل نے حجت کی اور کہا کہ ممکن ہے پولیس کے خوف سے انھوں نے اپنے صحیح نام نہ بتلائے ہوں۔ اس نے حوالدار سے اپنی پریشانی کا اظہار کیا اور کہا کہ صرف انھی کی تلاش میں اس نے اتنی دور کا سفر کیا ہے۔ جھل نے اس سے درخواست کی کہ اگر وہ اپنا کچھ وقت صرف کر کے گزشتہ دنوں کے روزنامچے پر تفصیل سے نظر ڈال لے تو ایک پردیسی کے ساتھ احسان کرے گا۔ حوالدار جز بز ہوا، منھ بنانے لگا۔ جھل نے کہا کہ وہ دو آدمی اُسے بے حد عزیز تھے، ان کے لیے وہ شہر کے بڑے سے بڑے حاکم کے پاس فریاد کے لیے جا سکتا ہے اور روپے پیسے کے خرچ کی اُسے اتنی پروا نہیں ہے۔ اُسے اپنے ان دو عزیزوں کا حال جاننے کی فکر ہے اور بس۔ روپے پیسے کا ذکر جھل نے جان بوجھ کے کیا ہوگا۔ اس پر حوالدار نے سر تا پا ان دونوں کا جائزہ لیا اور کھسیا کے بولا: "ہم کو یاد نہیں کہ اس درمیان ایسے آدمی ادھر لائے ہوں جیسا حلیہ تم لوگ بولتے۔" تاہم جھل کے گزارشانہ اطوار پر اس کا دل پسیجا اور اس نے ناگوارانہ توجہ سے دوبارہ روزنامچہ دیکھنا شروع کیا۔ ابھی اس نے تین چار ہی صفحے پلٹے ہوں گے کہ رک گیا اور کھسیانا ہوا، بولا: "دو آدمی تھے؟"

جھل نے جلدی سے گردن ہلائی۔ "ہاں ہاں صاحب! کیا وہ ادھر آئے تھے؟"

حوالدار نے تذبذب سے جواب دیا: "دو آدمی تو ہم کو یاد پڑتے ہیں لیکن..."

جھل نے اس کی بات کاٹ کے تیزی سے پوچھا: "آئے تھے کس معاملے میں آئے تھے صاحب؟"

"لیکن جو حلیہ تم بولتے ہو، ویسا کوئی آدمی نہیں تھا اور اس بات کو اتنے دن نہیں گزرے جتنے تم بولتے ہو۔ یہ کوئی سات آٹھ دن پہلے کی بات ہے۔ دو آدمی تھے، ایک نوجوان دوسرا بڑی عمر کا۔ میاں سپاہی پکڑ کے لائے تھے۔" اس نے جھل کو بتایا کہ یہ تقریباً آدھی رات کا واقعہ ہے۔ رات ہو گئی تھی۔ وہ بھی ڈیوٹی پر تھا اور اس نے ان لوگوں کو اچھی طرح دیکھا تھا۔ پھر اس نے فوراً صفحے پلٹے اور کچھ دن پہلے کی رپورٹ دیکھنے لگا۔ دیکھتا رہا اور سر ہلا کے بولا: "تم بھائی وہ لوگاں جیسا تم بولتا ہے ایسا حرکت کے نیئں تھا۔"

"کیا ہم ان سے مل سکتے ہیں؟" جھل نے اضطراب سے کہا۔

"وہ اب ادھر کہاں ہیں۔" حوالدار نے بیزاری سے بتایا۔ "وہ تو اسی رات چلے گئے تھے۔"

"اسی رات چلے گئے تھے؟"

"قسمت کے اچھے تھے۔" حوالدار نے کہا۔ "جلدی خلاصی ہو گئی۔ شرم پاروں کی ہم تم سے بولیں، ہم کو ایسے لوگوں سے کم واسطہ پڑتا ہے۔ ایک تجربہ جیان والا آدمی تھے۔ بہت سے اپنی آنکھاں سے دیکھنے والے بھی یہی بولتے ہیں کہ دیکھتے دیکھتے لڑکے چار آدمیوں کو کھینچ کے رکھ دیے تھے۔" کانتے نے مجھے اسی کے لہجے میں بتانے کی کوشش کی اور کنکھیوں سے مجھے دیکھا۔ میں اپنے ہی اور تنک میں پڑ دیکھ کے حوالدار کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی اور وہ ہمیں یقین دلانے کے انداز میں بولا کہ موسیٰ ندی کے کنارے چار آدمیوں نے انھیں گھیر لیا تھا۔ چار تھے، مگر نکل آئے تھے۔ انھوں نے اُن چاروں کو تو ایسا پیٹا کہ ایک کو زخمی بھی کر دیا اور ہجوم سے صاف نکل گئے۔ ادھر موسیٰ ندی پر ساری خلقت جمع ہو گئی تھی۔ اس نے جھل سے کہا کہ کچھ دیر اور ہو جاتی تو وہ دونوں پولیس کے ہاتھ بھی نہیں پڑتے لیکن اطلاع ملنے پر سرِ دست پولیس پہنچ گئی تھی، اُسے زیادہ دوڑ بھاگ نہیں کرنی پڑی۔ یہاں تھانے میں آ کے بھی وہ زور آوری دکھاتے رہے، مگر ان گناہ گاروں نے سلاخوں کے پیچھے بڑے بڑے رستم بچھتے دیکھے ہیں۔ ایک شہری کو رہا تو لگا تھا اس لیے انھیں نہیں چھوڑا جا سکتا تھا اور پھر سب انسپکٹر فیروز کو ان پر شک ہو گیا تھا کہ ایسی چاقو بازی اور زد و کوب کرنے والوں کا تعلق جیسا کہ وہ کہتے ہیں تجارت سے نہیں ہونا چاہیے۔ سب انسپکٹر کا شبہ درست معلوم ہوتا تھا لیکن ان کی یہ بات بھی سب کے جی کو لگتی تھی کہ چار آدمیوں نے روپے کی وجہ سے ان پر حملہ کیا تھا۔ ان کے بیان کے مطابق ان کا سامان بھی وہیں موسیٰ ندی پر رہ گیا تھا۔ کہتے تھے کہ صندوق میں بہت سے روپے تھے۔ روپے ان کی جیبوں میں بھی تھے اور خاصی معقول تعداد میں۔ حوالدار نے کانتے اور جھل کو وہی بتایا جو چالیسے ساتھ تھانے میں پیش آ چکا تھا۔ بتاتے بتاتے وہ یک لخت ٹھیر گیا۔ شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ اتنی تفصیلات کے ساتھ ان سے یہ سب کچھ کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے چنانچہ جھل نے کریدا کہ پھر آخر وہ لوگ چھوٹ کیسے گئے تو حوالدار ناراض ہونے لگا۔

"ہم کو تب ہے صاحب کہ وہ اپنے ہی آدمی تھے۔" یکایک جھل نے ڈوبے لہجے میں کہا۔

"کیا؟ کیا بولتے ہو تم لوگاں!" وہ ایک دم اکھڑ گیا اور درشتی سے بولا: "ہوگا تو پھر چلا گیا۔ اب وہ ادھر نہیں ہے۔"

"ہم یہی پوچھتے ہیں صاحب کہ آخر وہ کیسے چلے گئے؟ آپ بولتے ہو کہ قسمت نے ان کا ساتھ دیا، ان کی جلدی خلاصی ہو گئی۔"

"دیکھو، ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے جو آپ تھارے ساتھ مغز کھپائے۔ کسی دوسرے تھانے میں جا کے دیکھو اور رپورٹ لکھوانی ہے تو ہم کو بولو۔"

جھل نے اس سے گزارش کی کہ وہ پہلے ہی دو تھانے جا کے پوچھ آیا ہے۔ جب اس نے اتنی مہربانی کی ہے، اب تک اتنی ہمدردی سے پیش آیا ہے تو اب اچانک اُسے کیا ہو گیا ہے۔ کیا اس کی شان میں اُن سے کوئی گستاخی ہو گئی ہے۔ باقی کچھ بتلانے میں کیا حرج ہے۔ کچھ اور نہیں تو اُن کی تسلی ہو جائے گی۔ جھل سے زری لوگ ہیں۔ حوالدار اس کچھ جھجک سے پیا اور بھڑک گیا۔ نہایت تندی سے کہنے لگا، اس نے دوبارہ بیرا اور بیرو کا حلیہ دہرایا۔ یہ جھل کے بتائے ہوئے حلیے سے قطعی مختلف تھا۔ بس عمر کی ایک قریبی مطابقت مشترک تھی۔ وہ غصے میں جھل سے پوچھنے لگا: "ایسا ہی تھا تمھارا بڑا آدمی؟"

جھل نے انکار میں گردن ہلائی۔ وہ کسی قدر نرم پڑ گیا اور بڑبڑاتے ہوئے بولا: "اور ہم کیا بولتے ہیں، جب لوگاں ہی وہ نہیں تھے تو آگے جان کے تم کیا کرو گے۔" جھل خاموش رہا لیکن اٹھا نہیں۔ حوالدار کا پارا ٹھیر گیا۔ اس نے از خود بتانا شروع کیا کہ "وہ ایک گم سم دوسرا لڑکاں تھا بابا۔" نیچی آواز میں اُن سے بات کرنا نہیں آتا تھا۔ جھل اور کانتے کی خاموشی پر اس کا لہجہ زیادہ نرم ہو گیا۔ اس نے کہا، رات کو جب بڑے انسپکٹر ذکی میاں تھانے آئے تو انھیں ان کے سامنے پیش کیا گیا۔ اتفاق سے اُس وقت ذکی میاں کے کوئی معزز دوست بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ حوالدار نے انھیں دوسری یا تیسری ہی بار تھانے میں دیکھا تھا۔ ان کا اصل نام بھی اُسے اسی رات معلوم ہوا۔ نواب صاحب فیض علی خاں۔ دونوں ملزموں کا بیان انھوں نے بھی سنا اور بہت متاثر ہوئے۔ ان پردیسیوں کی کہانی سچی لگتی ہے، ان کو آزاد ہی کا کوئی تمغہ ملنا چاہیے۔ پھر انھوں نے ہچکچاتے ہوئے ذکی میاں سے کہا، جی چاہتا ہے کہ انھیں چھوڑ دیا جائے۔ ذکی میاں نے معذرت کر لی تھی لیکن نواب صاحب ضمانت لینے پر آمادہ ہو گئے۔ ذکی میاں اپنی مرضی کے آدمی ہیں، اپنے معاملات میں کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتے لیکن نواب صاحب کی بات اور تھی۔ کچھ ان سے اپنے تعلق کا پاس تھا اور کچھ نواب صاحب بڑے آدمی تھے، بڑی سی موٹر میں آئے تھے۔ لباس تک سے امارت جھلکتی تھی۔ ذکی میاں خاموش ہو گئے۔ "دیکھا تم نے!" حوالدار نے سر اٹھا کے کہا، "بڑے لوگاں کی بڑی باتاں۔ ابھی ایسا دل والا بھی دنیا میں پڑا ہے۔ اجنبی کا ضمانت لے لیا۔" پھر وہ ٹھنک کے کہنے لگا: "اب تم بولو گے، ہم کو نواب صاحب کا اتا پتا بولو۔"

"نہیں صاحب! ہم آپ کو کچھ نہیں بولیں گے۔" جھل نے ایک ثانیے کے سکوت کے بعد بوجھل لہجے میں کہا۔ "پھر آپ ٹھیک ہی بولتے ہو، اپنے آدمی ایسے نہیں تھے۔"

کانٹے کا خیال تھا کہ جگل حوالدار کو انسپکٹر زکی میاں سے ملنے کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کرے گا لیکن وہ اچانک اٹھ گیا۔ اس نے حوالدار کا شکریہ ادا کیا اور جیب سے ڈبے نکال کے مٹھی بند کر کے حوالدار کو دینے چاہے۔ حوالدار نے بس پلک جھپکنے کا تامل کیا پھر صاف انکار کر دیا۔

تھانے سے نکل کے وہ دونوں رکشا میں بیٹھ گئے۔ مزورا، شامو، جمرو، بنگو وغیرہ کچھ تھانے کے دروازے پر نظر لگائے ہوئے تھے۔ انھیں دیکھتے ہی وہ بھی رکشوں میں بیٹھ گئے۔

جگل کے لیے مختلف امکانات میں سے کوئی ایک متعین کرنا نہایت دشوار تھا۔ وہ یہی کر سکتا تھا کہ پہلے تمام امکانات الگ الگ کرے پھر سب سے پہلے مزرا اور سامنے کا امکان مستول کرے۔ مولوی صاحب کے حوالے سے ہماری گمشدگی کا کوئی امکان اس نے مسترد نہیں کیا ہوگا لیکن اس سمت کوئی قدم اٹھانے کے لیے اسے کوئی ایسا نام و نشان معلوم ہونا ضروری تھا جس کے باعث ہم نے یکا یک حیدرآباد آنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ جگل کو وہ نام و نشان مرادآباد کے مسافر خانے ہی سے مل سکتا تھا۔ مرادآباد بہت دور تھا۔ وہاں جانے اور واپس آنے کا وقت صرف کرنے سے پہلے جگل کو دوسرے امکانات کے سلسلے میں اپنا تردد دور کر لینا چاہیے تھا اور اس کی یہی صورت ہو سکتی تھی کہ وہ یا تو سیدھا اڈے کا رخ کرے یا پھر نواب عالم صاحب کی حویلی کا دروازہ کھٹکھٹانے تھانے پہنچے یا ادھر ادھر گھوم کے یہیں پیش آنے والے کسی ناقابل قیاس حادثے کی سن گن لینے کی کوشش کرے۔ آپاجان سے ساری روداد سننے کے بعد اس کے ذہن سے یہ حقیقت چھپی نہیں رہی ہوگی کہ ہمیں گم کر دینے والے اڈے کے پختہ اور حیثیت کے مضبوط لوگ ہی ہو سکتے ہیں۔ گم ہو جانے والوں کے ساتھیوں کے ردِعمل سے اچھی طرح باخبر اور اس کا جواب دینے کے لیے ہر طرح مستعد۔ پیسے سے متعلق تو جگل کو ایسی کوئی خوش فہمی نہیں ہوگی لیکن پیسے کے ساتھ بھی کے اڈے کا سب سے بڑا دادا بیرو بھی تھا۔ پیسے کے ساتھ اسے بھی بیل مرادآباد جگل کر دینا کوئی آسان کام نہیں اور پھر اتنے دن گزر جانے کے بعد ہماری طرف سے مسلسل سکوت۔

ہوٹل سے چلتے وقت جگل کے سر میں بے شمار جالے تنے ہوں گے۔ کچھ شواہد اور نشانیوں کے تعلق میں اس کے لیے اڈے جانا بہتر ہو سکتا تھا اور یہی احتیاط نواب عالم صاحب کی حویلی کے لیے ضروری تھی۔ وہاں سے کچھ نہ حاصل ہو سکنے کی صورت میں اور گڑبڑ پڑ سکتی تھیں۔ وہ کانٹے کو بھی اڈے بھیج سکتا تھا۔ اسے یہاں کوئی نہیں جانتا تھا مگر کانٹے کو اڈے کے لڑکوں سے ننھا سا ہونے اور صحیح صورت حال تک پہنچنے میں وقت لگ سکتا تھا۔ وہ لڑکوں کی نظروں میں بھی آ سکتا تھا اور اس کی ذرا سی غلطی کسی اور بڑے حادثے کا سبب بن سکتی تھی۔ جگل نے ادھر ادھر گھومنے اور ہوٹلوں میں تیر چلانے کا ارادہ اسی لیے موقوف کیا ہوگا کہ اسے اپنی بھی ہر ممکن احتیاط درکار تھی۔ جن لوگوں نے مجھے پہچان لیا تھا ان کی نگاہوں میں جگل کے خد و خال بھی محفوظ ہوں گے۔ جنھیں اپنے سر کی فکر نہیں ہوتی اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ اپنا سر بچا کے نہ چلیں۔ ہوٹل میں سہ پہر سے شام تک بیٹھے رہنے کا ایک سبب اندھیرے کا انتظار بھی ہو سکتا تھا۔

پھر تھانا ہی ایک راستہ رہ جاتا تھا۔ بازار یا آبادیوں ہی سے ہمیں کہیں لے جایا گیا ہوگا ورنہ ہم ایسے جانے والے نہیں تھے۔ ہم نے یقیناً کوئی مزاحمت بھی کی ہوگی اور اس کا کسی تھانے میں اندراج بھی ممکن تھا۔ آپاجان نے اسے بتایا ہوگا کہ شہر سے چھپنے والے تمام اخبارات پر وہ مسلسل نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔ کوئی ایسا ویسا واقعہ ہمارے ساتھ پیش آتا تو اخبار میں خبر ضرور آتی لیکن اخبار میں بہت سی خبریں شائع بھی تو نہیں ہو پاتیں۔ تھانے کی چار دیواری اور روزنامچے تک محدود رہتی ہیں۔ بسا اوقات تو روزنامچوں سے بھی دور ہی رہتی ہیں۔ جگل کی طرح آپاجان، زورا اور ماسٹی بھی تھانے جا سکتے تھے۔ زورا کے کہنے کے مطابق آپاجان تو وہاں جاتے جاتے لوٹ آئے تھے۔ انھوں نے اچھا ہی کیا۔ اول تو انھیں وہاں جا کے جگل کے لہجے میں بات کرنی چاہیے تھی، دوسرے تھانے سے حاصل ہونے والی معلومات کے بعد بھی انھیں جگل کی ضرورت پڑتی۔

موسی ندی کا پل عبور کرنے کے بعد پتھر گٹی، پھر چبوترہ کمان، شمشیر بازار اور اس سے ذرا آگے بڑھ کے چار مینار کا علاقہ تھا۔ یہاں وہ رکشا سے اتر گیا۔ چند قدم پیدل چلنے کے بعد وہ مکہ مسجد کے نزدیک آ گئے۔ زورا، شامو، جمرو، بنگو بھی ان کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ مکہ مسجد کے عین سامنے ایک ہوٹل میں وہ سب یک جا ہو گئے۔ کسی کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ ہوٹل میں آ کے بیٹھ جائے گا۔ ہوٹل میں گنجائش کم تھی لیکن کسی طرح سکڑ سمٹ کے انھوں نے تپائیوں پر نشست بنالی تھی۔ جگل نے ان کے لیے کھانا منگوا لیا۔ معمولی سا کھانا۔ دال اور چپاتیاں حالانکہ ہوٹل والے نے مختلف کھانوں کی ایک بڑی فہرست بتائی تھی۔ مسلسل ہی لکھتے اور ان میں ایک پیالی چائے کے سوا انھوں نے صبح سے کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ کھانے پینے کا ہوش کسے تھا۔ وہ سب جگل کا منہ تک رہے تھے۔ کانٹے نے کئی بار ارادہ کیا کہ کوئی بات چھیڑے مگر جگل کا سوچتا ہوا چہرہ دیکھ کے اس کی زبان اٹک اٹک گئی۔ تھانے میں سب کچھ اس نے اپنے کانوں سے سنا تھا پھر بھی اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے بہت کچھ سننے سے رہ گیا ہو۔ وہ جگل سے

بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ کھانا آ گیا۔ سب گم سم ٹکٹکی باندھے بیٹھے تھے۔ جگل کے شانے پر انھوں نے جیسے تیسے کھانا ختم کیا۔ ان کا کھانا بھی سب کی خوراک سے بہت کم تھا۔ پھر بھی بچ گیا۔ کھانے کے بعد اس نے چائے منگوائی اور بیڑی سلگا کے ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔ ان سب کو بہت گھٹن ہو رہی تھی۔ شامو دل ہی دل میں گھٹنے لگا کہ اس وقت استاد کی آنکھوں میں جیسے خون بھرا ہوا تھا۔ اس نے آدھی بیڑی پی پھر کے پھینک کر اٹھ کھڑا ہوا۔

سامنے چار مینار کے گھڑیال میں دس بج رہے تھے۔ ہوا خنک تھی۔ لوگ دکانیں بند ہو جانے کے باوجود سڑکوں پر آمد و رفت ابھی کم نہیں ہوئی تھی۔ کانٹے کہہ رہا تھا کہ اسے جگل کی خاموشی زہر لگ رہی تھی۔ طرح طرح کے اندیشے اس کے سینے میں بھنبھنا رہے تھے۔ کانٹے کی بے تابی کا اندازہ میں اچھی طرح کر سکتا تھا۔ پھر اس کے لہجے میں بھی اس کا اظہار ہوتا تھا۔ خود مجھے یہ سوچ سوچ کے دھڑکا سا لگا ہوا تھا کہ تھانے سے نکل کے جگل نے آخر کس طرف جانے کا ارادہ کیا ہوگا۔ جگل چار مینار سے آگے نہیں گیا۔ وہیں رکشے خالی مل گئے تھے۔ کانٹے بھی اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ باقی چاروں دوسرے رکشوں پر بیٹھے۔ کانٹے نے مجھے بتایا کہ رکشا میں بیٹھتے ہوئے جگل نے جب منزل بتائی تو اس نے جگہ کا نام صاف خود بھی سنا لیکن اسے خیال نہیں تھا کہ وہ بازار کا علاقہ ہوگا۔

"محبوب کی مہندی؟" میں نے تیزی سے کہا۔

"ہاں! وہ ادھر ہی آیا تھا۔" وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔

میری رگوں میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ کانٹے کہتے کہتے رکا۔ وہاں رکشا سے اترنے پر اس کا ماتھا ٹھنکا تھا۔ پہلے وہ سمجھا تھا کہیں وہ خاں صاحب یہاں نہ رہتے ہوں جن کا ذکر حوالدار نے جگل سے کیا تھا۔ اس کے خیال میں شاید اسی لیے جگل نے ان کا اتا پتا جاننے کی جستجو نہیں کی تھی کہ وہ پہلے سے ان سے واقف ہوگا۔ اگر خاں صاحب کی بات غلط تھی یا خاں صاحب نے انکار کر دیا یا انھوں نے کوئی اور؟ ... کانٹے کہہ رہا تھا کہ اس کا سر گھوم رہا تھا لیکن رکشا سے اتر کے اس نے جب بازار کا علاقہ دیکھا تو اسے خود بخود کوئی ایک طرح کی تسلی نصیب ہوئی۔ آنے والے لمحوں کی بو محسوس ہو گئی تھی اور اس نے جگل کا بایاں شانہ بار بار اوپر اٹھتا دیکھا تھا۔ اس نے کبھی غور نہیں کیا لیکن کانٹے کے کہنے کے مطابق کسی خاص وقت میں جگل کا بایاں شانہ پھڑکنے لگتا تھا۔ گلی میں داخل ہوتے ہی جگل نے پیچھے سے اس کی گردن کی چٹکی بھری اور اس کا سارا جسم جھنجھوڑ دیا۔ کانٹے کے لیے یہ بھی جگل کی طرف سے آنکھیں کھلی رکھنے کا اشارہ تھا تاہم اس کی آنکھیں بھر آئیں اور اس کا جی چاہا کہ وہ جگل سے لپٹ کے رونے لگے مگر جگل نے آگے بڑھ کے دھکیل دیا۔ اس نے باقی چاروں کو ساتھ آنے کی ہدایت نہیں دی تھی اس لیے وہ اس کے پیچھے ہی چلتے رہے۔ گلیوں میں اس وقت بہت ہجوم تھا۔ سارا علاقہ روشن تھا۔ بازار کی تیزی کا وقت تھا۔ جگل کہیں ٹھیرے بغیر بڑھتا گیا۔ راستے اسے معلوم ہی تھے۔ بعض گلیوں سے فاصلہ کم ہو جاتا تھا لیکن وہ تنگ گلیوں میں گھسنے کے بجائے بڑے راستے سے گزرا۔ اسی طرف سے جگل سے ہمیں ادھر گزرتے تھے۔ ایک چوک کی مختلف ہوٹلوں اور چائے خانوں کی تپائیوں پر اڈے کے لڑکے اور دلال اکثر بیٹھے رہتے تھے۔ جگل ابھی اس چوک سے دور تھا کہ ایک دلال اسے دیکھ کے چونک پڑا اور دوسرے ہی لمحے وہ ایک طرف بھاگ جانا چاہتا تھا۔ جگل نے فوراً دو قدم آگے بڑھ کے اس کے کندھے پر ترچھا ہاتھ مارا۔ وہ اڈے ہی سے وابستہ کوئی آدمی تھا۔ بلبلاتا ہوا وہ زمین پر بیٹھ گیا۔ جگل ہی نے بال پکڑ کے اسے اٹھایا اور کہا۔

"کدھر ہے تیرا دادا؟"

اس کی آنکھیں باہر نکل آئیں۔ گھگھیاتے ہوئے بولا۔ "وہ ادھر... وہ ادھر..." اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔

"اس حرام کے جنے کو رہا کر کے چل کر اب ادھم برپا کرنے کیا سمجھا؟" جگل نے اسے گردن سے اٹھا کے زمین پر پٹخ دیا۔ وہ اٹھ کے ایسی تیزی سے بھاگا کہ ذرا آگے ٹھوکر کھا کے گرتے گرتے بچا۔ فی الفور اٹھ کے دوڑنے لگا اور دیکھتے دیکھتے اوجھل ہو گیا۔ گلی کے لوگ متوجہ ہو گئے تھے لیکن انھیں آگے جاتے دیکھ کے خاموش بنے۔ انھوں نے ان کی راہ میں رکاوٹ بننے کی غلطی نہیں کی۔ کچھ آگے چل کے کانٹے نے دیکھا کہ دو آدمی لپکتے ہوئے ان کی طرف آ رہے ہیں۔ قریب پہنچ کے جگل اور کانٹے پر ان کی نظر پڑی تو وہ وہیں ٹھٹک گئے، جہاں تک پہنچے تھے وہیں کھڑے ہو گئے۔ جگل اور کانٹے لمحوں میں ان تک پہنچ گئے تھے۔ دونوں آدمیوں کے ہاتھ میں بندھا تو چھپے ہوئے تھے۔ انھوں نے ظاہر سامنے نہیں کیے۔ جگل کو ایک نظر غور سے دیکھا پھر آنکھیں چرانے لگے۔ ضرور انھوں نے جگل کو پہچان لیا تھا۔ جگل ان کے سامنے ایک لمحے بے حد جھکولا اور پھر ایک دم اس نے دونوں کے بال پکڑ کے ان کے سر ٹکرا دیے۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ گلی چیخوں سے گونج اٹھی۔ پھر بھی ان کے ہاتھوں میں رنج کے تھے۔ چلتے کی زبان نکلے سے بولا، ہم آ رہے تھے۔

"واہ واہ!" دونوں کانپتے ہوئے جگل کے پیروں پر گرے اور اس کی ٹانگوں سے چمٹ گئے۔ جگل کا پیر ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ کانٹے نے انھیں الگ کرنا چاہا لیکن جگل نے ان کی ٹھوڑیوں میں ہاتھ ڈال کے انھیں جھٹکا دے کے اٹھایا اور ادھر ادھر دھکیل دیا۔ "مجھے جانتے ہو کہ نہیں؟" اس نے جھنکار دار آواز میں انھیں گھورتے ہوئے پوچھا۔

اپنی ماں کا جنا ہے تو اُدھر ہی بیٹھا رہ، ہم آ رہے ہیں۔"

انھوں نے جو بڑبڑاتے ہوئے خود کو سنبھالے کے جنجل کا حکم سنا اور سرپٹ اُسی طرف بھاگ کھڑے ہوئے جدھر کالنتے اور جنجل کا رُخ تھا۔ وہ دونوں گلی میں بہت سے راہ گیروں کی نظروں میں آ گئے۔ بالاخانوں سے لوگ جھانکنے لگے تھے لیکن کالنتے اور جنجل سب سے بے پروا راستہ طے کرتے رہے۔ اُن کی رفتار نہ زیادہ تیز تھی، نہ اتنی سست۔ چوک میں اُن کے پہنچنے سے پہلے اُن کی اطلاع پہنچ گئی تھی۔ ہوٹل کے سامنے پڑی ہوئی تپائیاں خالی تھیں، اور گرد و نواح افراتفری سی چھائی ہوئی تھی۔ جنجل کو دیکھ کے دلوں میں سناٹا سا چھا گیا۔ تپائیوں کے پاس اڈے سے متعلق کئی آدمی مستعد کھڑے ہوئے سے لپٹے تھے، مگر وہ آگے نہیں بڑھے۔ جنجل خود اُن کے بیچ میں جا کے ٹھیرا اور کسی ایک کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ آدمی رُکا، جھجکا، پھر آہستہ سے اُس کے پاس چلا آیا: "ان سب کو بول کے اپنے دادا کے گئے چلے جائیں۔ ابھی ان کی آس اٹکائی گئی ہے کہ ضرورت پڑ سکتی ہے۔" جنجل کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ رُکا اور تپائی پر بیٹھ کے اس نے اسی آدمی کو ایک گلاس پانی لانے کا حکم دیا۔

وہ اپنے ساکت و جامد ساتھیوں کی طرف دیکھتا ہوا ہوٹل والے کی طرف پہنچا۔ ہوٹل والے نے بھی سن لیا تھا اور شاید جنجل کو پہچان لیا تھا۔ وہ پانی خود لایا اور جنجل کو سلام کرنے لگا۔ "چائے لاؤں دادا؟" اُس نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

"نہیں، ابھی پان کھلاؤ پہلوان! چائے پینے بعد میں آئیں گے۔"

تپائی پر بیٹھے بیٹھے اُس نے پانی پیا۔ دکان والا دوڑتا ہوا پان کی دکان پر گیا اور دو گلوریاں طشتری میں رکھ کے لے آیا۔ زورا، جبرو، شامو اور ٹنگو قریب ہی ایک دوسری پان کی دکان پر ٹھیرے ہوئے تھے۔ جنجل نے جیب سے نوٹ نکال کے ہوٹل والے کی طرف بڑھایا۔ اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ نوٹ واپس جیب میں ڈال کے جنجل اٹھ گیا اور اِدھر اُدھر نگاہیں گھماتے ہوئے بولا: "تم اُدھر ہی کھڑے رہو گے کیا؟ اپنے دادا کا دیدار کرنے نہیں چلو گے؟"

جنجل نے پھر مڑ کے اُن کی طرف نہیں دیکھا۔ چوک سے کوئی گلی ہی اڈے کی جانب جانے والی گلی تھی۔ وہ اور کالنتے اُسی میں مڑ گئے۔ کچھ دور جانے کے بعد کالنتے کو احساس ہوا کہ وہ اکیلے نہیں ہیں۔ زورا، جبرو، شامو اور ٹنگو کے علاوہ بھی کچھ آدمی اُن کے پیچھے آ رہے تھے۔ تنگ گلی کے نکڑ پہ انھیں وردی پوش سپاہی بھی دکھائی دیے۔ کالنتے کو ایک خدشہ بھی لاحق تھا کہ اگر کہیں پولیس نے اُن کی راہ میں کسی طور مزاحم ہونے کی کوشش کی تو خواہ مخواہ دیر لگ جائے گی، لیکن نہ تو گلی میں ایسا شور و شغب تھا، نہ دنگا فساد۔ ویسے بھی پولیس اڈے کے لوگوں سے اسی وقت اُلجھتی ہے جب کوئی چارہ نہ ہو یا انتظامی

اُن کا اندیشہ ہو۔ ایسے موقعوں پر بھی پولیس تب ہاتھ بڑھاتی ہے جب اُسے خاصی نفری ساتھ رکھنے کا اختیار ہو۔ اڈے والوں میں سے کسی کی طرف سے پولیس کو متوجہ کرنے کا امکان بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ اڈوں کے لوگ پولیس کو اپنے معاملات سے آخر وقت تک بے تعلق رکھتے ہیں۔ پولیس کو اُلجھانے کا مطلب خود بھی اُلجھنا ہے اور پھر اڈے کس کی ضرورت ہے۔ پولیس کو بیچ میں ڈال کے آئی بلا ٹال جا سکے تو یہ نہایت عارضی حل ہے۔ آڑ بار بار کام نہیں آتی۔ وہی لوگ چھوٹ کے آ جائیں تو پھر بلا بن کے سامنے آتے ہیں۔ زورا نے درمیان میں بتایا کہ انھیں دیکھ کے سپاہی چوکنے تو ضرور تھے لیکن وہیں سے کسی دوسری طرف کو گئے۔ اس کے علاوہ وہ خود بھی اس اثنا میں آگے بڑھ کے اُن کی نگاہ سے اوجھل ہو گئے۔ زورا کے بیان کے مطابق وہ اور جبرو وغیرہ ضرورت پڑنے پر پولیس کا دھیان بٹانے کے لیے پیچھے ہر طرح مستعد تھے۔

لیکن کالنتے کا خدشہ بھی بے سبب نہیں تھا۔ زورا اور جبرو وغیرہ وہ سب کچھ نہیں جانتے تھے جو کالنتے نے تھانے میں سنا تھا۔ اڈے اور اڈے کے آدمیوں سے کچھ ہوا تھا۔ کالنتے کے خیال میں کسی بھی لمحے کسی بھی جانب سے رکاوٹ کھڑی ہو سکتی تھی۔

گلی میں کچھ اندر جا کے اڈا تھا۔ اس طرف عام بالاخانے نہیں تھے لیکن یہ بازار ہی سے متعلق علاقہ تھا۔ یہاں گلیوں میں اتنی رونق بھی نہیں تھی۔ ابھی وہ اڈے تک نہیں پہنچے تھے کہ انھیں اندر گلی کی جانب سے بھاگتے ہوئے کئی آدمیوں کی چاپیں سنائی دیں۔ جتنی دیر میں جنجل اور کالنتے نے کچھ اور فاصلہ طے کیا، اُتنی دیر میں وہ بھی سامنے آ گئے۔ دونوں نے انھیں دیکھ لیا تھا، مگر وہ انھی کی طرف بڑھتے رہے۔ اُن کی تعداد پانچ تھی۔ پانچوں جسم کے مضبوط اور نگاہ کے تیز دکھائی دیتے تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں کھلے چاقو تھے اور وہ بہت بے قابو سے لگ رہے تھے۔ جنجل اور کالنتے کو چڑھتا دیکھ کے انھوں نے دُور ہی سے انھیں ٹھیر جانے کا حکم دیا تھا۔ جنجل نے جیسے سنا ہی نہیں، مگر آگے انھوں نے راستہ روک لیا تھا، اس لیے جنجل کو ٹھیر جانا پڑا۔ وہ کالنتے سے بولا: "دیکھ رہا ہے، مریل لے آ گئے، کیا بولتے ہیں اس کو، ہراول! اب اڈوں پر بھی ہراول ہونے لگے سالے۔" پھر اُس نے اُن سے مخاطب ہو کے پوچھا: "کیا بات ہے رے؟"

"وہ بات تو تم سے اپنی کو پوچھنا ہے استاد!" اُن میں سے ایک بگڑی ہوئی آواز میں بولا۔

"اپنے کو تیرے دادا سے ملنا ہے۔"

"اڈے پر اب کالے دادا نہیں ہے استاد!"

"تو جو کوئی بھی ہے، اپنے کو اُسی سے ملنا ہے۔"

"تم، تم کیا چاہتے ہو؟"

"وہ چاہتا ہے!" بولا، "تیرے اُستاد کو ملنا چاہتے ہیں۔" جنجل نے دھیمے لہجے ہی میں کہا۔

"چلے ادھر ہی سے مل لو استاد!" اُن میں ایک کسمساتے ہوئے بولا۔

"تو پھر تیرا دادا ادھر سے چلا جائے گا کیا؟"

"یہ دادا جانے۔" اُس نے ترشی سے جواب دیا۔

"ہٹ جا رے!" جنجل نے تندی سے کہا۔ "اپنے کو نہیں پہچانا ہے کیا؟"

"پہچانتے ہیں اُستاد! پر تم بھی اپنی کو..."

"ہاں آں!" کالنتے نے اُن کی بات کاٹ کے تیزی سے کہا: "دیکھ رہے ہیں تم کو اوپر سے نیچے تک اچھی طرح دیکھ رہے ہیں۔ ہم بولتے ہیں راستہ چھوڑ دو۔ اُدھر تمھارے دادا ہی سے کچھ بات کرنا ہے۔ تمھارے من میں کچھ اور ہے تو وہ سب بھی پورا کر دیویں گے۔ تم سے کوئی شکایت نہیں ہوگی، تم کو لیکن دادا سے پہلے نہیں۔ ابھی وہ سالا نہیں گیا ہے۔ اڈے کا مالک بنا ہے تو صرف تمھارے ٹھینگے پر نہیں بنا ہوگا، کچھ اپنا بل بھی رکھتا ہوگا۔ اپنے کو معلوم ہے اُس نے تم کو نہیں بھیجا ہوگا۔ کوئی اڈے وار سالا ایسا اُلّو کا پٹھا نہیں ہوتا۔ اپنے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اور ہم کو زیادہ بولنا بھی نہیں آتا۔"

"یہاں سے واپس چلے جاؤ اُستاد!" جواب میں اُن میں سے کسی نے بڑی بے بسی سے کہا: "آکا شاہ کبیر نہیں ہے، سب کے پاس سے چھینے والا۔ سالا اوں پانی بھی نہیں مانگتا۔ اپن بولتے ہیں تمھارے بھلے ہی کا، جدھر سے آئے ہو اُدھر ہی لوٹ جاؤ۔"

"آکا نام ہے اُس کا!" جنجل کی آواز دھیمی ہو گئی تھی۔ "ٹھیک ہی بولتے ہو، چند دنوں کے لیے اپنے کو وہ شاہ کبیر نہیں لگتا۔ شاہ کبیر تھوڑا بہت آدمی کا بھی لگتا تھا۔ اپنے کو تو سالا وہ دادا گیدڑ کا جنا لگتا ہے۔"

کالنتے کو پتا تھا کہ وہ دونوں بالکل تیار تھے اور اُن پانچوں کو کھلے چاقوؤں کے باوجود آسانی سے سنبھال سکتے تھے۔ جنجل نے کالنتے کو کوئی اشارہ نہیں کیا تھا۔ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اُس کے ساتھ کوئی اور نہیں، کالنتے تھا۔ اس نے کالنتے سے نہیں پوچھا لیکن پہلی تدبیر اُن کے ذہن میں یہی ہوگی کہ وہ اچانک کنارے کھڑے ہوئے دو آدمیوں پر جھپٹیں گے۔ اس سے پہلے کہ اُن کے باقی تین ساتھی کچھ سمجھنے کی کوشش کرتے، وہ اُن دونوں کو انھی کے سامنے منتشر کر دیتے۔ ہو سکتا ہے اور بھی کوئی صورت اُن کے ذہن میں ہو۔ زورا، جبرو، شامو اور ٹنگو کی دخل اندازی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ انھیں اُن سے الگ ہی رہنا تھا لیکن پیچھے وہ چاروں جنجل کے اشارے کے منتظر تھے۔ جنجل نے ایک بار پھر اُن پانچوں سے راستہ چھوڑ دینے کے لیے کہا۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ کالنتے سے برداشت کرنا مشکل

ہو رہا تھا۔ جنجل کی وجہ سے وہ ہاتھ پیر جکڑے کھڑا رہا، مگر جنجل کی طرح اُس کا اندازہ بھی یہی تھا کہ اُن پانچوں کی آمد محض ایک رسمی حجت ہے۔ ظاہر ہے انھیں آکا نے نہیں بھیجا ہوگا۔ اڈے کے اُدنیٰ کبھی کبھی استاد کی خوشنودی کے لیے یوں ہی سامنے آ جاتے ہیں۔ استاد بھی اُن کی طرح ایسے ویسے لوگوں سے فضول اُلجھے اور وقت ضائع کرنے نکل جاتا ہے۔ وہ بھی اسی خیال سے اڈے سے نکلے ہوں گے کہ دیکھیں تو سہی، خبر پہنچانے والے نے کسی سیانے سے تو کام نہیں لیا ہے۔ کوئی یوں ہی سر اٹھائے تو نہیں چلا آ رہا ہے۔ عام طور پر اُن کا مقصد آنے والے کا تخمینہ کرنا، اُس کا دعوا پرکھنا ہوتا ہے۔ سیانے ہی ہوتا تو شاید وہ اتنی دیر نہ کرتے لیکن یہ کیسے بچائے جنجل کے، جو جانتے تھے کہ وہ بالکل نہیں جانتے تھے اور جنجل سے وہ اسی حد تک واقف تھے کہ شاہ کبیر والے دنوں وہ اُس کے ساتھ تھا۔ انھوں نے اُسے شاہ کبیر سے زور کرتے نہیں دیکھا تھا، مگر جیسا کہ پچھلے چند روز تمام میں اڈے پر وہی اُن کے سامنے رہا تھا۔ بہرحال جنجل کے متعلق اُن کی رائے کسی غلط فہمی پر مبنی ہو سکتی تھی کیونکہ کہیں اُس نے اُسے سامنے بڑے پن کی وجہ سے یوں ہی رتبہ نہ رکھا ہو۔ ممکن ہے اس وقت اُس کے ساتھ نہ دیکھ کے انھیں آسانی محسوس ہوئی ہو کہ جنجل کو روکنا اُن کے لیے اتنا مشکل نہیں ہے۔ مگر یہ گمان ہی ہو سکتا ہے۔ چھکنے اور آزمانے کا خطرہ انھیں مول نہیں لینا چاہیے تھا اور اب تک اگر جیسا کہ کالنتے اور جنجل کا اُن کے متعلق اندازہ تھا، انھیں اُن کے سامنے سے ہٹ جانا چاہیے تھا۔ جنجل نے بھی اتنی دیر اسی لیے لگائی تھی کہ اڈے جانے سے پہلے گلی میں خون خرابہ مناسب نہیں تھا۔ انھیں حجت تمام کرنے کا وقت ضرور دینا چاہیے تھا اور جنجل کی نظروں میں شاید یہ وقت ختم ہو گیا تھا۔ اُس نے دوبارہ اُن سے راستے سے ہٹ جانے کے لیے نہیں کہا۔ وہ آہستہ روی سے ایک قدم آگے بڑھا اور اُس نے اپنے عین مقابل کھڑے ہوئے آدمی کی طرف ہاتھ اُٹھایا۔ اُس کے ہاتھ اُٹھانے پر وہ اُچھل گیا۔ نتیجتاً اُس کے باقی چار ساتھیوں کا بوکھلا جانا لازم تھا۔ کالنتے کی سانسیں سینے میں رُک گئی تھیں۔ وہ تو پیچھے سے اُن پر بے تحاشا ٹوٹ پڑتا مگر جنجل نے آگے جاتے ہوئے اُسے خاموش کھڑے رہنے کا اشارہ کر دیا تھا۔ کالنتے بتا رہا تھا کہ اُس لمحے اُس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ اُس نے نا دیکھا کہ اُس کے سامنے وہ چاروں کئی جانب سے چاقو لہراتے ہوئے بیک وقت جنجل ہی کی طرف جھپٹے مگر جنجل کے جسم پر سکوت طاری رہا۔ دوسرے ہی لمحے اُن چاروں کے اٹھے ہوئے ہاتھ جنجل کے جسم میں پیوست ہوتے ہوتے ٹھٹھک گئے۔ جنجل جیسے اُن سب سے بے خبر اُس آدمی کے مقابل کھڑا رہا جس کی جانب وہ بڑھا تھا۔ اُس نے اُس کے کندھے پر ہاتھ

نے کچھ دیر بھی لگائی تھی۔ مجھ کو تو اتنا وقت بھی نہیں ملنے والا ہے۔"
"بابا!" آکا ایک دم اکھڑ گیا اور دانت پیستے ہوئے بولا۔ "تیری موت تجھ کو ادھر کھینچ لائی ہے۔" اس کا گلا شدت غضب سے پھٹنے لگا تھا۔ مسلسل گالیاں بکے جا رہا تھا۔ ایک لمحے میں اس نے چاقو نکال لیا اور سانڈ کی طرح سر نیچے کر کے اچھلنے گھومنے لگا۔

جھل اپنی جگہ کھڑا رہا۔ "تو بل دکھائے بغیر نہیں مانے گا کچھ ہو گا بھی تو دکھائے گا۔ اپنا خیال تھا اتنی دیر میں ہما کا کوئی چھوکا چل کے تیرے سر سے پگڑی دھول ہٹائے گا پر تیرے دن ہی ختم ہو گئے ہیں تو ہم......"

جھل کی بات منہ ہی میں رہ گئی۔ آکا اچانک چاقو تول کے دیوانہ وار اس کی طرف بڑھ گیا۔ جھل کی آنکھیں کھلی تھیں۔ آکا اس کے بہت قریب آ گیا تھا مگر جھل بے حس و حرکت رہا۔ آکا کی وحشت دوچند ہو گئی۔ اپنے بڑھتے ہوئے قدم کھینچنے کے لیے اسے خود پر بہت جبر کرنا پڑا ہو گا مگر وہ بلبلاتا ہوا پیچھے ہٹ گیا اور ڈکراتی آواز میں بولا۔ "زیادہ فرصت کر گئے کے لیے اپنا چاقو نکال لے۔"

"تیرے پاس تو ہے رے۔" جھل نے سرد لہجے ہی کہا۔

کانتے نے جھل کے لہجے کی سردی اپنے رگ و پے میں محسوس کی۔ آکا اس کے سامنے چند قدم کے فاصلے پر چاقو تولے تڑپ رہا تھا۔ وہ اپنے آپے میں بالکل نہیں معلوم ہوتا تھا کسی بھی پل وہ دونوں آپس میں دست بگریباں ہو سکتے تھے۔ اس اثنا میں کانتے اپنی دانست میں آکا کو اچھی طرح پرکھ چکا تھا۔ جسم کے نپے تلے ہونے کے علاوہ اس کے ہاتھ پیروں میں غیر معمولی پھرتی تھی۔ کانتے کو اس وقت وہاں اڈے کا کوئی اور آدمی اس کا ہم پلہ نظر نہیں آیا تھا۔ کالے دادا کا جسم پھیلا ہوا تھا لیکن اسے یقین تھا کہ اڈا سپرد کرتے وقت جھل نے اس میں کوئی بات ضرور دیکھی ہو گی۔ کالے دادا اڈے کا مالک بننے کے بعد وہ بات برقرار نہیں رکھ سکا۔ پھیلتا گیا۔ آکا کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ کالے دادا کو اڈے سے زیادہ کسی اور بات سے دلچسپی ہو گئی تھی۔ شاید یہی وجہ ہو گی کہ آکا کے آنے کے سبب اس نے کوئی مزاحمت کرنا مناسب نہیں سمجھا اور خاموشی سے اڈا آکا کے حوالے کر دیا۔ اڈے پر آکا کے ساتھ اس کی موجودگی کا بھی یہی سبب معلوم ہوتا تھا۔ ہو سکتا ہے آکا ہی نے اسے روک لیا ہو۔ نئے اڈے پر اسے اعتماد کے کسی آدمی کی ضرورت محسوس ہوئی ہو گی۔ آکا حیدر آباد کا نظر نہیں آتا تھا۔ اس کی زبان، طور طریق اور شکل و صورت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اچھی کی طرح کسی دوسری جگہ سے آیا ہے اور اپنے بارے میں کچھ زیادہ ہی خوش فہمی میں مبتلا ہے۔ خوش فہمی ایسی بے وجہ بھی نہیں ہو گی۔ اڈے پر اس کے آنے کے بعد شاید کوئی شخص اڈے کا دعویٰ کرنے نہیں آیا تھا۔ سارے اڈے کے آدمیوں کے سامنے اس نے اڈے پر صرف اپنی موجودگی کا کوئی ایسا ثبوت پیش کیا ہو گا۔ ابھی سب کے چہروں پر اس کے نام سے ہیبت چھا جاتی تھی۔ عام طور پر کسی شہر میں سب سے بڑا اڈا بازار ہی کا ہوتا ہے اور اس نسبت سے اس اڈے سے متعلق آدمی بھی دوسرے اڈوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ آکا اپنی کسی خوبی کے بغیر ان لوگوں پر زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتا تھا۔

مگر کانتے کے لیے یہ سب کچھ نیا نہیں تھا۔ ایسے بہت سے آدمیوں سے جھل کا اور اس کا واسطہ پڑ چکا تھا۔ کانتے کے تذبذب اور اضطراب کا سبب یہ نہیں تھا کہ آکا نامی ایک شخص اس اڈے پر موجود ہے جس پر جھل کبھی اپنا آدمی چھوڑ کے گیا تھا۔ ان کا مقصد اس آدمی کو ہٹا دینا، اڈا دوبارہ حاصل کرنا اور اس طرح دل کو تسلی دینا نہیں تھا۔ کانتے کے انتشار کی وجہ اس کی اپنی بے یقینی تھی۔ اسے شبہ تھا کہ تھانے سے نکل کے جھل یہیں جگہ ہی آیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس ہنگ ٹو دو کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو اور ان کے اندازے کی کوئی غلطی ہو اور پھر کو ان سے اور خود کو شرمندہ ہونا پڑے۔ کانتے جانتا تھا کہ اب اس کے سارے وسوسے بعد از وقت ہیں۔ وہ بار بار اپنے آپ کو ٹوکتا۔ سہما سہما ادھر ہی نگاہیں ایک طرف بیٹھے اور جو موجود تھے انہی کی طرف مرکوز رکھنے کی کوشش کرتا تھا مگر کبھی ہی اس کے سامنے آ جاتا تھا کبھی چہرے کبھی انجان۔ ان کی آنکھوں کی ویرانی اس کے سینے میں کھب گئی تھی اور جھل نے اسے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا مگر کانتے کو معلوم تھا اس کے اندر کیا سمندر امڈ رہا ہے۔

ادھر اسے جھل کے پیر کی فکر تھی۔ بڑی مشکل سے زخم سوکھنا شروع ہوا تھا کہ دو دن کے مسلسل سفر سے اس پر اور زور پڑ گیا۔ آکا چاقو تولے جھل کے پاس آ کے پلٹ گیا تھا۔ کانتے نے جھکتے جھجکتے جھل سے کہا تھا۔ "استاد! میں دیکھتا ہوں اس حرامی موت کو۔"

جھل نے اسے جھڑک دیا اور اپنے ہاتھوں کو زور سے جھٹکے دیتے ہوئے آکا کی طرف بازو پھیلائے مگر آکا چاقو نکالنے کے لیے چیخنے لگا۔ "ہم نے کیا بولا؟" جھل نے کہا۔ "تیرے پاس کافی نہیں ہے؟" اس نے ترشی سے کہا۔

یہ سن کے آکا نے اپنا چاقو بھی فرش پر پھینک دیا۔ اسی اثنا میں جھل نے چاقو نکال لیا۔ آکا نے چاقو خود اٹھانے کے بجائے اپنے قریب کھڑے ہوئے آدمی کو اشارہ کیا۔ اس نے فرش سے چاقو اٹھا کے اس کی جانب اچھال دیا۔ آکا نے مشاقی سے چاقو اچک لیا اور پوری طاقت سے کسی فقیر کا نام لے کے نعرہ لگایا۔ اس کی آواز سے

عمارت گونج اٹھی۔ جھل نے پھر اس سے کچھ نہیں کہا۔ سب خود بخود پیچھے ہٹ گئے۔ کانتے بھی پیچھے چلا آیا۔ منورا اور مجرو وغیرہ اس سے پہلے ہی ہٹ چکے تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں سے دیکھنے کے سوا کوئی بات نہیں کی۔

جھل کے ہاتھ میں چاقو دیکھ کے آکا کے رگ و پے میں جیسے بجلی بھر گئی۔ سنسنا اچھالنے کے انداز میں اس نے دو چار مرتبہ چاقو اوپر اچھالا اور کئی مرتبہ آنا فانا اس ہاتھ سے اس ہاتھ میں منتقل کیا۔ ایسی تیزی سے کہ نظر ٹھیرتی ہی نہ تھی۔ گرفت میں خاصی لچک تھی اور ہاتھ چاقو سے خوب مانوس معلوم ہوتے تھے۔ جھل بھی یہی کہتا تھا کہ دونوں ہاتھ ایک دوسرے کے بندے ہونے چاہئیں۔ کبھی چاقو روانی سے منتقل کیا جا سکتا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ چاقو اٹھانے والے کا ہاتھ دایاں یا بایاں نہیں ہوتا۔ کانتے کے مطابق آکا کے ہاتھ ایک دوسرے کا اشارہ سمجھتے تھے چاقو چلاتے چلاتے ان کی اپنی آنکھیں ہو گئی تھیں۔ جھل نے آکا کی طرح چاقو نہیں ہلایا اور نگاہوں نگاہوں میں اسے تولتا ہوا آگے بڑھا۔ آکا پر جنون سا طاری تھا۔ جھل کی دو ایک جھڑکیوں نے مہمیز کا کام کیا۔ جواب میں وہ الجھنے کے بجائے وحشیانہ پن سے سیدھا جھل کی طرف جھپٹا۔ اس کی جھپٹ میں ایسی لپک تھی کہ جھل کو بچنے کے لیے ہٹنا اور ایک طرف ہو جانا پڑا۔ مگر آکا پل بھر میں رخ بدل کے پھر اس کے سامنے سے چاقو جھونکنے کے لیے آگے بڑھ گیا۔ دوسری بار بھی جھل کو پھلکی طرح پہلو بچا لینا چاہیے تھا لیکن اسے دیر ہو گئی۔ آکا اس کے قریب پہنچ گیا اور کانتے نے دیکھا کہ پیچھے ہٹنے یا اسے روکنے کے بجائے آکا کی تیزی سے جھل کچھ بہکا بہکا نظر آیا۔ کانتے کے بقول اس کے دل نے دھڑکنا بند کر دیا تھا جب یکا یک اس نے جھل کے ہاتھ سے چاقو چھوٹتے اور گھبراہٹ میں ڈگمگاتے اور ایک جانب گرتے دیکھا۔ چاقو اس کے ہاتھ سے چھوٹا تھا۔ فرش پر چاقو گرنے کی آواز کانتے کے کانوں میں دھماکے کی طرح گونجی۔

اپنے زور میں آکا چند قدم آگے چلا گیا تھا۔ یک بیک وہ پلٹا۔ جھل اس لیے گرا ہوا تھا اور دائیں ہاتھ کے بل اٹھنے کی کوشش میں کسی حد تک کامیاب ہو گیا تھا لیکن ابھی پوری طرح کھڑا نہیں ہوا تھا کہ آکا پھر اس کے سر پر پہنچ گیا۔ کانتے کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ اس نے آکا کو جھل پر جھکتے اور چاقو والا ہاتھ دراز کرتے اور ساتھ ہی جھل کا بایاں ہاتھ بلند ہوتے دیکھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے جھل اس صورت حال سے اوسان کھو بیٹھا ہے اور اس کا اٹھا ہوا ہاتھ آکا کو روکنے کے لیے ہے۔ مگر کانتے کو پلک جھپکنے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی جیسے ہی آکا نے جھل کی جانب جھکتے ہوئے چاقو والا ہاتھ دراز کیا، آدھے گرے اور ٹوٹے اٹھتے ہوئے جھل کے جسم میں یکا یک کوئی لہر سی آندھی بھر سب کچھ کانتے کی آنکھوں کی تیرگی میں منتشر ہو گیا۔ اس کی آنکھوں کی چکا چوند دور ہوئی تو اس نے دیکھا کہ جھل کا اٹھا ہوا ہاتھ آکا کا پنجہ گرفت میں لیے ہوئے ہے۔

پنجہ پکڑتے ہی جھل نے کسی تاخیر کے بغیر آکا کا ہاتھ پیچھے کر کے اور وحشیانہ زور سے جھٹکے سے کھینچا کہ آکا کے پاؤں زمین پر جمے نہیں رہ سکتے تھے۔ چاقو چھوٹنے کے ساتھ ساتھ وہ فرش پر گرا اور اس سے پہلے کہ دوبارہ سنبھلنے کی کوشش کرتا جھل نے جھپٹ اپنا پیر اس کی ٹھوڑی کا نشانہ لے کے مارا اور بڑی تیزی سے آگے کھڑا ہوا۔ اس کا اپنا چاقو اس سے نزدیک تھا۔ اٹھتے ہوئے وہ اسے فرش سے اٹھانا نہیں بھولا تھا۔

صحن میں چاروں طرف کھڑے دم بخود لوگ اس وقت اپنی سسکاریاں نہ روک سکے جب جھل نے دوبارہ کھڑے ہو کے اپنا چاقو فرش سے اٹھایا۔ ان دونوں کو ایک دوسرے کے مقابل آئے ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کسی کے سان گمان میں نہ ہو گا کہ ان کی آنکھوں کے سامنے یہ سب آئی جائی ہو سکتا ہے۔ کانتے کی طرح اوروں کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہا ہو گا کہ جھل کے چاقو چھوٹنے اور فرش پر گرنے کا اصل راز کیا تھا۔ سبھی نے جھل کے پیر پر بندھی پٹی دیکھی تھی چنانچہ وہ یہی نتیجہ اخذ کر سکتے تھے کہ اس کا پیر آکا کی تیزی کی گھبراہٹ میں رپٹ گیا ہے۔ ممکن ہے وہ ابھی تک یہی سمجھ رہے ہوں لیکن کانتے کے لیے یہ باور کرنا مشکل تھا کہ جھل کا چاقو اس کی انگلیوں سے یوں چھوٹ سکتا ہے۔ جھل کی انگلیوں میں آ کے چاقو کا اپنا کوئی زور نہیں رہتا تھا۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ پہلے چاقو گرا تھا۔ جھل کے پیر بعد میں ڈگمگائے تھے۔ سب کچھ کسی ایک پل ہی میں ہوا تھا۔ ایک پل ہی میں کانتے نے کیا کیا دیکھا۔

اس کی سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں اور سارا جسم پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ جیسے جیسے اس کے حواس یکجا ہو رہے تھے گزرا ہوا سب کچھ ترتیب سے اس کے ذہن میں ابھر رہا تھا۔ اب سب کچھ پتا لگا تھا۔ جھل کے ہاتھ سے گرنے پر وحشت زدہ آکا کا موقع غنیمت جاننا اور اس پر جھپٹنا لازم تھا۔ نیز دوسرے ہی لمحے فیصلے کی قوت کھو دینا بھی لازم تھا کیونکہ اس کے مقابل کا چاقو اس کے ہاتھ میں نہیں رہا تھا۔ یہ حیلہ تھا یا وہ پیچھے ہٹ جاتا اور اڈے کے کسی معقول دادا کی طرح جھل کو سنبھلنے کا ایک موقع اور دیتا۔ بہت سے لوگوں کی موجودگی میں اس فراخ دلی کا اظہار خود بخود ہو جاتا ہے۔ آکا فوراً پیچھے ہٹ جاتا تو بھی جھل کے بلند کیے ہوئے ہاتھ سے ایک قسم کی مزاحمت کا تاثر ملتا تھا۔ مزاحمت کرتے ہوئے مقابل کے سامنے رکنا مشکل ہو جاتا ہے۔ آکا پھر بھی ٹک جاتا مگر اسے کچھ وقت نہیں ملا تھا۔ وہ اتنا مشتعل تھا کہ اپنے

آپ پر قابو پانے اپنی نگاہیں کھینچنے کے لیے آ سکے کچھ وقت رکا رہا تھا دوسری
جمیل نے اپنا بلند کیا ہوا ہاتھ اچانک سمیٹ لیا تھا۔ اس سے مراد یہی
تھی کہ آکا کو اضطراری طور پر اپنا ہاتھ اور دراز کرنا پڑے۔ آکا نے
یہی کیا۔ اسے خیال نہیں رہا کہ جمیل کا پنجہ آکا کے مزید جھکنے اور اس
کا ہاتھ اور قریب آ جانے کا منتظر ہے۔

کاٹنے نے بتایا عمداً ادھر جمیل کھڑا ہوا، ادھر چند لمحوں کے تذبذب
کے بعد فرش پر لوٹتا ہوا آکا کچھ دور جا کے اٹھ کھڑا ہوا۔ جمیل نے اس
فرصت میں دو قدم گھوم کے آکا کا چاقو بھی فرش سے اٹھا لیا تھا لیکن
چاقو کے بغیر آکا کا چہرہ دیوانوں کی طرح بازو پھیلائے تلا کھڑا تھا اور بس
کسی موقع کی تلاش میں تھا۔ اس کی انگارا آنکھوں میں غضب کے ساتھ
حیرانی بھی شامل ہو گئی تھی۔ جمیل نے اس کا چاقو اس کی طرف اچھال
دیا۔ آکا نے چاقو اچکنے میں تساہل نہیں کیا۔ اس کے جسم کے ہیجان سے
یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ اس نے یہ سب کچھ اتفاق پر محمول کیا ہے دوبارہ
اس میں پہلے سے زیادہ آگ بھری ہوئی تھی۔ اس نے کوئی لمحہ ضائع
نہیں کیا، پہلے کی طرح آندھی کے مانند جمیل کی جانب آیا۔ جمیل ٹال کے
کے اور گھوم کے دوسری جانب ہو گیا۔ آکا نے فوراً اپنا چاقو دوسرے
ہاتھ میں جدھر جمیل کا رخ ہو گیا تھا، منتقل کر لیا۔ جیسے جیسے جمیل
اس سے پہلو بچاتا رہا، چاقو اس کے رخ پر رکھنے کے لیے ایک ہاتھ
سے دوسرے ہاتھ میں پھرتی سے تبدیل کرتا رہا۔ ایک لمحے اس کا چاقو
اِس ہاتھ میں ہوتا، دوسرے لمحے اُس ہاتھ میں۔ یہ اپنی مہارت
کی نمائش کا وقت نہیں تھا۔ اس کی منشا یہی ہو سکتی تھی کہ شاید جمیل
کسی ایک جگہ گڑبڑا جانے کی کوئی چوک کر بیٹھے۔ جمیل نے اس کے
اور اپنے درمیان گھومتے رہنے کے باوجود ایک فاصلہ برقرار رکھا تھا
اور کاٹنے کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ جلد جلد رخ بدل کے آکا کو بار
بار چاقو بدلنے پر مجبور کر رہا ہے۔ آکا کچھ اپنی مشاقی کے زعم میں
آ گیا تھا۔ پھر صحن میں یہاں سے وہاں اس جگہ سے اس جگہ پھرتے،
پینترے بدلتے ہوئے جمیل ایک جگہ یکایک رک گیا۔ آکا نے اپنی روش
کے مطابق اس کے رخ پر چاقو بدلنے کے لیے اپنے دوسرے ہاتھ کی طرف
اسے اچھالا لیکن ابھی اس نے چاقو جھپٹنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ جمیل
نے اچھل کے اس کے چاقو والے ہاتھ پر جھپٹا مارا۔ جمیل کا پنجہ پڑنے
کی مدت میں آکا چاقو اچھال چکا تھا۔ اس کی روانی اور یک دستی
دیکھتے ہوئے اس کے دوسرے ہاتھ میں چاقو آ جانا چاہیے تھا مگر
درمیان میں یہ ناگہاں رخنہ پڑ جانے سے آکا کے دونوں ہاتھوں کا توازن
قائم نہیں رہ سکا۔ چاقو جھپٹنے والا ہاتھ درہم ہو جانے اور کھنچ جانے
پر چاقو تھامنے والا ہاتھ لازماً متاثر ہونا چاہیے تھا، وہ ایک لمحے

سے بندھے نہ رہ سکے اور چاقو چھناکے کے ساتھ فرش پر گر پڑا۔
کاٹنے بتا رہا تھا کہ یہیں کوئی جھماکا سا ہوا تھا۔ اگر کوئی عمر
پر سکتہ سا طاری تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اُستاد کو یوں بار بار نیچے
دیکھ کے پہلے ہی کھٹک گیا تھا کہ اُستاد کے ذہن میں کچھ نہ کچھ [illegible]
وہ تجویز ہی تھا کہ آخر وہ کون سی بات ہو سکتی ہے جس [illegible]
میں سب کچھ بدلا ہوا تھا۔ ساری بات وقت کے تعین کی تھی اور وہ
یہ تھی کہ جمیل اسی وقت اپنا ہاتھ بڑھائے جب آکا چاقو اچھالنے والا
ہو۔ اس سے پہلے جمیل نے خود کو یہ یقین دلایا ہوگا کہ اس بار بھی اس کا
پینترا بدلنے پر آکا ایک سے دوسرے ہاتھ میں چاقو بدلنے کا عمل جاری
رکھے گا۔ وہ ہیجانی حالت میں تھا اور جمیل کے لیے یہ تعین کرنا ایسا دشوار
نہیں تھا۔ وہ اس کے اس ہاتھ پر بھی پنجہ مار سکتا تھا جس میں چاقو
آنے والا تھا لیکن محفوظ طریقہ یہی تھا کہ چاقو چھوڑنے والے ہاتھ کو
نشانہ بنایا جائے کیونکہ چاقو چھوڑ دینے کے بعد اس کی تن دہی اور مستعدی
میں یقیناً فرق آ جاتا ہے وہ ایک فرض سے بری الذمہ ہو جاتا ہے۔
اس کے مقابلے میں دوسرا چاقو پکڑنے والا ہاتھ زیادہ فعال اور متحرک
ہو جاتا ہے۔ ذرا بھی دیر ہو جاتی اور چاقو آکا کے دوسرے ہاتھ میں ہوتا
اور صورت حال یکسر مختلف ہوتی۔ جمیل کو پھر اپنی مدافعت کی کوئی
اور تدبیر سوچنی پڑتی جو ضرور اس کے ذہن میں ہوگی۔

جمیل کے ہاتھ میں اپنا چاقو تھا اور وہ آکا کے جسم کے کسی بھی
حصے میں اسے اتار سکتا تھا۔ چاقو گرنے پر آکا نے بدحواسی میں ایک اور
غلطی کی۔ اس نے چاقو زمین سے اٹھانے کے لیے جھکنا چاہا۔ جمیل نے
اس کی مہلت نہیں دی اور اس کے کولہے کے قریب گھٹنا مارا۔ آکا
لڑکھڑا کے سنبھل گیا تھا لیکن جمیل نے اس جانب اپنا چاقو والا
ہاتھ لہرا کے اسے متذبذب کیا تو دوسری طرف اپنے خالی ہاتھ سے
اس کی گردن پر ضرب رسید کی اور کوئی وقفہ دیے بغیر پے بہ پے کئی
ضربیں لگا کے آکا کو [illegible] کر دیا مگر جمیل کے
ہاتھ رکنے کی دیر تھی، آکا تیزی سے فرش پر [illegible] لڑھکتا ہوا دور جا
اس کا چاقو جمیل کے پیروں کے پاس پڑا تھا۔ آکا نے دوبارہ اپنی [illegible]
میں لیتے ہوئے جمیل کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ کسی کو توقع نہیں
ہوگی کہ آکا کو دور جا کے پھر اٹھ کھڑا ہوگا۔ جمیل ہاتھ نہ روکتا تو شاید یہ
موقع کبھی نہ ملتا لیکن جمیل نے جیسے اسے خود یہ موقع فراہم کیا تھا اور
سبھی دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے جب جمیل نے آکا کا چاقو اس کے کھڑے
ہو جانے پر دوبارہ اس کی طرف اچھال دیا۔ اس بار آکا کی گرفت میں
بے شک وہ پھرتی نہیں تھی لیکن چاقو ہاتھ میں آنے کے بعد وہ بالکل
جنونی ہو گیا۔ اس نے دائیں بائیں کچھ نہیں دیکھا، پھر سامنے کی طرف
جست لگا کے جمیل پر وار کرنے کے لیے لپکا۔ اس کی رفتار میں بجلی کی سی

لپک تھی۔ جمیل کے لیے بھی شاید اس کی یہ تیزی حیران کن ہو۔
کسی کے یوں سنسناتے آنے کی صورت میں مقابل کو ذرا
کوئی فیصلہ کرنا پڑتا ہے ورنہ ذرا سے تذبذب سے درمیانی فاصلہ
اور تنگ ہو جاتا ہے۔ ایسے عموماً اس وقت آیا جاتا ہے جب پیچھے
ہٹنے کے لیے مقابل کے پاس جگہ تنگ ہو اور وہی شخص سیدھا آتا ہے
جسے اپنی رفتار تیز کرنے کے ساتھ ساتھ وقت پر اسے قابو میں کر لینے
کا اعتماد بھی ہو۔ چونکہ مقابل کے پاس پہنچ کے اسے بہرحال اپنی رفتار
توڑنی پڑتی ہے۔ مقابل کسی بھی حالت میں کسی کو اپنی جانب اس
طرح بڑھتا دیکھ کے ساکت کھڑا نہیں رہ سکتا۔ فاصلہ تھوڑا ہو، بچ نکلنے
یا ایک طرف ہو جانے کی اجازت نہ دیتا ہو تو عام طور پر چاقو سیدھا
پیٹ کر دیا جاتا ہے۔ حملہ آور پھر خود ہی دوسری طرف ہو جاتا ہے مگر یہ
کہ جمیل کے پاس وقت تھا اور وہ آکا کی سیدھ سے ہٹ کے ادھر ادھر
ہو سکتا تھا۔ اس وقت آکا صحن کے دوسرے سرے سے چلا تھا۔ اس کے
اور جمیل کے درمیان فاصلہ کم نہیں تھا۔ تقریباً پورے صحن کا فاصلہ تھا
مگر جمیل نے ذرا بھی اپنا رخ بدلنے کی کوشش کی نہ ہٹنا چاہا تو آکا کی
سمت بدل سکتی تھی۔ اس کے برعکس وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا تاکہ اس
طرح اس کے لیے پیچھے رخ بدلنے کی گنجائش اور کم ہو گئی۔ اس کا یہ اقدام
آکا کے جنون کے لیے نہایت حوصلہ افزا ثابت ہونا چاہیے تھا۔ کوئی
بھی مقابل اسے اپنے لیے ایک خوش آئند علامت تصور کرتا۔ جمیل کا
مقصد بھی اپنے مقابل کے عزم کو اور تقویت دینا ہی تھا۔ تب آکا کو
ایک خاص دوری تک اسی تیزی سے آنے دینا تھا۔ آکا جب صحن
کے درمیان تک آ گیا، یکایک جمیل نے آکا کی سمت اسی کی سیدھ میں
بے تحاشا جست لگائی۔ جمیل کے بڑھتے وقت آکا درمیان میں تھا
یہ دیکھ کے وہ خود کو یک لخت نہیں روک سکتا تھا۔ کوئی بھی نہیں روک
سکتا تھا۔ رکتے رکتے بھی چند قدم اسے اپنی جھونک میں آگے بڑھ
جانا تھا اور اس صورت میں جمیل سے اس کا ٹکرا جانا لازم تھا۔ اس
کے لیے یہی چارہ کار رہ گیا تھا کہ اب جو بھی نتیجہ ہو وہ جمیل سے ٹکرا
ہو جائے اور اپنی رفتار قابو میں کرنے کی کوئی لغزش نہ کرے۔ اس موقع
پر رخ بدلنے کی کوئی کوشش بہت مہلک ہو سکتی تھی۔ جمیل نے اسے
پس و پیش کی مہلت نہیں دی تھی۔ کاٹنے کی طرح سبھی کی آنکھیں پھٹی
ہوئی تھیں۔ دو رستے لمحے دونوں کے متصادم ہو جانے کے بارے میں
کسی کو کوئی شک نہیں رہا تھا اور تصادم کے نتیجے میں کچھ بھی ممکن تھا۔
یہ امکان دور دور تک کسی کے تصور میں نہ ہوگا کہ جمیل اس تیز رفتاری
سے آنے کے باوجود ایک دم بیٹھ جائے گا۔

بس ایک آن کی کسر رہ گئی تھی، جمیل اب یک بیٹھ گیا۔ آکا کو بھی
اس کے بیٹھنے سے ٹکرانا تھا مگر کچھ مختلف طور سے۔ جمیل نے بیٹھے بیٹھے

اپنا پاؤں زور سے ہلایا تھا اور دونوں ہاتھ تیار رکھے تھے۔ اس کے بڑھنے
سے پہلے جھک کے پیچھے ہی کشادہ ہو گئی تھی۔ آکا اس کے اوپر سے گر کے دوسری
جانب گرتے ہی [illegible] جمیل نے اس کی دونوں ٹانگیں جھٹکے سے انھیں
فرش سے ایک بالشت [illegible] پیچھے پھینک دیا تھا۔ یوں وہ اس کے لیے
ٹنگا راستہ بن گیا تھا۔ وہ جھٹکے سے اٹھا اور کچھ دور جا کے پلٹ کر
کھڑا ہو گیا۔

آکا کا سر زمین سے ٹکرایا تھا اور بھی کئی جگہ چوٹ آئی ہوگی۔
چند لمحوں تک سکتہ چھایا رہا مگر دیکھتے دیکھتے وہ [illegible] پھر سیدھا
سیدھا کھڑا ہو گیا اور [illegible] سامنے کی طرف [illegible] سامنے اڈے کے
آدمی کھڑے تھے لیکن [illegible] ان میں سے کسی کے پیچھے ہی چاقو
[illegible] خوف محسوس ہوا تھا۔ اسی لیے وہ بڑبڑاتے
ہوئے پیچھے ہٹ گئے۔ اسی دوران آکا بھی کچھ سنبھل گیا تھا۔ اس نے
مڑ کے جمیل کو دیکھا اور چند [illegible] بڑی آنکھوں سے یکبارگی جتنی دیر
میں وہ اٹھ کے دوبارہ سامنے آیا، جمیل اس کے قریب پہنچ سکتا تھا
لیکن یہی جگہ [illegible] ہم سب کا یہی خیال تھا کہ شاید اب آکا اپنا
چاقو پھینک دے گا، اسے پھینک ہی دینا چاہیے تھا۔ پسینے سے
اس کا چہرہ تر تھا اور [illegible] سے خون جھلک رہا تھا [illegible]
چھلی ہوئی تھی [illegible] رکھا ہوا تھا۔ پہلے کی طرح چنگھاڑتا
وہ پھر جمیل کی جانب بڑھا۔ اس بار اس کا چاقو اس کے ہاتھ ہی
میں رہا۔ حق تھا کہ اس نے ساری توجہ چاقو کی گرفت ہی رکھنے پر دی تھی۔
وہ دائیں بائیں اور پیچھے [illegible] جیسے
[illegible]
اب بہت کچھ کاٹنے کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ جمیل کے اجتناب اور
تاخیر کا کیا سبب ہو سکتا ہے۔ وہ آکا کی بچی کھچی [illegible]
اور اسے زندہ ہی رکھنا چاہتا تھا کہ [illegible] کی ناکامی سے آکا کے ہاتھ
بہکنے لگے تھے۔ یہ کاٹنے کو جمیل کی دیر طلبی سے الجھن ہو رہی تھی۔
جتنی دیر تک آکا سامنے تھا، جمیل کے [illegible] رہا تھا لیکن
جمیل کا اپنے بارے کا خیال یقیناً کاٹنے سے زیادہ ہوگا۔

جمیل کے سامنے صرف آکا نہیں تھا۔ اڈے کے آدمی بھی تھے
جن سے جلد یا کسی وقت اس کا واسطہ پڑنے والا تھا۔ جمیل نے
تھکنے میں کاٹنے سے زیادہ نہیں سنا تھا۔ یہاں یہ آدمی اپنے
پیچھے [illegible] صبح و شام سے وہی اتنا بھی لازمی تھا جتنا کاٹنے۔
وہ اڈے پر [illegible] لیکن گلی کے لڑکوں کو ساتھ لے
چلنا اور اڈے پر آ کے آن کی آن میں بڑھ جانے کا انتظار کرنے سے اس
کی مراد اڈے کے آدمیوں کو ان کے موجودہ دل کا درجہ بتانا اور
زیادہ سے زیادہ یہیں تک گوارا کرنا ہی نہیں تھا بلکہ کاٹنے کی حیثیت

کا احساس دلانا بھی مقصود تھا۔ اڈے کے آدمیوں کی موجودگی میں اُستاد دادا
ہی کی طرح اپنے مقابل کو برتتا ہے اور اگر آغا کی جزئیت سے اڈے
کے آدمی کوئی قوت محسوس کرتے تھے تو انھیں یہ سامان دیر تک
حسّاک دینا چاہیے تھا اور یہی کی تحویل میں تھیں اور وہ پریشے تھے۔ جگل کو
ان لوگوں تک یہی کچھ منتقل کرنا تھا کہ یہ سب کچھ کسی جانتے۔ آغا کی کسی
چوک یا اتفاق پر مبنی نہیں ہے۔ شاہ کبیر کے واقعے سے ان پر کوئی
نہ فرق قائم تھا تو ان حالات میں جگل کو وہ تاثر بیدا ہی کرنا تھا۔
آغا کی کنپٹی سے بہتا ہوا خون اس کے جبڑے پر آگیا تھا۔
اُسے اندھا دھند ہاتھ چلاتے اور جگل کو اپنا جسم اس کی پہنچ سے
دور رکھتے بس یہی لوجہ ادھر گھومتے، اچھلتے دیر ہو گئی تو اس نے
پہلی مرتبہ ترک کے سامنے سے آغا کی کلائی پر ہاتھ ڈالا اور پیچھے کی
جانب زور سے جھٹکا دیا۔ آغا کی کرب ناک چیخ عمارت کے باہر تک
گونجی ہوگی۔ چاقو تو اس کے ہاتھ سے چھوٹا ہی تھا، وہ خود بھی اپنے
بس میں نہیں رہا اور لڑکھڑاتا ہوا فرش پر گر پڑا۔ وہ وحشت میں بار
بار اپنا ہاتھ جھٹک رہا تھا اور اس کی کراہیں عمارت کے در و بام میں گونج
رہی تھیں۔ کانتے نے پہلی بار جگل کے ہاتھوں میں لرزش دیکھی، اس کا
چہرہ بھی سنگ رہا تھا تاہم وہ لمحوں میں جھکڑا آغا کو گھونسا مار رہا۔ آغا کے
پہنچے کی ہڈی یا تو ٹوٹ گئی تھی یا اپنی جگہ نہیں رہی تھی۔ تبھی وہ اپنی
کراہیں روکنے پر قادر نہیں تھا۔ وہ دوبارہ خود نہیں اٹھا۔ جگل نے اسے
گدی سے پکڑ کے کھڑا کیا اور اس کے شانے پر ترچھا ہاتھ مارا۔ آغا تڑپا
ہوا گر گیا تھا۔ جگل نے آگے بڑھ کر چاقو اٹھا لیا اور اس کے پیٹ میں گھٹنے
سے ضرب لگائی۔ وہ دہرا ہو کے فرش پر تڑپنے لگا۔ جگل نے آگے
بڑھ کے اس کے بال پکڑ لیے اور سر جھنجھوڑتے ہوئے بولا "شاہ کبیر
کے وقت گرا دھر نہیں تھا نا؟"

آغا کو جواب کا یارا نہیں تھا۔ جگل نے انتظار بھی نہیں کیا۔
چاقو ڈال کے اس کا گریبان چاک کر دیا۔ "لگتا ہے اس وقت جو
ادھورا رہ گیا تھا، وہ تیرے سے پورا کرنے کو لکھا تھا۔"

آغا کی پیشانی خون سے لال ہو گئی۔ خون اتر کے اس کی بھوؤں
اور آنکھوں میں بھی بھر گیا۔ اس کے ایک ہاتھ کو پہلے ہی قرار نہیں
تھا، دوسرے سے وہ پیٹ پکڑے ہوئے تھا۔ تکلیف کی شدت ہی ہوگی
کہ اس کی آواز گھٹ کے رہ گئی لیکن اس نے سن لیا ہوگا کہ جگل نے
کیا کہا ہے۔ اس کا مطلب بھی شاید اس کی سمجھ میں آگیا تھا چنانچہ
اس کا چہرہ بگڑا، جسم سمٹنے اور اکڑنے لگا۔ "وہ کنجر کا بچہ شاہ کبیرا
وقت پہ اینڈ گیا تھا۔ سالے کو لگی آگئی تھی پہ تیری کھال اس سے بھی
بچے اپنجل کو بھی پتہ کہ اس سے اچھی آتی ہے۔ ذرا تار کے رکھ جانے
گا تو یہ تیرے ماں کے یار کچھ دیر تک یاد رکھیں گے کہ آیا تھا ایک

دادا، اُنھوں نے تیرا بہروپ دیکھا ہے۔ اب ذرا اصلی روپ میں تو
ان کو جھمکا لگا کے بتا۔"

جگل کی سرد آواز اور اس کے جلتے ہوئے لہجے سے کانتے کو یہ شبہ
ہو چلا تھا کہ کہیں اس کے دماغ میں آغا کو برہنہ کرنے کا سودا تو نہیں
سما گیا ہے۔ پھٹے ہوئے گریبان سے آغا کا سینہ جھلک رہا تھا۔ یہ چند ہی
لمحوں کی بات تھی کہ جگل اس کے لباس میں دوبارہ چاقو ڈال کے
کھینچتا چلا جائے مگر جگل نے چاقو پیچھے اچھال دیا۔ اس نے ناچلے
کا خیال کرکے چاقو پیچھے اچھالا تھا۔ چاقو کانتے ہی کے پاس آسکتا
تھا۔ کانتے نے اُسے زمین پر نہیں گرنے نہیں دیا۔ آغا کے سر کو کئی
جھٹکے دے کے جگل نے اس کے بال چھوڑ دیے اور آہستہ سے آگے
چوکی کے سرے پر پاؤں لٹکا کے بیٹھ گیا۔

چند لمحوں تک اڈے پر موت طاری رہی۔ پھر اُن کے جسموں
میں اُس وقت حرکت سی نظر آئی جب جگل نے کالے دادا کو اپنے
پاس آنے کا اشارہ کیا۔ کالے دادا بجری کی طرح سمٹ سا گیا۔ بجتے چپکتے
پیروں سے وہ اس کے پاس پہنچا اور سر جھکا کے کھڑا ہو گیا۔ جگل نے
بڑبڑاتے ہوئے اُسے کوئی ہدایت کی۔ کالے دادا کے سوا کوئی کچھ نہ سن
سکا۔ اسی لمحے اڈے کے تمام آدمی اپنی جگہوں سے آغا کے جسم
کے گرد جمع ہو گئے۔ انھوں نے اس کے قدموں میں چاقو ڈال دیے تھے
مگر جگل نے انھیں منع کر دیا۔ "ابھی اپنا ادھار اس کا تھوڑا حساب باقی
ہے۔ چکا کر کے ہی تم سے بات کریں گے۔" اس نے گھن گرجتی آواز میں
کہا۔ "ابھی کالے ہی ادھر سب دیکھے گا۔"

کانتے بتا رہا تھا کہ کالے دادا اور اڈے کے دوسرے آدمی آغا
کو اٹھا کے اندر ایک کمرے میں لے گئے۔ کچھ دیر بعد جگل بھی منہ پہ
چھپکا مار کے وہیں چلا گیا۔ کانتے سے اس نے ساتھ آنے کو نہیں کہا
تھا اس لیے وہ باہر ہی ٹھہرا رہا۔ جگل کے اندر جاتے ہی کالے دادا
اور اس کے ساتھی فوراً واپس آگئے۔ صرف جگل اور آغا کمرے میں کیسے
رہ گئے تھے۔ بند دروازے سے صرف ایک مرتبہ آغا کی گھٹی ہوئی چیخ
سنائی دی پھر خاموشی چھا گئی۔ کانتے پر ایک ایک لمحہ بھاری گزر رہا
تھا مگر جگل کو باہر واپس آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی اور اس کے
چہرے پر کوئی ایسی علامت نہیں تھی جو کانتے کی مضطرب نگاہوں
کے لیے کسی سکون کا سبب بنتی۔ باہر آکے جگل نے کالے دادا سے
وقت پوچھا۔ رات کے گیارہ بجے تھے۔ اس نے کالے دادا کو ہدایت
کی کہ اس کی واپسی تک تمام لوگ اڈے پہ موجود رہیں پھر ادھر ادھر
نظریں دوڑاتے ہوئے اس نے ایک آدمی کی جانب انگلی اٹھائی۔ وہ
چھریرے جسم کا نوجوان تھا۔ اس کا نام مولا تھا۔ مولا سر ہلا کے لپکا اور
جگل کے پیچھے پیچھے کے فرش پہ بیٹھ گیا۔ زردا، بھورا، شاہ مراد اور نگورو ہیں

رہ گئے۔ زردا بمبئی میں چھنگا استاد کے بے دخل ہو جانے کے بعد
اڈا دو چھنار رہا تھا اور لوگوں کو اچھی طرح قابو میں رکھ سکتا تھا۔ جگل نے
اُس سے یہی کہا ہوگا لہٰذا وہ فوراً چوکی پہ جا کے بیٹھ گیا۔ اندر کمرے
سے آکے جگل نے تین چار منٹ سے زیادہ نہیں لگائے ہوں گے کہ
کانتے اور مولا کو ساتھ لے کے عمارت سے چلا آیا۔

وہ چوک کے عام راستے کے بجائے گلیوں میں گھومتے ہوئے جلد
ہی سڑک پہ آگئے۔ مولا نے بھاگم بھاگ آگے جا کے ایک رکشا والے
سے بات کی اور تینوں ایک ہی رکشا میں بیٹھ گئے۔ وہ ٹھسے ہوئے
بیٹھے تھے۔ رکشا چلانے والا ابھی اُن کے منزل سے ہانپ رہا تھا۔
پلاٹیا کے قریب انھیں بگھی کو سواری بھی نظر آئی۔ تانگا بھی تانگے
کا گھوڑا نسبتاً تگڑا تھا اس لیے وہ رکشے سے اُتر کے تانگے میں سوار
ہو گئے۔ تانگے والے نے تو تکرار کی مگر مولا کا پاؤں دیکھ کے ٹھنڈا پڑ
گیا۔ جگل نے بیٹھتے ہی پانچ روپے کا نوٹ اُس کے حوالے کر دیا۔ پھر
تو اس کی رفتار ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ راستہ بھی صاف تھا۔ اکّا دکّا
سواریاں چل رہی تھیں۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد وہ اپنی منزل کے سامنے
تھے۔ اس وقت پونے بارہ بجے ہوں گے۔ کانتے کو کچھ معلوم نہیں تھا
کہ وہ کہاں آئے ہیں۔ راستے میں مولا کی وجہ سے اُس نے کچھ پوچھنے
کی کوشش نہیں کی تھی۔ ویسے بھی شاید وہ خاموش ہی رہتا کیونکہ جگل
کی مرضی کے بغیر اس سے کچھ جاننا ممکن نہیں تھا۔ کانتے کا دل جیسے
کسی نے مٹھی میں بند کر لیا تھا۔ تانگا جس جگہ جا کے ٹھہرا وہ کسی حویلی
کا دروازہ ہی ہو سکتا تھا۔

"حویلی کا دروازہ! تم، تم ......" میں نے گھبرائی آواز میں اُس
سے پوچھا۔ اتنی دیر تک میں اپنے آپ کو جیسے بھینچے بیٹھا رہا تھا کہ میری
مداخلت سے کانتے کے تسلسل میں کوئی رکاوٹ نہ آجائے مگر کانتے
کی زبان پر حویلی پہنچنے کا ذکر میرے کانوں کے لیے عجوبہ تھا۔ میں چپ
نہ رہ سکا۔

"ہاں لالہ! وہ تھکی تھکی آواز میں بولا۔ "وہ حویلی کا دروازہ
ہی تھا۔ نواب کی حویلی کا۔"

"یعنی تم ... تم وہاں تک گئے تھے؟" میری زبان اٹک رہی تھی۔

"یہی تو بول رہا ہوں۔ رات سالی بہت اوپر ہو گئی تھی۔ میں نے
استاد کو بولنا چاہا کہ ایک رات اور نکلنے دیتے ہیں۔ سویرا ہوتے ملیں
گے لیکن ہم وہاں پہنچ ہی گئے تھے تو میرا کچھ بولنا بالکل بے کار تھا نا
سالا! استاد مان کے نہیں دیتا۔" کانتے کا گلا خشک ہو گیا تھا۔ شاید وہ
اٹھ کے چارپائی کے پاس رکھی ہوئی صراحی سے ایک کٹورا پانی لا
کے اُسے دیا۔ کانتے نے ایک ہی سانس میں پورا کٹورا اتار لیا۔

مجھے یقین نہیں آرہا تھا مگر کانتے مذاق نہیں کر رہا تھا۔ اُس
کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ وہ جس رات کی بات کر رہا تھا، اُس دن
ہمیں تہ خانے سے ملازموں کے حصے ہی میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ گویا یہ جگل کا
اندازہ بالکل صحیح تھا۔ اسی یقین ہی کی بنیاد پہ وہ اتنا پُر اعتماد نظر آتا
تھا۔ کانتے کے رکنے سے مجھے بے چینی ہو رہی تھی۔ دل تیزی سے
دھڑک رہا تھا۔ مجھے تنگ آ کے اس کے چہرے کو جگل کی شکل میں
نمودار ہوئی۔ کہنے لگا کہ حویلی خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ دروازے کے
چوکیدار بند دریں لیے ہوئے تھے۔ وہ انھیں دیکھ کے بہت حیران ہوئے۔
جگل نے اُن سے کہا کہ وہ پردیسی ہیں اور بڑے نواب سے ابھی اسی وقت
ملنا چاہتے ہیں۔ چوکیداروں نے ہچکچاہٹ کی تو جگل کو سختی اختیار کرنی
پڑی۔ اُس نے اُن سے کہا کہ نواب کی بھلائی اسی میں ہے کہ جو کچھ
ہم کہہ رہے ہیں تم اُتنا ہی اُس سے جا کے کہہ دو۔ مولا کو ہم پیچھے
نواب سے متعلق کوئی ضروری بات کرنا چاہتے ہیں۔ اگر وہ سو رہا ہو
تو اُسے جگا دیا جائے۔

چوکیدار نے دوسرے چوکیدار سے کھسر پھسر مشورہ کیا اور
انھیں وہیں ٹھہرا کے اندر چلا گیا۔ اس کے چلتے وقت جگل نے اسے
تاکید کی تھی کہ وہ زیادہ دیر انتظار نہیں کریں گے اور جیسا کہ جگل نے
کہا تھا، انھیں اتنا ہی انتظار کرنا پڑا جتنی دیر میں اندر جانے والے عمارت
کی طویل گزرگاہ عبور کرکے کوئی اندھا بھی واپس آسکتا ہے۔ انھیں
اندر طلب کر لیا گیا تھا۔ وہ دونوں جانب مسلح چوکیدار اُن کے ساتھ تھے۔
انھیں عمارت کے چبوترے پر سامنے کے ایک وسیع عریض کمرے
میں بٹھا دیا گیا۔ جگل نے مولا کو باہر راہداری میں چھوڑ دیا تھا۔ کانتے
کہہ رہا تھا، اُسے توقع نہیں تھی کہ نواب دو اجنبیوں سے اس وقت
ملاقات پہ آمادہ ہو جائے گا۔ حویلی کی شان و شوکت سے ظاہر ہو رہا
تھا کہ وہ کوئی بڑا نواب ہے۔ کانتے کو اصل بات کا کچھ اندازہ نہیں
تھا۔ طرح طرح کے وسوسوں سے اس کا دماغ بھرا ہوا تھا۔ انھیں کمرے
میں بیٹھے چند منٹ سے زیادہ نہیں ہوئے ہوں گے کہ اندرونی دروازے
سے آگے پیچھے دو بھاری بھرکم شخص آگے پیچھے برآمد ہوئے۔ وہ بظاہر
آہستہ آہستہ اندر آئے لیکن اُن کے چہروں سے اضطراب صاف ظاہر
تھا۔ جگل کھڑا ہو گیا اور کسی تعارف و تمہید کے بغیر آگے آنے والے
شخص سے بولا۔ "کیا آپ ہی بڑے نواب صاحب ہیں؟" اُس نے اختیاری
انداز میں سر ہلا کے اقرار کیا اور جگل سے بیٹھ جانے کے لیے کہا۔ وہ خود
بھی قریب کے ایک صوفے پہ بیٹھ گیا۔

"ہم کو آپ سے اکیلے میں بات کرنی ہے۔ ان کو بول کہ ابھی کچھ دیر
کے لیے باہر چلے جائیں۔" جگل نے اس کے پیچھے آنے والے کی طرف
اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ اپنے ہی آدمی ہیں۔" نواب گڑبڑا کی آواز میں بولا۔

"ہم ہم کو صرف آپ سے بات کرنا ہے۔"

نواب نے کچھ توقف کیا اور متجسس نگاہوں سے تجمل کو گھورتا رہا پھر اس نے اپنے ساتھ آنے والے شخص کو اشارہ کر دیا۔ اس کے جاتے ہی تجمل نے کہا۔ "دیکھو نواب صاحب! ہم کو کئی زبان میں بات کرنا آتا ہے لیکن ہم سیدھی اور صاف زبان میں بات کرتے ہیں اس بھروسے پر کہ آپ بھی اس کا ویسا ہی جواب دو گے۔"

"کیا بات ہے؟" نواب نے متفسرانہ لہجے میں کہا۔

"بات آپ کے لیے اتنی بڑی نہیں جتنی اپنے لیے ہے۔ لیکن آپ کے لیے بھی کسی وقت بہت بڑی ہو سکتی ہے۔ ہم اپنے دو آدمیوں کے لیے آپ کے پاس آئے ہیں۔"

"کیسے آدمی؟" نواب نے تلخی سے کہا۔

"ہم کو معلوم تھا، آپ یہی جواب دو گے لیکن ہم یہ سننے کے لیے ادھر نہیں آئے ہیں۔"

"آپ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"ہم جو بول رہے ہیں سوچ سمجھ کے بول رہے ہیں۔ اتنا بہت سمجھو کہ ہم حویلی میں سیدھے راستے سے آئے ہیں اور آپ سے اپنے دو آدمیوں کے سوا کچھ نہیں مانگ رہے۔ ان آدمیوں کو چھوڑنے کا حکم دو نواب صاحب! آپ سمجھتے ہو کہ وہ خانم تک پہنچنے کا کوئی رستہ بن سکتے ہیں تو یہ آپ کی بھول ہے۔ وہ مر جائیں گے اور ایسے آپ کو خانم کے بارے میں کچھ نہیں بولیں گے۔ آپ نے ان دو کو ادھر ڈال کے شکنجے میں ہاتھ ڈالا ہے۔ وہ ایک دو نہیں ہیں۔ آپ گنتی کرتے کرتے تھک جاؤ گے اور وہ سب ایسے ہیں کہ ان کو لوٹ کے پیچھے دیکھنا نہیں آتا۔"

"آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔" نواب نے تمتماتی آواز میں کہا۔

"غلط فہمی آپ کو ہوئی ہے۔" تجمل نے تندی سے کہا۔ "دیکھو نواب! فضول کی بات مت کرو۔ چھوٹے نواب کے حال کا تھوڑا بہت پتہ اپنے کو چلا ہے پر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ کاٹ کھانے کو دوڑ چلو۔ اپنے آدمی کو آزاد کرو نواب صاحب! خانم کے بارے میں آپ کو کوئی بات کرنی ہے تو ہم سے بولو۔"

"جہاں تک آپ کے آدمیوں کا تعلق ہے ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ آپ کو دھوکا ہوا ہے۔" نواب نے سخت لہجے میں کہا پھر پہلو بدل کے بولا۔ "لیکن دوسری بات بے شک صحیح ہے۔ ہمیں خانم کی ضرورت ہے، کسی بھی قیمت پر۔"

"قیمت پر؟" تجمل بھڑک کے بولا۔ "آپ کیا قیمت لگا سکتے ہو نواب؟ ذرا زبان سنبھال کے بولو۔ خانم کا نام لیتے ہوئے تم کو دھیان رکھنا چاہیے کہ اس کے رکھوالے تمہارے سامنے بیٹھے ہیں۔ خانم کوئی بکاؤ مال نہیں ہے، وہ کسی گھر کی عزت ہے، ہمارے گھر کی۔ عزت کی قیمت آپ کے ہاں لگتی ہو گی، اپنے ہاں ایسا نہیں ہوتا۔"

"خیر چھوڑیے، ہماری گزارش ذرا تحمل سے سنیئے۔" نواب کا لہجہ یکایک بدل گیا۔ "اگر آپ واقعی خانم سے تعلق رکھتے ہیں تو یقین کیجیے ہمیں آپ کا شدت سے انتظار تھا۔ ہو سکے تو ہماری مدد کیجیے۔ قیمت سے کچھ اور نہیں محض اپنی طلب کا اظہار مقصود ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم اور کس طرح آپ کو اپنی مجبوری باور کرائیں۔ ہم سے تفصیل مت پوچھیے، بہتر ہے کہ ہمارے ساتھ چل کے چھوٹے نواب کو دیکھ لیجیے اور خود کوئی فیصلہ کر لیجیے۔" وہ بے چینی سے بولا۔ اس کی آواز بھرا رہی تھی۔ "ہمیں ہر صورت خانم مطلوب ہیں۔ یقیناً وہی چھوٹے نواب کا مداوا بن سکتی ہیں۔"

"آپ کو اتنا بولنے کی ضرورت نہیں ہے، کچھ لیے کر بھی سمجھائی دیتا ہے۔ اپنے آدمیوں کو گروی رکھنے کے پیچھے کوئی ایسی ہی بات ہو سکتی ہے۔ رشتے داری تو چھوٹے نواب سے نہیں نکلتی کوئی ان کی۔ چھوٹے نواب کو ہم نے خانم کو ادھر سے لے جاتے وقت دیکھا تھا۔ وہ اس وقت واپس چلے گئے تھے پر ہم اسی وقت کھٹک گئے تھے کہ نواب آدھے ہو کے واپس گئے ہیں۔ ہم نے سب کچھ خانم کی مرضی پر چھوڑ دیا تھا۔ اس کو پورا اختیار تھا کہ اپنے ساتھ جانے کا فیصلہ کرے یا چھوٹے نواب کے ساتھ۔ ادھر بھی ساری بات طے ہو گئی تھی۔"

"ہمیں معلوم ہے کہ کچھ ایسا ہی ہوا تھا لیکن یہاں کچھ اور ہی ہوا۔" نواب گرفتہ لہجے میں بولا۔ "ہم آپ کو کیا بتائیں۔"

"نواب لوگ کی بات ہے۔ اپنی گدّی ادھر ہی جیسے ہی دیکھا آنکھ سے ان کو نوچ کچھ پیچھے کھٹک گئی تھی چھوٹے۔ کوئی بیماری سی سال بہت منہ چڑھاتی ہو گی، لگتا ہے خانم کو جھگڑے کے چلتے ادھر چھوڑ گیا۔ خانم کے جانے کے بعد بازار چوپٹ نہیں ہو گیا ہے نواب لوگ سلامت رہیں روز ایک سے ایک نئی نویلی بچی یہاں ادھر بولی پر چڑھائی جاتی ہے۔"

"ایسا نہیں ہے جس طرح آپ سوچ رہے ہیں، خدا ویسا نہیں ہے۔" نواب نے التجائی لہجے میں کہا۔ "خانم کی واپسی کے بعد کتنے دن گزرتے گئے، چھوٹے نواب ان کے اور قریب ہوتے گئے اور ان کی حالت روز بروز ناقابل برداشت ہوتی گئی۔"

"پھر اتنے دنوں کی دل گرفتگی کے بعد آپ کو لاٹری نکل آئی، خانم کے دو چہیتے آپ کو دکھائی دے گئے۔ بیچ میں ایک نواب کا معاملہ تھا، سیدھی طرح کام نہیں بنا تو آپ نے ان کو اٹھوا لیا۔"

"ہم اس قسم کے طرز کلام کے عادی نہیں ہیں۔" نواب کا چہرہ سرخ

ہو گیا، تنک کے بولا۔ "مناسب ہو گا کہ آپ احتیاط سے گفتگو کریں۔"

"ہم کو کبھی عادت نہیں ہے نواب صاحب! اپنی بات کو یقین کرو، آپ کے سر کی قسم ہم بہت لگام سے کے ہی بول رہے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ آپ بڑے بڑوں کے نواب ہو، یہاں کے بادشاہ لگتے ہو، اس لیے کہ آپ کو سر شیب طرح کام نہیں کرنا ہے۔ کچھ دیر کے لیے اس کو ٹھکانے پر لے آؤ اور جو ہم بولتے ہیں دھیان سے سن لو ہم کو اپنے آدمی چاہئیں، سیدھے اس لیے آپ کے پاس آ گئے ہیں کہ آپ کا بھیجا سمجھا دیں ورنہ چھاپے کو کچھ لا سکتا تھا۔"

"مختار! ہم نے آپ سے بہت مروت برتی ہے محض اس وجہ سے کہ اپنے چھوٹے بھائی کی زندگی ہمیں تو سب سے زیادہ عزیز ہے، زبان درازی کی سزا ہمارے ہاں ایک ہی ہوتی ہے۔ شاید آپ نہیں جانتے کہ آپ کہاں بیٹھے ہیں۔"

"جانتے ہیں اچھی طرح جانتے ہیں پر جتنا ہم آپ کو جانتے ہیں اتنا آپ بھی ہم کو جان لیں تو کالا اُجلا آپ کی سمجھ میں جلدی آ جائے گا۔" تجمل نے تلخی سے کہا۔ "بات زیادہ لمبی کیوں کرتے ہو نواب؟ ہم نے کچھ جان کے ہی ادھر آپ کے دروازے پر دستک دی ہے۔ ہم کہیں اور بھی جا سکتے تھے۔ اسے آپ دھمکی سمجھو یا کچھ اور۔ ہمارے آدمی واپس نہ گئے تو آپ کے اور آپ کی حویلی کے لیے مصیبت بن جائیں گے۔ ہم سے دوبارہ مت کہنا کہ وہ تمہارے پاس نہیں ہیں۔ ہاں کوئی اور بات ہو تو بولو۔"

نواب نے سر جھکا کے کچھ تحمل کیا اور کانپتے ہوئے توقع کے خلاف تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ہم سمجھ رہے ہیں کہ اپنے ان دو عزیزوں کی گمشدگی سے آپ کس ذہنی کشمکش سے دوچار ہو سکتے ہیں لیکن ہمارے پاس افسوس اور ہمدردی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ بیشک ہم کب سے ان لوگوں کی جستجو میں ہیں جو خانم کا کوئی اتا پتہ جانتے ہوں اور اپنے چھوٹے بھائی کے دکھ کا مداوا کر سکیں ہم نے۔ ہاں کسی طرح آپ تک پہنچے اور آپ سے درخواست کرنے کے لیے مختلف لوگوں سے پوچھ گچھ کرائی تھی مگر اس سلسلے میں نہایت احتیاط کی گئی تھی مگر معلوم ہوتا ہے یہ بات چھپی نہ رہی ضرور ایسے ہی کسی واقف نے آپ کو اس حویلی کی جانب اشارہ کر دیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں اس میں ہمارے لیے بہتری ہی کی کوئی صورت مضمر ہے۔ آپ تسلی رکھیں ہم آپ کے عزیزوں کی تلاش میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں گے ساتھ ہی ہماری گزارش ہے کہ ہماری زندگی، ہمارے بھائی کے سلسلے میں آپ کوئی نرمی ضرور اختیار کیجیے۔ خانم کے بغیر جو ممکن تھا ہم کر چکے ہیں کچھ اور ہمارے امکان میں ہوتا تو ہم آپ سے کبھی اصرار نہ کرتے۔"

"کیا یہ کوئی خطرہ ہے نواب صاحب؟"

"نہیں تعلق نہیں، ہمیں یقین ہے اگر آپ کے آدمیوں کو کوئی اور حادثہ پیش آ گیا اور وہ اسی ریاست میں موجود ہیں تو ہم سے اتنی دور نہیں ہیں۔ ہم ان کی بازیابی کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ یہ آپ کی اس عنایت کا نہایت حقیر معاوضہ ہو گا جو آپ ہمارے بھائی کی سلامتی اور خوشی کے لیے ہمارے ساتھ روا رکھیں گے۔ ہماری درخواست ہے کہ آپ ہمارے ساتھ چل کے ایک نظر ہمارے بھائی کو دیکھ لیں۔ شاید اسی طرح ہماری بات آپ تک کچھ رسا ہو سکے۔"

"آپ کی ہر بات اپنی سمجھ میں آ رہی ہے۔" تجمل نے اکھڑی آواز میں کہا۔ "پر آپ شاید کچھ نہیں سمجھ رہے ہو۔"

"ہماری التجا ہے کہ آپ ہمارے بدنصیب بھائی کو دیکھ لیں۔" نواب کے لہجے میں عاجزی شامل تھی۔ اس نے جیسے تجمل کی بات سنی ہی نہیں۔

"اس کو کیا دیکھنا۔" تجمل نے کسمساتے ہوئے کہا۔ "لگتا ہے آپ سب ٹھیک ہی بول رہے ہو۔"

"نہیں نہیں ہم پر اعتبار کریں اور ہم کہتے نہیں یا ہے ایسی بہتر ہو گا کہ آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ ہم خانم کی طلب یا نیت سے انکاری نہیں ہیں۔ بے شک وہ بالاخانے کی زندگی ترک کر کے کسی نہایت شریف خاندان سے وابستہ ہو سکتی ہیں۔ ہماری مراد نہیں ہے کہ وہ ہماری زندگی میں مراجعت کریں۔ ہم تو کچھ اور کہہ رہے ہیں۔ یوں کہیے کہ ہم خانم سے ایک مودبانہ اور اپنا کے لیے درخواست گزار ہیں۔ ان کی ذرا سی توجہ کسی شکستہ دل کی راحت و مسرت کا سبب بن سکتی ہے۔ نہ ایک نفس خانم کو ایسی جگہ نہیں کرنا چاہیے نہ اس خاندان کو جس کے قلب کی کشادگی خانم کی بدولت سے ظاہر ہے۔ یہ نہ فرض کریں کہ چھوٹے نواب کے متعلق شروع میں ہم بھی اتنی بدگمانی کے مرتکب ہوئے تھے جس کا شبہ آپ کر رہے ہیں کوئی بھی یہ سب کچھ جان کے یہی تصور کرے گا مگر ایسا نہیں ہے۔ بات کچھ اور ہے اور ہمیں اعتراف ہے کہ اس احساس نے پہلی بار ستایا لگے ہیں شاید ہم نے خانم کو کبھی دیکھا ہو لیکن ہمیں اپنے بھائی کی نگاہ پر پورا اعتبار ہے۔ خانم کچھ ایسے ہی اوصاف کی حامل ہوں گی کہ ان کے نقش اتنے گہرے ہیں اور کوئی خاندان ان سے ایسی شدید وابستگی کا مدعی ہے۔ خود خانم کا سب کچھ ترک کر دینا کسی طہارتِ قلب کا آئینہ دار ہے۔ ہمیں احساس ہے کہ نئی زندگی میں شامل ہونے کے بعد خانم کے متعلق اب کوئی گفتگو کرنا اور بعد ازاں ان کا نام لینا بھی ناروا ہے۔ ہمیں اس نازکی کا پورا احساس ہے مگر ہم ہم..."

اس کی آواز رندھنے لگی، بات منہ میں رہ گئی، وہ بہت مضطرب سا ہو گیا تھا۔ یکایک اپنی نشست سے کھڑا ہو گیا۔ تجمل کو اس نے

کچھ کہنے نہیں دیا اور بے تابانہ آگے بڑھ کے اُس کا شانہ پکڑ لیا۔

تجمل نہ چاہتے ہوئے بھی اُٹھ گیا تھا۔ کاشف بھی اُس کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ نواب نے اندر سے کسی شخص کو طلب کرنے اور ہدایت دینے کے لیے آواز بلند نہیں کی۔ جیسے ہی وہ کمرے سے نکلے انھیں دروازے کے پاس کئی آدمی کھڑے نظر آئے۔ اُن میں مسلح چوکی دار بھی تھے اور وہ شخص بھی جو ابتدا میں نواب کے ساتھ آیا تھا۔ تجمل اور کاشف کو نواب کے ساتھ دیکھ کے وہ محتاط یا خفتہ سا ہو گیا تھا۔ نواب نے اُن کی جانب دیکھا بھی نہیں وہ سب خود ہی سراسیمگی سے ایک طرف کھسکتے گئے۔ نواب تجمل کا شانہ تھامے تھامے تیز قدموں سے اندر بڑھتا رہا۔ کاشف نے کہیں پڑھا تھا کہ حویلی کسی راجا کے محل سے کم نہیں تھی۔ ہر طرف جھاڑ، فانوس، قالین اور آرائشی دیواریں محرابیں تھیں۔ حویلی کے اندرونی حصے میں زیادہ دور نہیں جانا پڑا۔ جہاں وہ بیٹھے تھے وہاں سے سو قدم ہی چلے ہوں گے کہ نواب کوئی دستک دیے بغیر تیزی سے ایک دالان میں داخل ہو گیا۔ دوسرے لمحے ڈیوڑھی نما ایک مختصر راستے سے گزر کے وہ ایک کمرے میں موجود تھے۔ دو باندیاں تھیں یا نواب عالم تاب کی بیگم یا کوئی اور۔ نواب کو اور انھیں اس طرح سر اٹھائے آتے دیکھ کے وہ پریشان ہو گئیں اور ابتری کی حالت میں ادھر اُدھر ہو کے تاریک گوشوں کی طرف لپکیں۔

تجمل آگے جاتے جاتے ٹھٹک کے رک گیا۔ چند قدم کے فاصلے پر کمرے کے وسط میں دیوار کے ساتھ لگی ہوئی مسہری پر ایک شخص لیٹا تھا۔ نحیف و نزار سا۔ ادھ کھلے سے کمرے میں ہلکی روشنی تھی لیکن اس کے خط و خال انھیں اچھی طرح نظر آ رہے تھے۔ زرد چہرہ، آنکھوں کے گرد حلقے، اُلجھا اور بکھرا ہوا سا کوئی وجود۔ ان تینوں کی آمد کی آہٹیں اس کے کانوں تک ضرور پہنچی ہوں گی۔ اس کی پلکوں پر ہلکا سا ارتعاش نمودار ہوا اور اس کے سینے کا مدوجزر کسی قدر زیر و زبر ہوا مگر اس کی آنکھیں بند ہی رہیں۔ کاشف نے اُسے پہلی بار دیکھا تھا پھر بھی اس کے لیے یہ قیاس کرنا مشکل نہیں تھا کہ اس کے سامنے کون پڑا ہوا ہے۔ اُجڑا ہوا آدمی ہے جس کی ڈوری چل رہی تھی۔ تجمل لمحوں تک دیکھتا رہا اور لرزتی آواز میں بولا۔

"یہ یہ کیا کر لیا ہے انھوں نے؟"

"یہی ہے۔" نواب نے بھنچے ہوئے ہونٹوں سے جواب دیا۔

تجمل کی آنکھیں مسلسل چھوٹے نواب پر جمی ہوئی تھیں۔ کاشف کا خیال تھا کہ شاید وہ نواب کی مسہری کے پاس جا کے اُسے قریب سے دیکھے گا مگر جلدی ہی پلٹ کے وہ دروازے کی طرف چل پڑا۔ باہر آ کے اس نے بڑھتے نواب کو آگے آنے کے لیے راستہ دیا اور تینوں واپس اسی نشست گاہ میں آ کے بیٹھ گئے۔ "ایسا کب سے ہے؟" اس نے پر سکون آواز میں نواب سے پوچھا۔

"تبھی سے۔ شروع میں البتہ سنبھلے رہے۔ بہلاتے رہے لیکن ادھر کچھ دنوں سے ......" نواب کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

تجمل دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا اور آہستگی سے بولا۔ "ہم کوشش کریں گے نواب صاحب اپنے جیسی کوشش۔"

"ہو سکے تو ہمیں خانم کا پتہ بتا دیجیے ہم خود جا کے اُن سے ......"

"نہیں۔" تجمل نے صاف انکار کر دیا۔ "آپ کے اُدھر جانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہم خود جا کے خانم سے بات کرتے ہیں۔ راضی ہونا نہ ہونا اُس پر ہے۔ ہم کو ڈر سا ہے کہ وہ اپنی بات لیے نہیں ٹلنے کی۔ اس وقت ہم آپ کو اتنا ہی بول سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ آپ بھی کچھ مت پوچھنا۔ آپ کی عمروں نے ایک ہی طرح سے جانا سیکھا ہے۔ بولی بڑھانے کے خیال میں مت رہنا۔ اس کا تھوڑا بہت اندازہ آپ کو جاتے آدمیوں سے بھی ہو گیا ہو گا۔ اپنے روپیہ پیسے کے ادھر آپ کے پاس حویلی میں ڈھیر لگے پڑے ہیں، اُن کی اپنے کو اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی آپ کو ہے۔ اس کو سنبھال کے رکھو اور ہماری طرف سے اپنے آگے آنے والوں کے لیے سوغات سمجھو۔" تجمل نے زبان روک لی اور سپاٹ لہجے میں بولا۔ "اپنا مطلب ہے نواب صاحب ہم خانم کے پاس آدمی بھیجتے ہیں۔ آگے اچھے کی ہی آس رکھو اور ہمارے آدمی ہم کو واپس کر دو۔ ان سے آپ کو کچھ نہیں مل سکے گا۔"

نواب نے اضطراری انداز میں پھر دبی وضاحت کرنی چاہی۔ ہیرے اور پیسے کے بارے میں پھر لاعلمی ظاہر کی۔ کاشف کو حیرت تھی کہ تجمل نے اُس سے کوئی بحث نہیں کی وہ اسی لمحے اٹھ کھڑا ہوا۔ چلتے چلتے اُس نے نواب سے کہا۔ "ابھی نہیں تو سوتے میں دھیان کر لینا۔ ہم کو اپنے آدمی لوٹنے کا انتظار رہے گا۔ وہ لوٹ کے اپنے پاس آ گئے تو بھی جو ہم نے بولا ہے اپنی جگہ ہے اور آپ مان سکتے ہو۔ یہ بات آپ کے لیے اپنے من میں کوئی گھر ہی بنائے گی۔"

نواب اُسے روکتا اور اس سے کچھ کہتا رہ گیا۔ تجمل چل پڑا تھا۔ تاہم دروازے سے نکلتے نکلتے وہ ٹھہر گیا۔ "ایک بات اور سُن لو نواب!" اُس نے تند لہجے میں کہا۔ "اُن کے ساتھ کوئی ایسی ویسی ہوا تو یہ حویلی اپنی جگہ دکھائی نہیں دے گی۔ بہت بڑا گھاٹا ہو جائے گا۔ ہماری کے لیے کسی اور کے پاس نہیں جائیں گے لوٹ کے ادھر ہی آئیں گے۔ پیسے آپ کے پاس اور خانم پر کچھ نہیں ہے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ خانم کے آنے تک وہ آپ کے پاس بدلے میں رکھے ہوئے ہیں۔ ہو سکے تو ہوش میں رہنا۔ ہم نے پہلے ہی بول دیا ہے کہ آپ گھٹنے گھٹنے ٹھنک جاؤ گے۔"

راہ داری میں مولا موجود تھا اور حویلی کے باہر تانگا بھی کھڑا تھا۔ تینوں تانگے میں بیٹھ کے اڈے آ گئے۔

کاشف نے رک کے ایک گہری سانس کھینچی اور پلکیں جھپکائیں۔

"کالا سالا پتہ ہی نہیں چلا۔" وہ انگڑائی لیتا ہوا بولا۔

واقعی کسی کو احساس نہیں ہوا تھا۔ دھوپ ابھی دیواروں سے دور تھی لیکن ہر طرف اُجالا پھیلا ہوا تھا۔ شاہ مراد، زورا اور مستگر سب اس طرح کاشف کے گرد ہمہ تن گوش بیٹھے تھے گویا میری طرح وہ بھی پہلی بار سب کچھ سن رہے ہوں۔ بار بار اُن کی نگاہیں مجھ پر اُٹھتی رہی تھیں جیسے مجھ سے کہہ رہی ہوں "سنا تم نے؟" میں نے کاشف سے خود اصرار کیا تھا اور مجھی کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کاشف جان بوجھ کے مجھے یہ سب کچھ سنا رہا ہے۔ مجھے کوئی فرد جرم سنا رہا ہے۔ مجھ میں اُس سے اور کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں تھی مگر وہ خود ہی کہنے لگا۔ وہ اڈے واپس آئے تو رات بہت ہو گئی تھی اور آکا کے سوا سبھی موجود تھے۔ تجمل کی ہدایت پر زورا اُسی وقت خاموشی کے ساتھ اڈے سے نکل گیا۔ اتنے دنوں میں وہ شہر کے گلی کوچوں سے کسی حد تک واقف ہو گیا تھا۔ آبا جان کے پاس سے تجمل اندھیرا ہونے پر چلا تھا۔ وہ اُس کی واپسی کے بے چینی سے منتظر ہوں گے۔ رات گزرنے پر اُس کے نہ آنے سے اُن کے دل میں ہول اٹھ رہے ہوں گے۔ زورا نے راستے میں بہت احتیاط کی کہ وہ کسی کی نظروں میں آئے بغیر منزل پر پہنچ جائے۔ جس وقت وہ ہوٹل میں داخل ہوا تقریباً ڈھائی بج رہے تھے۔ کئی دن سے آبا جان کے ساتھ وہ اسی ہوٹل میں مقیم تھا اس لیے یہاں کسی غلط انداز نگاہ کی اُسے پروا نہیں تھی۔ آبا جان اور مارتی آنتیں گن رہے تھے۔ اُسے اکیلا دیکھ کے اُن کے چہرے زرد پڑ گئے اور زورا کو انھیں یہ یقین دلانے میں بہت مشکل پیش آئی کہ تجمل ہی نے اُسے بھیجا ہے۔ انھیں زیادہ بتا بھی کیا سکتا، خود ہی کتنا معلوم تھا۔ وہ نہ کاشف کی طرح تجمل کے ساتھ ٹھکانوں میں گیا، نہ بڑے نواب کی حویلی میں۔ درمیان میں اُسے کاشف سے سن گن لینے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ تجمل نے جو کہا تھا اُس نے وہی آبا جان کے سامنے دہرا دیا۔ تجمل نے آبا جان کو پیغام بھیجا تھا کہ میرا اور ہیرے کا سراغ بڑی حد تک مل گیا ہے اور امید ہے کہ تجمل جلد اُن کے پاس پہنچ بھی جائے گا۔ اس کے نہ آنے سے آبا جان گھبرائیں نہیں وہ کسی سبب سے رک گیا ہے اور آئندہ بھی ممکن ہے وہ دونوں سے بار بار نہ مل سکے۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح آبا جان سے رابطہ ضرور رکھا جائے گا۔ اُس کی کوشش ہو گی کہ کل کسی وقت آبا جان کے پاس پہنچ کے انھیں تفصیل بتا سکے۔ وہ اطمینان سے ہوٹل میں ٹھہرے رہیں اور اپنی جانب سے کوئی قدم نہ اٹھائیں۔

تجمل کو احساس ہو گا کہ صرف اتنی بات آبا جان کو کبھی مطمئن نہیں کر سکے گی اس لیے اُس نے زورا سے کہہ دیا تھا، اگر آبا جان نہ مانیں تو وہ انھیں بتا دے کہ بیچ میں ایک بڑے نواب کا معاملہ الجھا ہے۔ آبا جان کی یہاں بھی کہاں تسلی ہوتی۔ وہ اور بدحواس ہو گئے۔ زورا نے سب ٹھیک ہے سب خیریت ہے، بابا کیسے کیسے حیلے کیے۔ اپنے طور پر بہت کوشش کی لیکن وہ کرید کرید کے پوچھتے رہے۔ "بتاؤ تم کیا چھپا رہے ہو؟ صاف صاف کیوں نہیں بتاتے کہ میاں شمع لوگ کہاں کہاں گئے کن کن لوگوں سے ملے اور کیا بات ہوئی؟" زورا کی عجیب مشکل تھی۔ ایک طرف اُسے تجمل کا خیال تھا کہ اس سے زیادہ اُسے زبان نہیں کھولنی چاہیے تھی، دوسری طرف آبا جان کی تشفی کے لیے کوئی بڑا جھوٹ بھی نہیں بول سکتا تھا۔ وہ اُن کے سامنے آنے سے بھی بچنا چاہتا، مگر وہ اس کے پیچھے پڑ گئے تو اُسے بتانا پڑا کہ ہوٹل سے نکل کے تجمل مختلف ٹھکانوں پر گیا تھا۔ تیسرے ٹھکانے میں وہ دیر تک رکا رہا اور وہی آخری تھا۔ چاندنی چوک کے چار مینار کے قریب واقع ایک ہوٹل میں انھوں نے کھانا کھایا اس کے بعد وہ سیدھے بازار کے اڈے چلے گئے۔ آکا کا سارا حوالہ دینا زورا نے آبا جان کو بتانا ضروری نہیں سمجھا بس اتنا کہا کہ اڈے کے دالان سے آگے کمرے میں تجمل گھنٹے بھر کے قریب باتیں کرتا رہا۔ نکلتے ہی باقی چاروں کو روک کے وہ کاشف کے ساتھ کہیں چلا گیا۔ تھوڑی دیر پہلے ہی وہ اڈے واپس آیا تھا۔

زورا مزید کچھ بتانے سے مسلسل انکار کرتا رہا۔ آبا جان کی خاموشی بھیانک تھی۔ زورا کو صاف محسوس ہو گیا تھا کہ وہ اس سے کچھ خفا ہو گئے ہیں۔ بعد میں انھیں چپ سی لگ گئی تھی۔ آبا جان نے اب تک خود کو بڑا تھامے رکھا تھا۔ جب تک کوئی دوسرا نہیں ہوتا تو آدمی اپنا آپ خود ہوتا ہے۔ سہارا ملتے ہی آدمی سنبھلنے کے بجائے کبھی ٹوٹنے بکھرنے بھی لگتا ہے۔ تجمل اُن کے لیے اور دوسرا پیغام بھیج بھی کیا سکتا تھا۔ ہر صورت میں کم و بیش اُن کا یہی حال ہوتا۔ تجمل اگر یہ بھی کہلا کے بھیج دیتا کہ ہم دونوں اُسے مل گئے ہیں تو بھی اُس وقت تک اُن کے دل کی ڈھارس نہ ہوتی جب تک وہ اپنی آنکھوں سے ہمیں دیکھ نہ لیتے۔ تجمل کے آنے کے بعد آبا جان کو شاید یہ توقع ہو گئی کہ اُس کے آنے کی دیر ہے۔ آتے ہی وہ کوئی سحر پھونکے گا اور ہمیں اپنے ساتھ لے کر ہی لوٹے گا۔ زورا کہہ رہا تھا کہ مارتی کو اُس سے گلہ تھا۔ اُس کے خیال میں آبا جان کو نہیں تو کم از کم اُسے زورا کو اصل بات بتا دینی چاہیے تھی۔ سالا کنڈ زورا نے اڈے پر پیش آنے والے واقعے کی روداد کا پتہ اُسے سنا دی تھی۔ وہ تینوں باقی رات جاگتے ہی رہے۔

مارتی اور زورا کے کہنے پر آبا جان بستر پر لیٹ گئے تھے مگر پانچ منٹ بھی نہ بیتے ہوں گے کہ اٹھ کے صبح سورج نکلنے تک ٹہلتے پر بیٹھے رہے۔

تجمل نے زورا سے واپسی کے لیے کچھ نہیں کہا تھا اس لیے

صبح ہونے کے باوجود وہ ہوٹل سے نہیں نکلا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔

پھر کوئی نو بجے ہوں گے کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ زورا ہی نے بڑھ کے دروازہ کھولا۔ شامو اُن کے سامنے موجود تھا۔ تجمل نے اُسے گھیر لیا لیکن شامو نے عجلت ظاہر کی اور ابا جان سے کہا کہ وہ کسی تاخیر کے بغیر فیض آباد میں بڑے صاحب بہرعلی کے نام ارجنٹ تار بھیج دیں کہ خانم جیلی گاؤں سے حیدرآباد پہنچ جائے۔ تجمل نے ایک گھنٹے کے بعد دوسرا تار بھیجنے کی ہدایت کی تھی۔ ابا جان یہ سُن کے اور پریشان ہو گئے ہوں گے کہ انھوں نے شامو سے اس کی وجہ پوچھنی چاہی۔ وہ بھی انھیں زورا سے زیادہ کچھ نہ بتا سکا اور چائے کی ایک پیالی پی کے فوراً روانہ ہو گیا۔ صبح صبح کا وقت تھا۔ ابھی بازار سنسان پڑے تھے۔ کسی کو اُس کا کہیں آنا جانا محسوس نہیں ہوا۔ شامو ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد اڈے واپس پہنچ چکا تھا۔

تجمل رات ہی کو یہ پیغام زورا کے ذریعے بھیج سکتا تھا مگر یا تو اُس کا ارادہ سویرے کسی وقت خود تار دینے کا تھا جس کا اُسے موقع نہ مل سکا یا پھر ابا جان کو حقیقت حال سے بتدریج آگاہ کرنا اُس نے مناسب جانا تھا۔ اس نوعیت کی کوئی ہدایت اُن کے لیے مزید تکدر کا سبب بن سکتی تھی۔ وہ تو اُسی وقت تار گھر کے لیے نکل کھڑے ہوتے اور یہی ہوا۔ اِدھر شامو واپس گیا، اُدھر ابا جان نے شیروانی پہنی، مارٹی کو ساتھ لیا۔ تار گھر ہوٹل سے نزدیک تھا۔ پیدل کا راستہ۔ مارٹی اور ابا جان چند منٹ میں وہاں پہنچ گئے۔ لوٹتے وقت وہ ایک اور فارم بھی ساتھ لیتے آئے تاکہ تھوڑے وقفے بعد دوسرا تار بھیجا جا سکے۔

ادھر رات گئے، تجمل کانتھا اور مرلا حویلی سے واپس آئے تو اڈے پر سارے لوگ موجود تھے۔ وہ رات بھر تجمل کے گرد بیٹھے رہے۔ شروع شروع میں وہ زبان کھولتے ہوئے جھجک رہے تھے مگر تجمل کی توجہ دیکھ کے ساری رات آغا کے واقعات سُناتے رہے۔ تب کہیں جا کر معلوم ہوا کہ بازار کی ایک عورت کانتی بائی سے کالے دلوا کچھ ایسا قریب ہوا کہ اڈے سے دُور ہو گیا۔ پھر بھی اڈے پر کسی بات کی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ سب کچھ معمول کے مطابق جاری تھا اور کالے دلوا سے چند ایک شکایتوں کے سوا سبھی خوش تھے۔ اسی دوران آغا نمودار ہوا۔ کالے دلوا نے بھوپال سے آئے ہوئے ایک مہمان دلوا کے طور پر اُسے اڈے ہی پر ٹھیرایا۔ اُس نے کالے دلوا کی غفلت سے فائدہ اٹھا کے اڈے کے معاملات میں دلچسپی لینا شروع کیا اور کئی بار اڈے کے آدمیوں کے سامنے اپنے زور کی نمائش بھی کی۔ پھر چند دن بعد اُس نے انکشاف کیا کہ وہ اور شاہ کبیرا ایک ہی اُستاد کے شاگرد ہیں۔ اُستاد بھوپی کے۔ اُس کا یہ دعوا کسی حد تک درست ہی سمجھا گیا کیونکہ شاہ کبیرا اڈے کے آدمیوں سے اکثر اپنے اُستاد بھوپی کے بل کا ذکر کیا کرتا تھا۔ شاہ کبیرا کو … کوئی جرم کر کے حیدرآباد سے فرار ہو گیا تھا۔ برسوں بعد جب واپس آیا تو جوان ہو چکا تھا اور مُرگھنا بیل جس وقت بازار کے اڈے پر چوہدری دادا بنا بیٹھا تھا۔ وہ اگرچہ بوڑھا ہو چکا تھا لیکن سبھی اُس کی عزت کرتے تھے۔ مرا ہوا ہاتھی سوا لاکھ کے مصداق اُس وقت بھی سب میں اُس کا کوئی بدل نہیں تھا۔ حیدرآباد آ کے شاہ کبیرا … پاس بیٹھنے لگا۔ اپنے کس بل، پھرتی اور سوجھ بوجھ کی وجہ سے وہ جلد ہی چھوٹے دادا کے قریب ہو گیا تھا۔ ابتدا میں ان دونوں کا تعلق بڑے چھوٹے ہی کا تھا مگر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ اُسی شاہ کبیرا نے چھوٹے دادا کو اڈے سے بے دخل کر دیا۔ پھر کوئی پندرہ سال تک جو بھی شاہ کبیرا کے آڑے آیا، اُسے ذلت ہی اٹھانی پڑی۔

آغا کو اڈے پر مہمان ٹھیرے چند دن ہوئے تھے کہ اُس نے کالے دلوا سے اڈا حاصل کرنے کا باقاعدہ مطالبہ کر دیا۔ کالے دلوا کا عالم ہی دوسرا تھا۔ کانتی نے اُسے پہلے ہی بہت سنبھال رکھا تھا۔ مہمان آغا کی اس حیرت انگیز خواہش نے اُس کے رہے سہے اوسان بھی منتشر کر دیے۔ اُس نے اُس وقت آغا سے کوئی حجت کرنے کے بجائے خاموشی ہی مناسب سمجھی۔ اب نہیں تو پھر کسی وقت آغا کو نمٹا سکتا تھا۔ آغا کے مقابل آنے سے بچنے میں دوسری صورت بھی ممکن تھی۔ سب سے زیادہ اُسے کانتی بائی کا خیال تھا۔ اگر آغا نے واقعی اُسے اڈے سے بے دخل کر دیا تو کانتی بائی بھی اُس سے چھن جائے گی۔ اُس کے یہ قول جانے کیوں اُسے یہ آس بھی بندھی تھی کہ اُس کے وہ اجنبی محسن ہی بھولے بھٹکے لاہیں نہ جانے کہاں … بھوپال میں بازار کا اڈا ڈال کے چلے گئے تھے۔ اُسے اُن کا کوئی … معلوم ہوتا تو وہ اُنھیں باخبر بھی کر دیتا۔ تجمل نے اپنے بارے میں اڈے کے لوگوں کو کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ تاہم بھی کوئی دوسرا … تیار تھا۔ کالے دلوا نے آغا کو آگاہ کر دیا تھا کہ اڈے کا اصل مالک کون ہے مگر آغا نے کوئی دھیان نہیں دیا۔ وہ بتدریج اڈے پر حاوی ہوتا گیا اور اُس نے وہاں وہ کچھ شروع کیا جو اڈے پر کبھی نہیں ہوا تھا۔ اُس کے حکم کی سرتابی، مزاج کے خلاف چھوٹی سے چھوٹی … کی سزا میں کوئی رُو رعایت نہیں کی جاتی تھی۔ گھنٹوں اذیت … چاقو کی نوک سے کھال پر تا عمر رہنے والے نشانات بنا … دنوں تک بھوکا پیاسا رکھنا، سرزنش … اڈے کے مسلسل جیالی کرتا تھا۔ اڈے کے خلاف اور حسن کے … زمین کو … دیے بغیر دو دن تک گھوٹا، دونوں پاؤں یا ایک ہاتھ اٹھائے اور …

کھڑے رہنے کا حکم۔ اگر کوئی ذرا سی جنبش کرتا تو بیلٹ سے اُس کی کھال اُدھیڑ دی جاتی۔ کچھ ہی دنوں میں شہر اور نواح کے دُور دُور تک آغا کا نام پہنچ چکا تھا۔ اُس کے مزاج کا کچھ ٹھیک نہیں تھا کہ اُسے کب کون سی بات گراں گزر جائے۔ جیسے ہی اُس نے اڈے پر پوری طرح قابو پایا تھا، ہنسنا تو شاید وہ بھول ہی گیا تھا۔ اڈے کی پُرانی روش کے خلاف علاقے کی ساری آمدنی کسی ایک شخص کے سپرد کرنے کے بجائے اُس نے مختلف علاقوں کے لیے مختلف آدمی متعین کیے تھے۔ بشیر معافی سے راہ و رسم رکھتا تھا۔ اُنھی کی سفارش اور شکایت پہ وہ اڈے کے آدمیوں کے بارے میں فیصلے صادر کرتا تھا۔ کوئی شخص ان چند مقربین کی دیوار عبور کیے بغیر براہِ راست آغا کے پاس نہیں جا سکتا تھا بشرطیکہ آغا اُسے خود طلب کرے اور کسی اہم معاملے میں اُس نے اُسے باریابی کا اجازت نامہ جاری کیا ہو۔ اڈے پر اُس کے متعین کیے ہوئے لوگ ہمیشہ ایک دوسرے پر شک کرتے تھے کہ کہیں دوسرا آغا کے زیادہ قریب تو نہیں ہے اور اُسے میرے خلاف بھڑکا تو نہیں رہا ہے۔ ایسی صورت میں اُسے اڈے سے ہٹانے کے لیے کسی منظم سرکشی کا امکان کم سے کم ہو گیا تھا۔ کالے دلوا کو اُس نے کوئی کام تفویض نہیں کیا تھا مگر کالے دلوا کو وہ رکھتا اپنے پاس ہی تھا اور ایک وہی شخص تھا جس کا اُسے تھوڑا بہت خیال تھا۔

ساری رات وہ تجمل سے آغا کا چرچا کرتے رہے اور دن چڑھے بھی یہی حال رہا۔ جانے کہاں سے لوگ کھنچے کھنچے آ رہے تھے اور وہیں جم کے بیٹھ جاتے تھے۔ کسی کو جیسے اس خبر پہ یقین نہیں تھا کہ اڈے پر اب آغا کا راج نہیں رہا ہے۔ بازار کے کئی ہوٹل والوں نے اپنی طرف سے تینوں وقت کے کھانے کا اہتمام کرنے کی درخواست تجمل سے کی تھی۔ اُس روز اڈے پر لوگوں کی تعداد زیادہ تھی لیکن تینوں وقت انھوں نے اس قدر کھانا فراہم کیا تھا کہ بچ گیا۔ دن بھر میلا سا لگا رہا اور سماوار میں چائے کھولتی رہی۔ رات کو کئی بالا خانوں کی طرف سے اڈے پہ مجرا کرنے کی پیش کش بھی کی گئی لیکن تجمل نے منع کر دیا۔ اس طرح تجمل کا وہاں سے اُٹھنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور اُس نے خود ایسی کوئی کوشش بھی نہیں کی۔ طویل سفر، کئی راتوں کی رتجگائی نے کانتے، شامو، جمرو اور ٹھکو کو جیسے ہی بوجھل کر رکھا تھا۔ اس پہ اجنبی چہروں کے سامنے بندھے بیٹھے رہنے کا کھنچاؤ اور جیسا کہا جاتا ہے سب سے بڑا بوجھ تو دماغ کی دھند ہوتا ہے۔ آنے والے لمحوں کی بے اعتباری کا دھڑکا لگے اور آدھی شب کا اور ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کا۔ جب تک تجمل اُن لوگوں کے بیچ گھرا ہوا تھا، انھیں بھی وہیں موجود رہنا چاہیے تھا اور تجمل کی نشست کے کنارے اُس کے جلد اُٹھنے اور ان سب کے منتشر ہونے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ تجمل کو جیسے کوئی اور بات یاد ہی نہیں رہی تھی۔

رات کوئی بارہ بجے ہوں گے۔ بازار کا وہ وقت کب کا شروع ہو چکا تھا کہ زورا دکھائی دیا۔ سب کی بجھی بجھی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ تجمل بھی چونک گیا تھا۔ اُس نے اشارے سے اُسے اپنے پاس چوکی ہی پہ بلا لیا۔ زورا کو کل رات تک اڈے کے لوگوں نے خوب دیکھا تھا لیکن بے کسی نے اُس کی دن بھر کی رعونت خوشی کی … لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ زورا کو جیسے یہی موقع ملا۔ اُس نے تجمل کو ابا جان کی اضطرابی کیفیت سے آگاہ کیا اور بتایا کہ صبح تار دے کے وہ ہوٹل واپس آ گئے تھے۔ تم لوگ دیر نہیں گزری تھی کہ مارٹی کو ساتھ لے کے وہ پھر نکل کھڑے ہوئے۔ سہ پہر کو لوٹے تو بہت گرے گرے نظر آتے تھے۔ مارٹی نے اُسے بتایا کہ تجمل کے آنے سے پہلے وہ اُن دفتروں کا چکر کاٹتے رہے تھے۔ وہیں ریاست کے کسی بڑے عہدے دار سے انھوں نے ملاقات کا وقت طلب کیا تھا۔ عہدے دار اپنے پہلے سے طے شدہ سرکاری کاموں میں مصروف تھا، اُس نے معذوری ظاہر کی مگر ابا جان کے اصرار پہ اُس نے اپنی کوٹھی پر عصر کے بعد گھر پہ ملنے کا وقت دے دیا تھا۔ اسی دوران ابا جان نے دوسرا تار اور احتیاطاً ایک خط بھی بہرعلی کے نام فیض آباد ارسال کر دیا تھا۔ عصر کے قریب مارٹی کے ساتھ وہ پھر ہوٹل سے چلے گئے۔

ہوٹل میں قیام کے دوران انھوں نے وہاں کے خصوصی رسم و رواج کے لحاظ سے زورا اور مارٹی کے لیے چند جوڑے کپڑے جلد از جلد تیار کروا دیے تھے۔ چنانچہ مارٹی عمدہ لباس پہنے جیسے ہی ہوٹل سے نکل کے انھوں نے کرائے کی موٹر کچھ دور پہ جیسے پتے پر پہنچ کے موٹر ٹھیرا لی۔ وہ بڑی بڑی حویلیوں اور محلات کا علاقہ تھا۔ مارٹی نے ابا جان اور سرکاری اہلکاروں کی گفتگو سے اندازہ لگایا تھا کہ نواب حشمت جنگ کو ریاستی حکومت میں کوئی بڑا مقام حاصل ہے۔ دربار میں براہ راست اُن کا عمل دخل ہے۔ نواب کے یہاں تھا۔ انھوں نے دروازے پہ اپنی آمد کی اطلاع دی تو انھیں فوراً اندر بلا لیا گیا۔ اندر نواب کے معتمد نے انھیں ہدایت کی کہ وہ مختصر گفتگو کریں کیونکہ نواب صاحب کے پاس وقت کم ہے۔ کچھ دیر بعد انھیں ایک تقریب کی ایک دعوت میں شرکت کرنی ہے۔ پھر معتمد انھیں ایک دوسرے کمرے میں لے گیا۔ وہاں ایک بڑا سا چکلا بھاری بھرکم شخص اُن کا منتظر تھا۔ ابا جان نے تعظیم دینے کے بعد کہا کہ اُن کے آنے کی کوئی خاص غرض نہیں ہے۔ انھوں نے ریاست اور بیرون ریاست میں شرفا سے نواب حشمت جنگ کی بہت تعریف سُنی ہے۔ چنانچہ صرف نیاز حاصل کرنا اُن کی آمد کا مقصد ہے۔ نواب بلٹ ہی تھا،

کسی قدر دلچسپ بھی ہوا مگر رسماً اُس نے اباجان کا شکریہ ادا کیا۔
اُس کے استفسار پر اباجان نے بتایا کہ سرپرست وہ یوپی سے آ رہے ہیں لیکن سارے ہندوستان ہی کو انھیں اپنا گھر کہنا چاہیے۔ اُن کی زندگی کا بڑا حصہ جہاں نوردی ہی میں گزرا ہے۔ یہ اتفاق ہے کہ حیدرآباد پہلی بار آنا ہوا ہے اور جیسا انھوں نے سنا تھا، ریاست کی ویسی شان و شوکت انھوں نے دیکھی، اُن کا بھی جی چاہتا ہے کہ وہ اپنی باقی زندگی یہیں گزار دیں۔ اباجان کی شائستگی سے نواب کچھ متاثر ہوا اور کہنے لگا معزز! ریاست حیدرآباد نے ہمیشہ باہر سے آنے والے شرفا کے لیے اپنا سینہ کشادہ رکھا ہے یقیناً یہاں حسب دل خواہ آپ کی پذیرائی ہوگی۔ اباجان نے کہا۔ بے شک انھیں یہی توقع ہے اور بولے کہ ویسے بھی حیدرآباد اُن کے نوادر جمع کرنے کے شوق کے لیے نہایت موزوں جگہ ہے یہاں ہر طرف انھیں صاحب ذوق نظر آتے ہیں۔ نوادر کے ذکر پر نواب نے پہلی مرتبہ دلچسپی ظاہر کی اور تجسس سے پوچھا "کس قسم کے نوادر؟" اباجان نے شیروانی کی جیب سے ایک ڈبیا نکالی اور نواب کے سامنے پیش کر دی۔ نواب نے بجھے بجھے انداز سے کھولا اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ ڈبیا کی سرخ مخمل میں ایک نہایت خوبصورت ہیرا رکھا ہوا تھا۔ نواب کی متلاشی آنکھوں نے آج تک بہت سے بیش بہا ہیرے دیکھے تھے لیکن اُس ہیرے کی جو چمک دیکھنے کے لائق تھی، مارلی کے بیان کے بموجب نواب حشمت جنگ پر حیرت کا عالم طاری تھا۔ وہ کبھی اباجان کو دیکھتا کبھی ہیرے کو پھر سناٹی آواز میں بولا: "یہ واقعتاً ایک نادر ہیرا ہے کیا آپ۔۔۔۔" مگر اباجان نے تیزی سے کہا: "آپ کو پسند آیا؟"
"یقیناً" نواب نے بے ساختگی سے کہا: "بلاشبہ ہم نے اپنی زندگی میں ایسے عمدہ جواہر کم دیکھے ہیں۔"
"آپ صاحبِ نظر ہیں" اباجان نے کہا: "مجھے خوشی ہے کہ آپ نے اسے پرکھ لیا۔"
نواب ہیرا بار بار ہتھیلی پر رکھتا اور عجیب نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا: "ہم اس کی قیمت جاننا پسند کریں گے۔"
اباجان نے مسکرا کے کہا: "آپ کو پسند آ گیا، یہی اس کی قیمت ہے۔ کسی نایاب چیز کی اس سے بڑی عزت کیا ہو سکتی ہے کہ وہ اچھے ہاتھوں میں پہنچ جائے ورنہ بے توقیر ہی" انھوں نے رک کے کہا: "یہ اُس کی قدر ہے۔"
نواب کو یقین نہیں آیا، حیرانی سے بولا: "یہ آپ کیا فرما رہے ہیں"
اباجان نے متانت سے کہا کہ وہ ہیرا اسی ارادے سے یہاں لائے ہیں، ایک نیاز مندی کی جانب سے اسے قبول کیا جائے۔
نواب کے لیے یہ سب کچھ نہایت عجیب تھا۔ وہ وحشت سے اباجان کو تکنے لگا۔ ایک ایسا شخص جس سے پہلی بار ملاقات ہوئی ہو آخر یہ سخاوت کرنے پر کیوں مُصر ہے؟ اُس کے دل میں ہزار شبہے کروٹ لینے لگے ہوں گے۔ ہیرے ہیں سے متعلق مشہور روایتیں۔ مگر دوسری طرف اباجان کی وضع قطع اُن کے سلجھے ہوئے طرزِ گفتگو اُن کی نشست و برخاست بھی اُس کے پیشِ نظر ہو گی۔ اباجان بھی اُس کے ذہن میں جنم لینے والے فطری خدشات سے بے خبر نہیں تھے۔ انھوں نے صاف گوئی سے کہا۔ بے شک یہ ذرا کچھ قبل از وقت ہے۔ کسی قدر غیر متناسب سا معلوم ہوتا ہے۔ انھیں اندازہ ہے کہ کسی اجنبی کی ایسی پیش کش پر نواب بھی دل میں بہت کچھ سوچ سکتا ہے تاہم مناسب ہوگا کسی بدگمانی سے پہلے نواب اُن کی عمر کا خیال ضرور کرے اور اسے ایک علامت ہی تصور کیا جائے اور علامت ہے اُن کی غرض و غایت اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ نواب حشمت جنگ جیسے شرفا سے رفاقت کے طالب ہیں۔ ایک ذی وقار دوست سے حیدرآباد میں اپنے قیام کی ابتدا کرنا چاہتے ہیں۔
اباجان نے اپنے خزانے سے کوئی ایسا ہی ہیرا منتخب کیا ہو گا۔ جس کی ندرت اور نفاست میں کوئی کلام نہ ہو۔ ہیرے کھرے پرکھنے کے بعد انھیں ہیروں کی خوب پہچان ہو گئی ہو گی۔ کورا کی لائی ہوئی ہیرے جواہر کی تھیلی وہ آٹھ سال تک بیچ بیچ کے تبت میں مدفون خزانے کے [illegible] کرتے رہے تھے۔ اس دوران ہیرے جواہرات سے دلچسپی رکھنے والے معتبر لوگوں کا بھی تجربہ ہوا ہو گا۔ انھیں کوئی ایسا ہی ہیرا ساتھ لانا چاہیے تھا کہ نواب حشمت جنگ سے گل ہو جائے مگر نواب کی بے کلی اپنی جگہ تھی۔ وہ ایسے کس طرح اُن کے [illegible] ہیرا قبول کر سکتا تھا۔ اس نے معذرت کی کہ وہ قیمتاً ہی اُسے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اباجان کی یہ کرم فرمائی اُسے ہمیشہ یاد رہے گی مگر نواب نہیں کہ اُن سے رفاقت کے لیے یہی ایک معیار مستند سمجھا جائے۔ وہ بجز کے بتائیں کہ وہ اُن کی کیا خدمت کر سکتا ہے۔
مارلی نے زور دے کر بتایا تھا کہ نواب کی نظریں ہیرے پر جمی ہوئی رہی تھیں۔ اباجان نے اسے میز سے نہیں اٹھایا اور نہ قیمت بتائی۔ انھوں نے کہا کہ نواب قیمت کا ذکر کر کے وہ لطافت مجروح نہ کرے جو دو دوستوں کے درمیان لازم ہے۔ اس میں نواب کی تسکین کا بھی کوئی پہلو مضمر نہیں ہے۔ انھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ خدا نے نواب کو بڑی حیثیت سے نوازا ہے اس کے باوجود نواب کو قیمت کی ادائی پر اصرار ہے تو اس کے لیے آئندہ بہت وقت پڑا ہے۔ انھوں نے اشارہ کیا کہ حساب دوستاں بھی صاحب دلوں کا ایک شیوہ سلوک ہے مگر وقت سے پہلے نہیں ہوتے۔ ایسا ہی ہے تو وہ کسی اور طرح نواب سے اس کی قیمت وصول کر لیں گے۔ فی الحال تو اُن کی یہی خواہش ہے کہ وہ

مضافات کے کسی علاقے میں بلکہ بہتر ہے کہ نواب کے قریب کہیں کسی پرانی موروثی حویلی میں آباد ہو جائیں۔ اُن کے پاس خدا کا دیا بہت کچھ ہے، سو وہ اپنا باقی وقت عزت و سکون سے بسر کرنا چاہتے ہیں۔ نواب اس سلسلے میں اُن سے کوئی اعانت کر سکتا ہے تو وہ یقیناً اُس سے درخواست گزار ہیں۔
نواب نے بے اختیار کہا: "ضرور ضرور۔ ہم کوشش کریں گے کہ جلد ہی آپ کی یہ خواہش پوری کر دی جائے۔"
چائے آ چکی تھی لیکن نواب نے ملازم کو طلب کر کے ہدایت کی کہ وہ دوسرے کمرے میں اپنے معزز مہمانوں کے ساتھ چائے نوش کرے گا۔ اس دوران اُس نے اباجان سے اُن کے قیام کے بارے میں پوچھا۔ اباجان نے نہیں چھپایا کہ وہ کئی دن سے ویکاجی ہوٹل میں ٹھیرے ہوئے ہیں۔ انھوں نے نواب کو بتایا کہ اُن کا خاندان دو لڑکوں اور تین لڑکیوں پر مشتمل ہے مگر یا فہمیدہ کو انھوں نے مرا ہوا سمجھ لیا تھا۔ آدھی جزئیات اباجان نے دانستہ نواب کے گوش گزار کی ہوں گی تاکہ ان کے بارے میں نواب کے ذہن پر چھائے ہوئے اندیشے زیادہ سے زیادہ چھٹ سکیں۔ حیدرآباد کے سب سے بڑے ہوٹل ویکاجی میں قیام بھی اُن کی گفتگو اور لہجے کے اعتماد سے مطابقت رکھتا تھا۔
دوسرے کمرے میں جہاں نواب کی منشا پر انھیں لے جایا گیا تھا، وہاں انگریزی طرز کے کھانے کی لمبی میز لگی تھی اور اس پر انواع اقسام کی چیزیں سجی ہوئی تھیں۔ پھل، مشروبات، بھنے گوشت کے پارچے، چائے وغیرہ۔ درمیان میں ہیرے کی کوئی بات نہیں ہوئی۔ وہ دنیا جہان کی باتیں کرتے رہے۔ بیشتر اباجان ہی بولتے رہے۔ انھوں نے حیدرآباد اور مختلف ریاستوں اور علاقوں کے بارے میں اپنے مشاہدات اور تجربات کا محتاط انداز میں اظہار کیا۔ اباجان کا مقصد اس غیر ضروری گفتگو سے اپنے بارے میں کوئی رائے قائم کرانا ہی ہوگا۔ کوئی [illegible] نو سال تک وہ سفر ہی کرتے رہے تھے۔ انھوں نے تبت کا ذکر نہیں کیا۔ نواب اشتیاق و انہماک سے سب کچھ سنتا رہا۔ اباجان نے اُس کی جانب سے اپنے لیے کوئی اطمینان ہی محسوس کیا ہوگا۔ جبھی رخصت کی اجازت چاہی۔ نواب نے اُن سے کچھ دیر اور بیٹھنے کی گزارش کی۔ اباجان نے کہا۔ یہ اُن کی عزت افزائی ہے مگر انھیں احساس ہے کہ نواب کو کنگ کوٹھی کی دعوت میں شرکت کرنی ہے۔ جواب میں نواب بولا کہ وہ ایک معزز مہمان کے لیے وہاں تاخیر سے بھی جا سکتا ہے۔ کہنے لگا، کیا ہی مناسب ہو کہ اباجان رات کا کھانا کھا کے رخصت ہوں۔ سورج غروب ہوا چاہتا ہے اور رات کے کھانے میں اب دیر ہی کتنی رہ جاتی ہے۔ وہ کنگ کوٹھی کی دعوت میں اپنی شرکت سے معذوری کے لیے قاصد بھیج سکتا ہے مگر اباجان نے اس سے معذرت کرلی اور کہا کہ اُن کی وجہ سے وہ یہ اہم دعوت منسوخ نہ کرے۔ وہ حیدرآباد ہی میں ہیں۔ کسی وقت بھی طلبی پر حاضر ہو جائیں گے۔
وہ اٹھ کے پہلے والے کمرے میں آگئے تھے اور ناشتے کی میز پر نہیں تو بعد میں کسی لمحے پھر اُن کے درمیان ہیرے کا ذکر آنا چاہیے تھا اور اباجان کے جانے سے پہلے نواب کو اُس کی قیمت کے سلسلے میں تأمل کا بھی اعادہ کرنا چاہیے تھا۔ سو اباجان نے کہا کہ وہ نواب کی طمانیت کے لیے رسید لکھ دیتے ہیں۔ کسی بھی ادائی کی تکلیف وہ اس ارادے سے نہیں آئے تھے۔ اس ضمن میں نواب کا اصرار اُن کے لیے رنج کا باعث ہو رہا ہے۔
نواب نے خاموشی اختیار کر لی مگر اُس کی آنکھوں میں حیرت موج زن تھی، ایک سوال جو وہ بہت دیر سے کرنے کے لیے بے تاب ہوگا، اباجان کے اٹھنے سے پہلے آخر اُس نے کر ہی لیا کہ اُس کی مرضی نے یہ ہیرا کہیں سے تو حاصل کیا ہوگا۔ اُس کی مراد اُس رقم سے تھی جو اباجان نے ہیرے کے عوض صرف کی ہوگی۔
اباجان کچھ سوچنے لگے۔ سوچتے ہوں گے کہ کیا بتائیں کس طرح حساب جوڑیں۔ وہ گھر تو انھیں بہت یاد آتا ہوگا جس کی کوڑیاں اور قیمتیں انھوں نے اور اُن کے آبا نے اپنے ہاتھوں سے اٹھائی تھیں۔ وہ ایسا بڑا نہیں تھا مگر اُس کا سایہ بہت بڑا تھا۔ سوچتے ہوں گے کہ اُس کی کیا قیمت لگائیں اور اپنی نوجوان بیٹی کی جو کسی سے کچھ کہے بغیر گھر سے چلی گئی تھی اور اُس نو عمر بیٹے کی جو راستے میں بچھڑ گیا تھا۔ انھیں معلوم نہیں تھا کہ نجمی کے پیروں میں گھنگرو بندھے تھے اور اُن کا بیٹا جہاں گیر بازار میں پلتا رہا تھا۔ اباجان کو یہ سب کچھ معلوم نہیں تھا مگر دونوں کے اس طرح جدا ہونے کے بعد وہ اُن کے متعلق کسی خوش گمانی میں بھی نہیں رہے ہوں گے۔ نواب نے انھیں ٹوکا تو وہ کچھ چونک سے گئے اور کھوئے کھوئے لہجے میں بولے کہ یہ ہیرا انھوں نے خود تلاش کیا ہے اور انھیں یقین ہے کہ دنیا کی نظروں سے یہ صدیوں روپوش رہا ہے ورنہ وہ بھی کہیں نہ کہیں اس کا تذکرہ ضرور سنتے۔ اس کی نازک تراش خراش، رنگ اور بے داغی کی نمایاں خوبیوں کے علاوہ جس قطع اور محفوظ حالت میں یہ انھیں دست یاب ہوا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ گئے وقتوں میں لوگوں کو اس کی قدر و مالیت کا خوب احساس تھا۔ کوئی عجب نہیں کہ کسی بادشاہ کے تاج میں جڑا ہو یا کسی ملکہ کے ہار میں۔ وہ اتنا ہی بتا سکتے ہیں کہ کسی حکومت کے زوال کے وقت اسے چھپا دیا گیا تھا اور اب انھوں نے دریافت کیا ہے۔ اتفاقاً نہیں، انھوں نے نواب کے شوق کا پارہ تیز کرنے کے لیے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا مناسب سمجھا کہ اُن کے پاس ایسے اور بھی نوادر ہیں۔ وہ داستان بنا کر کہتے

تھے۔ نواب کو یقین آنا تھا، نہ آئے تھے یقین دلانا کسی طور بہتر تھا کہ
اُن کے پاس تو صندوق بھرے پڑے ہیں۔ انھوں نے نواب سے کہا، ان
کی خواہش ہے اگر بازیابی کا کوئی وسیلہ پیدا ہو جائے تو وہ چند نوادر
حضور نظام کی خدمت میں پیش کرنے کی جسارت کریں۔ انھیں
فوراً کچھ خیال آیا ہو گا یا احتیاط کا خیال، اس لیے رک سے گئے
انھوں نے نواب سے کہا، بازیابی کا امکان نظر آتے ہی وہ جلد از جلد
یہ نوادر یہاں لے آئیں گے۔ یوں حیدرآباد میں مستقل قیام کی صورت
میں کبھی نہ کبھی تو انھیں یہاں آنا ہی ہے۔

رخصت ہوتے وقت مارفی کے محبوب نواب کی آنکھیں چمک
رہی تھیں اور وہ بہت بے قرار سا نظر آتا تھا۔ ابا جان کو حویلی کے
خاص دروازے تک چھوڑنے آیا اور اُن سے بغل گیر ہو کے بولا کہ وہ
انھیں جلد ہی زحمت دے گا۔

ابا جان کوئی آٹھ بجے کے قریب ہوٹل واپس پہنچے تھے اور
رات کے تقریباً ساڑھے دس بجے ہوں گے، ہوٹل کے ایک ملازم
نے آ کے اطلاع دی کہ نواب حشمت جنگ ہوٹل میں موجود ہے اور
ابا جان سے ملنے کا خواہش مند ہے۔ مارفی اور زلفا ابا جان کا منہ
دیکھنے لگے مگر ابا جان کا چہرہ پُرسکون رہا۔ یہ سنتے ہی وہ اُٹھ کے
چلے گئے اور نواب کو لیے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرہ پانچ
آدمیوں کے لیے لیا گیا تھا، پورا ایک گھر سا تھا۔ نشست گاہ کے
علیحدہ حصے میں ابا جان نے اُسے بٹھایا اور اس کی بے تکلفانہ آمد
پر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ نواب نے اس بے وقت کی زحمت پر معذرت
چاہی اور کہنے لگا کہ وہ کنگ کوٹھی کی دعوت سے واپس آ رہا تھا، سوچا
یہ ہوٹل نہایت نزدیک ہے، اپنے محسن سے ملاقات کرتا چلوں۔

ابا جان نے کہا، اُن کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ وہ اپنے معزز
مہمان کا کس طرح شکریہ ادا کریں۔

نواب نے خوش اطواری سے جواب دیا کہ مہمان تو ابا جان ہیں۔
اُن کے جانے کے بعد اُسے احساس ہوا کہ اس نے ہوٹل سے اپنے
غریب خانے پر منتقل ہونے کی درخواست بھی اُن سے نہیں کی۔ اصل
میں یہی پشیمانی اُسے یہاں کھینچ لائی ہے۔ وہ ابا جان سے التماس
کرنے آیا ہے کہ اُسے اپنی مہمانی کے شرف سے نوازیں اور ازراہِ کرم
انکار نہ کریں۔

ابا جان نے کہا کہ وہ نواب کی اس نوازش کے بے حد ممنون
ہیں جس خوش نظری و خوش دلی کا انھوں نے اظہار کیا تھا۔ نواب
کی یہ خواہش اُس کے حسبِ مطابق ہے اور اُن کے لیے حکم کا درجہ رکھتی
ہے۔ انکار کی کسے مجال۔ وہ ابھی چلے چلتے ہیں مگر انھیں اجازت
دی جائے تو وہ لب کشائی کی جرأت کریں کہ ابھی یہ وجہ ان کا یہاں
ٹھہرنا ضروری ہے۔ انھیں یہاں کوئی بے آرامی نہیں ہے۔ چند ضروری
امور سے فراغت پاتے ہی وہ کسی دن خود آ جائیں گے۔ بہتر ہے
نواب اصرار کر کے انھیں آزمائش میں نہ ڈالے۔

نواب نے بھی اُن کا عذر تحمل سے سنا اور کہنے لگا، ہمارے لیے
اپنے والا مرتبت بزرگ کی خوشنودی ہر صورت مقدم ہے۔ ہماری
جانب سے وہ خاطر جمع رکھیں، ہم نے محض درخواست کی ہے مگر ذرا
سوچیے یہ کیسی عجیب بات ہے کہ کوئی محسن ہم پر ایسی عنایات
کرے، ہماری رفاقت کا ایسا بڑا اعتماد ہو اور اس شہر میں ہمارے
ہوتے وہ ہوٹل میں قیام کرے۔ پھر خود ہی بولا، اگر یہاں قیام سے
مقصود مشاغل اور ادائی کی آزادی ہے تو وہ یقین دلاتا ہے
حویلی میں بھی انھیں کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ وہ چاہیں تو اس کی
اقامت گاہ کے نزدیک پہاڑی کے اُس طرف دوسری حویلی میں قیام
کریں جہاں اُس نے زندگی کے بیس سال گزارے ہیں اور اسے
بتایا کہ نئی حویلی میں وہ کوئی تین سال ہوئے منتقل ہوا ہے۔ پرانی
حویلی میں اب اُس کے ذہنی مہمان قیام کرتے ہیں جو گھر کے روایتی
رکھ رکھاؤ سے گھبراتے ہیں۔ اس نے پیش کش کی کہ اگر ابا جان چاہیں
کریں تو مستقل وہیں قیام کریں جیسا کہ وہ ابا جان کی گفتگو سے سمجھا
ہے حویلی میں وہ تمام لوازم مہیا ہیں جن کی ابا جان کو کسی مکان میں
تلاش ہو سکتی ہے۔ گزشتہ دنوں یہاں کے ایک نواب نے اس
سلسلے میں بات کی تھی مگر اُس کا جی آمادہ نہ ہوا کہ وہ اپنے مرحوم
باپ کی نشانی فروخت کرے، بہت توجہ سے اسے والد مرحوم نے
تعمیر کرایا تھا۔ البتہ ابا جان کی بات دوسری ہے، فروخت کرنے کے
بجائے وہ حویلی اپنے کسی شخص کے حوالے کرنا پسند کرے گا جس کا
ذوق مستند ہو اور وہ اس کی نگہداشت اسی طرح کر سکے جس طرح سابق
مکین کرتے رہے ہیں۔ کوئی جگہ ترک کرنے کے بعد اس سے علاقہ
کی یہ خواہش بھی عجیب ہے لیکن سب ایسا ہی تھا شاید وہ ذہنی طور پر
ابھی تک پرانی حویلی ہی میں مقیم ہے۔

ابا جان نے قطع کلام کی معذرت چاہتے ہوئے کہا کہ وہ حویلی
کو اپنا مستقل مسکن بنانا پسند نہیں کریں گے کیونکہ نواب اُن سے
اس کی قیمت لینا پسند نہیں کرے گا اور یہ ایک طرح اُن کے لیے
ایک ناخوش گوار صورت ہو گی کیا وہاں اُن کے سینے میں سلسلۂ
تعلق گردش نہیں کرتا ہے کہ انھوں نے اسے کسی صلے میں کسی
چیز کے تبادلے میں حاصل کیا ہے۔ نواب کے لیے یہ صورت حال ممکن
ہے کسی آسودگی کا سبب بن سکے، اُن کے لیے نہیں۔ لہٰذا حویلی کا
ذکر ہی چھوڑ دیا جائے اور کسی ایسے مکان کی بات کی جائے جس کا
نواب سے کوئی تعلق نہ ہو۔

واپسی پہ بازار کی پناہ بھی تنگ ہو جاتی ہے۔ ...... یہی کچھ سوچ کر اُس کے دروازے پر وہ دونوں نمودار ہوئے۔ جہاں گیر کے لیے اپنا گم شدہ بھائی مل جانا کسی معجزے سے کم نہیں تھا اور خانم تو اُسے ہر حال میں خوش دیکھنے کی خواہش مند تھی مگر اس حقیقت کا دوسرا پہلو خانم کے لیے بڑا سانحہ تھا کہ اُس کا دیوتا اُس سے بچھڑ جائے گا۔ اب تجمل کے پاس ایک ہی راستہ تھا کہ وہ خانم سے بھی ساتھ چلنے کو کہے۔ جہاں گیر کے بغیر اُس کی زندگی خالی خالی ہو جاتی۔ کوئی اور عورت سامنے ہوتی تو تجمل کبھی ایسی پیش کش نہ کرتا۔ کوئی اور عورت بھی اس طرح اجنبیوں کے ساتھ جانے پہ آمادہ نہ ہوتی۔ تجمل نے اُسے بتایا تھا کہ وہ جائداد وغیرہ چھوڑ کے یوں ہی چپکے سے نکل جائے لیکن جائداد منقول تھی اُسے ایسے لٹانا بھی نہیں چاہیے تھا۔ خانم نے رازداری کی پوری کوشش کی تھی مگر یہ خانم کی بات تھی بازار کی سب سے ممتاز عورت کی لہٰذا چھپی کیسے رہ سکتی تھی۔ نواب عالم تاب کو بھی علم ہو گیا۔ اُس نے قاصد بھیج کے خانم کو حویلی میں طلب کیا مگر خانم بھی کوئی فیصلہ کر چکی تھی۔ نہ گئی۔ قاصد دوبارہ بھی آیا، زر و جواہر اور ملبوسات سے بھرے ہوئے خوان کے ساتھ۔ نواب کا اشارہ واضح تھا۔ خانم نے اُسے بھی واپس کر دیا۔

تجمل نے خانہ بدری کا واقعہ ابا جان کو نہیں سنایا اور کہا: تمام تر احتیاط کے باوجود آخری لمحوں میں جب وہ اسٹیشن پہ تھے نواب عالم تاب اپنے ساتھ مسلح آدمیوں کا قافلہ لیے سامنے آ گیا۔ اُس نے خانم سے اصرار کیا کہ وہ واپس چلی چلے۔ تجمل کو درمیان میں بولنا پڑا۔ اُس نے دُور کھڑے ہوئے نواب کے ساتھ آنے والے آدمی اور اُن کے تیور دیکھ لیے تھے۔ نواب کو شبہ تھا کہ خانم کے ارادے میں اُس کی مرضی کو اتنا دخل نہیں ہے جتنا مجبوری کو۔ اسٹیشن پہ کسی ہنگامہ آرائی سے بچنے اور نواب کا وہم دُور کرنے کے لیے تجمل نے تجویز پیش کی کہ وہ اُن کے درمیان سے ہٹ جاتا ہے۔ خانم اپنی زبانی اپنے فیصلے سے نواب کو مطلع کر دے یعنی اب بھی موقع ہے وہ چاہے تو نواب عالم تاب کے ساتھ واپس جا سکتی ہے۔ خانم سے اپنے دیرینہ مراسم کی وجہ سے نواب کو اس کی امید بندھی ہوئی تھی کہ خانم اُس کے حق میں فیصلہ دے گی مگر خانم نے معذرت کر لی۔ پھر نواب نے بھی کوئی حجت نہیں کی وہ بہت آزردہ ہو گیا تھا۔ خانم کی زبان سے انکار اُس کے لیے گنگ کر گزرا اور واپس چلا گیا۔ اس کے بعد خانم سے نواب کا رابطہ ممکن نہ رہا۔ یہاں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں گئی ہے۔ خانم کے ہاں چار پانچ روزہ قیام میں بازار کے لوگوں نے تجمل اور اُس کے چہرے کو اچھی طرح دیکھے تھے لیکن وہ اور کچھ نہیں جانتے تھے۔

ارقی نے چائے منگوائی تھی اور پیالیاں بنا کے اُن کے سامنے رکھ دی تھیں۔ تجمل رک کے چائے پینے لگا۔ ابا جان کا منہ کھلا ہوا تھا۔ خاصی دیر تک تجمل چائے پیتا رہا، وہ گم بیٹھے اُسے گھورتے رہے۔ بڑی مشکل سے ہوئے تجمل نے یک بارگی اپنی بوجھل پلکیں اُٹھا کے اُن کی جانب دیکھا، وہ سٹ پٹاتے ہوئے بولے: "اور یہی ہی نواب"

تجمل نے اُن کی بات کاٹ کے کہا: "پرسوں رات ہم اُدھر نواب کی حویلی کی طرف گئے تھے۔"

"آپ وہاں گئے تھے؟"

"ہاں ایک بار جا کے اُس کو دیکھنا تو تھا ہی۔"

"تو کیا اُس نے قبول کر لیا؟"

"آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہو۔" تجمل نے ترشی سے کہا۔

"پھر کیا اُس نے خانم کی شرط عائد کی ہے مگر اس طرح خانم کو چارہ بنا کے..... کیسے کم از کم ہم....."

"آپ جو سمجھ رہے ہو ویسا نہیں ہے۔" تجمل نے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا: "ہم کو پتہ تھا، آپ ایسا ہی بولو گے۔ آپ کا سینہ بہت بڑا ہے بابا۔ خانم کی شرط وہ تب رکھتا جب اُس نے اپنے دعوے کی تصدیق داری لی ہوتی۔"

"پھر آپ آپ نے کیوں خانم کو؟....." ابا جان تذبذب کے عالم خاموش ہو گئے۔

"اُدھر نواب کا بڑا بھائی سامنے آیا تھا، بڑا نواب بہت اونچی حویلی ہے اُس کی ہم اپنی طرف سے جتنا بول سکتے تھے بولے؛ مگر وہ کچھ اور بولتا رہا۔"

"کیا، کیا؟" ابا جان ہذیانی انداز میں بولے۔

"وہ اپنے کو اندر لے گیا تھا، اندر چھوٹا نواب تھا اور وہ وہ جب ہم نے پہلے دیکھا تھا، اُس سے آدھا بھی نہیں رہا تھا۔"

ابا جان کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ تجمل نے جس حال میں نواب عالم تاب کو دیکھا تھا، اُنھیں بتایا اور چپ ہو گیا۔

ابا جان کے ہونٹوں کو جیسے مہر لگ گئی تھی دیر تک ساکت بت کی طرح بیٹھے رہے پھر بد حواسی سے بولے: "آپ کے خیال میں کیا خانم کے آنے کے بعد وہ اُن دونوں کو آزاد کر دے گا؟ میرا مطلب ہے، ہمارے پاس اِس کی کیا ضمانت ہے کہ اُنھیں رہا کرتے ہوئے کیا اور اندیشے اُس کے پیشِ نظر نہیں ہوں گے۔"

"کوئی ضمانت نہیں ہے۔ ایسا ہونا تو نہیں چاہیے اُس کو اِن دونوں سے اور کیا بیر ہو سکتا ہے۔ جو لوگ راستہ چلتے لوگوں کو اس طرح اُٹھا سکتے ہیں اُن کو آزاد کر دینے کے بعد اُنھیں کون سی پرواہ ہو گی۔"

"لیکن نواب لوگوں کا دماغ اُلٹی طرح سوچتا ہے۔" ابا جان متوحش لہجے میں بولے: "بعد میں بھی وہ اپنے منہ سے نکلا ہوا بیان ثابت کرنے کے لیے انکار کر سکتا ہے۔ نوابوں کی ضد اُن کی کٹ

بھی مشہور ہے۔"

"بعد کی بات دوسری ہے تھوڑی بہت اُس کو بھی اپنے بارے میں جانکاری ہے، معلوم ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جو اُس نے چھپا رکھے ہیں کون اُن کے لیے اُس کے پاس آئے تھے مگر اُن دونوں نے بھی اُس کو بولا ہو گا۔ کچھ ہم بھی بول کے آئے ہیں، جو باقی رہ گیا ہے وہ اُس کو دوست سمجھا دیں گے۔ ہم ہتھیار ساتھ رکھ کے ہی حویلی گئے تھے اُن کا وقت نہیں آیا لیکن وقت تو کبھی بعد میں بھی آ سکتا ہے۔"

"مگر یہ کوئی اچھی صورت تو نہ ہو گی۔"

"یہ تو اُس کے سوچنے کا کام ہے۔"

"اگر اُسے کسی طرح خانم کی آمد کا یقین دلا دیا جائے تو شاید....."

تجمل کو ہنسی آ گئی: "نواب حشمت جنگ کو بول کے؟"

"نہیں میرا مطلب ہے۔" ابا جان گھبرا کے بولے: "مگر ذریعہ اس کا بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔"

"اُس کو ابھی سنبھال کے رکھو وقت پہ شاید کام آ جائے۔ آپ نے دھیان نہیں دیا، زیادہ اس رشتے نواب کو چھیڑنے سے اس کا معاملہ اور بھی رُسوا ہو سکتا ہے۔ اپنے آدمی اُس کے پاس ہیں اور حویلی اُس کی اتنی اونچی اور بڑی ہے کہ دو آدمی اُس کے لیے کوئی بات نہیں رکھتے۔ اِدھر قانون بھی اپنا ولایتی والا نہیں ہے۔"

"مگر یہ تو بہت فکر کی بات ہے یہاں ایسا اندھیر بھی نہیں ہوتا ہو گا۔ مجھے یہ بات بالکل اچھی نہیں لگ رہی ہے کہ خانم پہلے وہاں جائے یہ تو کوئی بات نہ ہوئی، اس سے پہلے جانے آدمیوں کو اُسے چھوڑنا چاہیے۔"

"پھر آپ ہم کو بولو، ہم کدھر جائیں؟"

تجمل کے اس سوال پہ ابا جان اُس کی صورت دیکھتے رہ گئے۔ تجمل نے بھی اُن کے جواب کا انتظار نہیں کیا، صوفے سے اُٹھ گیا۔ جانا خوب ہو چکا تھا۔ ابا جان بے حس و حرکت بیٹھے تھے۔ تجمل نے اُن کے شانے پہ ہاتھ رکھا تو وہ حواس باختگی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ تجمل نے اُنھیں گلے سے لگا لیا اور آہستگی سے بولا: "ہستی میں آدمی سیدھے ہی ہاتھ چلاتا ہے اور نواب تو ان دنوں ویسے بھی دیوانہ بنا ہوا ہے، دیوانوں کے ساتھ بات کرنے میں جوکھم کی ضرورت زیادہ پڑتی ہے۔"

سڑکوں پہ دن کی چہل پہل ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ تمام دکانیں بند تھیں، سواری سامنے موجود تھی لیکن وہ کچھ دُور تک پیدل چلتے رہے اور ہوٹل سے کئی فرلانگ آگے آ کے اُنھوں نے تانگے کو کنارہ کیا۔ زیادہ وقت ہوٹل میں رہ گیا تھا، صرف کاٹنے اُس کے ساتھ تھا بازار پہنچتے پہنچتے دھوپ اور پھیل گئی تھی۔ جس وقت وہ اڈے کی عمارت میں داخل ہوئے، کالے دادا اور چند آدمیوں کے سوا باقی سب سوئے ہوئے تھے مگر اُن کے آتے ہی سب کو بیدار کر دیا گیا۔

اُس روز ناشتے کا انتظام بازار کے ایک ہوٹل والے نے کیا تھا۔ دوپہر اور رات کے لیے تجمل نے کالے دادا کو ہدایت کی تھی کہ کسی اور جگہ سے انتظام نہ ہونے کی صورت میں وہ دیگیں چڑھوائے۔ دوپہر کے کھانے سے پہلے وہ کالے دادا اور اڈے کے دس پندرہ آدمیوں کے ساتھ اڈے سے نکلا۔ سب بازار کے علاقے سے دُور ایک جگہ جا کے غیر معروف تنگ و تاریک گلی میں ایک شکستہ سا مکان تھا۔ کالے دادا کو دروازے کے باہر کھڑے ہوئے ایک شخص نے پہچان لیا۔ وہی بھاگا بھاگا اندر گیا اور واپس آیا تو اُس کے ساتھ ایک بوڑھا آدمی تھا۔ بھوسے دادا۔

اُسے یقین نہیں آیا کہ اڈے کا کوئی اڈے سے نکالنے والا دادا اُس کے دروازے پہ آیا ہے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ اُس کے گھر کی حالت نہایت خستہ تھی اور وہ تجمل کو اندر لے جانے سے کترا رہا تھا مگر تجمل خود پیش قدمی کر کے اندر داخل ہو گیا۔ مکان مختصر تھا اور باہر کی نسبت اندر کچھ بہتر حالت میں تھا۔ شکستہ دیواروں اور دروازوں کے باوجود ایک سلیقہ جھلکتا تھا۔ دالان میں بچھی ہوئی دری نئی نہیں تھی، اُس پر گاؤ تکیے کے ساتھ میلی سی سفید چادر بھی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں وضو کرنے والی چیزیں اُوپر تلے رکھی تھیں۔ اندر بیٹھتے ہی شربت اور تواضع آئی اور تشتریوں میں طعام دو نوعمر لڑکے بھی تھے۔ بھوسے دادا شاید اُنھی کو زندہ گزار رہا تھا۔ وہاں جا کے کالے دادا کو علم ہوا کہ بھوسے دادا نے اڈے سے نکلنے کے بعد کیسے دن گزارے ہیں۔ گزشتہ دن وہ اڈے کے کئی آدمیوں کی زبانی بھوسے دادا کا نام سن چکا تھا۔ کالے نے بھی یہی طے کیا تھا، اگر وقت ملا تو وہ ایک بار بھوسے دادا کو دیکھنے ضرور جائے گا۔ کالے نے یہ بتا کے مجھے حیران کر دیا کہ بھوسے دادا کے سیدھے ہاتھ کی دو انگلیاں کٹی ہوئی ہیں۔ میں نے غور نہیں کیا تھا مگر اس کا مطلب یہ ہے کہ رات جو چاقو اُس نے ناچنے والی لڑکی پر حملہ کرنے والے پر پھینکا تھا، وہ ان کٹی ہوئی انگلیوں کا کرشمہ تھا۔ بھوسے دادا کی لڑکپن ہی میں شادی ہو گئی تھی مگر شادی کے پہلے سال اُس کی بیوی اچانک اُس سے جدا ہو گئی۔ کہتے ہیں رات کو سوتے وقت وہ بالکل ٹھیک تھی صبح بستر پہ مُردہ پائی گئی۔ پھر برس گزر گئے، دادا نے دوسری شادی نہیں کی اور کسی عورت کی طرف نگاہ اُٹھا کے دیکھا مگر پھر بازار کی ایک عورت اس قدر پسند آئی کہ دوبارہ شادی نہ کرنے کا عہد توڑ دینا پڑا۔

اُس زمانے میں دُور دُور تک بھوسے دادا کا طوطی بولتا تھا۔ اُس کے بازوؤں میں ڈھلتی عمر کے باوجود ایسی لپک تھی کہ کوئی سامنے نہیں ٹکتا تھا۔ وہ عورت بھوسے دادا سے شادی کرنے پہ آمادہ نہیں

تھی جانے کے قابل رہی۔ بھورے دادا چاہتا تو اُسے کسی اور طرح بھی حاصل کر سکتا تھا مگر وہ اُسے کسی پھول کی طرح سمجھتا تھا۔ کہتے ہیں پھول تھی بھی وہ۔ نام اُس کا الماس تھا۔ بھورے دادا کو اتفاقاً شادی پر آمادہ ہو گیا تو الماس نے اُس سے ایک بڑی رقم کا مطالبہ کیا۔ بھورے دادا کے لیے اتنی بڑی رقم کی فراہمی مشکل تھی مگر اُس نے کسی نہ کسی طرح رقم حاصل کر کے اُس کے قدموں پر لے جا کے رکھ دی۔ پھر الماس نے اڈہ چھوڑ دینے کو کہا۔ بھورے دادا اس پر بھی تیار ہو گیا۔ تب بھی وہ طرح طرح کے حیلے تراشتی رہی۔ اصل میں اڈے کے کسی آدمی پر اُسے اعتبار نہیں تھا یا وہ اڈے کے آدمیوں سے بہت خوف زدہ تھی۔ بھورے دادا تو بازار بلکہ شہر کا سب سے بڑا دادا تھا۔ پھر ایک دن الماس نے عجب مطالبہ کیا۔ اُس نے کہا، میں یقین کرنا چاہتی ہوں کہ تم کبھی چاقو کو ہاتھ نہیں لگاؤ گے۔ اس لیے اپنے ہاتھ کی دو انگلیاں کاٹ کے میرے حوالے کر دو۔ نہ جانے الماس نے بھورے دادا سے کوئی مذاق کیا تھا یا وہ سنجیدہ تھی مگر بھورے دادا نے دیر نہیں کی۔ اُسی وقت چاقو نکالا اور پوچھا، کون سی انگلیاں؟ الماس سکتے میں رہ گئی۔ بھورے دادا نے سیدھے ہاتھ کے انگوٹھے کے برابر والی دونوں انگلیاں اُسی وقت کاٹ دیں۔ لوگ بتاتے ہیں کہ الماس یہ دیکھ کے بے ہوش ہو گئی تھی۔ اب کوئی عذر الماس کے پاس نہیں رہا تھا۔ بھورے دادا اُسے ساتھ لے آیا اور اڈے سے نزدیک ایک گھر میں ایک بوڑھی عورت کے حوالے کر دیا۔ پھر اُس نے اعلان کیا کہ آیندہ جمعرات کو اُس کی الماس سے باقاعدہ شادی ہو گی۔ جمعرات میں تین دن باقی تھے مگر اس کا موقع نہیں آیا۔ بدھ کی رات جب بھورے دادا کی طرف سے عورتیں مہندی لگانے پہنچیں تو الماس وہاں نہیں تھی۔ بوڑھی عورت فرش پر بے سُدھ پڑی تھی۔

اڈے کے آدمیوں نے سارا بازار چھان مارا۔ الماس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ بازار میں کسی گانا سننے والے کسی شخص کے ہاں اُس نے خود کو چھپا لیا ہو گا اور اُسی شخص کی مدد سے وہ حیدرآباد سے نکل گئی ہو گی۔ بھورے دادا نے کسی کو اُس کی تلاش کے لیے متعین نہیں کیا تھا۔ اڈے کے آدمی خود ہی اپنے دادا کو خوش دیکھنے کے لیے جگہ جگہ مارے مارے پھرتے رہے۔ حیدرآباد سے نزدیک کئی شہروں میں گئے۔ یہاں تک کہ بمبئی بھی پہنچے۔ الماس کسی بازار میں نظر نہیں آئی۔ بھورے دادا نے لوگوں کی توقع کے خلاف خاموشی سے یہ صدمہ سہا تھا مگر اُس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ بجھ بجھ گئی تھی۔ گو وہ ہمیشہ کی طرح جم کے اڈے پر بیٹھتا تھا اور ہمیشہ ہی کی طرح اڈے کے آدمیوں کا خیال رکھتا تھا۔ یہ لوگ بھی اُسے پہلے سے زیادہ عزت دیتے تھے۔ اسی دوران شاہ کبیر آیا تھا اور اُس نے اچھی طرح اندازہ لگا لیا تھا کہ انگلیاں کٹ جانے سے بھورے دادا کی چاقو کی گرفت ختم ہو گئی ہے اور اس کے جسم کی پھرتی بھی کچھ رخصت ہو چکی ہے تاہم لوگ بھورے دادا کو ایک زمانے سے دیکھ رہے تھے۔ کسی کو اُس سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ اڈے کا کام حسبِ معمول چل رہا تھا۔ اب بھی بھورے دادا اڈے کے آدمیوں کو ورزش کراتا اور انھیں چاقو کے ہاتھ سکھاتا تھا۔ شہر اور اطراف کا کوئی دادا بھورے دادا کو اڈے سے ہٹانے کے لیے آگے نہیں آیا۔ کسی کے گمان میں بھی نہ ہو گا کہ بازار کے اڈے پر بھورے دادا کی جگہ کوئی دوسرا شخص بھی ہو سکتا ہے۔ صرف ایک شاہ کبیر تھا جو شروع میں اُس کے شاگرد کی حیثیت سے رہا۔ بعد میں ایک دن چاقو تان کے اُس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ جواب میں بھورے دادا نے ہتھیار نہیں اُٹھایا۔ خاموشی کے ساتھ اڈے سے نکل گیا۔ اُسے اڈے سے دور کر دینے کے بعد بھی شاہ کبیر کو چین نہیں آیا۔ اُس نے اُس کا تعاقب کیا۔ اڈے کے ہر آدمی پر اُس سے ملنے کی پابندی عائد کی۔ اڈے کے جن آدمیوں نے احتجاج کیا یا جن کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ بھورے دادا سے رابطے کیے ہوئے ہیں، انھیں شاہ کبیر کا عتاب جھیلنا پڑا۔ بھورے دادا شہر چھوڑ گیا تھا۔ وہ کچھ ہی دنوں تک شہر میں رہ سکا۔ پھر لوگوں سے خبر ملی کہ وہ گلبرگے میں خواجہ گیسو دراز کے مزار پر چلا گیا ہے۔ اس کے غیاب میں اڈے کے اکثر آدمیوں کو ملنے کے بعد بھی یہ خوش فہمی رہی کہ وہ ایک دن پھر لوٹ کے آئے گا اور شاہ کبیر کو اڈے سے نکال پھینکے گا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُن کا یہ خواب دھندلا گیا اور اڈے پر شاہ کبیر کی گرفت روز بروز مضبوط ہوتی گئی۔

بہت عرصے بعد جب لوگوں کی یادوں پر گرد پڑنے لگی تھی اچانک بھورے دادا پھر حیدرآباد میں دکھائی دیا۔ لوگوں کو توقع تھی کہ اب شاہ کبیر کے دل میں اس کے لیے پہلے جیسا عناد نہیں رہا ہو گا۔ بھورے دادا اور بوڑھا ہو کے آیا ہے مگر شاہ کبیر کے ہاں کوئی لچک نہیں تھی حالانکہ از خود بھورے دادا نے اڈے کے کسی آدمی سے ملنے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ قصہ مختصر اُسے دوبارہ واپس جانا پڑا۔ وہ پھر اُسی وقت حیدرآباد آیا جب اڈے پر شاہ کبیر نہ رہا۔ اب کالے دادا بھی نہیں۔ تاہم اس وقت اڈے پر آکا بیٹھا ہوا تھا۔ لوگ اس اُمید پر جوق در جوق بھورے دادا سے ملنے گئے کہ نئے دادا کو اس سے کیا پرخاش ہو سکتی ہے لیکن آکا بھورے دادا کے معاملے میں شاہ کبیر سے زیادہ حساس ثابت ہوا۔ جو لوگ ایک بار اُس سے ملنے کا گناہ کر چکے تھے انھیں آکا کے سامنے جواب دہی کی زحمت اُٹھانی پڑی۔

بھورے دادا کو بازار کے علاقے سے دور ایک ٹھکانا مل گیا تھا مگر ضروریات کے لیے وہ کوئی چھوٹا موٹا کام کرنا چاہتا تھا مگر کام کے لیے پیسے درکار تھے۔ تن دہی کے کسی کام کے وہ لائق بھی نہیں رہا تھا۔ اڈے کے پرانے آدمیوں نے ڈھکے چھپے طور پر اُس کی مدد کرنی چاہی مگر اُس کے انکار پر خاموش ہو گئے۔ پھر اُنھوں نے ایک اور بیرونی علاقے سے دور دور کے چند نوعمر لڑکوں کو بھورے دادا کے پاس بھیج دیا کہ وہ انھیں ورزش کرائے۔ لڑکوں کی تعداد نہایت محدود تھی اور اُن کا تعلق کسی اڈے سے نہیں تھا۔ بات پھیلی نہیں۔ لڑکے بھورے دادا کی خدمت کرتے تھے اور اس کے لیے روزی کا وسیلہ بن گئے تھے۔ بھورے دادا کی بھی دلی خواہش یہی ہو گی کہ وہ اپنی زندگی میں کچھ ایسے لوگ تیار کر جائے جو کسی وقت آکا اور شاہ کبیر جیسے آدمیوں کا سامنا کر سکیں۔

اندر بھورے دادا نے جھبل کو حویلی کے بیچ میں بٹھایا۔ اس پر اضطراری عالم طاری تھا۔ وہ جھبل کے ہاتھ سینے سے لگائے آنکھیں موندے بیٹھا رہا۔ اس نے سب کو تعزیت ملا ہوا دھوپ پلایا۔ وہ جھبل کو بازار کے دادا کی حیثیت سے مخاطب کر رہا تھا لیکن جھبل نے فوراً ترمیم کی کہ بازار کا دادا سر دست کالے دادا ہی ہے۔ اس پر کالے دادا اُس کے سامنے ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہو گیا اور عاجزی سے بولا کہ جھبل کی موجودگی میں وہ اڈے کی نگرانی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ بھورے دادا نے بھی دبے لہجے میں خواہش ظاہر کی کہ اڈے کی قیادت کرنا جھبل ہی کو زیب دیتا ہے۔ وہ دوبارہ اڈے کے آدمیوں کی نجات کا سبب بنا ہے۔ جھبل نے نرمی سے جواب دیا کہ بھورے دادا کا حکم سر آنکھوں پر مگر اپنی چند مجبوریوں کے سبب وہ اڈے پر بڑے دادا کی رسم ادائی سے معذور ہے۔ جھبل کوئی ایک ڈیڑھ گھنٹے وہاں بیٹھا اور اُس نے وعدہ کیا کہ جلد ہی بھورے دادا کے پاس پھر آئے گا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ جھبل اُسے اپنے ساتھ اڈے پر لے جائے گا۔ اڈے سے جانے کے بعد بھورے دادا نے بازار کے علاقے میں قدم نہیں رکھا تھا اور اس واقعے کو زمانہ گزر چکا تھا۔ جھبل کو اس کا احساس تھا چنانچہ چلتے وقت اُس نے بھورے دادا سے کہا، وہ اس وقت کچھ الجھنوں میں گھرا ہوا ہے ورنہ اُسے بھورے دادا کو ساتھ لے جانے میں خوشی ہوتی۔ اس عالم میں وہ اڈے پر اس کی پذیرائی نہیں کر سکے گا۔ یہ سن کے قریب کھڑے ہوئے لوگوں نے بے ساختہ کہا کہ وہ انھیں کوئی حکم دے، جان کا حکم دے۔ جھبل مسکرانے لگا اور بولا: "ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔"

دوپہر کے کھانے کے وقت اور بعد میں گزشتہ دن کی طرح اڈے پر بھیڑ لگی رہی۔ وہ اجنبیت جو کالے، شاہ رحم اور منگو کو محسوس ہو رہی تھی اب اتنی نہیں رہی تھی۔ اسی رات جھبل کی ہدایت کے بموجب علاقے کے تمام گشتی پولیس والوں کو بھی مدعو کیا گیا۔ بازار سے بھی مختلف عورتیں آتی رہیں۔ شام کو جھبل نام پلی کے عطا صاحب کے پاس گیا۔ یہ ایک چھوٹا مگر شہر کے دولت مند آدمیوں سے بھرا اڈہ تھا۔ سائیں کے آکا سے اچھے مراسم تھے یا یوں کہا جائے کہ اُسے آکا سے اچھے مراسم رکھنے پڑتے تھے۔ جھبل کو دیکھ کے وہ بوکھلا سا گیا تھا مگر جھبل کی آمد کا مقصد جان کے اُس کے حواس کچھ درست ہو گئے۔ اُس نے ندامت کا اظہار کیا کہ اپنی طبیعت خراب ہونے کے سبب وہ آکا کے جانے کے بعد جھبل سے ملنے نہیں آ سکا لیکن اُسے جھبل کو دیکھنے کی بڑی تمنا تھی۔ اُس کے آدمی جھبل اور اُس کے ساتھ آنے والوں کے لیے آناً فاناً اتنی چیزیں سمیٹ لائے تھے کہ رات کے کھانے کی گنجائش ختم ہو جاتی تھی۔ آکا کے لیے سائیں کے سینے میں بہت کینہ بھرا ہوا تھا۔ جھبل کے تیور دیکھ کے وہ پھٹ پڑا۔ اُس نے انکشاف کیا کہ نام پلی سے ہونے والی آمدنی کا دسواں حصہ آکا کو جاتا رہا ہے۔ یہ روایت چند مہینے پہلے آکا ہی نے ڈالی تھی۔ شکایت پر اُس نے سائیں کو دھمکی دی تھی کہ وہ نام پلی پر اپنا آدمی بٹھائے گا۔ سائیں کہہ رہا تھا کہ وہ کسی مناسب موقع کی تاک میں تھا۔ کچھ لوگوں کی امداد پہلو پر کے لوگوں سے آکا نے بنا رکھی تھی چنانچہ سوچ سمجھ کر ہی کوئی قدم اُٹھایا جا سکتا تھا۔

یہ جان کے جھبل کو جو کہنا چاہیے تھا، وہی اُس نے کہا۔ اُس نے کالے دادا کی طرف دیکھتے ہوئے اعلان کیا کہ آج سے اڈے کی ساری آمدنی اسی علاقے کے آدمیوں میں تقسیم کر دی جائے۔

سائیں ساتھ ہی اڈے پر آیا۔ اُس کے علاوہ نام پلی کے اور بہت سے آدمی۔ رات کے کھانے کے بعد بھی وہ کہیں رات گئے واپس گئے۔

اڈے کے بعض لوگ کانتے سے کسی قدر قریب ہو گئے تھے۔ اُن کی زبانی کانتے کو خانم کا نام سن کر بڑی حیرت ہوئی۔ وہ لوگ کانتے سے تصدیق چاہتے تھے کہ کیا خانم واقعی حیدرآباد واپس آ گئی ہے؟ پہلے تو کانتے کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دے۔ خانم کی آمد کی خبر اُس سمیت جھبل اور زورا کے سوا کسی کو نہیں تھی۔ زورا موجود نہیں تھا اور وہ ایسی غیر ذمے داری کر بھی نہیں سکتا تھا۔ پھر انھیں کہاں سے سن گن ملی؟ ایک جھبل ہی رہ جاتا تھا۔ غور کرنے پر اس کا جواب ایسا مشکل نہیں تھا۔ کانتے کے دماغ میں پڑی ہوئی بہت سی گرہیں خود بخود کھلتی گئیں۔ جھبل نے ضروری سمجھا ہو گا کہ یہ خبر اڈے کے لوگوں سے نہ چھپائی جائے کیونکہ اُسے یقین ہے کہ اڈے کے آدمیوں میں یا باہر اُن سے متعلق لوگوں میں کچھ ایسے لوگ ضرور ہوں گے جو یہ اطلاع دور تک منتقل کر سکیں گے۔ بڑے نواب کے بیٹے جہاں یہ اطلاع تشویش کا سبب ہو گی کہ اُس کے محبوسوں کے پرسان حال شہر

میں آ گئے ہیں وہاں اُن کی آمد اُن کے لیے شکون کا باعث بھی ہوگی کہ
ان لوگوں کا تعلق خانم کے کوائف جاننے والوں سے ہے۔ اب وہ نہیں
کئی آدمی سامنے ہیں اور لازم نہیں کہ بھی بابر اور سیٹھ کی طرح موقع
کھال کے ہوں اور کچھ نہیں تو پولیس کی توجہ ہی ان سب کی جانب
مبذول کرائی جا سکتی ہے۔ پولیس کے لیے ایک اشارے کا جواز بہت
ہوتا ہے اور وہ لوگ جن کا تعلق واقعے سے ہو، اُن کے لیے جواز تراشنے
میں پولیس کو کتنی دیر لگتی ہے۔ سب سے بڑا جواز تو اُن کا اس شہر میں
اجنبی ہونا تھا۔ شاید اجنبیت کا یہی احساس مٹانے کے لیے فیصل نے
اپنے گرد مجمع لگا رکھا تھا اس کی آڑ سے اپنے لیے اتنی ضرورت نہیں
تھی جتنی دوسروں کے لیے تھی۔ دوسروں کو یہ جتانا لازم تھا کہ یہ اجنبی کسی
ایسے احساس کے شکار نہیں ہیں۔ اس کے پیچھے کہ بڑے نواب کے دماغ
میں کچھ اور سما جائے، اُسے خانم کی آمد کے سلسلے میں مطمئن کر دینا مناسب
تھا مگر اور بھی بہت سی باتیں اور واقعے سے ملنے والی خبریں نواب
کو کسی ہیجانی اقدام سے باز رکھنے کے لیے کافی ہونی چاہیے تھیں۔

فیصل اور کالنے کے لیے نواب کی واپسی تھامنا ایسا دشوار
نہیں تھا۔ وہ حویلی میں پہلے ملازموں کا بڑا ہجوم دیکھ کے آئے تھے جو
بعد میں اور بڑھا دیا گیا ہوگا مگر فیصل اور کالنے طے کر لیتے تو حویلی
میں داخل ہو کر ہی دم لیتے۔ اس طرح کوئی مثبت نتیجہ برآمد ہونے کا
امکان ہوتا تو وہ ایک پل کی تاخیر کرتے ورنہ اُن کی ذرا سی چوک
انہیں بہت پیچھے دھکیل سکتی تھی۔ وقت کی نزاکت انہیں بھی راس نہ
آئی۔ فیصل نے نئے لفظوں میں آغا جان سے کہنا چاہا تھا کہ اُن کے دو
آدمی ان کے پاس نہیں ہیں اور وہ اُن سے مزید دو لیے جا سکتے
ہیں وعدوں کی وسعت سے آغا جان خوب آشنا ہوں گے۔ بڑے
نواب کو بھی یقیناً حویلی سے چلتے وقت فیصل کے کہے گئے لفظ یاد ہوں
گے مزید کسی پیچیدگی کا خیال فیصل سے زیادہ اُسے ہونا چاہیے تھا کہ
جگ ہنسائی کا خیال بھی تو ہوگا لیکن آدمی کا کچھ ٹھیک نہیں بنے پل
بھر میں بکھر جاتا ہے کسی بھی وقت کوئی ایسا لمحہ آ جاتا ہے کہ وہ ہی
اپنا ہی آشیانہ پھونک کے اپنے آپ کو بھسم کر ڈالے۔ نواب خود نہیں
تو اُس کے مصاحب تو ایسے کسی سرکش دشمن لمحے سے دو چار کر
سکتے تھے۔

کالنے کی آنکھوں میں جیسے اس کی بینائی واپس آ رہی تھی
لیکن فضا اس کے سامنے واضح ہوتا جا رہا تھا۔ اتنا ہی اس کی آنکھوں میں
اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ بار بار اُسے ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی پیچھے سے اُس کی
جانب بڑھ رہا ہو۔ وہ اپنی ہی آہٹ پہ چونکنے لگا تھا۔ بار بار اس کے
دماغ میں سب کچھ گڈ مڈ ہو جاتا تھا۔ پولیس کسی وقت بھی روک
سکتی ہے کسی وقت بھی کسی بھی طرف سے اُسے گھیرے میں لیا جا سکتا

ہے۔ خانم کی آمد سے کوئی نتیجہ نہ نکلا تو؟ اس کے باوجود نواب اگر
الجھی رہ گئی؟ اگر خانم ہی نہیں آئی یا اُس کے آنے میں دیر ہو گئی؟
اور اس درمیان چھوٹے نواب کو کہیں کچھ ہو گیا تو اس کا بھائی بڑا
نواب تو... اور وہ دونوں لاڈلے اور بہرے دادا معلوم نہیں کس
حال میں ہوں گے کالنے جتنا سوچتا تھا، اُس کے جسم میں خون
جمنے لگتا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وقت ہاتھ سے نکلا جا رہا ہو۔

رات کو کھانے کے بعد ابھی سامان نہیں گیا تھا گشتی پولیس
والے چلے گئے تھے کہ کالے دادا نے فیصل سے کہا۔ آکا کے پاس سے
آدمی آیا تھا۔ وہ استاد سے ملنے کے لیے ضد کر رہا ہے۔ کالے دادا نے
بلند آواز میں فیصل کو بتایا تھا۔ سبھی نے سنا تھا۔ فیصل کا جواب سننے
کے لیے عمارت میں یک دم سناٹا چھا گیا۔ فیصل نے فوراً جواب نہیں دیا۔
کچھ توقف کے بعد تنک کے بولا۔ "اس کو ایسی کیا تکلیف ہے؟"

"آدمی بولتا ہے اُدھر بہت بھیڑ ہے۔ پی ڈی والے لگنے لگے ہیں۔"
کالے دادا نے تشویشی آواز میں کہا۔

"چل بولو کہ لے آ۔" ایک ثانیہ کے تذبذب کے بعد فیصل ناگواری
سے بولا۔ پھر عمارت میں سکوت ہی طاری رہا جیسے سب چلے گئے ہیں۔
سب سہے ہو کے بیٹھ گئے تھے۔ کالنے کو معلوم تھا کہ آکا کو اڈے
سے قریب کسی مکان میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ اس سے زیادہ آگے کچھ
جاننے کی بے چینی بھی نہیں تھی۔ جس حال میں کالنے نے آخری بار
آکا کو دیکھا تھا اُس کے لحاظ سے اُسے سنبھلنے کے لیے بہت وقت
درکار تھا اور اس کے بعد اس کا شہر میں دکھائی دینے یا لوٹ کے آنے کا
کوئی امکان نہیں تھا۔ کالنے کو گزشتہ رات آکا کے بارے میں کچھ
معلوم ہوا تھا اور پہچان کے تردد ہوا تھا کہ وہ ابھی کہاں شہر میں ہے۔
پھر کالنے نے خود کو یہ تسلی دے کے چپ ہو رہا کہ فیصل نے اس حالت میں
آکا کا باہر نکلنا بہتر نہ سمجھا ہوگا۔ ہو سکتا ہے آکا کی موجودگی میں اس کی
مجبوری سے زیادہ فیصل ہی کی مرضی کو دخل ہو۔ فیصل نے بعض دوسری
وجوہ سے بھی اُسے روکے رکھا ہوگا۔ کسی ثبوت کے لیے آکا کی
ضرورت پڑ سکتی تھی۔ واقعے کا وہ واحد آدمی ہوگا جس سے بڑے نواب
یا اس کے اہل کار زماں صاحب نے رابطہ قائم کر رکھا تھا۔ ان پانچ آدمیوں
نے بھی اُسی کی ہدایت پہ میرا اور بیرو کا تعاقب کیا تھا۔ واقعے کے
آدمیوں کا خون گرم رکھنے کے لیے بھی اس کی موجودگی ضروری تھی اس
کے نواب کی خبروں سے اُن کی آگ ابھی فروزاں نہ رہتی جیسی اس
کے ہونے پر تھی۔ نواب کے سلسلے میں مزید معلومات کے لیے بھی اُسے
قریب ہی رہنا چاہیے تھا۔

مگر اب آکا فیصل سے کیسے ملنا چاہتا ہے؟ کالنے کی طرح
سبھی یہ جاننے کے لیے بے تاب تھے۔ فیصل اور کالے دادا نے آکا

کے آدمی کی واپسی کے بعد عمارت میں چھائی ہوئی اضطراب آمیز خاموشی توڑنے کی کوشش کی لیکن اب سب بہت بے کل ہو گئے تھے۔ ناٹی کا دادا ساجن بھی گم سم سا تھا اور جھل کے سوالات کے جواب کھوئے کھوئے انداز میں دے رہا تھا۔ سب کی نگاہیں بار بار دروازے کی طرف جا رہی تھیں۔ دس منٹ گزرے ہوں گے کہ دروازے سے آہٹیں گونجیں اور ایک ساتھ کئی آدمی اندر داخل ہوئے۔ اُن کے بیچ میں آکا تھا۔ سوتی چادر میں لپٹا ہوا۔ سر ننگا، چپ چاپ، سہمی ہوئی۔ آنکھ اندر کو دھنسی اور ٹھوڑی پہ چھائے جھکے ہوئے۔ وہ عمارت میں سب کی موجودگی سے گویا بے خبر سیدھا چوکی کی طرف بڑھا۔ اُس کا سر جھکا ہوا تھا۔ لوگ اُسے راستہ دینے کے لیے اِدھر اُدھر سمٹ گئے تھے۔ جھل اُسے آتے دیکھتا رہا۔ چوکی کے پاس آ کے آکا رک گیا۔ پھر ایک دم سامنے بیٹھے ہوئے جھت سے لوگ اچھل گئے۔ جب آکا نے چوکی پر چڑھنے کے لیے قدم بڑھائے۔ جانے اُنھوں نے کیا سمجھا ہو۔ ایک لمحے کے تذبذب کے بعد آکا نے اوپر چڑھ کے تیزی سے جھل کے پیر پکڑ لیے۔ کانتے چوکی پر جھل کے نزدیک ہی بیٹھا تھا۔ آکا جھل کے پیر پکڑ کے رقت آمیز آواز میں گڑگڑا رہا تھا کہ اُسے معاف کر دیا جائے۔ زندگی میں کبھی اس سے اتنا بڑا دھوکا نہیں ہوا تھا۔ اب وہ اُس وقت تک چین نہیں لے گا جب تک جھل اُسے معاف نہ کر دے۔

"اپنے کو تجھ سے کوئی بیر نہیں ہے لے۔" جھل نے دھیمی آواز میں کہا اور پہلو بدلنے لگا۔

عمارت میں سوئی بھی گرتی تو آواز آتی۔ سب بے حس و حرکت بیٹھے تھے۔ اُن کی نظریں جھل اور آکا پر جمی ہوئی تھیں۔ آکا کہنے لگا کہ وہ ایک بنتی کرنے آیا ہے جس کا اُسے کوئی حق نہیں پہنچتا مگر جھل نے جہاں اُس کا اتنا خیال کیا ہے ایک احسان اور کرے۔ اُسے جدا نہ کیا جائے۔

"کیا بولتا ہے تو؟" جھل نے ترشی سے کہا۔

"اپن کو اپنے سے الگ مت کرو۔" وہ رکتی آواز میں بولا۔ اُس نے کہا کہ وہ اب کہیں نہیں جائے گا۔ زندگی بھر جھل کی خدمت میں رہنا چاہتا ہے۔

"دھیان کر کے پھر کبھی اپنے سے بات کرنا۔" جھل نے نرمی سے کہا۔ "کیا آنا ہی بولنے کو آیا تھا؟"

"اور اپنے پاس بولنے کو کیا رہ گیا ہے دادا!" وہ تڑپتے ہوئے لہجے میں بولا۔ کہنے لگا۔ اُسے یقین دلایا جائے کہ جھل نے اُس کی درخواست قبول کر لی ہے۔ یہ دوسری زندگی اُسے جھل کی وجہ سے ملی ہے اور اسے وہ اسی کی چھاؤں میں گزارنا چاہتا ہے۔ سب اُسے

محسوس ہو رہا ہے کہ وہ کیسے سراب میں دن گزار رہا تھا۔

آکا کا لہجہ عاجزانہ تھا۔ اُس میں کوئی کھوٹ نظر نہیں آتی تھی۔ کانتے کو اپنا سینہ پھٹتا محسوس ہوا۔ اُس نے کبھی کسی دادا کو اپنے لوگوں کے درمیان ٹوٹ کے اس طرح آتے نہیں دیکھا تھا۔ "جانے دے رے۔ جس طرح ہونا تھا، ہو گیا سالا۔" جھل نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"اپنے کو کچھ پوچھو تو دادا، کوئی دکھ نہیں ہے۔ قسم سے بہت خوشی ہے کہ اپنے کو ایک آدمی مل گیا۔" وہ جلتی آواز میں بولا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ "تم کو پتہ نہیں دادا! اپن تمھاری تلاش میں کدھر کدھر گھوم گھام کے اِدھر آ کے نکلا تھا۔ پھر تم کو ایسے ملا تھا۔"

"جا کے آرام کر۔ زیادہ مت بول۔"

"تم جب تک کچھ بول نہیں دو گے آرام اپنے کو نہیں ملے گا۔"

"اپنے ساتھ تو نہیں چلنے کا رے۔"

"تم کوئی حکم کر کے دیکھو دادا! سمجھو کہ پیلا آکا مر چکا ہے۔ وہ سُوَر کی اولاد بہت مجبور تھا۔ وہ کتا تھا دادا! اُس کو ایک دن مر ہی جانا تھا۔ اُس کو بھول جاؤ۔ یہ سب کچھ تم سے نیا آکا بول رہا ہے۔" اُس نے ملتجی نظروں سے کانتے کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ وہی جھل سے سفارش کرے۔

"کیا چاہتا ہے تو؟" جھل نے نرمی سے کہا۔

"تمھارا پٹا مانگتا ہے۔ گلے میں اپنا پٹا ڈال دو۔ جب تک سانس رہے گی، قسم سے تمھاری چوکھٹ سے ہل کے نہ جاؤں تو اپنی ماں کا جنا نہیں۔ اپن اور کچھ نہیں مانگتا۔"

"دیکھیں گے پھر۔" جھل نے سر ہلا کے کہا۔

"نہیں دادا! اپن ایسے بالکل نہیں جانے کا۔ تم سے اپن طے کر کے آیا ہے۔ جب تک تم ہاں نہیں کر دو گے۔ اِدھری تمھارے پیروں پہ پڑا رہے گا۔ کچھ اور تمھارے پاس اپنے لیے نہیں ہے تو اپن کی ایک بات تم ضرور پوری کر سکتے ہو۔ اپن کو اپنے ہاتھوں سے ختم کر دو دادا! تمھاری دی ہوئی موت کے بنا اپن کو آدھر ہی۔۔۔"

"جا، جا کے آرام کر۔" جھل نے بیزاری سے کہا مگر وہ جھل کے پیروں سے لپٹ گیا۔ جھل نے اُس کی گردن پکڑ کے اُس کا چہرہ اوپر اُٹھایا اور پلے آئے خشمگیں نظروں سے گھورتا رہا۔ پھر کہیں اُس کے ہونٹوں میں جنبش ہوئی۔ وہ بدلی ہوئی آواز میں بولا۔ "ابھی جا کے اپنا حال تو تھوڑا ٹھیک کر۔"

آکا کو جھل کی آنکھوں میں کچھ نظر ہی آ گیا تھا۔ وہ بے تحاشا سسکنے لگا۔ جھل نے اُس کا سر اپنی آغوش میں کھینچ لیا۔

اُس کے جانے کے بعد عمارت پر سوگ سا طاری رہا۔ سب کہیں گم ہو گئے تھے۔ ساجن بھی دیر تک بے سُدھ بیٹھا رہا۔

بارہ بجے کے قریب جب ساجن اور اُس کے ساتھی چلے گئے تھے، رشامو نے زورا سے کانتے کے بھی بھری آگے دروازے پہ زورا کا چہرہ دکھائی دیا تھا۔ کل بھی زورا لگ بھگ اسی وقت آیا تھا۔ ممکن ہے اُسے کسی آدمی نے اُس کو رات گزارنا اور دن بھر غائب رہنا محسوس کیا ہو مگر زورا کو جیسے اس امر کی فکر نہیں تھی۔ وہ کسی تذبذب کے بغیر اُن کے درمیان آ کے بیٹھ گیا۔ کانتے کو جستجو تھی کہ وہ خانم کے جوابی پیغام سے مطلع کرنے آیا ہو گا مگر زورا کے پاس خانم کی آمد کے متعلق کوئی خبر نہیں تھی۔ وہ جھل کو یہ بتانے آیا تھا کہ نواب حشمت جنگ کا معتمد دوپہر کے وقت اباجان سے ملا تھا۔ اُس نے اُن سے کہا کہ نواب کے حکم کے مطابق وہ انھیں ایک حویلی دکھانا چاہتا ہے۔ وہی حویلی جس کا تذکرہ کل رات نواب نے اُن سے کیا تھا۔ اباجان نے اُسے شام کا وقت دیا۔ شام کو مقررہ وقت پر ٹھیک سات بجے وہ آ گیا۔ اُس کے پاس نواب کی موٹر تھی۔ مارتی، زورا اور اباجان تینوں اُس میں بیٹھ کے حویلی گئے۔ زورا کے بیان کے بموجب وہ صاف ستھرے پُرفضا علاقے میں واقع ایک خاصی بڑی حویلی تھی۔ دو منزلہ۔ پچھلی تیسری منزل پر بھی چند کمرے بنے ہوئے تھے اور باغیچہ لگا ہوا تھا۔ باہر سے اُس کا رنگ روپ گوارا تھا لیکن اندر سے وہ سجاوٹ دیکھنے کے لائق تھی۔ ایک نواب اور چند ملازموں کے سوا وہاں کوئی مقیم نہیں تھا۔

ابھی وہ پہنچے ہی تھے کہ نواب حشمت جنگ کی سواری بھی آ گئی۔ اباجان باہر ہی سے حویلی دیکھ کے پسندیدگی کا اظہار کر چکے تھے۔ اندر جا کے وہ اور متاثر ہوئے۔ اُنھوں نے نواب حشمت جنگ سے کہا کہ یہ بہت نفیس عمارت ہے مگر اُن کی ضرورت سے بہت بڑی ہے۔ نواب نے اسے اباجان کے انکسار پر محمول کیا اور اس سے پہلے کہ اباجان کوئی اور حیلہ پیش کرتے۔ اُس نے حویلی کے مالک اپنے عزیز سن رسیدہ نواب سے معاملے کی بات شروع کر دی۔ زورا کو حویلی کی قیمت سُن کے حیرت ہوئی تھی۔ حویلی کے مالک نے صرف اسّی ہزار روپے طلب کیے تھے۔ فرنیچر اور دیگر ساز و سامان کے پانچ ہزار الگ۔ نواب حشمت جنگ کو کچھ نہیں چاہیے تھا مگر اُس نے اباجان کی خاطر حویلی کے مالک سے قیمت پر نظرِ ثانی کی درخواست کی مگر اباجان نے بیچ میں دخل دے کے ساری بات ہی ختم کر دی۔ انھوں نے کہا جس ذوق و شوق سے یہ عمارت تعمیر کی گئی ہے اُس کے مقابلے میں مطلوبہ رقم کچھ بھی نہیں ہے۔ دوسرے انھیں یوں بھی کوئی اعتراض نہیں کہ حویلی

کے مالک محترم نواب یہ رقم کار خیر میں صرف کرنا چاہتے ہیں۔ مستحقین کے حق میں کوئی کمی نہیں کرنی چاہیے۔

اباجان نے گفتگو میں ہیروں کی فروخت سے ڈھائی لاکھ روپے کے قریب حاصل کیے تھے۔ اُسی میں سے بچی ہوئی بڑی رقم اُن کے پاس محفوظ ہو گی کہ کوئی اور بھیرا فروخت کرنے کی ضرورت نہیں پڑی ہو گی۔ اس وقت اُن کی جیب میں چند ہزار روپے تھے۔ کچھ زورا اور مارتی کی تحویل میں تھے۔ دس ہزار روپے بیعانے کے طور پر انھوں نے حویلی کے مالک بوڑھے نواب کے سامنے رکھ دیے۔ نواب نے کہا، اس کی ضرورت نہیں۔ شرفا کی زبان ہی بیعانہ ہوتی ہے مگر اباجان نے نوٹ واپس نہیں اُٹھائے۔ بعد میں نواب نے انھیں بتایا۔ معاملے سے پہلے وہ مناسب نہیں سمجھتا تھا کہ حویلی کے بارے میں کوئی بات کرے۔ اصل میں اُسے یہ حویلی کسی صاحبِ ذوق کے حوالے کرنے کی خواہش تھی۔ اسی لیے اتنے دن بھی لگ گئے۔ حال ہی میں بڑی دلچسپی سے متعلق ایک بڑے انگریز عہدے دار نے دلچسپی ظاہر کی تھی مگر بڑے ہال میں حافظ و سعدی کے اشعار کے بیچ اور آیاتِ کلام اللہ کی نقاشی کی گئی ہے۔ لہٰذا گریز رہا۔ انگریز نے مختلف ذرائع سے سفارش کروائی مگر حویلی کسی غیر مسلم کے حوالے کرتے ہوئے نواب کا دل نہ مانا۔ ویسے اُس انگریز کے اعلیٰ ذوق میں کلام نہیں تھا۔

اُس نے اباجان سے کہا کہ وہ کسی بھی وقت منتقل ہو سکتے ہیں۔ ابھی چاہیں تو ابھی۔ رسمی کارروائی بعد میں ہوتی رہے گی کیونکہ نواب حشمت جنگ درمیان میں ہے۔ حویلی کا مالک یہاں سے چند جوڑے کپڑے اور بعض خاندانی یادگاروں کے سوا کچھ لے کے نہیں جائے گا۔ حویلی میں آنے والے کسی بھی خاندان کو اس کے سوا غالباً کسی چیز کی ضرورت محسوس نہ ہو۔ اباجان نے پیشکش کی کہ حویلی کا مالک جب تک چاہے وہاں قیام کرے۔ نواب نے اُن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جواب دیا کہ وہ تو کب سے پا بہ رکاب ہے۔ اب جلد از جلد یہاں سے جانا چاہتا ہے۔ اباجان اگر آج آنا پسند کریں تو آج ہی آ جائیں۔ وہ ایک روز کے لیے وہ اپنے ایک دوست کے ہاں منتقل ہو جائے گا۔ پھر اُس نے کہا۔ حویلی، باغ، باورچی خانے، صفائی اور دیکھ بھال کے لیے گیارہ ملازم ہیں۔ اُن کے ساتھ اُن کے متعلقین بھی ہیں۔ یہ لوگ برسوں سے اُس کے خاندان کی خدمت کرتے رہے ہیں۔ اباجان چاہیں تو انھیں برقرار رکھ سکتے ہیں۔ اُن کی شرافت، مستعدی اور دیانت کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔ اباجان نے کہا۔ وہ انھیں بخوشی کام پر رکھیں گے۔ ہر چند کہ انھیں اتنے ملازموں کی ضرورت شاید نہ پڑے۔ پھر نواب حشمت جنگ اُن تینوں کو اپنی تولی لے گیا۔ رات کو

کھانا کھائے بغیر اُس نے اُنھیں نہیں آنے دیا۔

ابّاجان نے تجمّل سے رائے پوچھی تھی۔ جواب میں تجمّل نے زور دار سے کہا، مزید بحث و پیش و پیش کیے بغیر وہ کل ہی ہوٹل چھوڑ کے حویلی منتقل ہو جائیں۔ خانم کہیں گئی تو اسی حویلی سے جائے گی۔ رات بہت ہو گئی تھی اس لیے زورا اڈّے ہی پہ ٹھیر گیا۔ وہ کالے کے حجرے، شامو اور ننگو کے ساتھ اوپری منزل پہ چلا آیا۔ پھر باتیں کرتے کرتے ان سب کی آنکھیں جھپک گئیں، صبح اُنھیں معلوم نہ ہو سکا کہ زورا اُس حجرے سے کس وقت نکل گیا۔

گزشتہ راتوں کی طرح بہت سے لوگ وہیں سو گئے مگر جو چلے گئے تھے، صبح ہوتے ہی اُن کی آمد پھر شروع ہو گئی۔ اُن کا آنا لازمی تھا۔ تجمّل ہی نے گزشتہ شام اُن سے کہا تھا کہ کل صبح وہ اڈّے پہ روزانہ کی باقاعدہ نشستیں جاری رکھنے کے لیے کچھ آدمیوں کی دیکھ کریں گو یہ تکلّف تو محض بیرونِ اوقات تھا۔ تجمّل کی منشا ہی معلوم ہوئی تھی کہ اُن دنوں اڈّے کے آدمی شہر میں بھٹکنے کے بجائے زیادہ وقت اڈّے ہی پہ رہیں۔ بہتر ہے کہ اس دوران شہر کے کسی تھانے میں اُن کی کوئی رپورٹ درج نہ ہو اور پولیس بازار کے علاقے سے دُور ہی دُور رہے۔ زیادہ سے زیادہ آدمیوں کی موجودگی میں زیادہ سے زیادہ آشنائی کے علاوہ ایک اور بھی رمز تھا۔ ممکن ہے تجمّل کے ذہن میں یہ ہو کہ زورا ابّاجان کے ہمراہ آزادی سے شہر میں گھوم پھر سکے اور ہوٹل سے اُس کے کسی رابطے کا لوگوں کو علم نہ ہونے پائے۔ زورا کو اُنھوں نے اتنی بار یہاں دیکھا تھا کہ اب اُس کا چہرہ سب کی نظروں میں کھُب چکا ہو گا۔

اڈّے پہ آنے اُنھیں پورا تیسرا دن تھا۔ خانم کو تلاش کرتے ہوئے دو دن گزر چکے تھے۔ تیسرا دن شروع ہو گیا تھا۔ کالے کے خیال میں اب تک خانم کا جواب آ جانا چاہیے تھا۔ اگر کسی وجہ سے اُس کی آمد میں تاخیر ہو رہی ہے تو بھی اطلاع اُسے فوراً دے دینی چاہیے تھی۔ اُس نے صبح ہی سے انتظار شروع کر دیا تھا۔ اُسے اُمید تھی کہ زورا آج دن میں کسی وقت تجمّل کو خانم کے متعلق کوئی خبر سنانے ضرور آئے گا مگر صبح سے دوپہر ہو گئی۔ دھوپ اُترنے کا وقت آ گیا زورا نہیں آیا۔

تمام کمرے چار پانچ چائے تقسیم کی جا رہی تھی۔ عمارت میں آدمیوں کی بڑی تعداد موجود تھی۔ صدر دروازے سے ایک شخص لپکتا جھپکتا سیدھا تجمّل کے پاس پہنچا۔ اُس نے سرگوشیانہ لہجے میں بتایا کہ دادا باہر رستے کا انچارج آیا ہے۔ کالے کا ماتھا ٹھنکا۔ تجمّل بھی چند لمحوں کے لیے چپ رہا پھر اُس نے اطلاع دینے والے سے پوچھا، "کیا چاہتا ہے؟"

"بولتا ہے نئے داوا سے ملنا ہے۔"

"لے آ پھر اُس کو ادھر ہی۔" تجمّل کی آواز ابھی ہوا میں تھی کہ آدمی ابھی دروازے تک نہیں پہنچا تھا کہ تجمّل نے اُسے روک دیا اور جھٹ کر سے اُٹھ کے دروازے کی طرف جانے لگا۔ کالے دادا، ننگو، حجرو، شامو بھی پیچھے نہ رہ سکے۔ تھانے کے آدمی اڈّے میں داخل ہونے سے عموماً اس وقت تک اجتناب کرتے ہیں جب تک کسی خاص مقصد سے ہی اُن کا آنا ضروری نہ ہو جائے یا پھر اُنھیں اڈّے پہ باقاعدہ مدعو نہ کیا جائے۔ اُن کی اچانک آمد کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اڈّے کا کوئی آدمی پچھلے دروازے سے فرار نہ ہو سکے۔ انچارج اندر نہیں آیا تھا مگر باہر بھی اُس کی موجودگی کسی سبب ہی سے ہو سکتی تھی۔

وہ دروازے تک پہنچے تو سامنے چوڑی آنکھوں اور ... جیسے رنگ کا کوئی پچاس سالہ آدمی تھا۔ وہ ریاستی پولیس کی وردی میں ملبوس۔ اُس کے ساتھ دو سپاہی بھی تھے۔ دونوں کے کندھوں پہ بندوقیں لٹک رہی تھیں۔ بوڑھے دادا نے جلدی سے آگے بڑھ کے سیلوٹ کے انداز میں انچارج کو سلام کیا۔ جواب میں اُس نے سر کو خفیف سی جنبش دی اور چمکتی آنکھوں سے کالے دادا کے پاس کھڑے ہوئے تجمّل کو گھورتا رہا۔

"کیسے آنا ہوا سرکار؟" کالے دادا نے کسی قدر بے چینی سے پوچھا۔

انچارج کی نظریں تجمّل پہ جمی ہوئی تھیں۔ اُسی کو دیکھتے ہوئے وہ بولا، "سنا ہے کسی نے جیجڑی مار کو پھر سے لا کے بٹھا لیا ہے۔ اس کو دیکھنے آئے ہیں کتنے دانت کا ہے۔"

اِس سے پہلے کہ کالے دادا کوئی جواب دیتا، تجمّل سامنے آ گیا اور دھیمی آواز میں بولا، "لگتا ہے تم آپ کچھ تجمّل سے ہو۔ ادھر ایسا کوئی پالتو نہیں ہے۔ ادھر ہم ہیں اور ہم کو آپ دیکھنے آئے ہو تو دانت گیا، جو آپ بولو، دکھانے کو تیار ہیں۔"

انچارج کے جسم میں کوئی ہرنی اُٹھی۔ وہ بھنکاری بھر کے دھیمے لہجے میں کہنے لگا، "تو وہ تم ہو۔ معلوم ہوتا ہے سب ٹھیک ہی سنا ہے۔ بڑے چرچے ہو رہے ہیں شہر بھر میں۔"

"کاہے کے چرچے صاحب؟ ضرور کسی نے صاحب کے کان بھر دیے ہوں گے۔" تجمّل نے مسکرا کے کہا۔

"آدمی پرانے معلوم ہوتے ہو۔"

"آپ بھی اپنے کو نئے نہیں لگتے۔"

"کہاں سے آئے ہو؟"

تجمّل ہنس پڑا۔ "پرانے آدمی ہو کے آپ ایسا پوچھتے ہو؟ ایسی باتوں کا جواب ہم گھر پہ نہیں دیتے اور صد میں بھی آدمی دیکھ کے بولتے ہیں۔"

"تم ایک پولیس افسر سے مخاطب ہو۔" اُس نے نخوت سے کہا۔

"آپ بھی کسی سے بات کر رہے ہو، اپنے کو خوب جانکاری ہے آپ سے اپنی کوئی رشتے داری نہیں نکلتی۔"

"کالے!" وہ برہمی سے بولا۔ "اپنے داوا کو بولو، تھا تم نے ہمارے بارے میں کچھ نہیں بتایا کہ ہمیں کون سی زبان پسند ہے کون سی...."

کالے دادا بدحواس سا ہو گیا۔ تجمّل نے اونچی آواز میں کہا۔ "کالے سے کیا بولتے ہو صاحب؟ اپنے سے بات کرو۔ ہم کو اچھی طرح پتا ہے آپ کون سی زبان پسند کرتے ہو۔ ہم اپنے کو بھی ایک ہی آتا ہے۔"

"لیکن بے سُرا ہونا ہمیں بالکل اچھا نہیں لگتا۔"

"تسلّی رکھو صاحب! اپنی کوشش یہی ہوتی ہے کہ آپ لوگ کو کوئی شکایت نہ ہو۔ کبھی ہو جاتی ہے تو اپنے کو تکرار کی عادت بالکل نہیں ہے۔"

"کالے جانتا ہے کہ ہم ایک ہی بار رعایت دیتے ہیں۔"

"دوسری بار میں اپنے کو بھی شرم آتی ہے۔"

"معلوم ہوتا ہے تمھارے واسطے کچھ زیادہ ہی پڑے گا۔"

"اگر یہ حسرت ہے تو بات دوسری ہے، ابھی صاحب کے ساتھ چلے چلتے ہیں، ویسے ہم تنگ ہوں لے کے ہی گھر سے نکلتے ہیں۔"

کالے کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا کہ تجمّل اُس سے کس قسم کی باتیں کر رہا ہے۔ آخر اتنی طول کلامی کی کیا ضرورت ہے۔ اگر پولیس افسر کا مقصد محض نئے داوا کو دیکھنا اور اڈّے کی تبدیلی کے بارے میں کوئی اندازہ لگانا ہے تو تجمّل کو اسی حد تک بات کرنی چاہیے تھی مگر وہ تو الٹ کر رہا تھا۔ کالے کو شبہ تھا کہ استاد اس وقت ہوش میں بھی ہے یا نہیں۔ کالے دادا کا بھی بس نہیں چل رہا تھا کہ تجمّل کے منہ پر ہاتھ رکھ دے یا اُس کا ہاتھ پکڑ کے روک دے۔ انچارج کے چہرے کا رنگ پھیکا اور گہرا ہو گیا تھا۔ تجمّل سے کہنے لگا، "ضرور کالے نے تمھیں اندھیرے میں رکھا ہے۔"

"ابھی آپ سامنے موجود ہو جو اِس نے نہیں بولا وہ آپ ہی بول دو۔" تجمّل نے سانس لے کے کہا، "لگتا ہے کہ آپ اُوپر سے نیچے تک ابھی تک دکھائی دے رہے ہو۔"

"دکھائی دے رہے ہیں تو اچھا ہے ورنہ...."

"آگے کیوں بولتے ہو صاحب؟" تجمّل نے تیزی سے کہا۔ "اپنی ایک جیتی ہے۔ چلی اور آدمی اس کو کچھ اور مت سمجھنا۔ اپنی طرف ہاتھ بڑھانے سے پہلے یہاں جھٹک کر مت بھولنا۔ اس میں سب کا بھی بھلا ہے اپنا بھی۔ پہلے کچھ دوسروں کو بہت وقت خراب کرنا پڑا ہے اس لیے ایسا بول رہے ہیں۔ یہاں آپ حاکم ہو اور ہم کو پتا ہے کہ بازار کے اڈّے پہ آپ کو کچھ جان کے ہی بلایا گیا ہے۔"

پولیس افسر کی آنکھیں پھیلنے لگیں۔ "نہیں یہاں کس طور پہ بلایا گیا ہے؟" وہ سر اُٹھا کے بولا۔

"وہ تو تم کو پہلے دکھائی دے گیا تھا۔ آپ ادھر کھائی کی گھاٹ کے ایک دم نہیں ہو۔"

"تم نے کیسے جانا؟" وہ بے تابی سے بولا۔

"بہت دن دنیا چھانتے ہو گئے صاحب! اور ساری آپ ہی لوگوں میں گزری ہے۔ پر معاف کرنا آپ ادھر پولیس میں کیسے لگ گئے؟"

"کیوں کیوں؟ تمھارا کیا مطلب ہے؟" اُس نے چونک کے کہا۔

"آپ کو تو صاحب کچھ اور ہونا چاہیے تھا۔ اپنے کو تو آپ کوئی شکاری جان پڑتے ہو۔ اُدھر جنگل سے کیوں چلے آئے؟"

انچارج کی آنکھیں پھٹ پٹانے لگیں۔ "نگاہ تمھاری کافی تیز ہے۔"

"دل بھی ایسا کھوٹا نہیں ہے صاحب!"

"ہوں!" وہ سر ہلانے لگا۔ "پر یہ... یہ سب...." وہ کہتے کہتے رہ گیا۔ تجمّل بیچ میں بولا، "سب کچھ تماشا ہے صاحب۔"

وہ جز بز سا ہو کے کہنے لگا، "مگر تم نے ہمیں ٹھیک پہچانا۔ اس شکار نے ہمیں بہت رسوا کیا ہے۔ معلوم نہیں تم نے کبھی شکار کھیلا ہے یا نہیں؟" تجمّل کے کچھ کہنے سے پہلے وہ خود بولا، "پولیس میں تو ہم اتفاقاً بلکہ حادثتاً آ گئے۔ اس طرف ترائی میں شکار کھیلتے گھومتے ایک سینگ گینڈا نظر آ گیا۔ ہم شاید تم نے سنا ہو گا پاکا ماڈھو یا منگو کے سامنے علاقے میں آگ لگا رکھی تھی۔ دیکھتے ہی ہم کو شک ہو گیا تھا کہ دن میں اکیلا ایک اسی کا خون نہیں ہے۔ گھیرے کے شہر سے کوشش کر کے لے آئے اور سیدھے ایک پولیس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ سانس لینے کو بھی کہیں ڈھیرے بہت چھوڑ چھاڑا آ رہا تھا۔ اس کے بعد کمشنر نے ہمیں پتری ڈال دی۔ پہلے خاص خاص موقعوں پہ جاتے تھے پھر ایک دن ساری بریلی کمشنری کی خدمت رکھ دی۔ کام البتہ ہمارا وہی ہے جو تم نے ابھی بتایا ہے۔ اُوپر دُور دُور تک کوئی پولیس کے قریب نہیں پھٹکتا تھا۔ ویسے پولیس میں بھی اچھا ریکارڈ بڑے بڑے لفٹیننٹوں سے ملا ہے۔" وہ زبان پہ چڑھ آیا، کہتا رہا۔ اس نے تجمّل کو یہ بتایا کہ ابھی نوکری کیا کر کوئی دس جگہ کے گورے کمشنروں نے اُسے اپنے ہاتھ سے سرٹیفکیٹ لکھ کے عطا کیے ہیں۔ یہاں بھی ڈپٹی ڈنٹ بہادر کی سفارش پہ اُسے بھیجا گیا ہے۔ پھر اُسے خود خیال آیا، اس کا لہجہ بدل گیا۔ "تم بھی یہاں کس

جنگل کے نہیں معلوم ہوتے۔ بگاڑ ہماری بھی ایسی اکثری ہوتی نہیں ہے اور کچھ تو کچھ اور بھی تمھارے متعلق...."

"اندر ہی بیٹھتے ہیں صاحب!" مجھل نے جلدی سے کہا۔ "کیوں جگ ہنسائی کراتے ہو۔ آپ بولو اپنے لیے کیا حکم ہے؟ ادھر صرف ہم کو دیکھنے آئے ہو تو اندر آ کے بیٹھو۔"

"نہیں نہیں۔" وہ جھجک کے بولا۔ "ہم یہاں ٹھیک ہیں۔"

"کچھ اور نہیں ہے تو صاحب اندر ہی چلو۔"

"تم سے کچھ نہیں کہنا تھیں ہر حال پھر سہی۔"

"وہ تو صاحب ہوتی رہیں گی لیکن اس وقت تو آپ تھوڑی دیر...." مجھل نے دبیٹھے لہجے میں کہا۔ "ایسے دروازے سے لوٹ جانے کو اپنے ہاں اچھا نہیں سمجھا جاتا۔"

وہ کچھ تذبذب میں پڑ گیا۔ مجھل نے بڑھ کے اس کی کمر پہ ہاتھ رکھ دیا۔ انچارج کا چہرہ ایک لمحے کے لیے تمتما اٹھا پھر وہ کسی بچے کی طرح مسکرا دیا اور کالے دادا دیکھتے رہ گئے۔ انچارج نے اندر جانے کے لیے قدم بڑھا دیے۔

کالے دادا اس سے پہلے بھاگ کے اندر چلا گیا تھا۔ دروازے کے قریب بیٹھک نما کمرہ کھول دیا گیا۔ اڈے کے کئی آدمیوں نے جلدی جلدی وہاں چوکی پہ چاندنی ڈال دی اور گاؤ تکیہ لگا دیا اور ساری کھڑکیاں کھول دیں۔ جتنی دیر میں انھوں نے یہ انتظام کیا، انچارج باہر کھڑا صحن اور دالان میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھتا رہا۔ "جگہ تو بڑی ہے۔" وہ اندر تخت پہ بیٹھتے ہوئے تیکھے لہجے میں بولا۔

"بس وقت گزر رہا ہے۔"

"سنا ہے تین دروازے ہیں؟"

"چوتھا بھی ہے ایک پرانا۔ ہم نے بھی ابھی نہیں دیکھا اور شاید دیکھنے کی ضرورت بھی نہ پڑے۔"

"مگر تم نے ایک مقولہ سنا ہوگا۔ تمام راستے روم کی طرف جاتے ہیں۔ ہمارا ابھی کچھ یہی ہے جب تک ہم علاقے میں ہیں یہاں سے نکلنے والے تمام راستے ہم تک پہنچتے ہیں۔"

مجھل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کالے دادا اور اڈے کے دوسرے آدمیوں نے بعجلت صفائی اور چائے وغیرہ کا اہتمام شروع کر دیا تھا۔ منٹوں میں انھوں نے چوکی کے وسط میں چینی کی پلیٹوں کا انبار لگا دیا۔ گو انچارج اندر آکے بیٹھ گیا تھا اور پہلے کی نسبت کچھ ٹھنڈا اور ٹھہرا ہوا نظر آتا تھا لیکن اس کی آنکھوں کی چمک اور گہری ہو گئی تھی۔ کالے کو وہ پہلے سے زیادہ پراسرار لگ رہا تھا۔ مجھ کی یہ وہ اس طرح جسم پھیلا کے بیٹھا تھا جیسے یہاں پہلے بھی کئی بار آ چکا ہو اور جیسے ہوا کی

اس کی ملکیت ہو اور اڈے کے سب لوگ رعیت۔ بظاہر اس کے رویے سے کوئی بناوٹ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ آنے والے دونوں سپاہی دروازے کے پاس مستعد کھڑے تھے۔ باہر صحن اور دالان سے اڈے کے آدمیوں کی بلبلاتی سرگوشیوں کی گونج کمرے تک آ رہی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ انچارج کی آمد ان کے لیے کتنے ہیجان کا سبب بنی ہوئی ہے اور علاقے پہ اس کو غلبہ کس قدر ہے۔ انچارج نے نرش چائے پہ اکتفا کی۔ کالے دادا کے اصرار پہ نمک پاروں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے وہ کہنے لگا۔ "کالے! نمک بخش دینا۔"

کالے دادا نے بے اختیار مجھل کی طرف دیکھا۔ مجھل نے اسے کچھ نہیں کہنے دیا، خود بولا۔ "آپ کے ادھر آنے کو ہم بلی رعایت ہی سمجھتے ہیں صاحب! دوسری کے بارے میں ہم پہلے آپ کو بول چکے ہیں۔"

یہ سن کے انچارج کے نتھنے پھول گئے۔ وہ چٹکتی آواز میں بولا۔ "ایک سال ہمیں یہاں آئے ہو رہا ہے لیکن اب تک کچھ مرد والوں کی سے واسطہ پڑا ہے۔ البتہ جیلی یاد کرتی...." پھر وہ خود اپنی بات کاٹ کے بولا۔ "معلوم ہوتا ہے اب کے بیچ میں شاید ہمارے یہاں آنے میں آتی دیر لگوانے کا مقصد پورا ہو جائے۔"

"ہم کیا بول سکتے ہیں صاحب! دعا کریں تو اپنا کھاتہ سیدھے لیے آپ آدمی اپنے کو کھرے لگتے ہو۔ ایک کا تو ادھر کے تھپّے کا بھی آپ کے پیچھے ہونا چاہیے۔"

کالے کے خیال میں ہر بات کا جواب دینے سے خاموش رہنا ہی بہتر تھا۔ زیادہ سے زیادہ دو تین دن کی بات تھی۔ انھیں یہاں کون سا مستقل رہنا تھا۔ بس شام کے آنے تک انھیں پولیس کو کسی طرح خود سے دور رکھنا تھا۔ درمیان میں مجھل کے لہجے کی تبدیلی سے کالے کو کچھ سکون ہوا تھا مگر اندر آ کے مجھل پھر اس قسم کی باتیں کر رہا تھا جیسے انچارج کی عمر کہاں لے رہا ہو۔ انچارج کا چہرہ بار بار سرخ ہو جاتا تھا۔ سب کچھ جس کے سامنے تھا کہ ان سے تعلق اڈے کے آدمیوں سے انچارج کے روابط کیسے رہے ہوں گے اور لوگوں سے کیسی باتیں سننے کا عادی رہا ہے۔ انچارج کو بھی قرار نہیں تھا۔ چائے کی پیالی ختم کر کے اس نے تجسس اور طنز کے ملے جلے لہجے میں مجھل سے کہا۔ "یہاں تمھارے ٹھکانے اور بل کی بڑی دھوم تھی ہے۔"

"مجھل کے بات کرو صاحب!" مجھل نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ "اپنے کو تنگ ہے آپ اپنی تعریف کرتے ہو یا آپ کو کچھ برا لگتا ہے۔"

"نہیں نہیں۔" انچارج کا لہجہ مدافعانہ ہو گیا۔ "ہم اچھے نشانے بازوں کی دل سے قدر کرتے ہیں۔ کیا بندوق میں بھی تمھارا نشانہ اتنا ہی

بچل ہے؟"

"نشانہ تو صاحب دیٹے کا ہوتا ہے۔"

"تم نے بڑی مناسب بات کہی۔" وہ بے اختیار بولا۔

"ہم اپنے جانے ہیں سب ٹھیک ہی بول رہے ہیں پر سمجھنے والا بھی کوئی آپ جیسا ہو۔" مجھل نے ہنس کے کہا۔

مگر انچارج نے یہ جملہ خوش دلی سے نہیں سنا تھا۔ اس کی پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئیں۔ جواب میں وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر رک گیا اور سر ہلاتے ہوئے معنی خیز انداز میں بولا۔ "ہم تو سب سمجھ رہے ہیں اور تھیں بتا بھی دیں کہ نشانہ اچھا بھی کم ہی چوکتا ہے۔"

"کانٹے میں بل پڑ جانے پہ چوکتا ہوگا، ورنہ لینے میں تیزی سے نشانہ کبھی لوٹ کے بھی آ جاتا ہے صاحب!"

"ہاں ہاں۔" وہ سلگتے ہوئے بولا۔ "ہمیں اندازہ ہے۔" اس کی آواز میں غصے کی لرزش تھی مگر اس نے جلد ہی خود پہ قابو پا لیا اور کہنے لگا۔ "بہرحال ہمیں یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ تم جانے لیے ایک اضافہ ہو۔"

"ہم زبان کھولیں گے تو آپ کہو گے آپ کا برا لگتا دیا۔ پھر یقین کرو صاحب اپنے کو بھی آپ جیسا نہیں ملا۔"

"یہ بات تم بڑی حد تک درست کہہ رہے ہو۔" اس نے تحمل سے کہا۔ "بہتر ہے ہم ایک بات کی وضاحت کر دیں۔ ہماری اختیارات ہماری وردی اور عہدے سے مت جانچنا۔ وہ اس سے کہیں سوا ہیں۔ ہم چاہیں تو تمھیں کوئی وجہ بتائے بغیر اسی لمحے یہاں سے لے جا سکتے ہیں۔"

"آپ ایسا کر سکتے ہو پر آپ کرو گے نہیں۔"

"کیوں؟"

"یہ آپ اپنے آپ سے پوچھو۔"

"نہیں ہم تم سے پوچھنا چاہیں گے؟"

"اپنے کو یہ لگتا ہے آپ دھوپ والوں کے سر کا ڈنگ نہیں بلا رہے ہو۔" مجھل نے کہا۔ "آپ کو صرف یہی کہ اپنا نام نشانہ نہیں کیا، آدھا بھی بھرم رکھتا ہے دوسروں سے کچھ زیادہ ہی۔"

"ہوں نہیں۔" اس نے لمبی سانس کھینچی اور جیسے کہیں کھو گیا۔ پھر یکایک متفانی آواز میں بولا۔ "آگا کہاں ہے؟" مجھل کو جواب میں دیر لگی۔ انچارج پہلے سے زیادہ اونچی آواز میں بولا۔ "تم نے سنا نہیں ہم کیا پوچھتے ہیں؟"

"نہیں لیا صاحب! سوچتے ہیں کیا جواب دیں۔ ادھر ہم کو سامنے دیکھ کے آپ بولتے ہو کہ آگا کدھر ہے۔"

"یہ ہمارے سوال کا جواب نہیں ہے۔"

"تو ہم کیا کریں صاحب!" مجھل کی آواز بجھنے لگی تھی۔

"تم، تم نہیں جانتے!"

"ایسا وہ آپ کا سگا لگتا ہے تو تھانے میں رپٹ کرو صاحب!"

"تم نہیں جانتے!" انچارج نے دوبارہ کھینچی ہوئی آواز میں کہا۔

"جانتے بھی ہیں تو سمجھو ابھی بتانا ضروری نہیں سمجھتے۔"

"تمھارا یہ طور تمھارے لیے بہت مہلک ہو سکتا ہے۔"

"بہت دنوں سے اڈے پر بیٹھتے ہیں صاحب! آپ کی شاید پولیس کی عمر بھی اتنی نہ ہو۔"

"تم کیا جتانا چاہتے ہو؟" وہ تلخی سے بولا۔

"نئے تو ادھر آپ ہو، اپنے کو کیا جتانا!"

"تمھاری آواز تمھارے قد سے بہت اونچی ہے اس میں ہمیں دھمکی کی آمیزش محسوس ہو رہی ہے یا تم ہمارے اعصاب کی کوئی آزمائش کر رہے ہو مگر یہ اچھا نہیں ہے۔"

"سیدھی بولی آپ کو کڑوی لگتی ہے تو ہو سکتا ہے ہم زبان بند کر لیں۔ اپنا اچھا برا ہم آپ سے زیادہ سمجھتے ہیں صاحب! آپ کی اپنی کوئی خاندانی دشمنی نہیں ہے جس کو ٹھنڈا دکھا کے ہم چھاتی ٹھنڈی کریں۔ آپ کو کچھ برا لگا ہے تو سرسے جھٹک دو۔ ہم نے آگے والوں سے بھی سنا ہے کہ حاکم کو لوگوں کی اونچ نیچ پہ نہیں بولے جھگڑے پہ دھیان دینا چاہیے۔ بھلے اٹلے کھرے کھوٹے کو کھو جانا چاہیے۔ حاکم تو ترازو دیتا ہے صاحب! اس کو کان دار اور گاہک کی تکرار سے فرق نہیں پڑتا۔ چیز اس میں کیسی بھی لگے سے ہی پڑتا ہے۔ آپ ادھر صرف علاقے کے انچارج کے روپ میں آتے تو ہم آپ کو باہر سے سلام کر کے لوٹا دیتے۔ آپ کو کچھ جان کے ہی ہم نے زبان کھولی تھی۔ قاعدے قانون کا چکر آپ لوگوں کے ساتھ لپیٹے رہتے برا بھلا اپنی سمجھ میں آ گیا ہے اور آپ اختیار کی بات کرتے ہو تو ہم کو یقین ہے آنکھوں خون آپ کو معاف نہیں ہوگا۔"

کالے نے سر جھکائے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ درمیان میں وہ مجھل کے پاس جاتے جاتے آدھے رستے رک کے رہ گیا تھا۔ اس کی توقع کے خلاف انچارج اٹھ جانے اور سپاہیوں کو کوئی اشارہ کرنے کے بجائے سکڑی ہوئی آنکھوں سے مجھل کو گھورتا رہا۔ بہت دیر بعد کالے نے اس کا بڑھا ہوا اضطراب اور منتشر چہرہ اس کے سامنے تھا۔ اس لمحے کالے کے اندھیرے دل و دماغ میں روشنی کی پھوٹ پڑی۔ اتنی دیر میں پہلی بار اس کی سمجھ میں آیا کہ یہ سب کھیل بے وجہ نہیں ہے۔ مجھل کی لگام اس کے ہاتھ ہی میں ہے۔ کالے کے جی میں آیا کہ وہ بڑھ کے آگے ہو

کا منہ چوم لے، اُسے سینے میں بھینچ لے۔ مگر اس سے پہلے کہ انچارج کچھ کہتا، قجل نے اٹکتے لہجے میں کہا: "بکنی بول ہم کو اتنی سمجھ نہیں آتی پر جانتے ضرور ہیں۔ بولیں تو آپ کو گولی مار دو، اپنا کام ہے۔ آپ سوچو ایسے آپ کو آگے کی راڑ رگڑ گھِس کی تشفی بہت ہے، پرواہ کرنے پہ آئیں تو قسم سے صاحب! اپنے رنگ بھاؤ کی جانکاری ہیں یہ آدھا بھی سفید ہو جائے تو کو۔ یہ اپنا مطلب بھی یہی ہے کہ آپ اڈے پہ بیٹھنے والے پہلے لوگوں کے جھگڑے میں اپنے کو مت رکھو اور۔۔۔" قجل نے منہ بنا کے کہا: "اور اُس حرام کے جنے آکا کو بھول جاؤ۔ اب وہ ادھر سے چلا گیا ہے۔ اڈے سے جانے والا پلٹ کے نہیں آتا۔ آتا ہے تو بچا کھچا دام لگانے کے خیال سے ہی آتا ہے اور اس کو یہ سمجھنے میں ابھی بہت دیر لگے گی۔ اڈوں کی یہی ریت ہے کوئی اس کا ٹنے والا آپ کے پاس آئے تو تھانے کے کھاتے میں درج کرا دینا اور زیادہ پھیل جائے تو ہم کو علاقے کی تسلی کر لینا، پر جیسا ہم نے بولا ہے کوئی حکم کرنے سے پہلے اچھی طرح قجل سے ملا کے دیکھ لینا۔" قجل خاموش ہو گیا۔

خاصی دیر بعد انچارج کے بھاری جسم میں جنبش ہوئی، وہ بوجھل آواز میں بولا: "چپ کیوں ہو گئے؟"

"اپنے کو اتنا ہی بولنا تھا، آپ بتاؤ، آپ نے وقت آپ کیوں لیے تھے؟ ہم سے کچھ بات کرنا ہے؟"

"اب شاید اس کی ضرورت نہیں رہی۔"

"آپ کی مرضی صاحب!" قجل نے کسمساتے ہوئے کہا۔

"نہ جانے کیوں کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے تمہیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔" انچارج متجسس لہجے میں بولا۔

"اپنے کو بھی کچھ لگتا ہے پر شاید ایسا نہیں ہے، ادھر جیسے دیکھے ہی اپنے کو دن ہو گئے۔"

"ہونہہ۔" اس نے ہنکاری بھری۔ "بہرحال تم سے مل کے خوشی ہوئی۔" اُس کی آواز میں طنز صاف نمایاں تھا۔ "ہم نے سب کچھ ایک تجربے کے طور پہ سنا ہے اور ہم اسے اسی طرح برتنے کی کوشش کریں گے۔ ہر تجربے سے ہمیں کسی قسم کی لذت ملتی ہے۔ یقیناً تم نے ہمیں اپنے آپ سے شناسا کرانے میں فراخ دلی کا مظاہرہ کیا ہے جس کا شکریہ ہم پہ واجب ہے، اتنا کچھ سمجھنے بوجھنے میں بے شک ہمیں دیر لگتی۔ آئندہ ہمیں اس سے بہت مدد ملے گی۔ تمہاری خواہش کے برعکس ہماری کوشش ہوگی کہ تم سے تمہارے مراتب کے تناسب سے تعلق قائم رہے۔ امید ہے تمہیں اس سلسلے میں ہم سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔"

"آپ کا شکریہ صاحب!" قجل نے جیسے اس کا تلخ و ترش لہجہ محسوس ہی نہیں کیا۔

انچارج اچانک چوکی سے اُٹھ گیا۔ کالے دلوانے جو کھلانے جیسے انداز میں اس سے کچھ دیر اور بیٹھنے کی درخواست کرنی چاہی مگر قجل کی جانب دیکھ کے ٹھٹھر گیا۔ انچارج کا چہرہ تمتما یا ہوا تھا۔ قجل اُس کے ساتھ دروازے تک گیا۔ ابھی انچارج نے دروازہ عبور نہیں کیا تھا کہ رک گیا اور قجل کی طرف رُخ کر کے بولا: "شاید جلد ملاقات ہو۔"

"سب آپ پہ ہے۔" قجل نے کہا۔ "پر شاید جلدی نہ ہو۔"

"ہاں صرف ہم ہی پر نہیں، یہ تم پر بھی منحصر ہے۔"

"ہم نے مناسب سمجھا تو پہلے سلام کرنے آ دھمکیں گے، ورنہ صاحب آتے رہا کریں گے۔"

"بشرطیکہ ارادہ بھی اسی خیر کا ہو۔"

"ایسا ہی ہوگا صاحب!"

"ہمیں خوشی ہوگی۔" وہ قجل کے عین مقابل کھڑا تھا، دونوں کے درمیان ایک فٹ سے زیادہ کی دوری نہیں ہوگی۔ "کسی دوسری صورت حال سے ہمیں یقیناً زیادہ خوشی ہوگی اور رشتہ داری میں ہم ہمیں بھی نیچے نہیں پاؤ گے مگر فاصلوں کا بُعد ہے۔ کبھی ایسا ہوا نہیں ہے اور جس طرح ہو رہا ہے یا ہوتا ہے اُس کے ہم قائل نہیں ہیں۔"

"اتنا اندازہ ہم بھی کر سکتے ہیں۔"

"بہرحال۔" وہ ٹھنڈی سانس بھر کے بولا: "خود کو تنہا نہ سمجھنا، اور یہ تلقین ہماری طرف سے اپنے لیے مثبت رویے کی پہل سمجھنا۔ ہیلی رعایت یوں بھی ہمارا اصول ہے، ہم آگاہ ہیں اور اپنا دائرے کار اختیار کیے بغیر کبھی ہتھیار نہیں اٹھاتے، شکار میں ایک مرتبہ ہم سے ایک بے خبر جانور پہ گولی چل گئی تھی، بے خبری ہماری بھی کیا تھی، بس نگاہ چوک گئی مگر کیا بتائیں، مدت میں ہمیں کئی راتیں نیند نہیں آئی۔ خیر وہ قصہ دوسرا ہے۔" وہ جیسے خود کو ڈپٹ کے مڑتے بولا: "تم سے کہنا ہے کہ یہاں اڈے کی تبدیلی کی خبر صرف اس علاقے تک محدود نہیں رہی ہے۔ حیدرآباد آنے کے بعد علاقے کے انچارج نادر علی کو ہیلی بار آوپر سے بازار کے اڈے کی نگرانی کی بات کی گئی ہے۔ نادر علی کے لیے ایسی کوئی ہدایت ذہن کے متراوف ہے، حکام بالا کو غور کرنا چاہیے تھا کہ انھوں نے کس مقصد سے اس ریاست میں ہمیں بلایا ہے اور کس غرض سے بطور خاص اس علاقے میں تعینات کیا ہے۔ ہم سے علاقے کی صورت حال پر کوئی مشورہ

اور گفتگو کیے بغیر ہدایت بھیجنے سے مراد یہی ہو سکتی ہے کہ کہیں ہم غفلت کے مرتکب تو نہیں ہوئے ہیں، ہماری بینائی اور سماعت پہ چربی تو نہیں چڑھ گئی ہے۔ حکام بالا کا یہ رویّہ ہمارے لیے ناحق آزار کا سبب ہے، ہم اُن کے اعتماد کی کمی کا منظر ہے مگر وہ ہیں ذہنی جنگ ہے۔ حکام بالا کو کوئی بھی ہدایت بھیجنے کا اختیار ہے، شکر ہے کہ یہ ہدایت ہے حکم نہیں۔ تجویز ہے، فیصلہ نہیں ورنہ ہمارے لیے یہاں ریاست میں ٹھہرنا مشکل ہو جاتا۔ اس کے علاوہ ہم سمجھتے ہیں کہ حکام کی تشویش و اضطراب کو کوئی اور محرک بھی ہو سکتا ہے، کچھ لوگوں نے جو بازار کے علاقے میں آکا کو برقرار دیکھنے کے خواہش مند تھے، انھوں نے اُن کی توجہ اس جانب مبذول کرائی ہوگی۔ بہرصورت اس سے تمہیں حالات کی سنگینی کا اندازہ ہو جانا چاہیے۔ ہماری اطلاعات کے مطابق ریاست کے کئی بااثر اور مقتدر لوگوں سے آکا کے مراسم تھے۔" انچارج کی آواز میں تنبیہہ کے ساتھ ساتھ سنجیدگی اور متانت بھی تھی۔ "سمجھ رہے ہو؟" اُس نے قجل کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے کہا۔

"ہاں صاحب!" قجل چونک کے بولا: "سمجھ رہے ہیں پر آپ نے اتنا بولا ہے تو ہم بھی کچھ۔۔۔۔۔"

اس نے قجل کی بات پوری ہونے سے پہلے کہا: "ہم نے اپنے متعلق تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے اور تمہاری طرف سے ہمیں کسی وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ چاروں طرف دیکھ کے کوئی قدم اٹھانا اور خیال رکھنا کہ علاقے کا انچارج نادر علی خاں ہے، نادر علی اپنے لیے کوئی۔۔۔۔۔"

"آپ چین سے اُدھر جا کے بیٹھو۔" قجل نے تیزی سے کہا: "کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو آکا کو ادھر دیکھنا نہیں چاہتے، کرسی اور کمیٹی میں وہ آکا کے رکھوالوں سے اونچے بھی ہو سکتے ہیں پر ہم بھی کسی بوتے پر یہاں آ کے بیٹھے ہوں گے، اپنے کو جتنے یہ جگہ کون سی ہے۔ رہی ہدایت کی بات تو کل آپ کو اس کے الٹ بھی آ سکتی ہے۔"

انچارج کا جسم ایک تانے کے لیے ہل کھا گیا۔

کاٹنے تیار تھا کہ چلتے وقت انچارج کا چہرہ دھواں دھواں تھا، اُس کی نگاہوں کی کاٹ کا ٹنے نے اپنے رگ و پے میں محسوس کی تھی مگر اس اذیت میں کیسا شکوہ چھپا تھا، یہ کاٹنے ہی جانتی تھا۔ اسے اطمینان ہو چلا تھا کہ دو تین دن بھی کی نہیں کوئی اور چار و شیش بنا گیا تو آئندہ کئی دن کی مہلت بھی انھیں مل سکتی ہے مگر صورت

یہی ایک بہتر صورت تھی کہ انچارج کے ذہن میں گرہ پڑ جائے۔ پیش بینی کہ کوئی فیصلہ کرتے ہوئے امکانات و نتائج اُس کے پیش نظر رہیں، نتائج کے کسی تعین کے لیے اُسے کشمکش و تردد کے ایک مرحلے سے گزرنا لازم تھا اور انھیں بہت زیادہ وقت درکار نہیں تھا، صرف اتنا کہ خانم شہر میں آ جائے۔ اس کی آمد کی اطلاع آ ہی چاہتی تھی۔ نادر علی کے بجائے کوئی اور شخص ہوتا تو شاید قجل کو خود پہ اتنا جبر نہ کرنا پڑتا۔

کاٹنے، شاہ مزمل اور ننگو کے لیے وہ ایک مسکراتی اور نرم شام تھی، سبھی کو ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی بوجھ سے آ سر گیا ہو، جیسے اچانک ہوا بدل گئی ہو۔ انچارج کے جاتے ہی اڈے کے لوگ قجل کے گرد جمع ہو گئے تھے، انھوں نے نہ قجل سے کچھ پوچھا، قجل نے اُن سے کچھ کہا، مگر قجل کا کھلا کھلا چہرہ دیکھ کے اُن کے اضطراب کو قرار آ گیا۔

رات کا کھانا کھاتے کھاتے گیارہ بج گئے۔ زہرا بیگم کی طرف سے کچھ رعایت مل جانے کی تعین ہونے کے باوجود کاٹنے کی بے کلی بڑھتی جا رہی تھی۔ زہرا کے انتظار میں بار بار اس کی نگاہیں دروازے کی طرف اُٹھ جاتیں۔ رو رو کے ایک انجانے سے خیال اٹھ رہا تھا اور وہ یہ کہ اگر خانم حیدرآباد آنے پہ آمادہ نہ ہوئی تو کیا ہوگا۔ اُسے انکار تو نہیں کرنا چاہیے کیونکہ بازار قجل کے نام سے گیا ہے مگر وہ تو حیدرآباد کا نام ہی سن کے لرز گئی ہوگی۔ اس شہر میں واپسی پہ آمادہ ہو جانا اس کے لیے ایسا آسان نہیں ہے۔ زہرا دیکھ کے اس کے دل میں کیسے کیسے ہول اُٹھے ہوں گے۔ زریں کی حویلی اس کے لیے کسی جنت سے کم نہیں ہے، کاٹنے نے جب اسے پہلی بار دیکھا تھا، یہی سمجھا تھا کہ وہ زریں کی کوئی عزیزہ ہے۔ وہ زریں کی تربیت میں رہ کے معلوم ہوتی تھی۔ کاٹنے نے اسے کسی حور کے مانند حویلی میں راج کرتے دیکھا تھا۔ اس کے آنے کے بعد کاٹنے کو محسوس ہوا تھا کہ حویلی میں اس کی کتنی کمی تھی۔ کاٹنے کے لیے یہ انکشاف بہت حیران کن تھا کہ اس حور کا تعلق بازار سے تھا۔

خانم کو اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کا بھی پورا حق ہے۔ وہ یہاں واپسی پر خودکشی کو ترجیح دے گی۔ تار میں اسے پوری تفصیل نہیں لکھی جا سکتی تھی کہ اس کا آنا کس قدر ضروری ہے۔ کاٹنے کو یہی دھڑکا لگا ہوا تھا۔ مگر رات کے بارہ بجے زہرا اڈے پہ نمودار ہو گیا۔ کاٹنے نے اسے قجل کے قریب جانے سے پہلے بیچ میں روک لیا۔ زہرا کے پاس خانم کی کوئی اطلاع نہیں تھی البتہ اس نے بتایا کہ آج وہ ہوٹل کے بجائے حویلی سے آ رہا ہے۔ وہ بیگم نواب حشمت

جنگ کی موٹر ابھی نہیں لینے آئی تھی، اُن کے حویلی پہنچ جانے کے تھوڑی دیر بعد نواب حشمت جنگ بھی آ گیا۔ اُس کے ساتھ کوئی مصاحب دار بھی تھا۔ دونوں کی موجودگی میں ابا جان اور حویلی کے بڑے منشی نے کاغذات پر دستخط کیے۔ ابا جان نے ساری رقم اُسی وقت ادا کر دی۔ انھوں نے بوڑھے نواب کو کچھ دن وہیں ٹھہرے رہنے کی پیشکش کی لیکن وہ نہ مانا۔ حویلی کی تمام چابیاں اُن کی تحویل میں دے کے رخصت ہو گیا۔ نواب حشمت جنگ کے ہاں سے اُن تینوں کے لیے رات کا کھانا آیا تھا۔

شام سے اب تک زورا اور مارتی حویلی کے مختلف کمروں کا مکانوں کی ایک ایک چیز کا جائزہ لیتے رہے۔ حویلی کے ملازمین انشائے کے منتظر اُن کے آگے پیچھے گھومتے رہے۔ زورا کے کہنے کے مطابق ابا جان نے حویلی کے لیے ایک خطیر رقم ادا کی تھی مگر حویلی کی شان و شوکت اور اس کی آرائش و زیبائش کے مقابلے میں یہ رقم کچھ بھی نہیں تھی۔ ابا جان کو احساس تھا کہ نواب کی گاڑی کسی وقت بھی انھیں لینے آ سکتی ہے۔ اُن سب کے پاس نہایت مختصر سامان تھا۔ ابا جان نے صبح بازار جا کے سوٹ کیس اور دوسری چیزیں خرید لی تھیں تاکہ نواب کے ذہن میں اُن کی متعین حیثیت قائم رہے۔ وہ ہوٹل میں کہہ کے آئے تھے کہ اُن کا کوئی خط یا تار آنے کی صورت میں محفوظ کر لیا جائے یا ہو سکے تو حویلی کے پتے پر بھجوا دیا جائے۔ نواب حشمت جنگ کی آمد و رفت کی وجہ سے ہوٹل کا مینیجر اور عملہ اُن کے ساتھ نہایت تحمل سے پیش آنے لگا تھا۔ مینیجر نے وعدہ کیا کہ وہ فی الفور ابا جان کو مطلع کرے گا۔ اس کے باوجود زورا رات کو اوّل وقت ہوٹل جا کے خود تصدیق کر آیا تھا، خانم کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔

جھبل کو بھی کانتے کی طرح یہی امید تھی کہ زورا اب کے کوئی خبر لے کے ہی لوٹے گا۔ زورا کے لٹکے ہوئے ہونٹ دیکھ کے جھبل کے چہرے پر لکیریں پڑ گئی تھیں تاہم اُس نے زورا کو ہدایت کی کہ وہ صبح منہ اندھیرے منگو کے ساتھ حویلی چلا جائے اور اب اُسی وقت واپس لوٹے جب اُس کے پاس خانم کے سلسلے میں کوئی خبر ہو یا کوئی اور ضروری بات ہو۔ جھبل نے ابا جان کو کہلوایا کہ وہ ابھی نواب حشمت جنگ سے کوئی تذکرہ نہ کریں۔ خانم کا انتظار کرتے رہیں۔

زورا سورج نکلنے سے پہلے منگو کو ساتھ لے کے اڈے سے چلا گیا تھا۔

پھر وہ دن بھر نہیں آیا، رات کو بھی نہیں۔ پانچواں دن تھا، روز کی طرح دن بھر اڈے پر چہل پہل رہی۔ یہ اجتماع اگر ایک طرف جھبل کے ایما کے مطابق تھا تو دوسری طرف اُن کی اپنی بے چینی بھی تھی۔ بہت سوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ نئے دادا کو اپنے دو آدمیوں کا انتظار ہے

اور جب تک وہ نہیں آ جائیں گے، نیا دادا اڈا سنبھالنے کی بات زبان پر نہیں لے گا۔ مگر وہ لوگ کب آئیں گے؟ وہ کہاں ہیں؟ اڈا سنبھالنے کے بعد بھی تو اُن کا انتظار کیا جا سکتا ہے؟ اڈا ابھی تک کیوں موجود ہے؟ اڈے پر اُس کے دوبارہ نمودار ہونے سے یہ نفرت بھی اُن کے ذہن میں جا گزیں ہوا ہو گا کہ کہیں وہ بھی پھر...... وہ ایسے بے نگاہ نہیں تھے کہ جھبل کے جسم کو ناآسودہ محسوس نہ کر سکیں۔ جھبل نے اُنھوں نے زورا کی رات کو اڈے پر آمد اور سات دن گم شدگی بھی محسوس کی ہو۔ انچارج سے جھبل کی گفتگو کے دوران اڈے کے کئی آدمی موجود تھے۔ انھوں نے اپنے ساتھیوں سے جھبل اور ابا جان کے درمیان ہونے والی باتوں کی جانے کس کس طور سے تشریح کی ہو۔ اڈے کی چوکی پر گو جھبل ہی بیٹھا تھا مگر وہ موجودہ صورتِ حال سے کسی طرح مطمئن معلوم نہیں ہوتے تھے۔ اس عرصے میں کانتے، جمیرا اور شامو سے کئی آدمی اچھی طرح گھل مل چکے تھے۔ ہرچند کہ انھوں نے آن پہ اپنی تشویش ظاہر نہیں کی تھی لیکن کانتے، جمیرا اور شامو اُن کی نگاہوں اور سرگوشیوں سے بے خبر نہیں تھے۔

دیر کسی طرح نہیں ہونی چاہیے تھی۔ وہ دن جیسا کہ کہا جاتا ہے اُنھوں نے کانٹوں پر لوٹ کے گزارا تھا۔ رات کو وہ جھبل چھت پر بھی نہیں گئے تاکہ زورا آئے تو سامنے ہی آئے۔ رات کو زورا کے آنے کی توقع زیادہ تھی مگر وہ نہیں آیا۔ تینوں کی نظریں بار بار جھبل کی جانب اٹھتی تھیں۔ وہ ایک دوسرے سے کچھ کہہ سن کے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتے تھے۔ استاد تو نہ کسی سے اس سلسلے میں بات کرتا تھا، نہ آنکھ کے ایک پہر کو نکلنے اڈے کے کسی کمرے میں جاتا تھا۔ اُس رات اڈے کے چند آدمیوں کے اصرار پر وہ تینوں بازار کی طرف نکل گئے۔ گلیوں میں جہاں جہاں سے وہ گزرے گلی گلی بالا خانوں کے لوگ انھیں اپنے ہاں بلانے آئے مگر وہ انھیں گلیوں میں گھومتے پھرے اور علاقے کا ایک چکر بھی پورا نہیں کیا تھا کہ واپس لوٹ آئے۔ انھیں جھبل کا خیال تھا کہ وہ اڈے پر اکیلا رہ گیا ہو گا۔ جھبل کو دیکھ کے اُن کا دل ڈوبنے لگتا تھا لیکن جیسے دیکھ کے اُن کے سینوں میں دوبارہ کونپلیں پھوٹنے لگتی تھیں۔

چھٹے دن دوپہر کو کھانے کے بعد کانتے نے ہمت کی۔ چوکی پر جھبل کے گرد وہ تینوں تھے۔ کانتے نے جھجکتے ہوئے اُس سے کہا۔ "استاد! زورا نہیں آیا؟"

"یہاں سے نہیں آیا۔" جھبل نے بھاری آواز میں جواب دیا۔

"اُس کو آ جانا چاہیے تھا استاد!" وہ بے تابی سے بولا۔

"آ جائے گا لوٹ کے۔"

"اور اگر اُس کے آنے میں اور دیری ہو گئی؟ اگر وہ..."

اُمی نے اُچٹتی زبان میں کہا۔ "ادھر اپنی خانم بیمار بھی ہو سکتی ہیں۔" اُس نے جھبل سے کہا۔ "حیدرآباد کا نام سن کے خانم تو بہت گھبرا گئی ہوگی۔"

"ابھی دیکھتے ہیں رے۔" جھبل نے تنک کے کہا۔

کانتے سے یہ بات نہ پوچھی گئی کہ دوسری صورت میں جھبل کے پاس کون سی تدبیر ہے۔ وہ اُس سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر استاد کو اور پریشان نہ کرنے کے خیال سے ٹھٹک کے رہ گیا۔

انچارج کے جانے کے بعد سے اب تک علاقے کے تھانے کی طرف سے کوئی ہرکارہ نہیں آیا تھا مگر پولیس کی جانب سے وقت کی تھوڑی بہت چھوٹ کا کانتے کو ایسا اعتبار نہیں رہا تھا۔ یہ رعایت تو اُن کا اپنا گمان تھی۔ پولیس کسی بھی لمحے اڈے کا رخ کر سکتی تھی۔ آنے کے لیے اُسے اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ اُس کے لیے تو دروازہ کھٹکھٹانے کی رسم کی بھی قید نہیں ہے۔

کل سہ پہر کا وقت تھا۔ انھوں نے زورا کو دروازے میں داخل ہوتے دیکھا۔ عمارت میں لوگ تھے۔ اس کے باوجود زورا کو دیکھ کے وہ بے اختیار اٹھ گئے۔ انھوں نے دور سے زورا کے چہرے کی سرخی اور آنکھوں کی دمکتی روشنی بھانپ لی تھی۔ قریب آ کے زورا نے انھیں دھڑکتی آواز میں بتایا کہ خانم کل حیدرآباد پہنچ رہی ہے۔ انھیں ایسا لگا جیسے زورا اُن سے مذاق کر رہا ہو۔ زورا کے بیان کے مطابق دوپہر وہ ہوٹل پہنچا تھا، وہاں نیفی آباد سے آیا ہوا تار ملا۔ ہوٹل کا منیجر تار حویلی پہنچانے کا انتظام کر رہا تھا۔ زورا تار لے کے سیدھا حویلی گیا۔ تار پڑھتے ہی ابا جان نے اُسے فوراً یہاں کے لیے روانہ کر دیا۔ جھبل نے زورا کو واپس نہیں بھیجا۔

دھوپ ہر سو پھیل چکی تھی۔

کانتے نے ایک جھرجھری لی اور بازو جھٹکتے ہوئے بولا۔ "ایک بل کو رہ گیا تھا لالے! اپنے کو امید تھی کہ آج کے دن ہیرا اور پیر دادا کا درشن ضرور ہو جائے گا۔ پیا اوپر والے کو اپنا چلے خیال آ گیا۔"

میں گُنگ بیٹھا اُسے دیکھتا رہا۔

"کیا ہو گیا تجھ کو؟" وہ مجھے جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"بولتا کیوں نہیں؟"

"کیا بولوں کانتے بھائی؟"

"تو بتا، تو نے اُدھر کیسے کاٹی؟"

"بس کانتے بھائی!" میں نے بے تابانہ اُس کا ہاتھ سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ "اب اُسے دہرانے سے کیا حاصل۔" میری آواز بھرّا گئی تھی۔

"جانے دے۔" اُس نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور مجھے اپنی لپیٹ میں لیا۔ پھر میں نے خود کو بہت روکنا چاہا مگر مجھے بھی نہ جانے کیا ہوا، میری سسکیاں نکل پڑیں۔ "ابے لاڈلے! لاڈلے!" وہ بے قرار ہو کے بولا۔ "یہ کیا، یہ کیا! اب تو سب اُٹھ گیا ہے جانی! کوئی نیا تھوڑا ہی اُدھر پہاڑوں سے زیادہ تو نہیں تھا اور بمبئی میں گزرتا ہی...... وہ سب بھول گیا کیا؟ اپنے گھر پہ ہے۔ اُدھر نواب نے تم لوگوں کے ساتھ کوئی آدمی پتا نہیں کیا ہو گا۔ تم نے استاد سامنے پڑھا آتا تھا، یہ نے اس کو دیکھا ہے جان پہ رہتا ہے۔ وہ وہی حرام کا جنا تھا، ان تو اُدھر حویلی میں چوہے کی طرح دبکا کھڑا تھا۔ ان باتی تھے بیالے؟ تجھ کو کیسے بولوں، ماں قسم! اُدھر ایک پل بھی کسی کو چین نہیں تھا۔ تجھ کو پتا ہے، اپنے کو زیادہ بسیرا پھیرا نہیں آتی۔ استاد نے سالی بات نواری کو رکھی تھی ورنہ تیرا بھائی حویلی کی دیوار اُتر کے ہی دم لیتا۔ اُدھر ایک ہی بات کا دھڑکا لگا تھا، خانم کے آنے کے بعد نواب پھر کہیں وصیت بیان نہ کر دے۔ اپنے کو اسی کا انتظار تھا۔ کل یا کو ملتا یا پھر کوئی کسی کو نہ ملتا۔ اس سے زیادہ اپنے بس کا نہیں تھا۔ پھر شاید اپنے کو بھی استاد کے آگے آنا پڑتا۔"

کانتے جانے کیا کیا کہہ رہا تھا۔ وہ بتا رہا تھا کہ انھیں نیند آتی تھی نہ کچھ کھایا جاتا تھا۔ اُن کے جسموں پر ہر لمحے جیسے چیونٹیاں رینگتی رہتی تھیں۔ زورا، جمیرا اور شامو نے مجھے گھیر لیا۔ وہ سب باری باری میرے گال چوم رہے تھے۔ جتنا وہ مجھے چوم رہے تھے، اتنی ہی میرے سینے میں جلن بڑھتی جاتی تھی۔

"چھوڑ دو اس کو۔" کانتے انھیں میرے پاس سے دھکیلتے ہوئے بولا اور مجھ سے کہنے لگا۔ "رو لے، جی بھر کے رو لے۔" اُس کی آواز ڈول رہی تھی۔ "تجھ کو یہ سب کچھ ہم سے نہیں بولنا چاہیے تھا۔ پر تو نے آج تو......"

"کانتے بھائی!" میں نے سسکتے ہوئے کہا۔ "مجھے معاف کر دو۔"

"کیا! کیا بول رہا ہے تو؟" وہ وحشت سے بولا۔

"میں نے بہت... میں نے تم سب کو......"

اُس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "آگے سنبھل کے بولنا۔" اُس نے ملکتی آواز میں کہا اور میرے سینے سے اپنا چہرہ رگڑنے لگا۔ "بولے تو ابھی چھاتی کاٹ کے رکھ دیں تجھ کو؟"

زورا نے مجھے اُس سے چھین لیا اور چارپائی سے کھڑا ہو گیا۔ میری آنکھوں سے کوئی سوتا چھوٹ پڑا تھا۔ زورا مجھے گلے لگائے

وہ مرغن کو دکھانے کے لیے کھا یا ہوا لاتی کوئی نہایت لذیذ تھا۔ بریانی،
قورمہ اور ماش کی دال۔ بازار کے کسی ہوٹل والے نے ماش کی چرپری دال
بطور خاص پکوائی تھی۔ واقعی ایک ایک دانہ الگ تھا۔ چرچرے چٹپٹی
ماش کی دال رہی ہے جیسے مٹھی بھر کے دیوار پر پھینکو تو ایک دانہ بھی
دیوار پہ نہ ٹکے۔ ساتھ میں ناریل کی چٹنی تھی۔ کھانے کے وقت لوگوں
کی تعداد اور بڑھ گئی تھی۔ اس دوران کاشتے نے کئی بار زورا سے پوچھا
کہ زم زم کے متعلق جمیل نے ابا جان کو کچھ اور تو نہیں کہلوایا تھا۔ جمیل
نے ایسی کوئی ہدایت اُسے نہیں دی تھی اور ابا جان سے رابطے کا ایک
ذریعہ زورا ہی تھا اب سب کچھ بعد از وقت تھا۔ گاڑی کر وقت
پر آتی تھی تو آ کے بھی چلی گئی ہوگی۔ شاید جمیل نے اپنے طور پر کچھ
لیا تھا کہ ابا جان اور وارثی اسٹیشن سے خاموش کر لے ہی آئیں گے۔ ہم
میں کسی کا اسٹیشن جانا ویسے بھی نامناسب تھا لیکن اگر ابا جان نے
بھی احتیاط کی تو؟ وہ بھی کہیں جانے بھرنے پہ ہے تو؟

تقریباً تین بج چکے تھے۔ اس وقت صحن اور دالان میں لوگ
کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ زم زم کا دادا سا ابن بھی آ گیا تھا۔ سکندرآباد
کا دادا اُدو دُنیا بھی موجود تھا۔ اُدو دُنیا شہزادو کی کا بیٹے والا تھا اس
لیے اُس کا نام اُدو دُنیا پڑ گیا تھا۔ اُدو یعنی ہندوستانی آدمی ملنگا نہ بولتا
تھا۔ جمیل نے کالے دادا سے چائے کی فرمائش کی۔ چائے تیار ہو رہی
رہی تھی تھوڑی ہی دیر میں آ گئی۔ چائے پینے کی دیر تھی کہ جمیل اُٹھ
کھڑا ہوا۔ پیرو بھی اُس کے ساتھ اُٹھ گیا۔ اُن دونوں کے پاس بیٹھے ہوئے
بڑے چھوٹے دادا نے حیرانی سے اُنھیں دیکھا۔ "کدھر؟ کدھر دادا؟"
وہ بے چینی سے بولا۔

"بس دادا! ابھی ہمیں جانے کی اجازت دو۔"

"ایک دم! ایک دم کیسے اُٹھ گئے؟"

"بس دادا! کبھی نہ کبھی اُٹھنا ہی تھا۔"

"ایسا کیسے؟" چھوٹے دادا نے گھبرائے ہوئے لہجے ہی کہا۔

"ابھی بیٹھو کچھ دیر اور ادھر بیٹھو۔"

"کیا فرق پڑے گا دادا!" جمیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "جانے
سے پہلے ادھر کو آئیں گے۔ یہ پکا نہیں ہے۔"

"کیسا لگتا ہے اپن سے کوئی غلطی ہو گئی۔" چھوٹے دادا مضطرب
انداز میں کھڑا ہو گیا اور جمیل کا بازو تھام کے اس نے اُسے اپنی طرف
کھینچ لیا۔

"ابھی ایسا مت بولو دادا!" پیرو نے بیچ میں کہا۔ "ماں قسم
اپن کے پاس وقت ہوتا تو اپن مقامے پہ بیٹھیں ہی بیٹھا رہتا۔"
چھوٹے دادا سر جھٹکنے لگا اور اس نے والہانہ انداز میں پیرو
کا ہاتھ اپنے سینے سے لگا لیا۔ بین کرتے۔ محرو اور شامو بھی مت چپ
اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ صحن اور دالان میں بیٹھے ہوئے لوگ بھی اپنی جگہ
پر بیٹھے نہ رہ سکے۔ ہر شخص کا ایک عجیب سی بے کلی تھی۔ "اپنے کو بھول مت
جانا!" چھوٹے دادا نے بھری بھری آواز میں جمیل سے کہا اور اس کے
گلے سے لپٹ گیا۔

"جلدی جلدی ملیں گے۔" جمیل مسکراتے ہوئے بولا۔

"اپن کے پاس ابھی زیادہ تم کو رکھنے کی نہیں ہے تا! مجھے سالوں کی
آواز دھمکاتی تھی۔ تھوڑا اپنی بات مان لیتے تو....."

"اپنا بھی ہوتا ہے۔ ابھی پورا ٹبر پڑا ہے تمھارے پاس۔" جمیل
نے اڈے پر موجود لوگوں کی طرف نظریں گھماتے ہوئے آہستگی سے
کہا۔ "ابھی ان سب کو دیکھنا ہے تم کو۔ وہ کیسے، اور آ کا کان جگنو
نے ان کو بے دھڑا بنا دیا ہے۔ تم کو نئے سرے سے ان کی اُٹھک
بیٹھک کرانا ہے۔"

"جیسا تم بولتے۔ پر ان سب ویسا ہی جھگڑنے کی نیتی کریں
گے۔ پر تم... تم......"

جمیل نے سر کے اشارے سے تسلی دی اور اُسے بازو میں
بھینچے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ ابھی وہ چوکی سے نہیں اُترا تھا کہ جیسے کمپن
میں سب لوگ کھڑے اُسے گھور رہے تھے۔ جمیل چند لمحے گم سم سا
کھڑا رہا۔ عمارت پر سکوت چھا گیا تھا۔ جمیل نے نسبتاً بلند آواز میں
کہا۔ "ہم کو جانا ہے۔ ابھی کچھ پتہ نہیں کہ کب اپنی واپسی ہو۔ جب
بھی آئیں ہماری بیٹھک پر چھوٹے دادا مان گیا ہے کہ وہ اسی جگہ پر بیٹھے
گا۔ بیچ میں اپنے پیچھے کسی کو کھلا اُٹھنے کو تم کو جو بولتا ہے وہ جو کرنے
کی ضرورت نہیں۔ ادھر ابھی سب چھوٹے دادا کے حکم پہ چلے گا۔ کالے
بھی ساتھ میں اڈا دیکھنے کو پر کالے چرپٹ چلے گا تو چھوٹے دادا کسی
کو اس کی جگہ دلا دے گا۔ ہم نے یہ سب خوب جان کے کیا ہے۔
اب آگے تمھارا کام ہے۔ یہ تم پر ہے کہ تم دادا سے کتنا سیکھتے اور بنتے
ہو۔ ہم نے اس سے بولا ہے کہ ادھر اڈے کے ہی آدمی تیار کرو۔ اگر
اور کیسے لوٹ لوٹ کے تنتے رہیں گے۔" جمیل نے ایک ایک
ٹک کے اُن کی طرف دیکھا اور دھیمے لہجے میں بولا۔ "ادھر ہم کچھ لوگ
کو اپنا پتہ بول کے جا رہے ہیں۔ دادا کو کوئی تکلیف ہو اس کو دوبارہ
کھو دو گے تو اپنا کچھ نہیں بگڑے گا۔ سب تمھارا ہی کیا دھرا ہے۔ دھیان
رکھنا تم کو ہم چھوٹے دادا کے ہاتھ سونپ کے جا رہے ہیں۔ تو اس
کو تنگ مت کرنا ہے......"

عمارت پر سکوت طاری ہو گیا تھا۔ چھوٹے دادا جمیل کے پہلو
سے چپکا سر جھکائے کھڑا تھا۔ کالے کی آنکھیں بھی برس رہی تھیں۔ جمیل

نے پھر کچھ نہیں کہا۔ چوکی سے اُتر گیا۔ سامنے کھڑے ہوئے آدمی خود پیچھے
ہٹ گئے تھے اور دروازے تک اُن کے درمیان گلی سا راستہ بن گیا تھا
سب دم بخود سے تھے اور جیسے اُن کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ہمارا
حال بھی کچھ یہی تھا۔ دروازے کے قریب ادھیڑ عمر قوتے سے صبر نہیں
ہوا۔ جمیل اُس کے پاس سے گزرا تو وہ سسکیاں بھرنے لگا۔ جب
جمیل اڈے پر آیا تھا، قوتو اُس کے پاس ہی چھٹتا رہا تھا۔ کبھی اُس
کے پیر دباتا کبھی حقہ تازہ کرتا۔ جمیل نے رک کے اُس کے سر پہ ہاتھ
رکھا اور اُس کے بال جھنجوڑے تو وہ اپنے حواس اور کھو بیٹھا۔ دروازے
تک جانا پہنچنا مشکل ہو جاتا۔ سب ہمیں گھیر لیتے مگر جمیل نے ہاتھ
بلند کر کے انھیں خود سے دور رکھنے کی کوشش کی۔ کالے اور
چھوٹے دادا بھی انھیں ہمارے پاس سے ہٹ جانے کو کہہ رہے
تھے پھر بھی کئی آدمی جمیل کے پیروں سے لپٹ گئے اور اُسے اڈے
پر رک جانے کی دہائیاں دینے لگے۔ "آئیں گے بھیا، جلدی آئیں گے۔"
جمیل اُن سے یہی کہتا رہا۔ کالے دادا کی مداخلت پر بمشکل تمام وہ جمیل
سے دور ہوئے۔

باہر گلی میں بھی اُن کا ہجوم ہمارے پیچھے آنا چاہتا تھا مگر جمیل
نے بلند آواز میں انھیں روک دیا۔ "خرابہ مت کرو۔" اُس نے کسی قدر
تندی سے کہا اور چھوٹے دادا سے بغل گیر ہو کے تیز قدموں سے آگے
بڑھ گیا۔ چھوٹے دادا پیرو اور ہم سب سے ملنا چاہتا تھا لیکن جمیل کے
بڑھ جانے کی وجہ سے اس کے بازو اُٹھے رہ گئے۔ چند منٹ بعد
ہی مختلف گلیوں میں گھومتے ہوئے ہم بازار کی خاص گلی کے نکڑ پر
آ گئے تھے جہاں سے ہمیں آگے سورج غروب ہونے میں دیر تھی اور اسی
نسبت سے بازار کا سورج طلوع ہونے میں دیر تھی پھر بھی خاصی چہل
پہل تھی کچھ دور تک تو کسی کو احساس نہیں ہوا لیکن نکڑ پہ ہوٹل کی
تھانیوں پہ بیٹھے ہوئے لڑکوں کی جیسے ہی ہم پر نظر پڑی وہ بدحواس
ہو گئے۔ پھر آگے نہ جانے کس طرح سارے راستے کے بالاخانوں،
دکانوں اور راہ گیروں کو جیسے ہمارے آنے کی خبر ہو گئی تھی۔ ہم کل سات
تھے۔ جمیل، پیرو، کاشتے، زورا، محرو، شامو اور میں۔ جیسے بھی گلی میں
قدم رکھا، آدمیوں کا ساتھ گزرتا۔ گلی کے لوگوں کے کیسے اور جمیل رہ سکتا تھا
خصوصاً جب اُن کا تعلق اڈے سے ہو اور اڈے پر بھی وہ نو وارد
محل سے گئے تمام راستے پہ بالاخانوں کے دروازے اور کھڑکیاں کھلتی گئیں
اور راہ گیر یا تو سمٹ کے ایک طرف ہو گئے یا جہاں موجود تھے
وہیں ٹھٹک کے رہ گئے۔ دکانوں پہ بیٹھے کئی آدمیوں اور راہ گیروں نے
جمیل کو سلام بھی کیا لیکن جمیل نے جیسے اُن کی جانب دیکھا ہی نہیں۔
پھر کچھ کی جگہ سے بھی آگے آ گئے جہاں خانم کا مکان تھا اور جہاں نیساں
رہتی تھی۔ مگر گلی کے خاتمے سے کچھ پہلے پان کے ایک دکان دار نے
ہمیں روک لیا۔ وہ تیزی سے نیچے اُتر کے جمیل کے مقابل کھڑا ہو گیا
تھا۔ وہ کر کے مسکراتا اور ہاتھ لہراتا آیا تھا اور اس کی آواز میں بھی کچھ
ایسی کسک تھی کہ جمیل کو ہنسی آ گئی۔ "بندی کا پان کھائے بغیر ادھر
سے گزر جائیے گا سرکار؟" جمیل اُس کی دکان پر مڑ گیا۔ دکان دار
اچھل کے دکان پہ چڑھا۔ اُس کے پان لگانے کا انداز بھی دیکھنے
والا تھا۔ مسکرا مسکرا کے اُس نے کتھا چونا لگایا اور مسالے ڈالتا تھا۔
نفاست اور تیزی سے اُس نے ہم سب کے لیے بیڑے بنائے اور
انھیں چاندی کے ورق میں لپیٹ کے اپنے ہاتھوں سے ہمیں کھلائے۔
جمیل نے اُسے پیسے دینے چاہے تو وہ مچل گیا۔ جمیل نے بھی زیادہ اصرار
نہیں کیا۔ اُس سے کچھ آگے حلوائی کی دکان پر وردی پوش پولیس والے موجود
تھے۔ ہم نے انھیں دور سے دیکھ لیا تھا اور سمجھا تھا کہ حلوائی نے
اشارے سے انھیں ہماری جانب متوجہ کیا ہے۔ ہم پر نظر پڑتے ہی
اُن کے جسم تن گئے تھے لیکن انھوں نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔
وہیں کھڑے ہمیں گھورا کیے۔ اڈے کا کوئی آدمی اب تک ہمارے پیچھے
نہیں آیا تھا مگر گلی کے کنارے پر دو اڈے سے متعلق ہی آدمی تھے
جو ادھر گلی میں داخل ہوتے ادھر ہم اُن کے سامنے تھے۔ وہ کچھ بوکھلا
گئے تھے تاہم اُن میں سے ایک نے جھجکتے ہوئے انداز میں درمیان کا مختصر
فاصلہ طے کیا اور قریب آ کے اُس کا جسم دوہرا ہو گیا اور اس کی زبان
سے ایک لفظ نہیں نکلا۔ اس اثنا میں ہم گلی سے نکل چکے تھے۔

باہر چند گز کی دوری پر تانگے موجود تھے۔ جمیل اور پیرو پوچھے
بغیر اُس میں بیٹھ گئے۔ تانگے والے نے منہ بنایا مگر دوسرے لمحے وہ
سیدھا ہو گیا۔ پیچھے دوسرے تانگے میں ہم چاروں سوار ہو گئے تھے۔
زورا، جمیل اور پیرو کے ساتھ اگلے تانگے پر چلا گیا تھا۔ تھوڑی دیر
میں ہم چار مینار تک آ گئے تھے اور درمیان میں نہ کسی پولیس والے
نے ہمارا تعاقب کیا تھا نہ اڈے کے کسی آدمی نے۔ کوئی ہوتا تو ہماری
نظروں سے چوک نہیں سکتا تھا۔ تانگے کے اگلے حصے پر شامو اور محرو
بیٹھے تھے، پچھلے پر کاشتے اور میں۔ اڈے سے نکل کے کسی نے کسی سے
کوئی بات نہیں کی تھی۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ ہم کس طرف جا رہے
ہیں۔ چار مینار سے ہم اسٹیشن کی طرف بھی جا سکتے تھے اور ابا جان
کی حویلی تک بھی۔ حویلی کا فاصلہ مجھے معلوم نہیں تھا لیکن چار مینار سے
دونوں اسٹیشنوں کا فاصلہ زیادہ طویل تھا۔ وہ کتنا ہی ہموار ہو مگر گمان
ہو کہ کسی محفوظ جگہ پہنچے بغیر کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا کہ آگے کون سی
رکاوٹ کا سامنا کرنا پڑ جائے۔ سب کی خاموشی کا سبب شاید یہی
دھڑکا تھا۔ تانگے کے تانگے پر جمیل، پیرو اور زورا بھی خاموش

نظر آرہے تھے۔ چار مینار کے چوک پہ کانسٹیبل نے میری طرف متوحش نگاہوں سے دیکھا۔ میں اس کی نگاہوں کا مفہوم سمجھ گیا تھا۔ مخبروں اس سے کیا کہا تھا۔ تجمل کا شہر سے باہر جانے کا ارادہ ہوتا تو وہ پہلے وڈا کو آبا جان کے پاس ضرور بھیج دیتا۔ انھوں نے اقبے پر موجود اپنا مختصر سامان بھی ساتھ نہیں لیا تھا۔ بہرحال چند لمحوں بعد تانگا جب پاد کمان کی طرف جانے والے راستے کے بجائے دائیں طرف مڑ گیا تو بات واضح ہو گئی۔ کسی اور طرف جانے کا تو بظاہر کوئی امکان نہیں تھا۔ تجمل آبا جان کے پاس ہی جا رہا تھا۔ گویا اس کا ارادہ سب کو ساتھ لے کے ہی حیدرآباد سے رخصت ہونے کا تھا۔

چار مینار سے خاصی دور نگے گنجان آبادیوں کی بستیاں ختم ہو جاتی تھیں اور بڑے مکانات کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ یہی راستہ بڑے نواب کی حویلی کو جاتا تھا۔ موٹروں، ٹم ٹموں اور بڑی سواریوں کے لیے الگ سے ایک راستہ موجود تھا۔ جیسے جیسے فاصلہ کم ہو رہا تھا، ابا جان کے بیٹے کے خیال سے میری رگوں میں آگ سی چلنے لگی تھی۔ انھیں کچھ خبر نہیں ہے۔ تجمل کے ساتھ مجھے اور پیرو کو دیکھ کے ان کا کیا حال ہو گا۔ انھیں اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آئے گا۔ رات زندان میں ختم نہیں گیا تھا۔ اس کے انتظار میں وہ یوں بھی لمحے گن رہے ہوں گے۔ خانم کو اگر انھوں نے سب کچھ بتا دیا ہے تو اُن کے لیے بھی یہ کسی کرشمے سے کم نہیں ہو گا۔ ممکن ہے ابا جان نے اُسے ابھی کچھ نہ بتایا ہو۔ ابا جان اُس سے کیسے کہہ سکتے ہوں گے کہ ان کا بیٹا ایک نواب کی قید میں ہے اور خانم کی سفارش کے بغیر اس کی رہائی ممکن نہیں ہے۔ ابا جان کو خانم سے یہ کہنے کے لیے بڑی جرأت کی ضرورت ہے۔ خانم سے ان کا واسطہ ہی کتنے دن رہا ہے۔ صرف اتنے دن جب تک وہ فیض آباد میں زریں کی حویلی میں چھپے۔ خانم کے اصرار کے باوجود انھوں نے اس سے کچھ نہیں کہا ہو گا اور تجمل پر ہی سب کچھ چھوڑ دینا مناسب سمجھا ہو گا۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد ہم ایک سرسبز علاقے میں آ گئے تھے جہاں ہر طرف قلعہ نما حویلیاں بنی ہوئی تھیں۔ تانگے والے کو زور زور کے راستہ بتانے کے انداز سے ظاہر تھا کہ اب ابا جان کی ٹھہری ہوئی حویلی زیادہ دور نہیں ہے۔ حویلی پہنچنے کے بعد اب شاید اتنی دیر نہ لگے۔ کاش کہ ایسا ہی ہو۔ رات کا وقت سفر کے لیے زیادہ بہتر ہو گا۔ رات کو بمبئی کے لیے ایک گاڑی روانہ ہوتی ہے۔ نہیں ہوتی تو بھی نہیں، یہاں سے کسی اور سمت نکل جانا چاہیے۔ جتنی جلدی اس شہر سے چھٹکارا مل جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ تجمل کو بھی ان سب باتوں کا احساس ہو گا کہ یہاں مزید ایک لمحہ بھی نہیں گنوانا چاہیے۔ ابا جان کی اتنی طویل غیر حاضری سے ترنجی نزاکت زدہ ہے اور اگر تو بالکل ہی مایوس ہو گئے ہوں گے۔ مولوی اکرم بہت نیک آدمی ہیں لیکن کوئی کب تک دوسروں کا اتنا خیال رکھ سکتا ہے۔ بمبئی جیسے شہر میں دو جوان لڑکیوں کی ذمے داری۔ مولوی اکرم انھیں زمانے کی نگاہوں سے بچا کے رکھنے میں خود بہت نڈھال ہو گئے ہوں گے۔ جنت سے خدا جانے کوئی سوال بھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے ابا جان نے کلکتے یا فیض آباد سے اپنی جلد واپسی کے بارے میں انھیں کچھ لکھا ہو اور لکھا ہو کہ ان کا فرزند بڑا بیٹا بھی ان کے ساتھ آ رہا ہے یا ابا جان نے یہ سوچ کے کہ یہاں اتنے دن گزر گئے ہیں وہاں چند دن اور سہی انھیں کچھ بھی نہ لکھا ہو۔ بہرحال زیادہ سے زیادہ اب ایک ہی دن کا بل رہ گیا ہے کہ ساری دوریاں ختم ہو جائیں گی۔ ان کے سامنے جانے کے تصور سے میرا سینہ بند ہونے لگتا تھا۔ معلوم نہیں وہ اپنے جانی کو پہچانیں بھی کہ نہیں۔ انھیں اس شخص کا چہرہ نہیں دیکھنا چاہیے جس کی وجہ سے ان کا گھر اُن سے چھوٹ گیا اور ان کی ماں۔ انھیں ابا سے بہت شکوہ ہو گا کہ انھوں نے ان سب کا خیال نہیں کیا۔ ایک میں ہی ان کا بیٹا نہیں تھا۔ مگر میں ان کے سامنے ضرور جاؤں گا اور ان سے کہوں گا کہ وہ جتنی چاہیں مجھے سزائیں دیں، وہ اپنے جانی کو سنگسار کریں اگر اس طرح کوئی تلافی ہو سکتی ہے۔

تانگا چوراستے سے مڑ کے ایک بڑی حویلی کے دروازے پر ٹھہر گیا۔ پتھر کی اونچی چار دیواری اور اونچے اونچے درختوں کے درمیان سجی ہوئی لال عمارت کا بالائی حصہ باہر سے نظر آ رہا تھا۔ دربان موجود تھا۔ زور دار کو دیکھتے ہی اس نے جھک کے سلام کیا اور دروازہ کھول دیا۔ پسینے کے مساموں سے پسینہ چھوٹ رہا تھا اور سارا جسم جیسے نچڑ گیا تھا۔ تانگے سے اتر کے کانسٹیبل نے میرا ہاتھ زور سے پکڑ لیا۔ اس کی سانسیں بھی تیز تیز چل رہی تھیں۔ دربان نے پیرو اور دروازہ کھولا تھا۔ کانسٹیبل اور ہم سب کے بعد اندر داخل ہوئے۔ دونوں جانب لگی ہوئی پھلواری کے بیچ سرخ رنگ کی ایک چوڑی گزرگاہ ہمارے سامنے تھی جس کے سرے پر برآمدہ نظر آ رہا تھا۔ پیرو، تجمل اور شامو کی آنکھیں ادھر اُدھر جھانک رہی تھیں۔ کیاریوں میں گلاب کے بڑے بڑے پھول کھلے تھے اور دور چار دیواری تک پیڑوں کا قطار در قطار سلسلہ چلا گیا تھا۔ گزرگاہ کا گھماؤ عبور کرتے ہی عمارت بلکہ شاید ابھی لال اور سفید پتھروں سے بنی ہوئی دو منزلہ حویلی طول و عرض میں اتنی بڑی نہیں تھی مگر سارا نقشہ کسی محل سے مشابہ تھا۔ اس وقت دھوپ اُوپر چلی گئی تھی اور ہر جانب سانولی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ہم عمارت سے چند قدم کے فاصلے پر تھے کہ ہمیں مارتی دکھائی دیا۔ وہ مارتی ہی تھا۔ وہ منتظر تھا کہ اس نے ہماری آہٹیں سنیں، یکایک اس کے جسم پر بجلی سی لپکی۔ وہ بے تحاشا چبوترے کی سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے آ گیا۔ پیرو نے آگے بڑھ کے اُسے پکڑ لیا۔ "ماسٹر، ماسٹر!" وہ اُسے جھنجوڑتے ہوئے بولا۔ "سالا تم تو ابھی ایک دم نمنوش کی مانک بدل گیا ہے۔"

مارتی کی آنکھیں خیرہ ہو گئی تھیں۔ وہ بدحواسی میں سب کے چہرے دیکھ رہا تھا۔ مجھ پہ اس کی نظر پڑی تو بوکھلا سا گیا۔ "راجا، راجا آگیا تو؟" پیرو کے بازوؤں سے خود کو چھڑا کے وہ تڑپتا ہوا میری طرف بڑھا اور مجھے دبوچ دبوچ کے دیکھنے لگا۔ وہ بالکل پاگل ہو گیا تھا۔ معاً اسے کچھ خیال آیا اور وہ وحشت کے عالم میں سیڑھیاں طے کرتا ہوا اندر کی جانب بھاگ پڑا۔ ہم چبوترے پر پہنچے ہی تھے کہ اندر سے تیز تیز قدموں کی آوازیں سنائی دیں اور مارتی کی چہکتی آواز بھی۔

وہ ایک بسیط و عریض گول کمرہ تھا۔ اوپر گنبدی چھت پر جا بجا رنگ برنگے شیشے جڑے تھے۔ بیچ میں ایک بڑا فانوس تھا۔ دیواروں پر ہر طرف بیل بوٹے کندہ کیے گئے تھے اور فرش پر نیلا قالین تھا۔ دیوار کے ساتھ تین جانب گدے لگے ہوئے تھے اور درمیان میں ایک جانب چوکی کی نشست تھی۔ ان سب کی آوازوں سے کمرہ گونج رہا تھا۔ سبھی موجود تھے۔ ابا جان، مارتی، زورا، منگلو، کالے، تجمل، شامو، پیرو، تجمل اور میں۔ منیر علی بھی۔ منیر علی کو وہاں دیکھنے کے بعد خانم کی آمد کے بارے میں کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں رہی تھی مگر یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ وہ خانم کے بجائے کوئی عذر لے کے آئے ہوں یا تار کے ذریعے ابا جان کا تجمل کو بلوانا اور تجمل کے بعد خانم کی طلبی۔ خانم تو اس قدر تفریح اور سرگرمی میں نیم جاں ہو گئی ہو گی، شاید اسی لیے منیر علی کو آنا پڑا ہو۔ مگر مجھے تصدیق کی کوئی ایسی الجھن نہیں تھی۔ وہاں تو سب کچھ بدلا ہوا تھا۔ کسی کو کچھ اور سوچنے کی فرصت نہیں تھی۔ ابا جان کے ایک جانب تجمل بیٹھا تھا اور دوسری جانب پیرو۔ میں ان کے بالکل سامنے تھا۔ وہ مجھے گلے سے لگا کے قریب تول تول کے دیکھ چکے تھے لیکن شاید ابھی تک انھیں کسی فریب نظر کا گمان تھا۔ بار بار ان کی متوحش نگاہیں میری اور پیرو کی طرف اُٹھ جاتی تھیں۔

حویلی پر چھائی ہوئی خاموشی ذرا سی دیر میں بادلوں کی طرح چھٹ گئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے سب کے سب ایک دوسرے سے مدتوں بعد ملے ہوں اور سب دنیا سے دور کسی جزیرے میں آ بسے ہوں، کسی گم شدہ جنت میں۔

مجھے دیکھا ہے تو برسوں بعد۔ آج کا دن گزر نہ جائے کہیں۔

کچھ دیر تک کسی کو ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ ابا جان کو احساس ہوا۔ انھوں نے مارتی کو اشارہ کیا کہ وہ ہم تھکے ہوؤں کے لیے چائے وغیرہ کا بندوبست کرے۔ تھکن تو یہاں آتے ہی دور ہو گئی تھی۔ مارتی بڑبڑاتا اُٹھ کھڑا ہوا۔ جانے آنے سے پہلے ابا جان نے حکم دیا کہ پہلے سب اپنا حلیہ درست کر لیں۔ لباس تیار ہے اور غسل کے لیے گرم پانی بھی۔ ان دنوں میں ابا جان نے اندازے سے سب کے کپڑے تیار کرا لیے تھے، ایک کے بجائے دو دو جوڑے۔ نواب حشمت جنگ سے تعلق کے باعث انھیں اس اہتمام کی ضرورت محسوس ہوئی ہو گی ورنہ آپ کا سامنا ہونے پر کپڑوں کا لباس بھی مکان کے شایاں ہو۔ کسی کو بھلا ان سے الجھنے کو نہیں چاہ رہا تھا لیکن سب مختلف کمروں میں چلے گئے۔ گول گنبدی نشست گاہ کے تینوں دروازے ایک گول راہداری پر کھلتے تھے۔ وہیں سے کمروں کے لیے مختلف راستے نکلتے تھے۔ ساری کی ساری حویلی بیش قیمت سامان سے مرصع تھی۔ کہیں بھی کوئی ویرانی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ قیمتی پردے، کھڑکیوں کے شیشے، جھنڈوں کی تصاویر اور دیگر آرائشی چیزیں، ہر کہیں گرد کا نشان تک نہیں تھا۔ میں راہداری میں آیا ہی تھا کہ منیر علی نے میرا بازو تھام لیا اور آنکھ کے اشارے سے مجھے اپنے ساتھ آنے کی ہدایت کی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مجھ سے خانم کے متعلق کوئی بات کرنا چاہتے ہیں۔ میرا دل تجربے لگا کہ کہیں وہ کوئی ایسی ویسی بات نہ بتا دیں۔ راہداری ہی سے اوپر کی منزل کو سیڑھیاں جاتی تھیں۔ "آپی آپ سے نہیں ملے گے؟" وہ مُرجھا سا مجھ سے بولے۔ "وہ تمھیں دیکھنے کے لیے بہت بے تاب ہے۔"

"آپی آئی ہیں؟" میں نے دھڑکتی آواز میں کہا۔

"انھیں بہرحال آنا تھا۔" وہ مسکراتے لہجے میں بولے۔

"اور کون کون ہے؟"

"آنے کو تو سبھی تیار تھے، میں نے روک دیا۔ جہاں تجمل کا جانا ہوا تھا۔" منیر علی نے افسردگی سے کہا۔

"کیا؟" میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "کیا آپی کو سب کچھ معلوم ہے؟"

"نہیں۔" وہ متانت سے بولے۔ "بھائی صاحب نے ان کو بھی کچھ بتایا ہے۔ میں نے خانم کو تسلی دینے کی اپنی سی کوشش کی ہے لیکن وہ ماشاء اللہ سوجھ بوجھ کے لحاظ سے ہزاروں میں ایک ہے۔ طرح طرح کے سوال کر رہی تھیں۔ انھیں یہاں نہ دیکھ کے بہت پریشان تھی۔ نہ پوچھو سارے راستے ہم نے وقت کس طرح کاٹا ہے۔ کیسے کیسے وہم ستا رہے تھے۔ خانم ہیں، پھر بھی بہت تحمل ہے لیکن سنجیدہ ہو گئی ہے۔ پہلے تم اُس سے جا کے مل لو۔"

میرے قدم رکنے لگے تھے مگر پھر میں نے جلدی جلدی ساری سیڑھیاں طے کیں۔ بالائی منزل کے پہلے کمرے کے باہر جھروکے کے پاس ہی خانم کھڑی تھی۔ سر تا پا نیلگوں لباس میں۔ تنگ مہری کا پاجامہ اور کڑھا ہوا کرتا۔ دوپٹا بھی اُسی رنگ کا تھا۔ مصور کی طلسماتی

چھوڑ دیں۔ اُس نے سیڑھیوں پر بھاری بھاری چاپیں سُن لی تھیں۔ اُس کا رُخ ہماری ہی طرف تھا۔ منیر علی نے غلط نہیں کہا تھا تو خانم بیمار نہیں جا رہی تھی۔ بڑی بڑی چمکتی چمکتی آنکھیں چہرے کی ساری سُرخی چھلکی۔ مجھے دیکھ کے اُس کے سراپا میں لرزتی سی آنکھیں اور اُس کے ہونٹ کپکپانے لگے وہ بے تابانہ میری طرف بڑھی میرے ہاتھ بھی بے اختیار پھیل گئے۔ میں اُسے تسلی دینے آیا تھا لیکن مجھے اپنی ہی سُدھ بُدھ نہ رہی۔ خانم نے مجھے بازوؤں میں چھپا لیا۔ اُن میں بہت نرمی اور ٹھنڈک تھی۔ میرا بند بند ٹوٹنے لگا۔ ایسا محسوس ہوا کہ میں پگھل کے گر جاؤں گا جیسے میرے جسم کی ساری قوت ڈھیر ہو گئی ہو اور خانم کا قد بہت بڑا ہے اور اُس کا سینہ کوئی سمندر ہے اور جیسے میں اُسے پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ میں اُس کے اتنے قریب رہ کے بھی اُس سے کتنا دور رہا تھا۔ اُس نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور اُس کی بے قرار انگلیاں میرے بالوں، میری گردن اور کمر پر لرزاں ہوئیں میری آنکھوں سے زار و قطار آنسو جاری ہو گئے۔ مجھے نہیں معلوم کتنا عرصہ گزر گیا۔ منیر علی نے میری کمر پر تھپکی دی اور میرا شانہ پکڑ کے جھنجھوڑا تو میں بوکھلا سا گیا۔ "بابر میاں! یہ کیا! ایں! میں نے تم سے اسی لیے تو یہاں آنے کو نہیں کہا تھا۔" منیر علی کی بھرائی ہوئی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ انھوں نے مجھے اُس سے جدا کر دیا اور میرا ہاتھ پکڑ کے وہیں کمرے کے باہر رکھی ہوئی چوکی پر لے آئے۔ خانم بھی آ کے میرے برابر بیٹھ گئی۔ میری نظر اُس کے چہرے پر گئی۔ میری آنکھیں اور دھندلانے لگیں خانم کا چہرہ بھیگا ہوا تھا۔ ہم دونوں دیر تک سر جھکائے بیٹھے رہے۔ منیر علی بھی کچھ نہیں بولے پھر آخر وہی کہنے لگے "میرا خیال ہے۔ بابر میاں! اب نیچے چلو۔ خانم بیٹی تم بھی اپنا حال کچھ ٹھیک کرو۔ سب لوگ نیچے بیٹھے ہیں۔ تجمل اور پیرا بھی ہیں۔ اُن لوگوں کے لیے تمھیں کچھ انتظام وغیرہ بھی کرنا ہے۔"

"تھوڑی دیر انھیں یہیں رہنے دیجیے۔" خانم نے بمشکل زبان کھول اور ڈوبتی ہوئی آواز میں منیر علی سے کہا۔

"یہ اب یہیں ہیں اور اب تو سب یہیں ہیں۔" منیر علی گہری سانس بھر کے بولے۔ "میں انھیں یہاں عمداً نہیں چھوڑنا چاہتا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم دونوں اتنے لبالب بھرے ہو اور تم بیٹی! تم تو بہت حوصلے والی ہو۔ میں تو ابھی بابر میاں سے یہی کہہ رہا تھا۔ دھوپ چھاؤں ہی زندگی ہے۔ میں نے تم سے راستے میں کیا کہا تھا کہ اللہ نے چاہا تو سب خیریت ہو گی۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔" منیر علی نرم آواز میں بولے۔ "بابر میاں سے پوچھو اب ایسی کوئی اُلجھن در پیش نہیں ہے۔"

"ہاں آپی!" میں نے اٹکتے لہجے میں کہا۔ "اب سب ٹھیک ہی ہے۔"

"مگر مگر۔" خانم دبی زبان میں بولی۔

میں نے اُس کی بات پوری ہونے سے پہلے کہا۔ "یقیناً آپ بہت کچھ جاننے کے لیے بے تاب ہوں گی مگر اب سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ اب اُسے دہرانے سے کچھ حاصل نہیں۔ آپ اطمینان رکھیے۔"

"اطمینان تو تمھیں دیکھتے ہی ہو گیا مگر مجھے کچھ بتاؤ تو سہی۔ ایسی کون سی بات ہے جو آپ لوگ مجھ سے چھپا رہے ہیں؟"

"سمجھو کہ ایک معاملے میں تمھاری ضرورت پڑ گئی تھی۔" منیر علی بیچ میں بولے۔ "لیکن اب سب درست ہو چکا ہے۔"

"کیا معاملہ تھا؟" خانم اضطراب سے بولی۔

"کچھ میری بات تھی آپی! میری وجہ سے آپ کی ضرورت پڑ گئی تھی۔" خانم حیرت سے میرا چہرہ دیکھنے لگی اُس کے ہونٹ کچھ کہنے کے لیے پھڑک کے رہ گئے۔ میں نے پھر بھرائی آواز میں کہا۔ "آپ کا آنا شاید ضروری ہو گیا تھا۔ بہتر ہے مجھ سے کچھ مت پوچھیے۔ تجمل بھائی آپ کو سب کچھ بتا دیں گے۔ سب کو احساس تھا کہ آپ کس قدر پریشان ہو جائیں گی لیکن لیکن...... اب کچھ بھی نہیں ہے۔ اچھا ہوا کہ آپ آ گئیں اور یقین کیجیے میں نے نہیں تجمل بھائی نے آپ کو بلوایا تھا۔ مجھے تو کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔"

"تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟" وہ آزردگی سے بولی۔

"میں آپ سے بالکل سچ کہہ رہا ہوں مجھ سے مشورہ کیا جاتا تو میں شاید منع کر دیتا۔ میرے ذہن میں تو دور دور تک نہیں تھا کہ آپ کو تار دے دیا جائے گا مگر پھر سمجھیے کہ تجمل بھائی کے پاس اور کوئی چارہ بھی نہیں رہا تھا۔ چارہ تو دوسرا بھی تھا لیکن نتائج کا یقین نہیں تھا۔ کچھ ایسا ہی تھا۔"

"تم مجھے صاف صاف کیوں نہیں بتاتے۔" وہ التجائی لہجے میں بولی۔ "یقین کرو سوچ سوچ کے میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔"

"میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ کچھ مت سوچیے۔ آپ کی اذیت کا مجھے خوب اندازہ ہے لیکن میرے بس میں کچھ نہیں تھا بلکہ کسی کے بس میں بھی......"

"کوئی ایسی بات ہے تو تجمل بھائی نے بالکل ٹھیک کیا۔ ہر اذیت تو میرے لیے عین راحت ہے۔" اُس کی آواز رندھنے لگی۔ "میرے لیے اس سے بڑی خوش نصیبی کیا ہو سکتی ہے کہ میں تمھارے یا تجمل بھائی کے کسی کام آؤں۔ میں سمجھوں گی کہ میری زندگی کا بھی کوئی مقصد ہے۔"

"یہ تو آپ دوسروں سے پوچھیے۔ آپ کی ذات ہی ایک نعمت ہے۔ مقصد صرف اپنے لیے تو نہیں ہوتا۔" میں نے عاجزی سے کہا۔ "تجمل بھائی

نے جو سرزنش کی تھی، وہی کیا کم ہے۔ مجھے یہ سب کچھ اس طرح اچھا نہیں لگتا تھا۔"

"کیا اچھا نہیں لگتا تھا؟"

"یہی کہ...... یہی کہ آپ کو دوبارہ، دوبارہ کسی... میرا مطلب ہے اس شہر میں......" الفاظ میرے حلق ہی میں منتشر ہو گئے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اُس سے کیا کہنا چاہتا ہوں۔ میں نے آپ کو اور تجمل بھائی کو ہیجان میں مبتلا کر دیا تھا۔

"تم رُک کیوں گئے؟" وہ اضطراری انداز میں بولی۔ "میں نے زندگی میں بہت صدمے سہے ہیں لیکن شاید یہ صدمہ نہ سہا جا سکے کہ تم اپنی آپی کو کسی آزمائش کے لیے منتخب سمجھو۔ یہ سارا رتبہ تم نے اور تجمل بھائی نے دیا ہے۔ میرے نگہبان موجود ہیں مجھے کیسے کوئی فکر ہو سکتی ہے۔ ہاں اگر تمھاری نظروں میں...... مجھ سے کوئی لغزش......" اُس نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

"معلوم نہیں آپی! آپ کیا سمجھ رہی ہیں ایسی باتیں مت کیجیے۔ رتبہ کون کسی کو ایسے ہی دیتا ہے۔ رتبہ تو رتبے کے لائق لوگوں ہی کو ملتا ہے۔ میرا یقین ہے کہ آپ سے لغزش کبھی ہو ہی نہیں سکتی۔ ایسی ویسی ہر بات دل سے نکال دیجیے۔" میرے لہجے میں تندی آ گئی تھی۔ میں نے اُس سے کہا۔ "کسی بات پر ہی تو آپ کو اطلاع دی گئی تھی وہ وقت اب ٹل گیا ہے۔ کوئی ایسی بات ہی نہیں ہے۔ تھی بھی تو اب بالکل نہیں رہی ہے۔"

مجھے معلوم تھا کہ میری کوئی بات اُسے مطمئن نہیں کر سکے گی۔ ایک بار جی میں آئی کہ اُسے سب کچھ بتا دوں۔ اُس کی جگہ کوئی بھی ہوتا اسی طرح مضطرب ہوتا۔ اُسے بلانے کے لیے "فوراً چلی آؤ" تار دیے گئے تھے اور خط لکھا گیا تھا۔ پھر کسی اور جگہ نہیں حیدرآباد آنے کو لکھا گیا تھا جہاں اُس نے ایک عرصہ گزارا تھا۔ یہاں آنے کے بعد ہمارا یہ رویہ اُس کے لیے بہت ناقابلِ فہم ہو گا۔ جانے کیسے کیسے شبہے اُس کے دل میں پنپ رہے ہوں گے مگر میں اُسے کیا بتاتا! میری زبان سے شاید کچھ بھی نہ نکلتا۔ میں نے اُس کی منت کی۔ "مجھ سے کچھ مت پوچھیے آپی! شاید میرے لیے آپ کو بتانا مناسب نہ ہو۔"

اُس کا چہرہ سُلگ رہا تھا، آنکھیں انگارے جیسی ہو رہی تھیں ہونٹوں کے گوشے لرز لرز اُٹھتے تھے مگر اُس نے پھر مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ منیر علی کرسی سے اُٹھ کے چوکی پر آ گئے اور کہنے لگے۔ "تم اتنی جلد اداس کیوں ہو رہی ہو بیٹی! بابر میاں واقعی ٹھیک کہہ رہے ہیں اب آگے ٹھہراؤ ہے خیر ہے۔ میرا خیال ہے ہم جلد ہی یہاں سے چلے جائیں گے۔ شاید آج ہی رات۔" خانم کچھ نہیں بولی۔ انھوں نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کے آہستگی سے کہا۔ "میں تمھارے باپ کی جگہ ہوں اور تم مجھے زہرہ سے زیادہ عزیز ہو۔ کوئی فکر نہ کرو۔ میرا کہا تو مانو گی؟" خانم

نے ڈبڈبائی نظروں سے بے تابانہ اُن کی طرف دیکھا۔ منیر علی نے اُسے سینے سے لگا لیا اور اُس کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ خانم سسکنے لگی۔ ابھی ہوا زینے پر کسی کی آہٹ ہوئی۔ وہ ابا جان تھے۔ خانم نے دوپٹے سے چہرہ چھپا لیا اور کمرے میں چلی گئی۔ ابا جان یہیں آوازیں دیتے چڑھتے تھے مگر ہم دونوں کے چہرے دیکھ کے ٹھٹھک گئے۔ پہلے انھوں نے منیر علی کو غور سے دیکھا، پھر مجھے۔ زبان سے کچھ نہیں کہا۔

"ہم نیچے آ ہی رہے تھے بھائی صاحب!" منیر علی نے زیرِ لب کہا اور ابا جان کا ہاتھ پکڑ کے آہستہ آہستہ سیڑھیاں اُترنے لگے۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ گول کمرے کا بڑا فانوس روشن کر دیا گیا تھا اور ساری فضا بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ دونوں کانٹے اور تبرو دُھلے دُھلائے بیٹھے تھے۔ گریبان کڑھا سفید کُرتا، چوڑی مہری کا سفید پاجامہ اور واسکٹ۔ دونوں کی واسکٹوں کے رنگ مختلف تھے۔ بال سلیقے سے کڑھے ہوئے تھے، ایک ٹانکے کا چوک پڑا تھا۔ دونوں ترو تازہ لگ رہے تھے۔ کمرے کا ماحول بھی ایسا ہی تھا۔ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ کانٹے اور تبرو ہیں۔ مجھے دیکھ کے دونوں مسکرانے لگے۔ کانٹے نے اِتراتے ہوئے اپنی واسکٹ کی گرد انگلی سے صاف کی، مجھے بھی ہنسی آ گئی۔ اتنی دیر میں شاہد اور زلیخا بھی آ گئے پھر پیرا اور تجمل۔ سب کے سب ترو تازہ، شگفتہ شگفتہ نظر آ رہے تھے۔ سب آ چکے تو ایک ملازم نے چپکے سے ابا جان کے کان میں آ کے کچھ کہا۔ ابا جان اُٹھ گئے اور انھوں نے سب کو اُٹھ چلنے کا اشارہ کیا۔ ہم تھمبی کی ڈیوڑھی میں گول کمرے سے نکل کے راہ داری کا چند قدم کا فاصلہ طے کرتے ہوئے ایک دالان نما کمرے میں آ گئے۔ یہاں ایک لمبی چوڑی میز لگی تھی۔ میز پر قسم قسم کی پیالیاں چنی ہوئی تھیں چائے اور کئی مشروبات چلے ہوئے، مٹھائیاں اور کئی طرح کی نمکین چیزیں۔ کھانے کا اہتمام بھی اس سے بڑھ کے کیا ہو گا۔ میں نے غسل کیا تھا، نہ لباس بدلا تھا۔ نیچے آ کے منیر علی نے مجھے روک لیا تھا کہ چلنے کو تیار ہے۔ اب ناشتے وغیرہ سے فراغت ہی پا کر تبدیل کرنا۔ رات کے کھانے میں بھی اب کتنا وقت رہ گیا تھا لیکن خانم کے سوا سب نے خوب سیر ہو کے کھایا۔ اُس نے صرف ایک پیالی چائے اور تھوڑی سی آلو کی چاٹ کے سوا کچھ نہیں لیا۔ تجمل پہلے بھی اُن سب سے الگ دکھائی دے رہا تھا جیسے وہ وہاں موجود ہی نہ ہو۔ شاید اوروں نے خیال نہ کیا ہو لیکن مجھے تجمل کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں بھاری بھاری تھیں، چہرہ سُوجا ہوا تھا اور ماتھے پر شکنوں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ اتنے دنوں تک وہ تقریباً جاگتا ہی رہا تھا۔ ممکن ہے یہ حال تھکن کی وجہ سے ہو۔ اُسے گہری نیند کی ضرورت تھی۔ ہجوم سے آنے کے بعد شروع شروع میں تو یہاں کی خاموشی

ان دو دنوں میں زریں کو یہ چیزیں اکٹھی کرنے کا موقع مل گیا ہوگا۔ مارتی ایک ایک چیز احتیاط سے نکال کے مجھے دکھا رہا تھا۔ نیپیاں کے ہاتھ کا کڑھا ہوا رومال بھی تھا جب میں چلا تھا، نیپیاں نے یہ ادھورا رومال مجھے دکھایا تھا اور مجھ سے پوچھا تھا کہ پھول اس نے کیسا بنایا ہے۔ یہ سارا کام زریں ہی نے اسے سکھایا تھا۔ اسی نے نیپیاں کو مشورہ دیا ہوگا کہ سفید رومال کے کونے پر سفید تار کشی سے پھول بنایا جائے تو رومال زیادہ نفیس اور دیدہ زیب ہو جائے گا۔ یہ نفاست اسی کو آتی تھی۔ کچھ دیر کے لیے میں خود کو بھول گیا۔ زریں جیسے میرے سامنے سر جھکائے کھڑی تھی سفید لباس میں ملبوس کسی مجرم کی طرح۔ میری آنکھیں اسی کو دیکھ رہی تھیں۔ مارتی نے مجھے چونکا دیا اور ہنسنے لگا۔ "ابھی کدھر چلا گیا تھا بابا؟"

مجھے اس کے سامنے خفت سی ہوئی۔ میں نے جلدی سے ایک جوڑا نکال کے الگ رکھا۔ مارتی نے شیروانی بھی نکال لی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ میں آج بھی یہ لباس پہنوں۔ حیدرآباد میں شیروانی کا عام رواج تھا مگر میں نے شیروانی سوٹ کیس ہی میں واپس رکھ دی اور تنا سکٹ نکال کے سیدھا غسل خانے میں آ گیا۔ مجھ سے ٹھیک طرح غسل بھی نہیں کیا گیا۔ گرم پانی موجود تھا مگر وہ اتنا گرم تھا کہ ٹھنڈا پانی ملا کے معتدل کرنے میں دیر لگتی۔ میں نے ٹھنڈے ہی پانی پر اکتفا کیا۔ پاجامے میں کمربند پڑا ہوا تھا، کمربند ڈالتے میں اندر سرک جانے کے خیال سے گرہ بھی لگا دی گئی تھی۔ باہر مارتی میرا منتظر تھا۔ میں نہا کے تیار ہو کے نکلا تو مارتی ایسی سیٹی بجانے لگا جیسی زندگی میں کوئی بازی گر کرتب دکھانے پر بجائی جاتی ہے۔ وہ جسم جھکا کے مجھے مختلف زاویوں سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے میرے پیروں کے آگے سلیم شاہی جوتی رکھ دی۔ جوتی جیسے پیر میں بالکل فٹ آ گئی۔ زریں کو میرے کپڑوں اور جوتوں کی پیمائش کا کیسا اندازہ تھا۔ میں نے سوچا کتنی بار باہر گیا ہوں تینوں بہنوں کے لیے لیکن مجھے کبھی خیال تک نہیں آیا کہ اس کے لیے کوئی چیز لیتا چلوں۔ اس نے کبھی کوئی شکوہ نہیں کیا مگر شاید شکوہ کرنا اسے آتا ہی نہیں تھا۔

کمرے میں نصب قدِ آدم آئینے میں خود کو دیکھ کے مجھے حیرت سی محسوس ہوئی۔ بالوں کی ترتیب بھی آدمی کو کتنا بدل دیتی ہے۔ مجھے اچھے نہیں لگ رہے تھے لیکن مارتی نے کاڑھے تھے اس لیے میں نے انھیں جوں کا توں رہنے دیا۔ کمرے سے نکلنے ہی والے تھے کہ منگو دوڑتا ہوا آیا۔ "لاڈلے بھائی! استاد تم کو بلا رہے ہیں۔"

"مجھے؟" میں نے بے چینی سے کہا۔ "کیا کانتے اور دادا واپس آ گئے ہیں؟"

"ہاں ہاں۔" وہ پھولی ہوئی سانسوں سے بولا۔

میں کسی تامل کے بغیر دروازے کی طرف جھپٹا۔ تیز تیز قدموں سے میں نے راہداری عبور کی۔ وہ سب مجھے نشست گاہ سے باہر ہی کھڑے نظر آ گئے۔ تجمل کے کندھے پر شال پڑی تھی۔ پیرو کے کندھے پر بھی ایک شیروانی رکھی تھی۔ انھیں جیسے بیزاری اور اضطراب تھا۔ میرے پہنچتے ہی وہ آگے بڑھے اور چبوترے پر چلے آئے۔ باہر بیرونی گاڑی کے سائبان میں دو فٹن موجود تھیں۔ ان سب کے چہرے بوجھل تھے، سب گم صم سے تھے جیسے موت ہو گئی ہو۔ میں ان کے قریب جا کے ٹھٹک سا گیا تھا۔ تجمل نے مجھے پاس آنے کا اشارہ کیا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھے رکھے آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ جتنی دیر میں ہم فٹن کے قریب پہنچے چبوترے کی دوسری جانب سے مجھے شیر علی اور خانم آتے دکھائی دیے۔ خانم برقع پہنے ہوئے تھی۔ چبوترے پر روشنی اتنی تیز نہیں تھی مگر کالے نقاب کے بیچ میں خانم کا چہرہ چاند کے مانند دمک رہا تھا۔ برقع میں اس کا قد کچھ اور بڑا ہو گیا تھا۔ پہلے ایک لمحے کو مجھے شبہ ہوا تھا کہ وہ کہیں اور نہ جا رہے ہوں مثلاً نواب حشمت جنگ کے ہاں لیکن خانم کو آتے دیکھ کے اس شبہے کا کوئی جواز نہیں رہا تھا۔ جب وہ نواب حشمت جنگ کے ہاں خانم کو ساتھ لے جانا مناسب نہیں سمجھ سکتے تھے تو آخر انھوں نے فیصلہ کر لیا تھا۔ میرے سینے میں بھرا ہوا اندھیرا جیسے چھٹ گیا۔ فٹن پر چڑھتے وقت کسی نے مجھے ٹوکا دیا کہ انھوں نے کوئی سامان ساتھ نہیں لیا ہے لیکن اس کا جواب دوسرے ہی پل مل گیا۔ ملازم شامو، جبرو اور منگو ہمارے ساتھ فٹن میں نہیں بیٹھے تھے۔ وہ جانے پیچھے پیچھے چبوترے تک آئے تھے لیکن ابا جان نے انھیں وہیں روک دیا تھا۔ تجمل نے بھی طے کیا ہوگا کہ وہ سامان بعد میں لے کے آئیں مگر مارتی اتنی دیر سے میرے ساتھ تھا۔ ابھی کوئی بات آتی تو وہ مجھے ضرور بتاتا۔ شاید مارتی کے موجود رہنے پہ مجبور کر کے بھیجا دیا گیا ہو۔ پہلی والی فٹن میں خانم اور ابا جان، شیر علی اور تجمل بیٹھ گئے۔ دوسری میں پیرو، زورا، کانتے اور میں۔ جلد ہی دونوں گاڑیاں عمارت سے نکل کے بڑی سڑک پر آ گئیں۔ میں نے پیرو اور کانتے سے کچھ پوچھنا چاہا لیکن پھر مناسب نہیں سمجھا کیونکہ وہ تینوں اپنے آپ میں گم بیٹھے تھے۔ میں بھی چپ رہا۔ اب تشکیل ان کی بھی طرح غالب آ رہی ہوگی۔

سڑک کے دو رویہ کھمبوں پر روشنی کی قطاریں حدِ نظر تک چلی گئی تھیں۔ آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ دونوں فٹنوں کی ٹاپیں دور دور تک سنائی دے رہی ہوں گی۔ ہوا نرم اور خنک تھی۔ کبھی کبھی کوئی تیز جھونکا ہم تک پہنچ جاتا تھا۔ فٹن مناسب رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔ کسی کے تعاقب کا بظاہر کوئی امکان نہیں تھا۔ کانتے اور زورا سے یہ یقین کر لینے کے بعد ہی تجمل نے باہر نکلنے کا ارادہ کیا ہوگا۔ ہم

میری نظریں سڑک پر بکھری ہوئی تھیں۔ دونوں اطراف حویلیوں کے برجوں، شہ نشینوں اور جھروکوں میں روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ پر سکون چھایا ہوا تھا۔ فٹن خاصی دور آنے کے بعد بھی شہر کے گنجان علاقے میں داخل نہیں ہوئی تو مجھے بے کلی ہونے لگی۔ میں نے کچھ دیر اور انتظار کیا پھر فٹن کے باہر جھانکا۔ دور تک آبادی علاقہ ہی نظر آ رہا تھا اور ان تینوں کو سمت کی کوئی فکر نہیں معلوم ہوتی تھی۔ مجھ سے ضبط نہیں ہوا۔ میں نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے پیرو سے جھجک کے پوچھا۔ "دادا! یہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

پیرو نے سر اٹھا کے میری طرف دیکھا اور کسی قدر حیرت آمیز لہجے میں بولا۔ "تجھ کو نہیں پتہ بھائی؟"

"ہم ہم بمبئی جا رہے ہیں نا؟" میں نے اٹکتی زبان سے کہا۔

اس نے اپنے پنجے سے میری گردن دبوچ لی اور میرے سر کو جھٹکے دیتے ہوئے بولا۔ "ابھی کیدر رے!"

"پھر پھر ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"بڑے نواب کے ہاں۔" وہ آہستگی سے بولا۔

مجھے یک لخت جھٹکا سا لگا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھا کیا۔

"ہاں بھائی! اپن اُدر ہی جا رہا ہے۔" پیرو کھنچتی ہوئی آواز میں بولا۔ "میرا ہم سن ہو گیا تھا۔ مجھ سے کچھ نہیں کہا گیا۔" ابھی تجمل بھائی بھی بولتا ہے کہ اپن لوگ اُدر جانا چاہیے، بولتا ہے کہ اور خانم کا ضرور رکھیں۔"

"مگر مگر دادا!...." میں نے بمشکل کہا۔ میری آواز بھرا گئی تھی۔

وہ میری پیٹھ تھپکتے ہوئے بولا۔ "کبھی ایسا بھی چلتا ہے بابا!"

میرے جی میں آئی کہ فٹن سے کود پڑوں۔ پیرو کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "تجمل بھائی بولتا ہے اور چھوٹا نواب ایک دم اکڑ گیا ہے۔"

"تم نے ان سے یہ نہیں کہا۔ تم نے یہ نہیں کہا کہ خانم کوئی ...."

"وہ اپن سے زیادہ جانتا ہے۔"

"روک دو دادا! گاڑی روک دو۔" میں نے بپھری آواز میں کہا۔ "خانم کو ایسے وہاں نہیں جانا چاہیے۔ یہ کیا بات ہوئی بھلا۔ تم سب کچھ بھول گئے جو انھوں نے اٹھائے ہیں۔ ہم پر زخم نشانات ہوں گے۔ کل ہی رات کی تو بات ہے گھنگھرو ٹوٹ گئی تھی۔ تم نے نہیں بتایا دادا کہ ہم سے؟...."

"ہم کو بولتا ہے کہ چھوٹا نواب کا حال ٹھیک نہیں ہے۔"

"لیکن خانم کوئی کھلونا نہیں ہے۔" میں نے چیختے ہوئے کہا۔ "وہ بازار میں نہیں بیٹھی ہے۔"

"پر کیا وہ کسی گھر نے نہیں جا سکتی؟"

"تم تم کیا کہہ رہے ہو دادا؟"

"اپن ٹھیک ہی بول رہا ہے۔"

"دادا! مجھے تجمل بھائی سے بات کرنے دو۔" میں نے فریاد کی۔ "گاڑی رکوا دو۔"

"کانتے اور دادا بڑے نواب کو ہاں کے آیا ہے کہ ہم لوگ ابھی خانم کے ساتھ آؤ دوا آتا ہے۔"

"نہیں نہیں یہ ٹھیک نہیں ہے دادا، ضروری نہیں کہ تجمل بھائی کا ہر فیصلہ درست ہو۔ مجھے ان سے بات کرنے دو۔ ایسا کوئی قدم اٹھانے سے پہلے ہر پہلو پر سوچ سمجھ لینا چاہیے۔ یہ نواب لوگ ہیں، تم نے انھیں خوب دیکھ لیا ہے۔ ان کے دل پتھر کے ہیں۔ اپنی غرض کے سوا انھیں کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ دو آدمیوں کو بالا قدروں کی طرح قید رکھ سکتے ہیں۔ اصطبل میں گھوڑوں کے ساتھ باندھ دیتے ہیں۔ ایسا ہی ہے تو آج کوئی باقاعدہ بات کیے بغیر.... اور یہ سب کچھ تو بعد میں بھی ہو سکتا ہے۔ فی الحال ہمیں یہاں سے نکلنے پہ توجہ دینی چاہیے۔" میں نے عاجزی سے کہا۔ "اور خانم، دادا! وہ اب تمھاری بیٹی ہے اور وہ تو پیرو کے لیے بھی کسی طرح کم نہیں ہے۔"

"پر وہ استاد کا بھی تو کچھ لگتا ہے۔" پیرو نے جواب میں تلخی سے کہا۔ "اس نے خانم سے بات کر لیا ہے۔"

"خانم ان کے سامنے کیا بول سکتی ہے۔ یہ تو جانے سوچنے کا کام ہے۔ چھوٹے نواب کا حال ٹھیک نہیں ہے تو کیا خانم کو اس پر قربان کر دینا چاہیے؟ خانم دل سے اس پر تیار نہیں ہوگی۔ مجھے یقین ہے وہ کبھی وہاں جانا نہیں چاہے گی۔ میں جانتا ہوں اسے اپنی موجودہ زندگی عقیدت کی حد تک عزیز ہے۔"

"اپنی کرچتہ ہے پرجانی... وہ کسمسا کے رہ گیا۔
"پھر کیا، کیا؟" میں نے وحشت سے کہا۔ "تم مجھے کیوں نہیں رہے ہو؟
اُس وقت کی بات دوسری تھی جب ہم نواب کے قبضے میں تھے اور وہ تم تھے جس نے خانم کا پتہ بتانے سے انکار کر دیا تھا اور بدلے میں سلاخوں کے پیچھے قید قبول کر لی تھی۔ جمیل بھائی کو کوئی اور راستہ نہ دیکھ کے اُسے بلانا پڑ گیا۔ ٹھیک ہے مگر اب تو ایسی کوئی مجبوری نہیں ہے۔ اب کیا بات ہے؟ یہاں پہنچنے سے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ پہلے ہی کیا کم ہوا ہے۔"
"سوچو دادا! میری بات ذرا دھیان سے سن لو۔ تم کون ہیں نواب کون ہے خانم کون ہے۔ آدمی کے حوالے شکل سے ملتے ہیں۔ خوب خوب جانتا ہے ہمارا تعلق اڈے سے ہے۔ وہ ہیں بھی اس طرح کی حیثیت... میری والد بانپ رہی تھی نہ خانم کر... مگر تم نے ان جمیل بھائی کے انداز سے غلط ہو گئے خیالات تو ہو سکتے ہیں۔" "تو پھر؟ ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔ اس کام کے لیے یہ وقت کسی طور موزوں نہیں۔" ہیرو کی بے بسی دیکھ کے میرے جسم میں کھولن سی ہونے لگی۔ گاڑی اپنی رفتار سے چل رہی تھی۔ کتنے اور زور ابھی مجھے جمیل کا واسطہ دے کے خاموش رہنے کی تلقین کرنے لگے۔ وہ میری بات سننے کی کوشش کر رہے تھے نہ سمجھنے کی۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں ہیرو سے بازو چھڑا کے نیچے اترنے کے لیے لپکا۔ ٹرام کی رفتار اتنی تیز نہیں تھی کہ میں اتر نہ سکتا۔ آگے کچھ ہی فاصلے پر دوسری ٹرام چل رہی تھی۔ میں تیز رفتاری سے درمیانی فاصلہ عبور کر کے اُسے آسانی سے پکڑ سکتا تھا۔ مجھے ہر حال جمیل سے بات کرنی چاہیے تھی۔ میں اس سے کہنا چاہتا تھا کہ اگر اس کی یہی منشا ہے تو نواب کے پاس جانے کا یہ طریقہ مناسب نہیں ہے۔ مگر ٹرام میں آغا جان اور وزیر علی بھی بیٹھے تھے۔ خانم بھی تھیں۔ نجو کو پہچان لیا تھا ہی تھا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ مجھے نواب کی حویلی آجانے سے پہلے اُسے روک لینا چاہیے۔ مگر آغا جان اور وزیر علی کے سامنے کچھ کہنا مناسب نہیں تھا تو میں جمیل سے چند لمحے تنہائی کی درخواست کر سکتا تھا۔
یقیناً اس نے فیصلہ کرنے میں عجلت کی ہے۔ مجھے اس سے اتنا ہی کہنا تھا۔ اس کے بعد اس کی جو مرضی۔ لیکن میں نے پائدان پر قدم ہی رکھا تھا کہ کوتنے نے جھپٹ کے میری کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ ٹرام زیرو زبر ہو گئی تھی۔ ہیرو نے میرا بازو کھینچ کے مجھے پھر نشست پر دھکا دے دیا۔ "دادا! میری بات سنو۔" میں نے ٹوٹی ہوئی سانسوں سے کہا۔ "جو ختم ہو گیا ہے اُسے دوبارہ کرید کر چھیڑنا کون سی ہوشمندی ہے پھر کوئی بگاڑ ہو سکتا ہے اور یہاں کوئی ایک آدمی نہیں ہے۔ سبھی کسی نہ کسی طرح ملوث ہو جاتے ہیں وہ دو سے لوگ ہیں دادا! تم تو انھیں بہت قریب سے دیکھ چکے ہو۔ جمیل بھائی جانے کیا سمجھ رہے ہیں۔ نواب عالم اب کا۔ یہ وقت تو کسی نہ کسی طرح گزر جائے گا مگر اس کے لیے..."
"استاد اس کو دیکھ کے آیا ہے میاں، اور تو جھوٹا ہے تو وہ نواب کا بیگم اور یہی آگے کیا بولتا تھا۔"
"مجھے یاد ہے لیکن وہ جلدی یاد رہیں ٹھیک ہو جائے گا۔ اب تک بھی وہ زندہ ہی ہے۔"
"اس کو ایسے ٹھیک ہونا ہوتا تو کبھی کا ہو جاتا راجا!" ہیرو زہرخند سے بولا۔ اس کی آنکھوں میں گہری چمک آگئی تھی شعلوں جیسی سرخی۔ "اپن اُدھر کوئی جاگیر لینے نہیں جا رہے سالا۔ بعد کو ہم بھی ادھر ہی ہے کبھی آدمی ایسے ٹھیک نہیں ہوتا۔ الو تو کبھی ایسا ہوتا ہے۔ ابھی تیشہ دیکھ کے نہیں آیا ہے، وقت کی کیا بات کرتا ہے۔ سالا کبھی بھرتا ہے تو اتنا ہی اُبھر کے آجاتا ہے۔ ابھی بیچ بھاگ کے اپنے سے بولا وقت تو تو نے بھی کم نہیں لیا ہے۔" اس کی نگاہیں مجھے اپنے جسم پر چبھتی محسوس ہو رہی تھیں۔ میں گنگ بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ ہیرو نے پھر سر جھٹک لیا اور تھکی ہوئی آواز میں بولا۔ "اپنی زبان بھی نہیں سمجھتا کیا؟"
ہیرو کا ایک ایک لفظ میرے سینے میں کسی خنجر ہی کی طرح اُتر رہا تھا۔ "بول نہ۔" وہ مجھے جھنجوڑ کے بولا۔ "چپ کیوں ہو گیا؟"
میں نے اُسے کوئی جواب نہیں دیا۔ جواب دینے کو یاد ہی نہیں تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں اُس کے سامنے ننگا ہو گیا ہوں۔ ہیرو نے میرا سر اپنے سینے سے لگا لیا اور مجھ سے جانے کیا کیا کہتا رہا۔ میں نے شاید کچھ بھی نہیں سنا۔ میں اُس کے آگے ہاتھ جوڑنا چاہتا تھا لیکن مجھ سے یہ بھی نہ ہو سکا۔ میرا سارا جسم پسینے میں ڈوب گیا تھا۔
مجھے نہیں معلوم، ٹرام کتنی دیر تک چلتی رہی۔ جب لڑکی تو ہٹ نے میرے گھٹنے پر تھپکی دے کے مجھے اُٹھنے کا اشارہ کیا۔ ٹرام سے مجھے رک کے پھر چل پڑی۔ وہ بڑے نواب کی حویلی کا دروازہ تھا۔ ہم نے کل رات ہی اُسے عبور کیا تھا۔ دروازے کے اطراف روشنیاں جل رہی تھیں۔ کل کے مقابلے میں بہت زیادہ۔ بڑا دروازہ فوراً کھول دیا گیا تھا۔ باہر کئی آدمی ہمارے انتظار ہی میں کھڑے تھے اور ان کی آوازوں سے باہر چھایا ہوا سکوت تھوڑی دیر کے لیے درہم برہم ہو گیا تھا۔ دروازے سے عمارت تک روشوں کے درمیان گزرگاہ میں فاصلے فاصلے سے مجھے کئی آدمی مستعد کھڑے نظر آئے۔ ٹرام خاص کاریڈور میں جا کے ٹھہری اور میں نے عمارت کی سیڑھیوں پر بڑے نواب کی جھلک دیکھی۔ وہ ٹرام ٹھہرتے ہی ہماری جانب لپکا۔ ہیرو نے میرا ہاتھ بڑے زور سے تھام رکھا تھا۔ اس نے مجھے کھینچ کے اُٹھایا۔ میں ہڑبڑا کے نیچے اُتر آیا تھا اور میں نے خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی لیکن میرا دل اندر ہی اندر جیسے کٹ رہا تھا۔ زمین پر آگے ہیرو نے ایک بار میری

جانب جھلکتی آنکھوں سے دیکھا تو میرا سارا وجود لرزنے لگا۔ اُس کی نگاہوں میں خفت اور یاسیت کی آمیزش تھی جیسے اس نے سب غلط کیا تھا اور میں نے غلط سُنا تھا۔ میرے جی میں آئی کہ میں وہیں سر پھوڑ لوں یا اُس کے پاؤں پکڑ کے التجا کروں۔ والٹا! بس کرو۔ مجھے جو چاہے سزا دے دو مگر میں کسی بخشش اور درگزر کا اہل نہیں ہوں۔ میں اپنے سوا واقعی کسی کو نہیں پہچانتا۔ اپنے سوا میں سب کے لیے لوزان اور چلنے رکھتا ہوں۔ میں بہت وحشی ہوں۔ مجھے میری اوقات ہی کے مطابق سلوک دو مگر شاید اس سے بڑی ذلت کوئی نہیں ہوتی کہ آدمی اپنی ہی نظروں میں ارزاں ہو جائے۔ پیرو مجھے کھینچتا ہوا چند قدم آگے بڑھ گیا۔ وہاں آگے والی قدم کھڑی تھی۔ پیرو کو مجھے کھینچنے گھسیٹنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اب میرے لیے مگر تلافی کا کوئی گوشہ بچا تھا تو یہی کہ میں خانم کا ہاتھ تھام کے اسے خود اندر لے جاؤں۔ ہر چند اب اس سے بھی کیا فرق پڑتا تھا۔ پیرو کو مجھ پر بہت رحم آتا یا بہت ہنسی آتی۔

تجمل کے اُترتے ہی بڑے نواب نے اُس کے ہاتھ چوم لیے۔ اُس کی آنکھیں جل سی رہی تھیں۔ لمحوں تک وہ تجمل کے سامنے اس کے ہاتھوں میں ہاتھ پیوست کیے گم کھڑا رہا، پتھر کی مورتی کی طرح اور اس کے ہونٹ مسلسل سسکتے، پھڑکتے رہے۔ سفا ابا جان درمیان میں آ گئے۔ اُسے کچھ احساس ہوا اور اس نے حواس باختہ انداز میں چبوترے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ خانم بھی منیر علی کے پیچھے پیچھے اتر گئی تھی۔ برقع پوش خانم کو دیکھ کے اُس کی حالت اور اضطراری ہو گئی۔ تجمل نے چبوترے کی سیڑھیاں آہستہ آہستہ طے کیں اور اس کے ساتھ ہم سب نے۔ نواب سب سے پہلے تیزی سے اُوپر چلا گیا تھا۔ چبوترے کے سائبان میں سامنے چراغ روشن تھا۔ نواب کی پیروی میں ہم بھی اندر داخل ہو گئے۔ منیر علی خانم کا سایہ بنے ہوئے تھے۔ کمرے میں آ کے نواب کے اوسان کچھ درست معلوم ہوتے تھے۔ اُس نے جھلملاتی نظروں سے باری باری ہمیں دیکھا۔ جیسے ہی اس کی نظر پیرو پر گئی، اُس کی آنکھیں پھیل گئیں اور وہ کسی توقف کے بغیر جھجکتی ہچکیوں اور دست پٹاتے قدموں سے پیرو کے پاس آیا اور اس سے پہلے کہ اُس کے لرزیدہ ہونٹ کچھ کہتے، پیرو نے اُس کے شانے پکڑ لیے۔ "ابھی کچھ نہیں بولنا نواب صاحب!" وہ دہکتی آواز میں بولا۔

"ہم ہم آپ سے...." نواب کا گلا رُندھنے لگا۔

"بعد میں بہت وقت پڑا ہے۔"

کل رات ہم اُس کی بندوق کی باڑھ پر تھے اور گولی چلنے میں بس کسی لمحے کی کسر رہ گئی تھی۔ یہی نہیں کل رات تو وہ بھی ہماری زد پر تھا اور ہم نے اُس کی گردن پر دباؤ ڈال کے اسے بے بس کر دیا تھا۔ پیرو نے آنکھیں میچ لیں اور گھٹتی ہوئی آواز میں بولا۔ "ابھی اپنی دھڑکن رہنے دیجیے۔"

نواب نے بے تابانہ اُس کے ہاتھ پکڑ لیے اور انھیں آنکھوں سے چومنے لگا۔ میں پیرو کے پاس ہی کھڑا تھا۔ وہ جیسے ہی مقابل آیا تو میری آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا۔ میں نے اسے نہیں دیکھا۔ سر جھکایا کیونکہ اُس کے چہرے سے دھواں سا اٹھ رہا تھا۔ چند لمحوں تک وہ بت سا بنے بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ اُس کی تیز تیز سانسیں جیسے کانوں میں دھمکتی رہیں۔ اچھا ہی ہوا کہ لمحے بھر میں وہ میرے سامنے سے ہٹ گیا اور مجھے جیسے کوئی پہاڑ سا بوجھ اتر گیا۔ وہ مجھ سے کچھ کہتا تو معلوم نہیں جواب میں میرے منہ سے کیا نکل جاتا۔

کمرے میں وہ اکیلا تھا۔ حویلی کا کوئی ملازم یہاں تک کہ خاص مما بھی موجود نہیں تھے۔ وہاں ہر جانب دیواروں کے ساتھ صوفے لگے ہوئے تھے لیکن ہم سب کھڑے رہے۔ نواب نے ہم سے مسند پر بیٹھنے کو کہا۔ تجمل کے قریب جا کے وہ جیسے کہیں کھو گیا تھا۔ اُس کی نگاہیں بار بار کبھی خانم کی جانب اٹھتی تھیں کبھی میری اور پیرو کی جانب۔ چند ثانیوں کے لیے کمرے پر سناٹا چھایا رہا۔ آخر تجمل کی آواز پر یہ وحشت انگیز خاموشی ٹوٹی۔ "ابھی اپنی بات تھوڑا دھیان سے سُن لو نواب صاحب!" اس کے اچانک تخاطب پر نواب اچھل سا گیا تھا۔ "ہم آ گئے ہیں۔" تجمل نے بڑے ہر طور سے ٹوٹے لہجے میں کہا۔ نواب زرخشتی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ "ادھر سے اپنے جانے کے بعد آپ کا کوئی آدمی اور اس کا کوئی سایہ بھی اپنے گروہ کی نئی پرچھائیں پڑ جاتا تو اپنا دوبارہ آنا مشکل ہو جاتا۔" نواب نے کچھ کہنا چاہا مگر تجمل نے اسے کچھ نہیں کہنے دیا۔ "خانم کسی اور ڈھنگ سے نہیں اپنے گھر سے آئی ہے۔ وہ گھر آپ کے گھر جیسا بڑا نہیں ہے لیکن کسی طرح کم بھی نہیں ہے۔ آپ نے اس بیچ کچھ جان لیا ہوگا کہ گھر اونچی دیواروں سے بڑا نہیں ہوتا، اُس کے مکین اور ہوتے ہیں۔"

"ہم نے بہت کچھ جان لیا ہے ہم نے...." نواب جذباتی آواز میں بولا۔ "از راہِ کرم اب ہم سے کچھ نہ کہیے۔"

"ہم کو زیادہ نہیں بولنا۔ بس اتنا ہی کہ ابھی آپ کچھ اور مت سمجھنا۔ رولی ہر چیز نہیں گھٹی۔"

"یہ تو آپ اُس سے کہیں جس کے پاس بولی لگانے کے لیے کچھ ہو۔ ہمارے پاس تو شاید یہی آنسو...." نواب نے منہ چھپا لیا۔ "ہم آپ سے بہت بہت...." اس کی آواز بھرانے لگی۔

"خانم اپنی امانت ہے نواب صاحب!"

"یہ بوجھ سر کا تاج ہیں۔" نواب تیزی سے بولا۔ "ہم اپنی عزت کی قسم کھاتے ہیں بشرطیکہ آپ کی نظروں میں اس کی کوئی گنجائش باقی رہی ہو۔ ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ہم نے زندگی محض ضائع کی ہے اور کچھ بچا ہے تو یقین کیجیے آج ہی جانا ہے۔"

"ابھی اتنا مت بولو نواب صاحب!" تجمل نے بجھے سے لہجے میں کہا۔ "خانم کو اندر لے جاؤ۔"

نواب ایک لمحے کے لیے سُن سا ہو گیا لیکن جیسے اُسے دیر میں آواز آئی ہو۔ اُس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں آگے بڑھ کے خانم کے سر پر ہاتھ رکھا۔ "آپ نے ہم پر بڑا کرم کیا۔ اس گھر پر آپ نے بہت احسان کیا۔" اُس نے بہ مشکل نم آلود سر جھکا کے بے اختیار خانم کے برقع کو چھو کر بوسہ دیا۔

تجمل نے مضطرب نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "لاڈلے! آپ کو اندر لے جا۔"

میں نے سُن لیا تھا لیکن جیسے پیر منجمد ہو گئے تھے۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ پیچھے سے پیرو نے مجھے آگے دھکیل دیا۔ خانم کے قریب آ کے دل کی دھڑکن جیسے بند ہو گئی تھی۔ اسی لمحے نواب نے شرکی کر کے ہاتھ رکھ کے اندر کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ میں نے سر اُٹھا کے تجمل کی طرف نگاہ کی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ نواب اور خانم چند قدم آگے بڑھ گئے تھے۔ میں نے دھڑکتے قدموں سے ان کا اپنا فاصلہ طے کیا۔ دروازے پر پہنچ کے مجھے کچھ تقویت ہوئی کہ منیر علی بھی میرے ساتھ ہیں۔ اندر نیم روشنی تھی۔ یہ ایک کشادہ اور لمبی چوڑی دالان جیسی جگہ تھی۔ یہاں سے گلیوں جیسے متعدد راستے نکلتے تھے اور تا حد فاصلے دروازے بنے ہوئے تھے۔ یہ وہ جگہ نہیں تھی جہاں سے ہم کل رات گزرے تھے اور داخل ہوتے ہی ہمیں وہاں کئی ملازم نظر آئے اور سب سے بائیں ہاتھ کے انتہائی جانب دروازے کے پاس بکھری کھڑی ہوئی کئی عورتیں ہمیں دیکھ کے دست بستہ ہو کے کمرے میں چلی گئیں۔ ملازم جہاں جہاں موجود تھے اپنے قدموں چل کے دیواروں کے ساتھ جم گئے۔ میں خانم کے پہلو بہ پہلو تھا اور میرا سارا جسم سُن سا رہ گیا تھا۔ برقع میں ہونے کے باوجود میں نے محسوس کر لیا تھا کہ خانم پر ارتعاش طاری ہے۔ میں نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ خانم کا ہاتھ برف کے مانند سرد تھا۔

نواب کی رفتار تیز تھی۔ ہم ابھی ہال کے وسط میں تھے جہاں عورتیں اندر گئی تھیں، وہاں سے چوڑیوں کی کھنکھناہٹ اور لپکتے قدموں کی سرگوشیاں سنائی دیں۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ نواب سیدھا اسی دروازے کی طرف بڑھا۔ منیر علی اندر وہیں رک گئے تھے۔ ہمیں اندر داخل ہوتے ہی جھجک سی ہوئی مگر خانم کی انگلیوں کا دباؤ میرے ہاتھ پر بڑھ گیا تھا۔ اُدھر نواب نے منتشر لہجے میں ہم سے اندر چلنے کی درخواست کی۔

وہاں کئی عورتیں دروازے کے پاس ہی کھڑی تھیں۔ باندیاں اور گھر کی عورتیں ہمیں آتے دیکھ کے وہ ایک طرف ہٹ گئیں لیکن نواب کی آواز پر ٹھٹک کے رہ گئیں۔ "بیگم صاحبہ! خانم آ گئی ہیں! خانم آ گئی ہیں بیگم!" نواب کی پھٹتی آواز گونجی تو ایک شور سا برپا ہو گیا۔

جو عورت ایک جانب سے دوپٹا سنبھالے دیوانہ وار سسکتی جھجکتی ہوئی آئی تھی وہ مجھ سے قریب عالم شباب کی بیگم تھی۔ میں اسے پہلی جھلک میں پہچان گیا۔ اُس کے ساتھ نواب کی بہن بھی تھی۔ سفید پاجامے اور نیلے کرتے میں ملبوس ان دونوں کی آنکھوں میں بجلیاں سی کوند رہی تھیں اور چہروں پر آگ سی دہک رہی تھی۔ میں نے خانم کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ نواب کی بیگم اور بہن نے بے تابانہ خانم کو سینے سے لگا لیا۔ خانم اُن کے ساتھ آگے چلی گئی تھی اور نواب بھی۔ میں اور منیر علی وہیں خاموش کھڑے سب کچھ دیکھتے رہے۔ وہ جیسے ہماری موجودگی بھول گئے تھے۔ میں نے دل ہی دل میں منیر علی کی طرف دیکھا ہی تھا کہ ایکا ایکی سامنے کوئی چھپاکا سا ہوا۔ وہ نواب کی بہن تھی۔ اُس نے پاک و پیچھے مڑ کے مجھے جلدی سے آداب کیا۔ اُس کے ہونٹ لرز رہے تھے اور رخساروں پر شفق پھوٹ رہی تھی۔

میں اُسے دیکھتا رہ گیا۔ اس سے پہلے کہ میں اُسے جواب دیتا، وہ باندیوں کے جھرمٹ میں اوجھل ہو گئی تھی۔

دوسرے کمرے میں ہم تنہا رہ گئے۔

منیر علی نے جھپکتی پلکوں سے میری جانب دیکھا۔ انھوں نے مجھ سے کچھ پوچھا نہیں تھا۔ میں نے خود انھیں بتایا کہ وہ نواب کی بہن تھی۔

"میں سمجھ گیا تھا۔" وہ متذبذب سے بولے۔ "وہ نواب کی بہن یا بیٹی ہی ہو سکتی ہے۔ ماشاء اللہ بالکل کسی شہزادی کے مانند ہے۔"

منیر علی غلط نہیں کہہ رہے تھے۔ اُس رات حویلی کے تہہ خانے میں جب وہ اور چھوٹے نواب کی بیگم چھپتی چھپاتی ہوئی پیرو سے ملنے آئی تھیں تو صرف ان کے چہرے کھلے تھے، بدن چادروں میں لپٹے ہوئے تھے۔ رات کا وقت تھا اور وہاں روشنی بھی کم تھی لیکن ان کے رنگ روپ، نقش و نگار، قد و قامت اب دیکھ کے اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ سراپا حوروں جیسی ہوں گی۔ میں نے انھیں چند لمحے پہلے چھوٹے نواب کی بیگم کو بھی دیکھا تھا جسے بڑے نواب گیتی کے نام سے پکار رہے تھے اور جو خانم کو دیکھ کے بے قرار ہو گئی تھی۔ اُس کے سراپا کی یہ تصویر میرے تصور سے اتنی مختلف نہیں تھی اور اگر تصویر کچھ دھندلی بھی تھی تو اب روشن ہو گئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کا عکس نظر آتی تھیں۔ عمروں میں بھی ان میں زیادہ فرق نہیں ہوگا۔ لباس بھی انھوں نے ایک جیسا پہنا ہوا تھا۔ چوڑی دار پاجامے، لمبے گھیر دار منقش کرتے، ہرے دوپٹے، کانوں میں ہلکے بندے اور کلائیوں میں طلائی چوڑیاں۔ البتہ اُس رات وہ بہت سا زیور پہنے ہوئے تھیں

غالباً اس لیے کہ کہیں ہم کوئی مطالبہ نہ کر بیٹھیں۔

سب اندر چلے گئے تھے۔ اندر سے سٹ پٹاتے قدموں اور بڑبڑاتی سرگوشیوں کا شور کچھ دیر سنائی دیتا رہا پھر خاموشی چھا گئی۔ وہ ہم سے اور دُور چلے گئے تھے ہمارا خیال تھا کہ اندر سے کوئی آ کے ہمیں پوچھے گا لیکن لمحے گزر گئے اور کوئی نہیں آیا تو منیر علی نے واپسی کا ارادہ کیا۔ کمرے کا دروازہ عبور کر کے ہم اُسی کشادہ ہال جیسے دالان میں آ گئے جہاں سے گلی جیسے متعدد راستے نکلتے تھے۔ دالان میں داخل ہوتے ہی میری نظر سب سے پہلے خاں صاحب پر پڑی۔ وہی شخص جو تھانے میں ہمارا نجات دہندہ بن کر آیا تھا اور جس نے ہمیں ایک زنداں سے نکال کر دوسرے زنداں میں ڈال دیا تھا۔ یہاں حویلی میں قدم رکھتے ہی اُس کا رنگ گرگٹ کی طرح بدل گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر پہلے تو خاں صاحب کا جسم اکڑ سا گیا مگر دوسرے ہی پل وہ بے تابی سے میری طرف بڑھے "میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔" وہ بدحواسی سے بولے۔

صرف اتنی سی بات تھی۔ بجّن کے بقول کتنی آسانی سے اُنہ کہہ دیا گیا تھا۔ میرے جی میں آئی کہ اُلٹے ہاتھ کا طمانچہ رسید کروں، کم از کم تجسّس تو ابھر آ جائے۔ اس کی عاجزی پر میرے سینے میں آگ سی بھڑک اُٹھی تھی۔ میرے اور بیرو کے جسم پر ابھی تک اُن بیدوں کے نشانات ہوں گے جو یہاں حویلی میں ہم پر برسائے گئے تھے۔ ہمیں اصطبل کی غلیظ کوٹھری میں رکھا گیا تھا۔ منیر علی پاس کھڑے تھے۔ میں نے بہت ضبط کیا اور ہونٹ بھینچے چپ کھڑا رہا۔

"میں... میں آپ سے کیا کہوں۔" خاں صاحب اضطراری لہجے میں بولے "یوں سمجھیے کہ ایک غلام نے محض اپنے آقا کے حکم کی تعمیل کی تھی۔ اس میں غلام کی کوئی غرض شامل نہ تھی اور آقا بھی اپنی جگہ بہت بے بس تھے۔"

میں نے اُس سے نہیں کہا کہ وہ آدمی سے اچانک کیسا وحشی بن گیا تھا۔ اُس نے ہماری کوئی بات سننی گوارا نہیں کی تھی۔ ہم نے اُسے کتنے واسطے دیے تھے، کیسی فریاد کی تھی۔

"جانے بھی دیجیے۔" منیر علی نے اضطراب سے کہا۔ "یقیناً آپ کا کوئی قصور نہیں تھا۔ قصور شاید کسی کا بھی نہیں تھا۔ جو وقت اللہ نے اچھا بُرا مقدر میں لکھ دیا ہے، اُس سے نمٹنا تو بہرحال لازم ہے۔"

خاں صاحب کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں، ہونٹ پھڑپھڑا رہے تھے۔ یکایک وہ میرے سامنے ہاتھ باندھ کے کھڑے ہو گئے۔ "یقین کیجیے میں نے آپ سے زیادہ عمر گزاری ہے مگر خود کو کبھی اتنا پست محسوس نہیں کیا۔ سب کچھ صحیح ہے لیکن... لیکن سب کچھ بہت غلط اور شرمناک حد تک ناروا تھا۔ میری درخواست ہے کہ آپ اِس مجرم کے لیے ضرور کوئی سزا تجویز فرمائیے تاکہ اس کی نجات کی کوئی صورت بن سکے۔"

"جانے اب آپ، اب آپ..." الفاظ میرے حلق میں گُھٹ گئے۔

"چھوڑیے بھی، رات گئی بات گئی۔ بُری گھڑیاں یاد رکھنے سے اذیت اور سوا ہوتی ہے۔" منیر علی نے اُن کی کمر تھپکتے ہوئے کہا۔ "آئیے اندر بیٹھتے ہیں۔ میں وضو کرنا چاہتا ہوں۔"

"ضرور ضرور۔" خاں صاحب مستعدی سے بولے۔ "میرے ساتھ تشریف لائیے۔" مڑتے مڑتے اُنھوں نے مجھے گلے لگانے کی کوشش کی۔ میں بے اختیار پیچھے ہٹ گیا۔ خاں صاحب نے میرے ہاتھ پکڑ لیے اور اُنھیں سینے پر رکھتے ہوئے بولے۔ "ہو سکے تو اپنے گناہ گار کو بخش دیجیے۔" اُن کی آواز بھرّا رہی تھی۔ میں سر جھکا کے رہ گیا اور منیر علی کو وہیں چھوڑ کے آگے بڑھ گیا۔

سارا دالان روشن تھا۔ خانم کو لے کے ابھی ابھی میں یہاں سے گزرا تھا لیکن اب مجھے اپنا کچھ ہوش نہیں تھا۔ اندازے سے میں کھلے دروازے کے ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔ ابا جان، بجّن، کاتے، زورا اور بیرو وہیں موجود تھے۔ سب کھوئے کھوئے، ایک دوسرے سے بیگانہ مخملیں صوفوں میں دھنسے ہوئے تھے۔ میرے آنے پر سبھی نے چونک کر مجھے دیکھا۔ بجّن نے ہاتھ بڑھا کے مجھے اپنے پاس بلا لیا۔ "دھواں کیوں دے رہا ہے رے؟" اُس نے بوجھل آواز میں مجھ سے پوچھا۔

"کچھ نہیں، بس وہ اِدھر، اُدھر..." مجھے بروقت احساس ہو گیا۔ اُسے پریشان نہ کرنے کے خیال سے میں نے خاں صاحب کا نام نہیں لیا۔

"اِدھر کوئی بھوت تھا رے؟"

"نہیں۔" میرے مُنہ سے نکل گیا۔ "اُس طرف ایک جنگلی تھا۔"

وہ سیدھا ہو گیا اور اُس کی گھورتی نظریں مجھ پر مرکوز ہو گئیں۔ "کیا ہے لاڈلے!"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے ترشی سے کہا۔

اُس نے مجھ سے حجت نہیں کی اور صوفے کی پشت سے سر لگا کے گہری گہری سانسیں بھرنے لگا۔ کمرے میں ملازمین مسلسل آ جا رہے تھے۔ اُنھوں نے اگربتی جیسی کوئی چیز سلگا دی تھی

ہر طرف بھینی بھینی خوشبو رچ گئی تھی جیسے ہوا میں گلاب گھول دیے گئے ہوں۔ ساری کھڑکیاں کھول دی گئی تھیں اور اُن پر پڑے ریشمی پردے ہوا کے جھونکوں سے سرسرا رہے تھے۔ ملازموں نے کمرے کا بڑا فانوس روشن کر دیا تھا اور درمیانی میز پر مختلف قسم کے مشروبات، خشک میووں کی طشتریاں اور پھلوں کے طشت کے علاوہ ایک بڑا خاص دان بھی لا کے سجا دیا تھا۔ بیرو نے خاص دان کھول کے دیکھا۔ وہ چاندی کے اوراق میں لپٹی ہوئی گلوریوں سے بھرا ہوا تھا۔ بیرو نے ایک گلوری اٹھا کے مُنہ میں رکھ لی اور اُس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "بجّن بھائی!" وہ خاص دان اٹھائے لپکتا ہوا بجّن کے پاس آیا۔ "ابھی ذرا سی کوتے دبا کے دیکھو۔ قسم سے ایک دم سالا پھول سا ٹک مُنہ میں گھل گیا ہے۔"

بجّن نے بھی گلوری مُنہ میں رکھ لی۔ بیرو اس طرح خاص دان بڑھائے ہوئے تھا جیسے کوئی عجوبہ ہاتھ آ گیا ہو۔ وہ زورا، کاتے اور ابا جان کو گلوریاں کھلاتا میرے پاس بھی آ گیا۔ میرا جی بڑا اُڑا سا تھا۔ میں بجّن کے کہنے پر خانم کو اندر پہنچا آیا تھا لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ طرح طرح کے سوال میرے ذہن میں بھٹک رہے تھے۔ یہاں سے واپسی کے بارے میں، خانم کے بارے میں، ابا جان کی خریدی ہوئی حویلی کے بارے میں۔ بے شک اب پولیس کی گرفت اور اڈّے کے کسی آدمی کے سبب راہ میں رکاوٹ پڑنے کا امکان نہیں رہا تھا۔ جس شخص کی وجہ سے پولیس کے حرکت میں آ جانے کا اندیشہ یا اڈّے کے آدمیوں کے بہک جانے کا احتمال تھا، ہم اُس کے گھر میں بیٹھے تھے۔ اب بظاہر کوئی گرہ باقی نہیں رہی تھی لیکن راستے صاف ہونے سے مراد اس شہر سے رہائی تو نہیں تھی۔ ممکن ہے بجّن نے روانگی کے بارے میں اپنے طور پر کچھ نہ کچھ طے کر رکھا ہو۔ میں نے اُس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی مگر اُس پر کھنچی ہوئی آڑی ترچھی لکیروں کے سوا مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔ اُس کی نیم وا آنکھیں سوئی ہوئی تھیں، کئی راتوں سے وہ جاگ رہا تھا اور شب و روز لوگوں کے درمیان بندھا بیٹھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اب صوفے پر اُس کا جسم گر گیا۔ بکھرا بکھرا لگتا تھا۔ شاید اُسے بھی آگے کا کوئی اندازہ نہیں تھا اور نہ اُن میں سے کسی اور کو۔ اُن کے چہروں پر اضطراب آمیز سکون چھایا ہوا تھا۔ وہی سکون جو کوئی منزل تمام کر لینے کے بعد ممکن ہوتا ہے اور وہی اضطراب جو کوئی منزل طے کر لینے کی بے یقینی سے ہوتا ہے۔ وہ چونکنے کے انداز میں بار بار ایک دوسرے کے چہرے دیکھتے تھے اور اپنے آپ میں کھو جاتے تھے۔ اُن میں سے کسی کو کوئی جلدی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ نہ بیرو کو اپنی بیوی اور بیٹی سے ملنے کی کوئی جلدی تھی، نہ ابا جان کو فرخ، فریال، فارعہ اور اکبر کو دیکھنے کی۔ جو بمبئی میں ایک اجنبی کے گھر نہ جانے کب سے اُن کی راہ تک رہے ہوں گے۔ پھر مجھے ایسی جلدی کیا ہے؟ وہ بھی اسی کشتی میں سوار ہیں۔ ایک مجھی پر یہ وحشت کیوں طاری ہے۔ کیا میں اُن سے زیادہ دیکھتا اور سُنتا ہوں یا مجھے اُن سے کم دکھائی اور سُنائی آتا ہے۔ اُنھوں نے تو مجھے نہیں ٹوکا تھا لیکن میں خود اپنے سامنے تو موجود تھا۔ بے شک کبھی ایسے لمحے بھی آتے ہیں جب آدمی اپنی ہی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ یقیناً اُن سب کا یہ سکوت اطمینان کی کوئی کیفیت تھی کہ اب اُنھیں بہرحال گھر ہی جانا ہے سو دیر سویر سے کیا فرق پڑتا ہے۔ مجھے فرخ، فریال، فارعہ اور اکبر سے دُور ہوئے تو برس سے اوپر ہو چکے ہیں تو اب چند دنوں، چند ہفتوں میں کیا رکھا ہے۔ وہ کون سے میرے منتظر ہوں گے۔ اُنھوں نے تو اپنی دانست میں کب کی اپنے بھائی پر مٹی ڈال دی ہو گی۔ مُردوں کا انتظار کون کرتا ہے اور ابھی خانم کو اِس گھر میں آئے دیر ہی کتنی ہوئی ہے جو مجھے روانگی کی بے کلی شروع ہو گئی۔ اچھا ہی ہوا جو میرا عندیہ ابھی تک مخفی رہا ورنہ بجّن مجھ پر بہت ناراض ہوتا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ خانم کو یہاں چھوڑ دینے کے بعد ہم اپنے راستے پر چل پڑیں۔ خدا کرے نواب عالم تاب جلد ٹھیک ہو جائیں۔ خانم کے آنے کا کوئی نتیجہ نکلے۔ کوئی کسی کا اتنا ہی طلب گار ہو سکتا ہے۔ کسی کے لیے اتنا ہی ویران... میں بھول گیا۔ ابھی راستے میں بیرو نے مجھے کیا طعنہ دیا تھا کہ میری آنکھیں اپنے سوا کسی کو کیوں نہیں دیکھتیں۔ ابھی راستے میں اُس نے میرے مُنہ پر طمانچہ مارا تھا۔

بیرو نے خاص دان میری طرف بڑھایا تو ایک گلوری میں نے بھی اٹھا لی۔ اُس نے بالکل سچ کہا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے مُنہ میں پھول کھل اُٹھے ہوں، گلاب کے پھول۔ میں نے زندگی بھر ایسا پان نہیں کھایا تھا۔ زرّین نے گھر میں پان دان کا خاص اہتمام کیا تھا۔ پان کا شوقین وہاں کوئی نہیں تھا لیکن زرّین کا کہنا تھا کہ پان دان کے بغیر گھر سُونا سُونا محسوس ہوتا ہے۔ وہ بھی بہت نفیس پان بناتی تھی مگر اس پان کی لذت ہی کچھ اور تھی۔ نہ ایسی تیز خوشبو کہ جی لوٹ جائے نہ ایسی کم کہ محسوس ہی نہ ہو۔ معلوم ہوتا تھا کہ سب چیزیں ناپ تول کے ڈالی گئی ہیں۔ ذائقوں کی بھی اپنی تاثیر ہوتی ہے۔ مجھے اپنا سینہ کُھلتا سا محسوس ہوا۔ اگر ایسی ہی بیدے سے فیض آباد جانا ہوتا تو میں یہاں کی ایک گلوری زرّین کے لیے ضرور لے جاتا۔ وہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہتی ہے۔

ایک ملازم ہمارے صوفوں کے آگے اسٹول جیسی گول چھوٹی میزیں رکھ رہا تھا کہ خاں صاحب کے ساتھ بڑا نواب تیز قدموں سے اندر داخل ہوا۔ اُس کی چال سے بے چینی عیاں تھی۔ آتے ہی اُس نے گھبرائے ہوئے انداز میں معذرت کی اور تجمّل سے مخاطب ہو کے بولا۔ ”یقیناً آپ حضرات نے رات کا کھانا نہیں کھایا ہوگا۔“

”تکلف کی ضرورت نہیں۔“ تجمّل کے بجائے آبا جان نے جواب دیا۔ ”ہم نے ابھی کوئی سات بجے سیر ہو کے ناشتہ کیا ہے۔ میرا خیال ہے، کسی کو بھی بھوک محسوس نہیں ہو رہی ہوگی۔“

تجمّل نے بھی آبا جان کی تائید کی لیکن بڑے نواب نے کسی کی نہ سُنی۔ ”کوئی مضائقہ نہیں۔ توشے کا اہتمام کچھ دیر میں ہو جائے گا۔“ ملازموں کو اشارہ کر کے وہ تجمّل کے سامنے والی نشست پر بیٹھ گیا۔ گلے تک شیروانی میں بند اُس کا سینہ زیر و زبر ہو رہا تھا اور خنکی کے باوجود پیشانی پر پسینے کے قطرے جھلملا رہے تھے۔ خاں صاحب بھی اُس کے دائیں جانب کونے میں ہٹے ہٹائے بیٹھ گئے تھے۔ کمرے میں لمحوں تک سناٹا طاری رہا۔ سب جیسے گونگے ہو گئے تھے۔ نواب کچھ کہنے کے لیے مضطرب نظر آتا تھا لیکن شاید اُسے لفظ نہیں مل رہے تھے۔ اُس کی آنکھیں جلتی بجھتی رہیں۔ آبا جان کو یہ خاموشی سب سے گراں گزر رہی تھی۔ اُنھوں نے نواب سے حویلی کے بارے میں رائے ظاہر کی۔ کسمساتے لہجے میں بولے۔ ”یہ عمارت تو خاصی نئی معلوم ہوتی ہے۔“

”جی، جی ہاں۔“ نواب نے چونک کے سر اٹھایا۔ ”پانچ سال کے قریب اس کی تکمیل کو ہوئے ہیں۔“

”نہایت شاندار عمارت ہے۔“

”جی ہاں۔“ نواب نے شائستگی سے کہا۔ ”بس بن گئی۔“

”برس لگے ہوں گے؟“

”جی، برس، کوئی چار سال۔“ نواب نے مختصراً کہا۔

”ہر گوشے سے نفاست جھلکتی ہے۔“

نواب پہلو بدل کے رہ گیا۔ آبا جان کو جلد اندازہ ہو گیا کہ یہ ایک بے محل گفتگو ہے۔ اُنھوں نے عمارت کے بارے میں پھر کوئی رائے زنی نہیں کی۔ وہی اجنبی سکوت پھر کمرے پر چھا گیا۔ نواب نے مضطربانہ خاں صاحب کو دیکھا پھر اُچٹتی بھٹکتی نظروں سے ہم سب کو۔ نواب کی جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو اُس کا یہی عالم ہوتا۔ وہ اُن لوگوں کے درمیان تھا جو اُس سے پہلی یا دوسری بار مل رہے تھے۔ اُسے اچھی طرح کسی کا نام بھی نہیں معلوم تھا۔ صرف ایک مرتبہ تجمّل اور کاتے اُس سے مل کے گئے تھے اور بیرو اور میں بارہ دن تک اُس کی قید میں رہے تھے مگر اُس کی یہ کیفیت صرف اجنبیت کے سبب ہی نہیں ہوگی، اور بھی بہت کچھ ہوگا۔ وہ ہمارے بارے میں کچھ جانتا تھا تو واقعے کے حوالے سے اور واقعے کی طرف سے۔ اس دوران اُسے عجیب عجیب خبریں ملتی رہی ہوں گی۔ ہمارے حیدر آباد آنے کے بعد بازار کے اڈے پر پیش آنے والے ایک ایک واقعے کا اُسے علم ہونا چاہیے۔ آغا کی بے دخلی، جمورے دادا کی آمد، موسیٰ ندی کا واقعہ، بلکہ ہو سکتا ہے مخبروں نے اپنی طرف سے اور حاشیہ آرائی کی ہو۔ پھر میں اور بیرو تو اُس کے سامنے ہی تھے۔ کل رات ہی کی بات تھی، میں اور بیرو کس طرح اُسے بندوق کی زد پر رکھ کے حویلی سے فرار ہوئے تھے اور بارہ دن طرح طرح کے ستم برداشت کرنے کے باوجود ہم نے خانم کے متعلق ایک حرف بھی نہیں اگلا تھا۔ انھی لوگوں کے درمیان اب وہ بیٹھا ہوا تھا۔ گو ہمارا لباس وقت سے ہماری وابستگی کی چغلی کھا رہا تھا اور اِدھر ہمارے ساتھ میر علی اور آبا جان ایسے بزرگ موجود تھے لیکن یہ تضاد تو اُس کے لیے اور کشمکش کا باعث ہونا چاہیے۔ چند ثانیوں تک سب جیسے کسی اَن ہونی کے منتظر گم بیٹھے رہے، پھر نواب ہی نے خاموشی توڑی۔ ”ہم، ہم کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔“ وہ رُک رُک کے بولا۔

”اب کچھ مت بولو نواب صاحب!“ تجمّل نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

”ہم پر بہت بوجھ ہے۔“ اُس نے تیزی سے کہا۔ ”ہمیں کہنے دیجیے، گو ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ ہم کیا کہیں، کس طرح آپ کے سامنے زبان کھولیں۔“

”ہم لوگ کو تھوڑا آنکھوں سے بھی سننا آتا ہے۔“ تجمّل نے آہستگی سے کہا۔ ”اچھا ہے، آپ زبان بند ہی رکھو۔ سمجھو ہم نے سب سُن لیا ہے۔“

”آپ کی نوازش، بخدا ہم اپنے قلبی اظہار سے قاصر ہیں۔ ہم پر اتنا بڑا احسان کبھی نہیں کیا گیا۔ ہمیں بار بار احساس ہوتا ہے کہ ہم نے آپ جیسے جلد......“ اُس کی آواز بھرّا گئی۔

”بس نواب صاحب ابھی بس کرو۔“ بیرو نے درمیان میں دخل دیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”قسم سے نواب صاحب! اپن نے آپ کو کیا بولا تھا؟ اپن نے جیسا بولا تھا، آپ اپن لوگ کو خلاصی کر دیتا تو ہم راستہ بدل کے سیدھا خانم بی بی کے پاس جاتا اور اُس کو ادھر لے آ کے ہی دم لیتا۔“

”اب اس کو مت لوٹاؤ!“ تجمّل نے ناگواری سے کہا۔

”مُنہ پر آ گیا تجمّل بھائی!“ بیرو نے لجاجت سے کہا۔

”انھیں کہنے دیجیے، ہم چاہتے ہیں کہ سب کچھ ہمارے مُنہ پر کہا جائے۔ یہ کچھ کم ہی کہیں گے، حقیقت اُس سے بہت زیادہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم کسی طور قابلِ معافی نہیں۔ ہماری وجہ سے انھیں بہت سے دُکھ اٹھانے پڑے ہیں۔ ہمیں ناز تھا کہ اس گھر سے ہمیشہ لوگوں کو سُکھ دینے کی خواہش کی گئی ہے۔ اس مرتبہ ہم یہاں کے مکین اپنے آبا کی روش بھول گئے۔ محض ندامت کا اظہار کافی نہیں ہے۔“

”از راہِ کرم۔“ آبا جان نے بے تابی سے کہا۔ ”از راہِ کرم نواب صاحب! اب یہ باتیں نہ کیجیے، ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ آدمی اپنی تدبیریں کرتا ہے۔ غلط فہمیاں، غلط تخمینے زندگی کا حصّہ ہیں، کہیں بھی آدمی کو اس سے مفر نہیں۔“

”نہیں، صرف اتنا نہیں ہے۔“ نواب کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ ”ہمیں معلوم ہے کہ آپ کا قلب کتنا کشادہ ہے۔ آپ ہمیں درگزر کی بھیک دے کر معاف کر دیں گے لیکن کیا اس طرح ہمیں سُرخ روئی نصیب ہو جائے گی؟ ہمارے بیٹے کا ملال کم ہو جائے گا؟ ہم آپ سے معذرت نہیں چاہیں گے۔ یہ مت سوچیے کہ ہم صورتِ حال کی تبدیلی سے معذرت خواہی پر مجبور ہیں کیوں کہ اب بھی تیور ہمارے لیے مناسب ہے بلکہ ہم آپ سے عرض کریں کہ ہمیں ان دونوں عزیزوں سے کوئی عناد نہیں تھا۔ ہماری کوشش یہی تھی کہ دونوں پر کوئی آنچ نہ آئے لیکن سب کچھ ہمارے ہاتھ سے نکلتا گیا۔ سب ارادۃً تھا، ہم اپنی غرض میں اتنے اندھے ہو گئے تھے کہ کچھ اور سجھائی نہیں دیا۔ یقیناً یہ ہمارے اجداد کی دی ہوئی اور ہمارے اندر چھپی ہوئی کوئی سرکشی تھی جس نے ہمارے حواس سلب کر لیے تھے۔ انھوں نے ابتدا میں ہمیں سب کچھ جتا دیا تھا مگر ہم سننے کے اہل نہیں تھے۔ ہمیں یہ بھی خیال نہ رہا کہ جن لوگوں سے ہمیں خانم بی بی کا سُراغ مطلوب ہے، اُن سے خانم بی بی کا کوئی واسطہ بھی ہو سکتا ہے اور وہ ایسے معزز بھی ہو سکتے ہیں۔ ہم اپنے ہوش ہی میں نہیں تھے۔ جگہ جگہ کی خاک چھاننے کے بعد کہیں ہمیں ان دو معززین کی صورت میں اُمید کی کرن نظر آئی تھی۔ موسیٰ ندی پر انھوں نے ہمارا ارادہ پسپا کر دیا تھا تو ہمارے پاس پہلے سے متبادل راستہ موجود تھا۔ ہمارا خیال تھا، ہم بآسانی ان پر دسترس حاصل کر سکتے تھے۔ یہاں گھر آ کے انھوں نے صاف انکار کر دیا تھا۔ ہمیں ہر دم وقت نکلتا محسوس ہوتا تھا۔ ہر گزرنے والی رات ہمارے بھائی کو ہم سے اور ناراض کر رہی تھی۔ ہم پر ایک وحشت طاری تھی لیکن اس کی وجہ صرف ہمارے بھائی کی ناراض و زبوں حالت ہی نہیں تھی، ہم جانتے ہیں اس کی وجہ دوسری بھی تھی۔ یہ حویلی تھی۔ یہ حویلی آئینے میں ہمیں صرف بلا چہرہ دکھاتی تھی۔“

”ابھی جانے دو نواب صاحب! اپن آپ سے بنتی کرتا ہے۔ ابھی کچھ مت بولو۔“ بیرو نے تندی آمیز نرمی سے کہا۔ ”اپن نے بولا تھا کہ ایسا اُلٹ پلٹ ہوتا رہتا ہے۔ کوئی نوا بات نہیں۔“

”مگر ہم اس اُفتاد سے پہلی بار دوچار ہوئے ہیں۔“ نواب نے جلتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ہمیں قطعی خیال نہیں تھا، اس طرح کبھی آپ لوگوں کا سامنا بھی ہو سکتا ہے۔ آپ ہمیں یوں آئینہ دکھانے آ جائیں گے۔ ہمیں بس اپنے شیش محل کا گمان تھا اور کچھ خبر نہیں تھی کہ لوگ بے شیشوں کے بھی ہوتے ہیں، اتنے دریا دل بھی ہوتے ہیں۔“

”نواب صاحب!“ تجمّل نے نسبتاً اُونچے لہجے میں کہا۔ ”ہم آپ کو بولیں، ہماری صورت کبھی آپ لوٹ کے نہ دیکھتے اگر ہم کو اِدھر دیکھنے کے بعد آپ سے کچھ اور لگا سیدھا ہو جاتا۔ آپ نے ٹھیک کیا جو ہم کو بازار کے اڈے پر نہیں چھیڑا اور اِدھر ان لوگ کے حویلی سے نکلنے کے بعد لگام کھینچے رکھی۔“

”آپ... بہت فرما رہے ہیں، آپ ہم سے اب کچھ کہہ کر گ

تھے مگر ہم آپ سے عرض کریں۔ ہم آپ کی طرف سے غافل نہیں تھے۔ ہمیں اپنی اس کوتاہی کا اعتراف ہے کہ ہم نے آپ کی باتیں درخورِ اعتنا نہیں سمجھی تھیں۔ ہم نے آپ سے اپنی مجبوری کا اظہار کر دیا تھا لیکن اس کا سبب اگر ایک طرف آپ کے دل میں کسی نرم گوشے کی توقع تھی تو دوسری جانب اس طرح ہمیں اپنی دانست میں یہ جتانا بھی مقصود تھا کہ آپ کے دونوں آدمی اُس وقت تک ہماری تحویل میں رہیں گے جب تک . . . .“

”ہم نے ایسا ہی جانا تھا۔“ جھلّل نے سرد لہجے میں کہا۔

”اور وہ اور بازار کے علاقے میں آپ کے ہر قدم سے باخبر ہونے کے باوجود ہمیں اعتماد تھا کہ آخر ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے۔ ہمیں مطلق اس کی پروا نہیں تھی کہ آپ کسی اور طرف دادرسی کے لیے جا سکتے ہیں اور ریاستی تگ و دو کا رُخ ہماری حویلی کی جانب ہو سکتا ہے۔ ہمیں اپنے ذرائع اور وسائل پر یقین تھا کیوں کہ اقتدار تک رسائی کا شرف ہمیں اور بہت سے اعزاز و امتیاز کے ساتھ ورثے میں ملا ہے۔ ہمارے عم زاد نواب حشمت جنگ تو ان دنوں ریاستی انتظامیہ میں اعلیٰ منصب پر فائز ہیں۔“

نواب حشمت جنگ کے نام پر ابا جان سیدھے ہو بیٹھے رہ گئے۔ انھوں نے اضطراری انداز میں جھلّل کی طرف دیکھا۔ جھلّل نے آنکھیں میچ لیں اور ابا جان کی زبان پر کچھ آتے آتے رہ گیا۔

نواب نے اپنی بات جاری رکھی: ”ہمیں علم ہو گیا تھا کہ آپ نے اُس طرف بازار کے علاقے میں آکا نامی مشہور سرغنہ کو کیسا رسوا کیا ہے۔ اُس طرف سے آنے والی اطلاعات ہمارے لیے بہت حیران کن اور کس حد تک تشویش انگیز تھیں۔ ہم یہاں دور بیٹھے بیٹھے آپ کے ایک ایک لمحے کے شاہد تھے اور ہمیں کوئی شبہ نہیں تھا کہ آپ کو وہاں کا رپلٹ کے ہماری طرف آنا ہے۔ ہمیں اطمینان رکھنا چاہیے کہ آپ کو اپنے دو آدمی ہم سے زیادہ مطلوب ہوں گے اور اگر آپ نے کسی دوسرے ارادے سے اس چار دیواری میں قدم رکھا تو . . .“ نواب پلکیں پٹپٹانے لگا اور گہری سانس لے کے بولا ”ہم نے محافظوں کو چوکنا کر دیا تھا اور کہا تھا کہ ممکن ہے، اب تمک آزمانے کا وقت آ جائے۔ ہم نے احتیاطاً نفری بڑھا دی تھی، ہر چند کہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم آپ سے سچ کہتے ہیں، ہمارے عزم میں کوئی لچک نہیں تھی۔ ناامیدی کی صورت میں ہم ان دو شریف النفس صاحبان کے لیے کسی دم کوئی بھی فیصلہ کر سکتے تھے، کوئی بھی آخری فیصلہ۔ اور یہاں تک کہ کسی کی نگاہ دراز ہونے

ہونے تک ہم ہر شہادت مٹا دینے پر قادر تھے۔“

ہم سب ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھ رہے تھے۔ جھلّل، پیرو اور ابا جان سب خاموشی سے سنتے رہے۔ ”فیصلے میں ہر بار بس ایک دو لمحے کی دیر ہو جاتی تھی۔“ نواب نے جھرجھری لے کے کہا۔ ”ہم نے اپنے طور پر اتنا ہی صبر و ضبط بہت کیا تھا۔ آپ نے ہمیں نتائج سے متنبہ کرنے اور کسی مذموم فیصلے سے باز رکھنے کے لیے ایک برمحل اور شریفانہ کوشش کی تھی۔ ہم نے سُن لیا تھا اور بعد میں بازار کے علاقے سے ملنے والی اطلاعات ہمیں کبھی آپ کا مشورہ آزمانے پر راغب بھی کرتی تھیں لیکن ہمارے بزرگ غالباً ہمیں ایک درس دینا بھول گئے تھے یا وہ خود اس کا ادراک نہیں رکھتے تھے۔ ہم سوچتے ہیں، جب آپ یہاں آئے تھے، کاش ہم اُسی وقت آپ کی بات مان لیتے اور ان دونوں کو آپ کے ساتھ ہی کر دیتے۔ اُس وقت نہیں تو ایک پہر بعد کر دیتے مگر اس اقدام میں ہمیں سبکی محسوس ہوتی تھی یا پھر ایسا تھا کہ ہمیں آپ کی جانب سے کسی بھی گداز کی توقع نہیں تھی۔ ہمیں آپ کے بارے میں شاید بتایا بہت کچھ دیا گیا تھا۔“

”آپ کو کم بولا گیا ہوگا نواب صاحب!“ جھلّل کی سپاٹ آواز کمرے میں گونجی۔

”یقیناً، یقیناً۔“ نواب نے شائستگی سے کہا۔ ”ہماری مراد غلط اطلاعات سے ہے۔ ہمیں یقیناً ایسی اطلاعات پہنچائی گئی تھیں جو تصویر کا ایک ہی رُخ پیش کرتی تھیں اور یہ ہماری گراں گوشی ہی تھی کہ ہم نے انھیں حرفاً قبول کر لیا۔ رات، صرف کل رات ہمارے بزرگ۔“ اُس نے پیرو کی طرف سر اُٹھا کے کہا۔ ”کل رات ہمارے بزرگ نے ہمیں زندگی کا وہ مشاہدہ کرایا تھا جس سے ہم کبھی آشنا نہیں ہوئے تھے۔ کل رات ہم نے اپنے آپ کو دیکھا تھا۔ ہم پر اپنی پیمائش منکشف ہوئی تھی، اور کل رات ہم بالکل بے وزن ہو گئے تھے۔ ہم نے اپنے بھائی کو خدا کے حوالے کر دیا تھا اور اپنے چارہ گروں سے کہہ دیا تھا کہ اب ہمیں بازار کے علاقے کی طرف سے کوئی خبر نہ پہنچائی جائے۔ حالانکہ ہمیں مشورہ دیا گیا تھا . . . .

ہمارے خیر اندیشوں نے ہمیں مشورہ دیا تھا کہ ہمارے دونوں قیدی بازار کے علاقے میں موجود ہیں۔ ہم ایک آخری تدبیر کے طور پر کیوں نہ اپنے وسائل حرکت میں لائیں۔ ہم ریاست کے راستوں پر پہرا بٹھا سکتے ہیں۔ دربار سے ہمارے آبا کی رفاقت پرانی ہے۔ اُس کے عظمت و جلال اور جاہ و حشم میں کچھ ہمارے آبا کا خون بھی شامل ہے۔ ہم بجا طور پر امید کر سکتے تھے کہ ایک رعایت ہمیں ضرور

سے اپنی قدیم وفاداری کے صلے میں ضرور دی جائے گی۔ ہم یہ کاروائی کر سکتے تھے اور ہمیں خوب اندازہ تھا کہ اس کے نتائج کتنے سنگین ہو سکتے ہیں۔ ان چند دنوں میں کم از کم ہمیں یہ احساس ہو چلا تھا کہ ہم کن لوگوں کی طرف انگلی اٹھائیں گے۔ وہ لوگ جنھوں نے ہمیں محتاط رہنے کی طرح طرح تلقین کی ہے۔ انھوں نے بازار کے علاقے کا رُخ جان بوجھ کے کیا ہوگا۔ وہاں بیٹھے بیٹھے انھوں نے ہمیں کچھ باور کرانے ہی کی کوشش کی ہے۔ بلاشبہ ایک خدشہ ہمیں اپنی رسوائی کا بھی تھا لیکن جہاں اس نوع کی کوئی صورت حال پیدا ہو گئی ہو وہاں رسوائی کیا اہمیت رکھتی ہے۔ ہمیں خوش گمانی تھی کہ اس شہر کے لوگ بازار کے علاقے سے وابستہ لوگوں کے مقابلے میں ہماری بات پر یقین کرنا چاہیں گے کیونکہ ہم یہاں ایک زمانے سے شرافت اور اعتبار کا کاروبار کر رہے ہیں۔ کوئی عجب نہیں کہ کسی آن ہم اپنے مشیروں کے فرمودے پر آمادہ ہو جاتے مگر رات ہم نے اپنے بزرگ کو دیکھ لیا تھا۔“ نواب کا اشارہ پیرو کی طرف تھا۔ کہنے لگا۔ ”ہم ایک شکست خوردہ کی حیثیت سے کوئی مجنونانہ قدم اٹھا لیتے لیکن ایک حقیقت ہم پر عیاں ہو چکی تھی کہ ہمارے مطلوب ہم سے بڑا ارادہ رکھتے ہیں۔ اُن کی ضد ہم سے قوی ہے اور جو بے سبب نہیں ہوگی۔ اس توانائی کے عقب میں کوئی بڑا یقین مضمر ہے۔ کسی بڑے سچ، کسی بڑے اصول کا یقین، اور جا ہے۔ ہم کچھ بھی کر لیں، اُن کی مرضی کے بغیر اُن سے کچھ نہیں جان سکتے۔ ہمیں خوشی ہے کہ وہ بدبخت لمحہ نہیں آیا۔ ہم نے بہرصورت اس پر غور ہی نہیں کیا۔“

”آپ نے اچھا کیا نواب صاحب۔“ جھلّل نے کہا۔

”درگزر فرمائیں، بڑی طویل ہے۔ بہر حال، ہم نے بے کم و کاست سب کچھ بیان کر دیا ہے۔“ نواب شکستہ آواز میں بولا۔ ”اس رُوداد سے ہماری غرض و غایت اپنی تنگ دلی و کوتاہ نظری کا اظہار ہے۔ ہم سے کچھ بھی بعید نہ تھا اور ہم نے کل رات کے سوا بہت سا کینہ اپنے سینے میں بھر رکھا تھا۔ ہم نے یہ اقبال محض اس لیے کیا ہے کہ آپ ہمارے لیے کسی بہتر سزا کا تعین کر سکیں اور ہم سے کوئی رعایت روا نہ رکھیں۔“

”آپ، آپ یہ کیا فرما رہے ہیں؟“ ابا جان نے بے چینی سے کہا۔

”آپ لوگ کیا ابھی ابھی درست اٹھ جائے نواب صاحب؟“ جھلّل تند لہجے میں بولا۔

”نہیں، نہیں۔“ بڑے نواب نے جذباتی انداز میں کہا۔ ”آپ ہمارے سر آنکھوں پر، مگر ہم آپ کو کیا بتائیں، ہمارا سینہ جیسے کوئی

دھنک رہا ہے۔ یہ عجز نہیں، نشہ ہے، ہذیان ہے۔ ہم کچھ نہیں کہنا چاہتے تھے لیکن یہ سب بے اختیار زبان پر آ گیا۔ آپ کو حد درجہ گراں گزر رہا ہوگا۔ خدا کے لیے ہماری یہ عرض حال کسی انداز بیان یا سخن آرائی پر محمول نہ کیجیے۔ اصطلاحات اور معانی کی کچھ حدود ہوتی ہیں۔ وہ خنجر خوش قسمتی سے آپ کی رگیں نہ لگے جو ہم نے جانے کتنی بار آزمائے تھے۔ ہماری درخواست ہے کہ ہمیں سزا سے مستثنیٰ کرنے کا رحم نہ کیا جائے۔ ہمارے لیے کوئی سزا تجویز کیجیے، کوئی عبرت ناک . . . .“

”ابھی آپ اُپ کیسا بولتے ہو نواب صاحب!“ پیرو نے اُمڈتی آواز میں کہا۔

”ہمیں احساس ہے کہ ہم کن لوگوں سے کس قسم کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اُن لوگوں سے جن کے دل سمندر ہیں۔ آپ نے ہم سے بہت سلوک کیے ہیں۔ اب ایک سلوک اور کر دیجیے، ہمیں کوئی حکم دیجیے۔ بخدا ہم نظر شناسی کے لیے نہیں کہیں گے۔ مبتذل ہے، ہم سے یہ اقبال ہی جیسے لیے رہیں، صرف اپنا جلوہ دکھاتا ہے جس نے اپنے سوا ہمیں سب سے دور کر رکھا تھا۔“

معلوم نہیں وہ کیا کہہ رہا تھا، شاید اُسے خود بھی معلوم نہیں تھا مگر اُس کی آواز فریادی تھی۔ انتہائی کھوٹ ہو تو صاف نظر آ جاتی ہے۔ مجھے وہ نواب یاد آ رہا تھا جو پہلی بار ہم سے یہاں حویلی کے کمرے میں ملا تھا، جو پھر ہمارے زنداں میں ہمیں حکم دینے آیا تھا۔ وہ کوئی اور شخص تھا، اس شخص کا کوئی بہروپ۔ مگر اس وقت بھی اُس میں کوئی آویزش نہیں تھی۔ سب بار بار بھی جھلّل کی طرف دیکھتے تھے، کبھی اُس کی طرف۔ جھلّل دم بخود سا بیٹھا تو نواب کھو رہا تھا۔ کمرے میں جلتے فانوس کی روشنیاں جیسے دھیمی پڑ گئی تھیں، ہوا بھی بند بند سی معلوم ہوتی تھی۔ نواب کے قریب ہی خان صاحب سر جھکائے بے حس و حرکت بیٹھے تھے۔

”ہمیں اپنا سا، ہم بہت ہلکا ہوا . . .“ چند ثانیوں کے توقف کے بعد نواب کی جھجکتی ہوئی آواز دوبارہ کمرے میں گونجی۔

جھلّل یک لخت صوفے سے اُٹھ گیا۔ ”ہم لوگ کبھی تھوڑا دھیان کرو نواب! اتنا ہی بولو جتنا سنا جا سکے۔“ جھلّل کو اُٹھتا دیکھ کر نواب بھی بے قراری سے کھڑا ہو گیا۔ چند قدم کا فاصلہ تھا۔ جھلّل اُس کے سامنے جا کے ٹھہر گیا اور اُس نے اپنے دونوں بازو پھیلا دیے۔ نواب کا جسم لہرا گیا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ جھلّل کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ ”آپ کیا بولتے ہو؟“ جھلّل نے بھرے بھرے لہجے میں کہا۔ ”ہم کو جانکاری تھی۔ ادھر ہم آپ سے جو جان کے گئے

تھے، ویسا آپ نے اپنے سے نہیں سمجھا۔ ہم کو سب پتہ تھا کہ ادھر آپ کتنے ہتھیار رکھتے ہو اور خون آپ کا کتنا گرم ہے۔ دادا نے ابھی ٹھیک بولا تھا، ہم آپ کے لیے ضرور نئے ہیں، آپ ہمارے لیے نہیں ہو۔ ہم کو ایسے اجنبیوں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ آپ نہیں جانتے تھے تو کیا ہوا خنجر اپنے نشانے کو بھی کچھ پہچانتا ہے؟"

سبھی اپنی نشستوں سے اٹھ کے اُن کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ نواب کا قد جھل سے خاصا کم تھا تاہم جھل کے شانے سے اُوپر اُس کا چہرہ میرے سامنے تھا۔ کہتے ہیں کہ چہرہ اندرونی کیفیات کا غماز ہوتا ہے۔ نواب کی بھنچی ہوئی آنکھیں، لرزتے پھڑپھڑاتے ہونٹ اور چہرے پہ ہر آن بدلنے والی کیفیں جھوٹ نہیں بول رہی ہوں گی۔ جھل نے اپنا حلقہ اور تنگ کر لیا اور نرم آواز میں بولا "ہم لوگ تو سزا پانے کے لیے ہیں، سزا دینے والے دوسرے ہیں، پر آپ کا ایسا بولنا ہی اپنے لیے بہت ہے۔ ہم ادھر لوٹ کے یوں ہی نہیں آ گئے ہیں، آپ کو اور چھوٹے صاحب کو دیکھ کے گئے تھے اس لیے آئے ہیں، پتہ تھا کہ کدھر واپس جا رہے ہیں۔ ذرا بھی آپ کے ہاں جا اپنے کو دکھائی پڑتا تو پھر دوسری طرح ہی آتے۔" جھل نے اُسے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "اب کچھ اور مت بولنا نواب! پھر ہم اِدھر نہیں ٹھہریں گے۔ سمجھیں گے تم اپنا ہی پلڑا بھاری رکھنا چاہتے ہو۔" جواب میں نواب نے زور سے جھل کو بھینچ لیا اور اپنے سسکتے ہونٹوں پہ قابو پانے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔

جھل نے کچھ دیر بعد نواب سے جانے کی اجازت کے لیے کہا تھا۔ کہا تھا کہ رات بہت ہو گئی ہے، سب کل صبح پھر آ جائیں گے۔ اُس نے خانم کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ خانم یہیں رہے گی مگر جھل کی زبان سے جانے کا ذکر سن کے نواب اور مضطرب ہو گیا۔ "اتنی عزت دے کر آپ ایسے چلے جائیں گے؟" اُس نے کچھ سننے سے انکار کر دیا اور شکایتی لہجے میں بولا۔ "جیسا کہ ہمارا قیاس ہے، آپ سب حضرات اس شہر میں مسافر ہیں۔ یقیناً کسی جگہ ٹھہرے ہوں گے مگر اب کہیں اور جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ گھر ہوتے ہوئے ہمارے عزیز، ہمارے محسن کہیں اور قیام فرمائیں۔" اُس نے حتمی انداز میں فیصلہ صادر کیا کہ اب ہم جب تک اس شہر میں رہیں گے یہیں قیام کریں گے۔

ابا جان نے اُس سے نہیں چھپایا کہ وہ کسی ہوٹل میں مقیم نہیں ہیں، اس علاقے میں کچھ فاصلے پر انھوں نے حال ہی میں ایک حویلی خریدی ہے، سب اُسی میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ وہاں کچھ اور لوگ بھی ہماری واپسی کے منتظر ہوں گے مگر نواب کے پاس پہلے سے ہر بات کا جواب موجود تھا۔ کہنے لگا کہ سب کو یہیں بلا لیا جائے گا ورنہ انھیں اطلاع پہنچا دی جائے گی۔ کاشے اور زورا اب تک خاموش بیٹھے رہے تھے۔ انھوں نے بھی دبے لہجے میں نواب سے منت کی کہ سردست انھیں جانے ہی دیا جائے مگر نواب نے جیسے سُنا ہی نہیں۔ اُس کے التجا آمیز اصرار کے آگے انکار کرنا آسان نہیں تھا۔ جھل کے پس و پیش پر وہ اداسی سے کہنے لگا "تو پھر ہم یہ سمجھیں کہ ہم اپنے محسنوں کے دل میں اعتبار قائم کرنے میں ناکام رہے ہیں؟"

اسی اثنا میں خاں صاحب لپکتے ہوئے باہر گئے تھے، وہ فوراً واپس آ گئے اور آ کے انھوں نے توشہ تیار ہو جانے کی اطلاع دی۔ کسی کو بھی بھوک نہیں لگ رہی ہوگی لیکن جب نواب نے جھل سے دوسرے کمرے میں چلنے کی درخواست کی تو اُس نے کوئی رد و قدح بھی نہیں کی۔ دوسرے کمرے میں روشنی بکھری ہوئی تھی، ہر جانب رنگ برنگے شیشے جڑی دیواروں سے روشنی جیسے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ قالین کے فرش پر وسط میں وسیع دسترخوان بچھا تھا اور ہر سو کھانوں کی خوشبوئیں بسی ہوئی تھیں۔ بڑے نواب اور خاں صاحب سمیت ہم کُل دس افراد تھے لیکن دسترخوان اور اُس پر سجے ہوئے طرح طرح کے کھانے دیکھ کے کسی برات کے کھانے کا گمان ہوتا تھا۔ کئی مرد بڑی مستعدی سے اِدھر اُدھر دوڑتے پھر رہے تھے۔ ایک طرف آفتابے ہاتھوں میں اُٹھائے دو خادمائیں بھی موجود تھیں۔ وہیں سلفچیاں رکھی تھیں۔ اُدھر خاں صاحب سرگوشیوں میں احکام دینے میں مصروف تھے۔ دسترخوان پر نواب کی نگاہیں ہم پر لگی ہوئی تھیں۔ کچھ تو اُس کی ترغیب اور تُمہ داری اور کچھ کھانوں کی لذت، خواہش نہ ہونے کے باوجود سبھی نے کچھ نہ کچھ کھایا۔ شیرینی کی قابیں رکھی جانے لگیں تو میری نظریں وہ حلوہ ڈھونڈنے لگی تھیں جو چھوٹے نواب کی بیگم اور بہن نے چپکے سے ہمیں زنداں میں بھجوایا تھا۔ پیرو بھی اُس کا ذائقہ نہیں بھولا ہوگا۔ میں نے کن انکھیوں سے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی لیکن وہاں حلوے کی قاب نہیں تھی۔

کھانے کے بعد ہم دیوار سے لگی ہوئی آرام کرسیوں پہ دراز ہو گئے، تبھی نوجوان لڑکیاں ایک جیسے لباس میں نمودار ہوئیں۔ اُن کے ہاتھوں میں پھل، فنجان اور چائے دانیوں کے طشت تھے۔ تینوں کے سر جھکے ہوئے تھے اور چھوٹا سا گھونگھٹ نکلا ہوا تھا۔ لمبے لمبے کرتے، چھوٹی مہری کے پاجامے اور چادر نما دوپٹوں میں اُن کا سارا بدن

چھپا ہوا تھا۔ تینوں کی رنگت بھی تقریباً ایک جیسی تھی، جیسے سانولے رنگ میں چمپئی رنگ کی آمیزش ہو گئی ہو۔ اُن کا رنگ رُوپ دیکھ کے کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ خادمائیں ہوں گی۔ ڈری ڈری سہمی سہمی سی، نگاہیں جھکی جھکی۔ انھوں نے نفاست سے طشت ہمارے سامنے کی میزوں پر رکھ دیے اور جب تک نواب نے انھیں جانے کا اشارہ نہیں کر دیا، ہاتھ باندھے سر جھکائے کھڑی رہیں۔ نواب نے اپنے ہاتھوں سے فنجانوں میں قہوہ انڈیلا۔ یہ شکر کے بغیر پیا جانے والا وہی قہوہ تھا میں نے ایک بار پیشی میں کرشاہی کے ساتھ پیا تھا۔ پچھلے کمرے کی نسبت یہاں کی فضا یکسر بدلی ہوئی تھی۔ نواب بھی اب سنبھلا، ٹھہرا ٹھہرا لگ رہا تھا۔ اُس کے لب و لہجے میں بھی شگفتگی لوٹ آئی تھی۔ سبھی کا کچھ یہی حال تھا، میرا بھی۔ مجھے بھی اپنے دست و بازو کھلے کھلے محسوس ہو رہے تھے۔ نواب نے اب تک ہمارے بارے میں کچھ جاننے کی جستجو نہیں کی تھی۔ یہ کیسی عجیب بات تھی کہ اُسے اپنے ان مہمانوں کے نام بھی ٹھیک طرح معلوم نہیں تھے جن کی خوشنودی و خاطرداری کے لیے وہ بہت مستعد اور بے تاب نظر آتا تھا۔ ظاہر ہے یہ درگزری دانستہ ہوگی اور مقصد ہماری دل داری کے سوا کیا ہو سکتا تھا۔ ایسے ہر سوال و جواب سے اجتناب ہی مناسب تھا جس میں مہمانوں کے لیے سرگرانی کا کوئی پہلو نکلتا ہو۔ یہ رسم اُس نے ہی بر چھوڑ دی تھی مگر ایسا کوئی موقع آتا تو جانے ہم سب کیسے ایک دوسرے کا تعارف کراتے۔ ابا جان اور منیر علی کی بات دوسری تھی لیکن جھل، پیرو، کاشے، زورا اور خود میرے بارے میں کیا اُسے سب کچھ بتا دینا چاہیے تھا کہ ہمارا تعلق باقاعدہ اڈوں سے ہے اور اب اڈوں پر پہچانے جانے والے نام ہی ہمارے نام ہیں۔ تاہم نواب کی گفتگو میں مغائرت کا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ ہمارے ساتھ ہی بیٹھا رہا حالانکہ خانم کی آمد کے بعد اُسے اپنے چھوٹے بھائی کا حال جاننے کی بے چینی ہونی چاہیے تھی۔

بارہ سے اُوپر ہو گئے ہوں گے۔ نواب حویلی کی نقاشی کے بارے میں ابا جان کے کسی سوال کا جواب دے رہا تھا کہ اُسے خیال آیا اور وہ معذرت خواہانہ لہجے میں بولا "اتنی رات ہو گئی ہے، ہمیں آپ کی خلوت کا دھیان ہی نہیں رہا۔" پیرو نے مسکرا کے کہا بھی کہ اپنے لیے دن رات کی بندش نہیں ہے۔ وہ اپنی بات جاری رکھے لیکن نواب نے اسے پیرو کا تکلف سمجھا اور متانت سے بولا "ہم ایک گزارش کرنا چاہتے ہیں۔" سب اُس کی جانب ہمہ تن گوش ہو گئے۔ نواب نے شائستگی سے کہا "حویلی میں مہمانوں کے لیے مہمان خانہ الگ موجود ہے لیکن ہماری خواہش ہے آپ حضرات حویلی کی عمارت میں ہمارے ساتھ قیام فرمائیں۔" اُس نے خود ہی جھجکتے ہوئے وضاحت کی کہ اُس کی نظر میں ہماری حیثیت دیگر مہمانوں سے مختلف ہے۔ اُسے خوشی ہوگی اگر ہم حویلی میں اُس کے عزیزوں کے مانند ٹھہریں، یہ جان کے کہ یہ ہمارا ہی گھر ہے، اس گھر کی ہر چیز پر ہمیں تصرف حاصل ہے۔ وہ ڈبڈبائی آواز میں کہنے لگا کہ جن لوگوں نے اس گھر کے سکھ کا اس قدر خیال کیا ہے، اُن کی قدر و منزلت کے لیے نہ ہمارے پاس لفظ ہیں، نہ اُن کی خدمت و خاطر کے لیے جرأت و ہمت۔ ہم آج خود کو بہت بے وسیلہ محسوس کر رہے ہیں۔ ہماری درخواست ہے کہ یہ ساری حویلی کھلی ہے، جہاں آپ چاہیں، جب تک چاہیں رہیں۔ ملازمین سے کہہ دیا گیا ہے کہ پہلی بار ایسے مہمان آئے ہیں جن کا مرتبہ اُن کے آقا سے بلند ہے۔ وہ لوگ آئے ہیں جنھوں نے اس گھر کی شادمانی کے لیے بہت ایثار کیے ہیں، جنھیں دوسروں کے دکھ درد کا ایسا احساس ہے۔" نواب کی آواز بھرانے لگی۔ نزدیک دُور موجود خادماؤں اور ملازموں کا بھی اُسے لحاظ نہیں رہا تھا، کہنے لگا "ہم نے اس گھر کی خواتین سے کہہ دیا ہے کہ نووارد مہمانوں کے لیے زنان خانے کی کوئی بندش نہیں ہونی چاہیے۔ جن لوگوں نے اس گھر کو زندگی کی نوید دی ہے، جو اپنے گھر کی آبرو، ہماری بی بی کو یہاں لا سکتے ہیں، کسی بڑی قدر کے لیے اُسے ایسی نازک صورت حال سے دوچار ہونے پر آمادہ کر سکتے ہیں، جنھوں نے ایک روٹھے ہوئے اجنبی کو منانے اور ایک برگشتہ شخص کی نشاط خاطر کے لیے اتنا بڑا حوصلہ کیا ہے۔ وہ اس گھر کے ہر فرد کے لیے واجب الاحترام ہیں۔ اُن کے سامنے کسی چلمن سے مغائرت کا گمان ہو سکتا ہے۔ ہمیں اندازہ ہے کہ خانم بی بی نے کن لوگوں کے ہاں جا کے پناہ لی ہے۔ وہ گھر کیسا عزت و احترام کے لائق ہوگا جس کے پاسبان ایسے ہوں جنھیں رشتوں کی یہ پاس داری آتی ہو اور جو اپنے عہد کے کسی شخص سے کیے گئے عہد کے لیے اتنی دور تک جا سکتے ہوں۔ ہمیں اندازہ ہے کہ خانم بی بی کس بڑے گھر سے آئی ہیں۔"

کسی نے اُسے نہیں ٹوکا اس لیے کہ ٹوکنے پر اُس کے بکھرنے، بپھر جانے کا خدشہ تھا۔ اُسے خود ہی احساس ہوا اور اُس نے بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے خاموشی اختیار کر لی لیکن جیسے اُسے پھر کچھ یاد آ گیا، ایک ثانیے کے تذبذب کے بعد وہ تھکی ہوئی آواز میں بولا "ہاں، ورنہ آپ نے ٹھکرا دیا ہے، وہ زندگی بھر ہمیں فریب دیتا رہا۔ ہم سوچتے ہیں ہمارے پاس باقی کیا رہ جاتا ہے؟"

"بہت ہے، بہت ہے نواب صاحب!" پیرو نے تیزی سے کہا اور محل کی جانب دیکھتے ہوئے بولا "آپ ایسا سمجھتے ہوں اتنا ہی اپن کے لیے زیادہ ہے۔"

ابھی نواب اور پیرو یا اکبر خاں صاحب نے بروقت مداخلت کی اور مودبانہ کہا "بالائی منزل پر مہمانوں کی خلوت کا اہتمام کر دیا گیا ہے۔"

"ہاں ہاں، بے شک۔" نواب نے ندامت سے کہا۔ "ہم تو بھول ہی گئے۔ اس دوران رات اور ڈھل گئی۔ بالائی منزل نسبتاً ہوادار اور پُرسکون ہے۔ ہم سے پوچھا جاتا تو ہم بھی وہی جگہ تجویز کرتے۔ شاید آپ حضرات کو بھی پسند آئے۔ بصورتِ دیگر کوئی تکلف نہ کیجیے گا۔"

وہ اُٹھ گیا۔ اُس کی معیت میں ہم بھی کمرے سے نکل آئے۔ پاس ہی خم دار زینہ تھا۔ چھوٹی چھوٹی سیڑھیوں کا روشن زینہ۔ دونوں طرف دیواروں پر نقاشی کی گئی تھی اور اُوپر تک سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ نواب نپے تلے قدموں سے سیڑھیاں طے کرنے لگا۔ کاتب میرے پہلو بہ پہلو تھا۔ میں جانے کس خیال میں تھا۔ اُوپر پہنچ کے اُس نے زور سے میرا ہاتھ دبایا۔ میں ہڑبڑا گیا۔ اُوپر آ کے واقعی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہم کسی اور عمارت میں آ گئے ہوں۔ بالائی منزل کا نقشہ ہی کچھ اور تھا۔ ہمارے سامنے صحن کے بیچ تک فرش سے ایک بالشت بلند وسیع و عریض بیضوی چبوترے پہ سبزہ زار کھلا ہوا تھا اور پھولوں کے تختے تھے۔ سبزہ زار کے وسط میں ایک حوض تھا۔ اُس میں ایک بڑا مجسمہ نصب تھا۔ چار سمتوں سے چار نوجوان لڑکیاں لہراتی ہوئی باریک قبائیں پہنے بے نیازانہ صراحیوں سے پانی انڈیل رہی تھیں اور نیچے اُن کے گھٹنوں تک آتے دو زانو بیٹھے ہوئے متعدد مرد پانی کے لیے ترساں تھے۔ چبوترے سے پرے سنگِ مرمر کے بھاری بھاری ستونوں کا بڑا دالان تھا اور دُور دالان میں ہی فاصلے فاصلے سے بنے ہوئے جھروکوں کی دیواروں کے پیچھے کمرے نظر آ رہے تھے۔ دالان کے سارے فرش پر اس طرح نقاشی کی گئی تھی جیسے پھول بکھرے ہوئے ہوں۔ سب مجسمہ دیکھنے کے لیے رُک گئے۔ مجسمہ دودھیا روشنی میں نہایا ہوا تھا۔ لڑکیوں کے پانی انڈیلنے کا انداز ایسا دل نشیں تھا کہ بے ساختہ آدمی کا جی چاہے کہ ان کے گرد بیٹھے ہوئے پیاسے مردوں میں شامل ہو جانا چاہیے۔ مجسمے کا شبہ تو اُس کے سفید رنگ سے ہوتا تھا ورنہ ایسا لگتا تھا جیسے بس ابھی ابھی انھیں پتھر کر دیا گیا ہے اور ایک پل میں یہ متحرک ہو جائیں گے۔ ابا جان حیرت زدہ نظروں سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ وہ نواب سے ضرور کچھ پوچھنا چاہتے تھے لیکن نواب آگے بڑھ چکا تھا۔ دالان عبور کر کے ہم جھروکوں کے پیچھے آ گئے اور نواب سامنے کے ایک بڑے دروازے میں داخل ہو گیا جو مخملی پردوں اور قیمتی سازوسامان سے مرصع تھا۔ کسی راجا کی خلوت گاہ کا منظر بھی اس سے زیادہ کیا ہو سکتا تھا۔

"مکینوں کے حسین ذوق کے بغیر یہ نفاست ناممکن ہے ماشاءاللہ۔" منیر علی چپ نہ رہ سکے اور ترستاتے لہجے میں بولے "اچھی چیزیں دیکھ کے دل کتنا خوش ہوتا ہے۔ سب کسی مصور، کسی شاعر کا خواب معلوم ہوتا ہے۔"

"آپ نے درست فرمایا۔" نواب پابیت سے بولا۔ "یہ سب ہمارے اُسی حرماں نصیب بھائی کی کارستانی ہے۔ تعمیر کی ابتدا سے اختتام تک ہماری حیثیت تو محض ایک تماشائی کی رہی۔ دیوار کا گوشہ گوشہ اُس نے اپنے ہاتھ سے تراشا ہے۔ نقشے بنانا، اُن میں رنگ بھرنا، پھر انھیں مسترد کر دینا اور نئے زاویے سے پھر ترتیب دینا۔ یورپ میں تعلیم کے دوران اُسے شاہی محلات غور سے دیکھنے کا موقع مل گیا تھا لیکن وہ تو عموماً یورپ جانے والے دیکھ کے آتے ہی ہیں۔ اصل چیز تو مشاہدے کی ہے، کون کتنا اخذ کرتا ہے۔ کوئی برسوں آنکھیں کھلی رکھنے پر کچھ حاصل نہیں کر پاتا، کسی کے لیے ایک جھلک بہت ہوتی ہے۔ بچپن ہی سے اُس کی حسیات کا عالم دگر تھا۔ ہمیں خوب یاد ہے اُس وقت اس کی عمر بارہ سال ہو گی، اسکول میں زیرِ تعلیم تھا۔ ایک روز ہمیں اُس کے ذوقِ شعر گوئی کا علم ہوا۔ موسمِ بہار پر اُس کی ایک مرصع نظم تھی کہ ہم سب حیران رہ گئے تھے۔ اچھے شعر کہنے لگا لیکن سب کچھ اپنے آپ تک محدود رکھا۔ اُسی زمانے میں مصوری کا شوق ہوا اور صرف مصوری کے مطالعے اور تصویریں دیکھ دیکھ کر ایسی پختہ تصویریں بنانی شروع کیں کہ لوگ یقین نہیں کرتے تھے۔ یورپ میں تصویروں کی نمائش گاہیں دیکھ کے یہ شوق اور فزوں ہوا۔ آپ کو شاید تعجب ہو کہ یہاں نقاشی کا جتنا کام نظر آ رہا ہے، سب اُسی کے بنائے ہوئے خاکوں کا کرشمہ ہے، حتیٰ کہ خطاطی بھی۔ موسیقی کے باب میں بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ ہمارے خاندان کو موسیقی سے ایک خاص شغف رہا ہے۔ والد مرحوم کی حیات تک یہاں نامی گرامی استادانِ فن جمع ہوتے تھے۔ اُن کے بعد اُسی نے یہ روایت زندہ رکھی۔ اُس نے اتنی جلد جانے کہاں سے ایسا درک حاصل کر لیا تھا کہ یہاں پھر وہی جمگھٹ ہونے لگا۔ ہم آپ سے کیا عرض کریں کہ ہمارا بھائی کن گوناگوں صفات کا حامل ہے۔ ہم پانچ بھائی تھے۔ بہن صرف ایک تھی۔ اب ہم صرف دو رہ گئے ہیں اور چھوٹی بہن سلامت ہے ۔۔۔ عالم تاب ہمارا بھائی ہے لیکن یقین کیجیے، ہم نے اُسے اولاد کی طرح

پروان چڑھایا ہے۔"

نواب ابھی تک رُکا ہوا تھا۔ چھوٹے نواب کے ذکر میں وہ ایسا کھو گیا تھا کہ اُسے اپنے اردگرد ہمارے کھڑے رہنے کا احساس بھی نہ رہا۔ بھائی کے نام پر اُس کی آواز ڈگمگانے لگتی تھی۔ سب گم صم کھڑے تھے۔ نواب کی آنکھیں بھیگنے لگیں تو ابا جان نے اُس سے بیٹھ جانے کی درخواست کی۔ ابا جان کی دخل اندازی پر اُس کے جھکے ہوئے شانے سیدھے ہو گئے اور وہ پشیمانی سے بولا "ہمیں وقت کا پھر خیال نہیں رہا۔ آیئے ہم آپ کو آپ کے کمروں تک پہنچا آئیں۔ باقی باتیں انشاءاللہ صبح ہوں گی۔"

وہ مُڑ کے کمرے کے وسط میں ایک کھلے دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا کہ معاً ابا جان نے اُس کا شانہ تھام لیا۔ "نواب صاحب! آپ زحمت نہ فرمایئے۔ ہم خود کمرے تلاش کر لیں گے اور یہ خاں صاحب قبلہ تو راہ بری کے لیے موجود ہیں ہی۔ قطع کلامی سے مراد یہی تھی کہ آپ تشریف رکھیں۔ ہماری فکر نہ کیجیے۔ ہم میں سے کسی کو بھی نیند نہیں آ رہی ہے۔ البتہ آپ کی بے آرامی کا ۔۔۔"

"اب کیسا آرام؟" نواب شکستگی سے بولا۔ "ہم تو اب عادی ہو گئے ہیں۔ ہمیں اپنی نیند لیے تو دن گزر گئے لیکن، لیکن آج ضرور سکون سے سو سکیں گے۔"

ابا جان اُس کا بازو تھامے تھامے اُسے کمرے میں ایک جانب پڑی ہوئی بڑی بڑی کرسیوں کی طرف لے آئے۔ جب تک ہم سب بیٹھ نہیں گئے، نواب کھڑا رہا۔ اسی اثنا میں خاں صاحب نے ہم سے مشروبات وغیرہ کے لیے پوچھا لیکن سب نے شدومد سے منع کر دیا۔ کرسی پہ بیٹھے بیٹھے نواب صاحب کا سینہ ہانپ رہا تھا۔ "تو یہ سب چھوٹے نواب صاحب کی فسوں طرازی ہے؟" منیر علی نے اشتیاق سے کہا۔

"جی!" نواب اکھڑی ہوئی سانسوں سے بولا۔ "سب اُسی کی خلاقی و خیال پردازی ہے۔ اُس کے بغیر یہ ممکن نہیں تھا اور ہم سے تو یہ قطعی ممکن نہ تھا۔ یورپ میں چار سال گزارنے کا موقع ہمیں بھی ملا ہے اور سیر و سیاحت ہم نے بھی خوب کی ہے مگر ہم وہ "یادگار" نقوش اپنے ذہن پر ثبت نہیں کر سکے جو عالم تاب نے محفوظ کیے تھے۔ یہاں واپس آ کے ہمارے مشاغل بھی مختلف رہے، شکار، مطالعہ اور جاگیر وغیرہ کے انتظامات۔ عالم تاب کو جاگیر کے جھگڑوں سے کبھی سروکار نہیں رہا لیکن اپنے خاندان کی انفرادیت قائم رکھنے اور نام روشن کرنے میں جو کچھ عالم تاب نے کیا ہے، ہم سے اس کا عشرِ عشیر بھی نہ ہو سکا۔ اُس کے بغیر عمارت کی کوئی اہم حیثیت ہو سکتی تھی مگر یہ نہیں جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ جب مکمل ہوئی تو دُور دُور تک شہرہ ہوا۔ کئی نوابوں نے عالم تاب سے اپنی عمارتوں کی تعمیر کے لیے مشوروں کی درخواست کی۔ ہمارے عم زاد نواب حشمت جنگ تو گویا عالم تاب کو باقاعدہ گرفتار کر کے لے گئے۔ اُن کی حویلی بھی خوب ہے، کبھی آپ کو دکھائیں گے۔" سب نے ابا جان کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش ہی رہے۔ انھوں نے تو یہ نہیں کہا کہ وہ مذکورہ حویلی دیکھ چکے ہیں۔ "پھر سلسلہ دربار تک جا پہنچا۔" نواب نے بات جاری رکھی۔ "نئے محلات کے لیے عالم تاب کے پاس سواریاں آنے لگیں۔"

"اس عمارت کو بھی محل ہی کہنا چاہیے۔" ابا جان نے قدرے اُونچی آواز میں کہا۔ "کوئی محل بھی اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔"

"ہاں! مگر اب تو کچھ بھی نہیں۔" نواب بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اب تو یہ سب ہمیں کھنڈر نظر آتا ہے جیسے ان در و بام کی روح کوئی کھینچ کے لے گیا ہو۔ عرصے سے کوئی محفل آرائی نہ ہو سکی۔ ایک وقت تھا کہ یہاں آئے دن کوئی نہ کوئی تقریب برپا ہوتی رہتی تھی۔ ہر وقت ایک جشن سا رہتا تھا۔ عالم تاب کی حالت جب بگڑی ہے، حویلی کے مکین گوشہ نشین سے ہو گئے ہیں۔ لوگوں کی آمدورفت بھی کم ہو گئی ہے۔ اب یہاں حکیم، ڈاکٹر آتے ہیں، چند عیادت کرنے والے یا یہاں کے ملازمین ہیں۔ معلوم ہوتا ہے حویلی کو کسی کی نظر لگ گئی ہے۔ عمارت کا ہر گوشہ اپنے خالق کو پہچانتا تھا اور اب اُس کی کبیدہ خاطری پر سوگوار ہے۔ ہمیں تو بہت بعد میں علم ہو سکا۔ ہم سے چھپایا گیا تھا۔ ہماری بہن نے ہم سے چھپایا تھا۔ امی جان نے بھی ہمیں خبر نہ ہونے دی۔ پھر جب ہمیں علم ہوا تو وقت بہت نکل چکا تھا اور ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ عالم تاب جو حسن سر تھا وہ کسی حسن کا اسیر کیسے ہو گیا۔ بہت دنوں سے ہمیں اُس کا رنگ متغیر معلوم ہو رہا تھا۔ بہت دنوں سے ہم محسوس کر رہے تھے کہ عالم تاب بزم آرائیوں سے کچھ کترانے لگا ہے لیکن ہم نے جانا کہ یہ ایک عارضی امر ہے۔ اب وہ عمر کی اُس منزل میں ہے جہاں ایک ٹھیراؤ آ جانا چاہیے۔ ہمارے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ ہم سے زیادہ بھی کوئی اُسے عزیز ہو سکتا ہے۔ خاں صاحب نے جب ہمیں بتایا، اُس وقت ہمارے اختیار میں کچھ نہ رہا تھا ورنہ ہم خود خانم بی بی کے ہاں جا کے عاجزی کر لیتے۔ تاہم ہم نے اپنی جیسی ہر کوشش کر لی۔ عاملوں اور غیب دانوں پر ہمیں کبھی اعتبار نہیں تھا لیکن ہم نے انھیں بھی آزما کے دیکھا۔ جس جس [illegible] کی نشان دہی

کی گئی، ہم نے اُس کی خدمت میں حاضری دی لیکن ہوا وہی جو ہمارے لیے طے کر دیا گیا تھا۔ بہر دوا بے اثر ٹھہری اور تدبیر بے سود قرار پائی۔ عالم تاب اپنے آپ میں گم، اپنے ہم نفسوں سے بے نیاز ہو گیا۔ طبیبوں نے مشورہ دیا کہ اب عیادت کرنے والوں سے معذرت کر لینی چاہیے کیونکہ اُن کی آمد عالم تاب کے لیے اور سرگرانی کا سبب بن سکتی ہے۔ ہمارے لیے یہ انکار مشکل تھا لیکن ہم نے اپنے احباب اور اعزا سے معافیاں مانگ لیں۔ ہم اُس کے لیے ایک چاند سی دُلھن لائے تھے۔ پہلے تو وہ سہرے سے شادی پہ آمادہ نہیں ہوتا تھا لیکن امی جان اور ہماری ضد پر بہر حال اُس نے سپر ڈال دی۔ دُور و نزدیک ہماری نظر ایک ہی لڑکی پہ ٹھہری جو رشتے میں ہماری عم زاد ہوتی ہے، ہمارے بھائی حشمت جنگ کی ہمشیرہ۔ ہم نے حشمت بھائی سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو کشمکش در پیچ میں پڑ گئے۔ گیتی کے لیے خاندان کے ایک بزرگ پہلے سے کسی ذی قدر صاحب زادے کے لیے تجویز پیش کر چکے تھے۔ گیتی کو دربار ہی میں کسی شہزادے کے محل کی زینت بننا چاہیے تھا مگر حشمت جنگ ہماری بات کیسے مسترد کر سکتے تھے۔ خود عالم تاب کو وہ عشق کی حد تک چاہتے ہیں۔ مان گئے اور ہم بہت دُھوم دھام سے گیتی کو دُلھن بنا کے لائے۔ گیتی کو سُکھ کے چند سال، دو ڈھائی سال ہی دیکھنا نصیب ہوئے تھے کہ عالم تاب پہ یہ گاثی چھا گئی۔ اُسے اپنی ضعیف ماں کا بھی خیال نہ رہا، اپنے بڑے بھائی کا بھی نہیں، جس نے پہلے ہی کم صدمے نہیں سہے۔ اُسے معلوم ہے کہ اُسے دیکھے ہوئے دیر ہو جاتی ہے تو ہمارا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ اُسے سب کچھ معلوم تھا پھر اُس نے ہمیں اتنی بڑی آزمائش میں کیوں ڈالا۔ بھلا بھائی ہم سے۔۔۔۔" نواب اپنے آنسو ضبط نہ کر سکا، اُس کی آواز حلق میں ڈوب گئی۔

ابا جان نے تسلی کے دو لفظ کہنے چاہے تو اُس کی سسکیاں نکل پڑیں۔ سب پریشان ہو گئے۔ نواب کی طرف نگاہ نہیں اُٹھائی جا رہی تھی، اُس کا وجود ریت کا ڈھیر معلوم ہوتا تھا۔ میری آنکھیں بھی جلنے لگی تھیں۔ نواب نے اپنا چہرہ رومال سے چھپا لیا تھا اور بچے کی طرح پھڑک پھڑک کے رو رہا تھا۔ شاید بہت دنوں سے اُس کے آنسو رکے ہوئے تھے۔ میرا جی چاہا کہ میں جھپٹ کے اُسے گلے لگا لوں۔

"ایسا، کبھی ایسا ہی پھیر ہو جاتا ہے نواب صاحب!" پیرو نے اٹکتی زبان سے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ "آدمی دوسرے کو کیا اپنے آپ کو بھی دکھائی نہیں دیتا۔ پر تسلی رکھو، ابھی سب دُور ہو جائے گا۔ سب ابھی ایک دم ختم۔ سمجھو نواب صاحب!"

"ہاں نواب صاحب!" ابا جان اُمڈتی آواز میں بولے۔ "حوصلہ رکھیے، آپ نے تو خود ابھی فرمایا ہے کہ سب کچھ لکھا ہوا ہے۔ اپنا لکھا ہوا مٹانے کی قدرت بھی اُسی کو ہے۔ آدمی اپنی سی کرتا ہے لیکن وقت کی گردش کس نے روکی ہے۔ کبھی کوئی شخص کسی کو۔۔۔۔" جانے کیوں ابا جان کی آواز کپکپانے لگی اور اُنھوں نے اپنے ہونٹ سی لیے۔ میری طرف اُنھوں نے نہیں دیکھا تھا لیکن میرا سارا جسم لرز کے رہ گیا۔ ضرور اُن کا اشارہ میری طرف تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہوں گے کہ کبھی کوئی شخص سارے رشتے ناتے توڑ کے ایسے ہی کسی پر چھا جاتا ہے۔ کبھی کوئی شخص کسی کے اتنا قریب آ جاتا ہے کہ اُس کی اوٹ میں ساری دنیا اوجھل ہو جاتی ہے۔ گویا ابا جان کو احساس ہو چلا تھا۔ اتنے عرصے زمانے کی نیرنگیاں دیکھ کے اور بد رنگی خاک چھان کے اُن کی سمجھ میں یہ بات آ گئی تھی۔ کاش وہ اُسی رات کچھ جان لیتے جب کورا اُن کے گھر میں پناہ حاصل کرنے آئی تھی۔ میں نے اُن سے اصرار نہیں کیا تھا۔ میں اُن کے سامنے یہ بات کس طرح کہہ سکتا تھا کہ کورا مجھے بہت اچھی لگتی ہے مگر اُنھیں خود بھی تو کچھ جاننا چاہیے تھا۔ بڑا نواب کہہ رہا تھا کہ اگر اُسے وقت پر خبر ہو جاتی تو وہ خود خانم کے در پہ حاضری دیتا۔ ابا جان نے تو کورا کو گھر سے نکال دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اُن کے فیصلے میں ذرا بھی لچک نظر آتی تو میں گھر سے نکلنے پر کیوں مجبور ہوتا، پھر کچھ نہ ہوتا۔ نہ مجھے سات سال جیل کاٹنی پڑتی، نہ بھرا گھر اجڑتا، نہ امی کو بے وقت موت آتی ورنہ ممی۔۔۔ ابا جان کو کبھی اپنی بیوی، بیٹی، اپنے گھر کی یاد آتی ہوگی مگر اب اس سے کیا حاصل۔ امی اور ممی تو لوٹ کے نہیں آسکتی تھیں۔

کمرے میں نواب کی گھٹی گھٹی سسکیاں گونج رہی تھیں۔ پیرو اور ابا جان کی تسلیاں مہمیز ثابت ہوئیں۔ اگر وہ مجھل کی طرح بے حس و حرکت بیٹھے رہتے تو شاید نواب کا یہ حال نہ ہوتا۔ اُسے تو بس شانے کی دیر تھی۔

ہم بھرے بیٹھے ہیں یوں راگ میں جیسے باجا
اِک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے!

پیرو واقعی بھول چکا تھا کہ کل رات تک ہم اسی حویلی میں قید تھے مگر خود میرا جی بھی نواب کو تھامنے، کسی طرح اُس کے آنسوؤں کا سیلاب روکنے کے لیے اُمڈ رہا تھا۔ نواب کی آواز میں سوز سا لیا

تھا کہ وہ آدمی کی رگوں میں اُتر جائے۔ میں تو ابا جان اور منیر علی کی وجہ سے سہما بیٹھا رہا۔

بہت دیر بعد نواب کو ہوش آیا مگر پیرو، منیر علی اور ابا جان کی تشفیوں سے کم اور خاں صاحب کی دخل اندازی سے زیادہ۔ خاں صاحب دیر تک نواب کی کرسی کے عقب میں بیٹھے رہے۔ پہلے اُنھوں نے جان کے نواب کو نہیں ٹوکا ہوگا کہ آنسو تو جسم میں سلگتی آگ کی طرح ہوتے ہیں، اُن کا بہہ جانا ہی ٹھیک ہوتا ہے، اور ایسے لوگ روتے کب ہیں۔ سُنا ہے، وہ ہر وقت بندھے ہوئے اکڑے ہوئے رہتے ہیں اور ملازمین کے سامنے تو بالکل پتھر بن جاتے ہیں۔

معلوم نہیں، وہ سب کب تک وہاں بیٹھے رہے، ہم تینوں اُٹھ کے چلے آئے تھے اس لیے کہ بُجھل نے ہمیں اُٹھ جانے کا اشارہ کر دیا تھا۔ خاں صاحب نے ہمیں بالائی منزل کے دوسرے حصے میں پہنچا دیا۔ یہ حصہ پہلے والے حصے سے ملحق تھا مگر بالکل مختلف۔ یہاں کا منظر ہی اور تھا۔ خاں صاحب نے میرے، کانتے اور زورا کے لیے الگ الگ کمرے تفویض کیے تھے۔ یہاں سے وہاں تک پھیلے ہوئے کمرے لیکن اُن کے جاتے ہی ہم تینوں ایک کمرے میں چلے آئے۔ جس وقت ہم اُٹھ رہے تھے، ہمیں دیکھ کے نواب بھی کھڑا ہو گیا تھا مگر بُجھل اور ابا جان نے اُسے روک لیا۔ کہا نہیں جا سکتا کہ ہمیں اشارہ کرنے میں بُجھل کی کون سی مصلحت تھی، وہ ہم تینوں کے پیچھے نواب کون سی بات کرنا چاہتا تھا یا اُس نے محض ہمارے آرام کی خاطر اپنے طور پر ہمیں آزاد کر دیا تھا۔ نواب کے سامنے سے اُٹھنے کو ہمارا جی نہیں کرتا تھا۔ ہر چند اُس وقت جب وہ نواب عالم تاب کی کیفیت کا ذکر کر رہا تھا اور خانم کا نام اُس کی زبان پہ آیا تھا، مجھے دھڑکا لگا ہوا تھا کہ اُسے ہمارے مابین رشتوں کا علم نہیں ہے، کہیں اُس کے منہ سے کوئی ایسی ویسی بات نہ نکل جائے جو میری اور ابا جان کی موجودگی میں مناسب نہ ہو مگر نواب نے بہت احتیاط کی، کہیں بھی شائستگی کا دامن اُس کے ہاتھ سے نہیں چھوٹا تھا۔

کمرے میں نیند نہیں آئی۔ ہم باہر نکل آئے۔ رات کا سناٹا ہر سُو چھایا ہوا تھا۔ اُس حصے کے صحن میں بھی بڑا سا باغیچہ لگایا گیا تھا۔ طرز ملی ہوئی تھی اور درمیان میں مجسمے کی طرح کئی سمتوں میں پانی برسانے والا فوارہ نصب کیا گیا تھا۔ سبزہ بھیگا بھیگا سا تھا اور فضا میں خنکی گھلی ہوئی تھی۔ زورا اور کانتے بھی میرے ساتھ سبزے ہی پہ پھیل گئے۔ دونوں نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی، بس آسمان تکتے رہے۔ میرا بھی بات کرنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ میں نے آنکھیں موندنے کی کوشش کی لیکن مجھے کسی غفلت کا احساس ہوا جیسے آنکھیں بند کرنے سے کوئی منظر نکل جائے گا۔ میرا دل بار بار دھڑ دھڑانے لگتا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب یہ کاہے کی دھڑکن ہے۔ اب مجھے راستہ بدل جانے اور بمبئی پہنچنے میں دیر ہو جانے، بارہ دن نواب کی قید میں گزارنے کا پچھتاوا نہیں تھا۔ بے شک اِن سب کے بدلے میں ایک شخص کی خوشی، ایک شخص کی زندگی بڑی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر ہم اچانک راستہ بدل کے حیدر آباد آنے کا ارادہ نہ کر لیتے تو خانم عالم تاب کو نہ ملتی اور جانے اُس پہ کیا گزر جاتی۔ مراد آباد میں سونو صاحب کا پتہ ملنا تو ایک بہانہ تھا۔ اصل میں اِس طرح نواب عالم تاب کی مراد بر آئی تھی۔ کہتے ہیں طلب کا سچا ہونا لازم ہے، اسباب خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو میری طلب میں کوئی کھوٹ ہی ہوگی اور وہی کورا کو مجھ سے دُور کیے ہوئے ہے مگر یہ کس طرح ممکن ہے۔ میں تو جب سے، اُس رات سے جب کورا مجھ سے جدا ہوئی ہے۔۔۔۔ یہ تو میں جانتا ہوں، کم از کم میرے دل کا حال تو مجھ پہ عیاں ہے۔ میرا تو ہر لمحہ اُسی کے لیے دعا کرتا رہا ہے۔ اُس کی ایک ایک بات میرے دل پہ نقش ہے۔ اُس رات کا ایک ایک واقعہ اور اُس سے پہلے اُس کے ساتھ گزرا ہوا ہر لمحہ، اُس کی باتیں، اُس کی صورت، اُس کی خوشبو، جب اُس نے ہوٹل کے کمرے میں میرے چہرے پہ اپنے ریشم ایسے بال بکھیر دیے تھے۔ یہ سب کچھ میری آنکھوں میں کُھبا ہوا ہے۔ میں تو اُسے، اُس کی خوشبو سے پہچان سکتا ہوں۔ شب و روز میں کتنی بار مجھے اُس کی آہٹوں کا گمان ہوتا ہے۔ اگر بھی کسی لمحے اُس کے اور میرے درمیان پردہ بھی حائل ہو گیا ہے تو پردے کے پیچھے وہی رہی ہے۔ بس یہ اتفاق کی بات ہے یا قسمت کی۔ اگر ہم دلی سے حیدر آباد کے لیے راستہ نہ بدلتے تو خانم عالم تاب کو نہ ملتی مگر سونیا تو بچ جاتی۔ سونیا کی موت اُسے کھینچ کے لائی تھی یا یہ نواب عالم تاب کی طلب کا اثر تھا۔

اوس نے سارے کپڑے بھگو دیے تھے لیکن نمی اچھی لگ رہی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ کانتے اور زورا بھی سبزے پہ کروٹیں بدلتے ہوئے میرے قریب آ گئے۔ کانتے نے اپنا بازو پھیلا کے میرے لیے تکیہ بنا دیا۔ میں نے بھی اُس کا سر اپنے بازو پہ رکھ لیا۔ رات کا آخری پہر ہوگا۔ دونوں ابھی تک جاگ رہے تھے۔ میں نے اُن سے نہیں پوچھا کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں۔ سوچ رہے ہوں گے دیکھیے اب وہ داتا کہاں کھینچ کے لے جاتا ہے مگر اب وہ داتا کیا، سب کچھ تو مجھ پر منحصر ہے۔ سوچتے ہوں گے کہ دیکھیں اب کون

ساتھ تماشا دکھانے کا سودا میرے سر میں سما آتا ہے۔ بہرحال، چند دن کی گرہ اور رہ گئی تھی۔ کل پرسوں، قریب تھا کسی دن نہیں بمبئی کے لیے روانہ ہو جاتا ہے۔ انھیں جتانے کی ضرورت نہیں تھی، میں نے پہلے ہی دل میں طے کر لیا تھا کہ اب گھر کے سوا کہیں نہیں جاؤں گا۔ میں اُن سے لاکھ منت کروں کہ وہ میرے پیچھے کیوں آتے ہیں، نہ آیا کریں مگر وہ کبھی نہیں مانیں گے۔ میں نے اُن سے الگ جا کے بھی دیکھ لیا ہے۔ وہ میرے ساتھ نہیں تھے لیکن سب میرے لیے کچھ بے چین تھے۔ میاں بیگم کی ایک اطلاع پر جھٹل بمبئی دوڑا آیا تھا۔ جھٹل کو مجھ پر اعتبار ہی نہیں ہے کہ میں تنہا اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکتا ہوں۔ میں انھیں کیسے روک سکتا ہوں کہ وہ میری پروا نہ کریں۔ میری وجہ سے کیوں اپنے دن اجیرن کرتے ہیں، میرا کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ یہی اُن کے قرار کے لیے مناسب ہے کہ میں اُن کے سامنے رہوں۔ میں اُن کے سامنے ہی رہوں گا۔ ابا جان نے اب کہیں نہ کہیں تو مستقل بسنے کا ارادہ کیا ہوگا۔ اگر انھوں نے مجھ سے مشورہ کرنا مناسب سمجھا تو میں فیض آباد کی رائے دوں گا۔ زریں کی حویلی بہت بڑی ہے، کئی خاندان سما سکتے ہیں ورنہ جہاں وہ رہیں گے، میں بھی انھی کے ساتھ رہوں گا۔ پھر زریں اور نیساں بھی لازماً ہمارے ساتھ رہیں گی۔ ممکن ہے ابا جان نے یہیں حیدرآباد میں رہنے کا ارادہ کر لیا ہو۔ ممکن ہے نواب حشمت جنگ سے راہ و رسم بڑھانے کے علاوہ یہاں حویلی خریدتے ہیں اُن کی اس خواہش کو بھی دخل رہا ہو۔ ویسے ایک حویلی کی خریداری سے اُن کے لیے فرق ہی کیا پڑتا ہے۔ زریں کی حویلی کے تہ خانے میں پتھروں سے اٹے کئی صندوق پڑے ہیں۔ ابھی تو انھوں نے صرف چند پتھر نکالے ہیں۔ سو ایک حویلی اس شہر میں بھی سہی۔ امیر لوگ ہر جگہ گھر بنا لیتے ہیں۔ بہرحال وہ کہیں بھی رہیں، میں اب کہیں نہیں جاؤں گا۔ کیا عجب کسی دن وہ یوں ہی اچانک مجھے مل جائے۔ کوئی ایسا حادثہ ہو جائے جیسے نواب عالم تاب کو خانم مل گئی۔ ہو سکتا ہے کبھی مولوی صاحب اُس کی نگرانی کرتے کرتے تھک جائیں اور انھیں میری یاد آ جائے، انھیں خیال آ جائے کہ وہ کسی کی امانت ہے۔ مجھ تک پہنچنا اُن کے لیے کچھ مشکل نہیں۔ انھیں کلکتہ جہیں سے جھٹل کے اڈے کا اور جھٹل کے اڈے سے فیض آباد کا پتہ معلوم ہو سکتا ہے لیکن انھیں میری جستجو ہو بھی تو۔

میں رات بھر اپنے آپ سے سرگوشیاں کرتا رہا۔ وہی کچھ دہراتا رہا جو اشارے کنایوں میں دوسرے مجھے جتانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کوئی نہیں سمجھتا کہ آدمی اپنے آپ سے بھی بہت کچھ کہتا، اپنے آپ کو بہت کچھ سناتا ہے۔ سب کچھ میری سمجھ میں آتا تھا لیکن سبھی کچھ کسی بھی لمحے میرے ذہن میں منتشر ہو جاتا تھا۔ میں نے پہلے بھی کتنی بار اپنے آپ سے عہد کیے تھے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہر ارادے کو ایک عمر لازم ہے۔ اب مجھے اپنے آپ کو باندھ کے ہی رکھنا پڑے گا۔ آدمی کی زندگی صرف اپنی نہیں ہوتی۔ دوسرے بھی اُس میں شامل ہوتے ہیں۔ پہلے کی بات اور تھی۔ ابا جان نہیں ملے تھے اور محض خوش قسمتی سے نہیں مل گئے ہیں۔ ہم نے اُن کی تلاش میں کہاں کہاں خاک نہیں چھانی۔ جہاں جہاں ہم مولوی صاحب کو پوچھتے تھے، ابا جان کو بھی معلوم کرتے تھے۔ وہ مل گئے، جہاں گیر مل گیا۔ فرخ، فریال، ندیم اور اکبر بھی اب دُور نہیں ہیں۔ صرف چند دنوں کی دیوار حائل ہے مگر۔۔۔ مگر جو بیٹا ہے، وہ کہیں پھر نہ بکھر جائے۔ ابا جان کو بھی اب تبت کے قدیم تہ خانے میں چھپے ہوئے باقی پتھر لانے کی بے چینی نہیں ہوگی۔

رات بھر میں وہ لمحہ درگزر کر دینے کی ہمت استوار کرتا رہا جب میرے قدم بہکنے لگتے ہیں اور سب کچھ ریت کے محل کی طرح منہدم ہو جاتا ہے۔ جتنا میں اپنے سینے میں اپنا عزم توانا محسوس کر رہا تھا، اتنا ہی میرا جسم ٹوٹ کر ڈھیر ہوتا جا رہا تھا۔ میری رگوں میں سردی سی بیٹھنے لگی تھی جیسے میں اپنے آپ سے دور ہو رہا ہوں۔

فجر کی اذان کے وقت مجھے وقت کا اندازہ ہوا۔ اذان کی آواز سن کے کانپتے مر مر کے اُٹھ بیٹھا۔ ابھی اندھیرا بہت گہرا تھا۔ کانتے اور زورا اپنے اکڑتے ہوئے ہاتھ پاؤں کھولنے کے لیے ملنے لگے۔ اندھیرا پھیکا پڑنے پر ہم نے اپنے کمروں کا رُخ کیا۔ ہر کمرے میں الگ ایک غسل خانہ تھا اور خاں صاحب نے ہمیں بتایا تھا کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو دیوار کے ساتھ لٹکی ہوئی نقرئی زنجیر کھینچ دی جائیں، ملازمین فوراً حاضر ہو جائیں گے کیونکہ وہ انھی کمروں سے پیوستہ عقبی حصے میں ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ آمد و رفت کے لیے اُن کے راستے بھی مختلف ہیں اور شب و روز میں مقررہ اوقات کے علاوہ وہ کبھی ہی حویلی کے ان حصوں میں نمودار ہوتے ہیں۔ میرا سارا جسم چپ چپا رہا تھا۔ کل شام ہی ابا جان کی حویلی میں کپڑے تبدیل کیے تھے مگر اوس کی وجہ سے گیلے اور مسکے ہوئے ہو گئے تھے لیکن دوسرے کپڑے موجود ہی نہیں تھے۔ میں نے انھیں کھینچ کھینچ کے شکنیں درست کیں اور غسل خانے میں تولیوں کے اسٹینڈ پر پھیلا دیا۔ گرم اور ٹھنڈے پانیوں کے نل الگ الگ تھے اور سارا غسل خانہ

تک سنگ مرمر کا بنا ہوا تھا۔ تین اطراف دیواروں میں قدِ آدم شیشے جڑے ہوئے۔ چینی کا ایک بڑا ٹب بھی موجود تھا۔ میں دیر تک نہاتا رہا۔ مجھے کچھ تازگی سی محسوس ہوئی۔ کپڑے اتنے سوکھے نہیں تھے۔ میں نے انھیں یوں ہی پہن لیا، جسم پر کپڑے ویسے بھی جلد خشک ہو جاتے ہیں۔ باہر سویرے کی دھند چھٹ رہی تھی۔ باغیچے میں مالی آ پہنچے تھے اور کئی خدمت گار فرش کی صفائی کر رہے تھے۔ میں نے جالیوں کی دیوار سے باہر جھانک کے دیکھا۔ نچلی منزل کا ایک حصہ اور حویلی کے اطراف میں دُور تک پھیلا ہوا باغ یہاں سے صاف نظر آ رہا تھا۔ پرندوں نے شور و غوغا مچا رکھا تھا۔ نیچے ملازموں کی چلت پھرت لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی اور روشنی بھی چپکے چپکے نکھرتی جا رہی تھی۔ ہم یہاں بارہ دن رہے تھے اور ہمیں کچھ اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ حویلی میں صبح کے وقت اتنی چہل پہل ہوتی ہے اور حویلی کا باغ اتنا وسیع اور سرسبز ہے۔ جا بجا پھولوں کے کنج تھے، فوارے، نہریں اور مصنوعی پہاڑیاں۔ زنداں میں تو ہر موسم ایک جیسا ہوتا ہے۔ یہاں ہم رات کو بھی آئے تھے، رات ہی کو یہاں سے رہائی نصیب ہوئی تھی۔ میرے جی میں آیا کہ نیچے جا کے باغ میں گھوموں مگر کانتے اور زورا ابھی تک اپنے کمروں میں تھے۔ میں وہیں کھڑا آتے جاتے ملازمین کو دیکھتا رہا۔ ان سب کو کوئی جلدی معلوم ہوتی تھی۔ ہو سکتا ہے ہر روز ہی اُن کا یہ معمول رہتا ہو یا آج کوئی خاص بات ہے، آج حویلی میں بڑے نواب کے بقول نہایت معزز مہمان آئے ہیں۔ اُن سے چھپا نہیں رہا ہوگا کہ ہمارے ساتھ آنے والی خاتون کون ہے اور اُس کی آمد پر ساری حویلی کیوں زیر و زبر ہو گئی ہے۔ اُن کے لیے یہ بھی کچھ کم حیرت کی بات نہ ہوگی کہ ایک دن پہلے انھوں نے جن لوگوں کو قیدی کی حیثیت سے دیکھا تھا آج انھیں مہمانی کا شرف حاصل ہے۔ اُن میں سے کتنوں کے سامنے میں اور پہرہ بندوق کی زد پر بڑے نواب کو حویلی سے لے گئے تھے۔ اُس رات چھوٹے نواب کی بیگم نے ہمیں بتایا تھا کہ حویلی کے ملازم اپنے چھوٹے مالک سے اس قدر وابستہ تھے کہ اب بھی ویران ویران معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے اُن کے چہرے پڑھنے کی کوشش کی لیکن ایسے کیا معلوم ہو سکتا تھا۔ مجھے یہ جاننے کی بے تابی تھی کہ خانم کو دیکھنے کے بعد نواب عالم تاب پر کیا گزری ہوگی۔ رات سے کتنی مرتبہ میری آنکھوں نے اُس منظر کو تصور کیا تھا جب خانم نواب عالم تاب کے سامنے پہنچی ہوگی۔ چھوٹے نواب پر تو سکتہ طاری ہو گیا ہوگا۔ اُسے پہلے تو اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا ہوگا۔ اتنے انتظار کے بعد کوئی یوں اچانک سامنے آ جائے تو آدمی پاگل بھی ہو سکتا ہے۔ کاش میں بھی وہاں ہوتا مگر وہاں تو شاید خانم کے سوا کوئی موجود نہ ہو۔ وہ منظر تصور ہی کیا جا سکتا تھا اور اس کے تصور سے میرا سارا جسم دھڑکنے لگتا تھا۔ رات خانم کو زنان خانے پہنچانے کے بعد سے اب تک اُس کی کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ خبر ملتی بھی کیسے، ایک ہی رات درمیان میں گزری تھی اور آدھی رات تک بڑے نواب ہمارے ساتھ رہا تھا۔

میں وہیں جھروکے کے پاس کھڑا رہا اور مجھے کچھ احساس ہی نہیں ہوا کہ صبح کی روشنی کتنی پھیل گئی ہے۔ کانتے اور زورا ابھی تک باہر نہیں نکلے تھے۔ میں انھیں دیکھنے کے لیے وہاں سے ہٹنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ میں نے اپنے کمرے کی جانب سے ایک لڑکی کو جھجکتے انداز میں اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ میری ہی طرف آ رہی تھی۔ میں سیدھا کھڑا ہو گیا۔ وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر آ کے ٹھہر گئی۔ اُس نے لجاتے ہوئے جھکتے میں مجھے آداب کیا۔ میں نے بھی جواب میں جلدی سے اُسے آداب کیا۔ وہ پیازی کرتا پاجامہ پہنے ہوئے تھی، ہرے دوپٹے کے آدھے گھونگھٹ میں اُس کا چمپئی چہرہ چمک رہا تھا۔ اُس کی عمر اٹھارہ بیس برس سے زیادہ نہیں ہوگی۔ وہ خادماؤں کے لباس میں نہ ہوتی تو کوئی بھی اُسے حویلی کے خاندان کا فرد سمجھتا۔ اُس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں اور ہونٹ لرز رہے تھے۔ چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا، ایک جا رہا تھا۔ اُس کے بائیں ہاتھ میں تازہ گل دستہ تھا۔ آداب کے بعد وہ کچھ کہنے کے لیے ہمت مجتمع کرتی رہی۔ میرے حواس بھی منتشر ہو گئے تھے۔ "بندی زنان خانے سے آئی ہے۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"جی، جی!" میں نے چونک کے کہا۔ "کہیے؟"

"چھوٹی بیگم اور بی بی صاحب نے آپ کو یہ گل دستہ بھیجا ہے۔" وہ گل دستہ میری طرف بڑھاتے ہوئے جھجکتے جھجکتے بولی۔

"میرے لیے؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"جی! انھوں نے کہا ہے، یہ اُن کی طرف سے قبول کیا جائے۔"

اُس کی آواز کسی قدر سنبھل گئی تھی۔

میں نے گل دستہ اس کے ہاتھ سے لے لیا تھا مگر کوئی جواب نہ دے سکا۔ اُس نے انتظار بھی نہیں کیا اور اُس کی چلتی آواز میرے کانوں میں گونج گئی۔ "اور انھوں نے پیغام بھیجا ہے، اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو۔" اُس کا بدن تھرتھرا رہا تھا۔ سانس لے کے بولی۔ "وہ آپ

کی خدمت میں آنے کی خواہش مند ہیں، یا آپ مناسب خیال فرمائیں تو زنان خانے میں تشریف لے آئیے۔"

"انھوں نے مجھے، مجھے یاد فرمایا ہے؟"

"جی" وہ سر جھکائے جھکائے بولی۔

"کہاں ہیں وہ؟" میں نے بدحواسی سے پوچھا۔

"وہ پیچھے زنان خانے کی طرف ہیں۔"

اس کے جواب سے مجھے احساس ہوا کہ بھلا یہ پوچھنے کی بات تھی۔ مجھے خاموش دیکھ کے وہ شائستگی سے بولی "اور انھوں نے کہا ہے کہ وہ آپ کی منتظر رہیں گی۔"

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دوں۔ اب وہ دونوں مجھ سے کون سی بات کرنا چاہتی ہیں۔ ایک بات کے سوا کیا بات ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے کچھ اور بات ہو۔ انکار بھی مناسب نہیں تھا اور یقیناً میرے دل کے کسی گوشے میں انھیں دیکھنے کا اشتیاق بھی تھا۔ رات ان کی بس ایک جھلک دیکھی تھی۔ اب تو وہ بہت خوش ہوں گی۔ انھی سے مجھے نواب عالم تاب کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا "مگر وہ کیوں زحمت فرمائیں، میں خود حاضر ہو جاؤں گا۔"

وہ کھڑی اپنے دوپٹے کا پلو نوچتی رہی اور دبی آواز میں بولی۔

"ابھی چلیے گا؟"

"ابھی؟" میں نے متذبذب سے کہا۔ "کیا انھوں نے ابھی کے لیے کہا ہے؟"

"جی نہیں" وہ تیزی سے بولی۔ "مگر وہ بہت مشتاق ہیں۔"

"بہتر ہے" میں نے غیر اختیاری طور پر کہہ دیا۔ اس نے پہلی بار سر اٹھا کے مجھے جھلملاتی آنکھوں سے دیکھا۔ اس کا چہرہ بھی مجھے کچھ اور روشن ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا اسی سے چھوٹے نواب کے بارے میں کچھ پوچھوں لیکن میں چپ ہی رہا۔ اس نے مجھے ایک جانب چلنے کا اشارہ کیا تھا۔ گل دستہ میرے ہاتھ میں تھا گلاب کے پھولوں کی خوشبو نے میرے گرد ایک ہالہ سا بنایا ہوا تھا۔ دالان میں آکے مجھے اپنے لباس کا خیال آیا۔ صبح کے کی تیز ہوا نے کپڑے خشک کر دیے تھے البتہ شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ اس حلیے میں ان کے سامنے جاتے ہوئے اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن انھوں نے پہلی بار زنداں میں مجھے کون سے اچھے حال میں دیکھا تھا۔ کل تک تو میں ان کی حویلی کا قیدی ہی تھا۔ دالان سے گزر کر وہ چند قدم دور گئی جیسے ایک راہداری میں آگئی۔ آگے جا کے جانے کیوں میرا جی گھبرانے لگا۔ میرا یوں زنان خانے میں جانا بے محل تو نہیں ہے؟ بڑے نواب نے رات ہمیں کھلی اجازت دے دی تھی اور رات وہ مجھے اپنے ساتھ زنان خانے میں لے بھی گیا تھا لیکن اس وقت کی بات اور تھی اور یہ اجازت محض حسن ظن بھی ہو سکتی ہے۔ سوچا، خادمہ کو منع کر دوں، پھر کسی وقت آجاؤں گا مگر وہ پیچھے ہوئی وہیں راہداری کے وسط میں بنے ہوئے ایک زینے میں اتر گئی۔ میں نے جھجکتے قدموں سے اس کی پیروی کی۔ وہ بار بار مڑ کے پیچھے دیکھتی تھی کہ میں کہیں راستے میں اس سے بچھڑ نہ جاؤں۔ اس کی رفتار سے اضطراب صاف نمایاں تھا۔ چند سیڑھیوں کا زینہ طے کر کے ہم پہلی منزل پر پہنچے یہ زنان خانے ہی کا حصہ تھا۔ زینے کے بعد وہ ایک کمرے میں چلی گئی۔ یہ ایک روشن اور مختصر نشست گاہ تھی۔ فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک جانب تخت پر گاؤ تکیے اور بیٹھنے کے لیے ادھر ادھر دیواروں کے ساتھ گدے رکھے تھے۔ خادمہ نے مودبانہ مجھے وہاں بیٹھنے کی درخواست کی اور بولی کہ وہ اطلاع کر کے ابھی آتی ہے۔ اس کے چہرے پر کسی لمحے ایسی حیران حیران سادگی عود کر آتی تھی کہ بس دیکھتے رہیے۔ بت بنے کی طرح مجھے لگے اس کی آنکھیں جھجکتی تھیں۔ میں یہاں آ تو گیا تھا لیکن میرا جی لوٹ جانے کو کرتا رہا۔ ابھی خادمہ کو گئے ہوئے چند منٹ سے زیادہ نہ ہوئے ہوں گے کہ دروازے سے ان کی آہٹیں سنائی دیں۔ میری سانس بند ہونے لگی۔ ان کے آنے سے پہلے میں اپنی نشست سے کھڑا ہو گیا۔ وہ دونوں ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئیں۔ میری آنکھوں میں ایک ثانیے کے لیے دھند چھا گئی۔ میں دن کی روشنی میں انھیں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ دن کی روشنی میں رنگ ایسے نمایاں ہو جاتے ہیں، مجھے اس کا اندازہ شاید پہلے کبھی آشنا نہیں ہوا تھا۔ سرخ اور سفید رنگ ان کے چہروں سے ابل سا رہا تھا۔ شہابی رنگ کی جیسے شعاعیں پھوٹی پڑتی ہوں۔ ان کے نقش و نگار بھی میری آنکھوں میں پہلے اتنے روشن نہیں تھے۔ دونوں سادہ لباس پہنے ہوئے تھیں۔ دودھیا آڑا پاجامہ، بند گلوں کے ہلکے نیل گوں جمپر، دوپٹے بھی ان کے اسی رنگ کے تھے۔ اس رات بھی دونوں ایک ہی طرز کا لباس پہنے ہوئے تھیں۔ وہ کوئی پہلی مرتبہ میرے سامنے نہیں آئی تھیں لیکن مجھے لگ ایسا ہی رہا تھا۔ دونوں کو سانچے میں ڈھالا گیا تھا۔ ان کی نازک اندامی اور تر و تازگی دیکھ کے معلوم ہوتا تھا کہ آج ہی بلکہ ابھی آسمان سے زمین پر اتری ہیں۔ ان کے آداب کے جواب میں میں نے بھی بولا سے انھیں سلام کیا۔ وہ میرے سامنے کی دیوار کے ساتھ رکھے ہوئے گدے والی پر خاص انداز سے بیٹھ گئیں۔ ان کے لباس کی بھینی بھینی خوشبو کمرے میں پھیل گئی تھی۔ میں نے کن انکھیوں سے انھیں دیکھنے کی کوشش کی لیکن ان کی طرف نظر بھر کے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ "ہم آپ کے شکر گزار ہیں کہ آپ نے یہاں آنے کی زحمت کی۔" چھوٹے نواب کی بیگم نے حسن حجابانی آواز میں کہنے کی کوشش کی۔

مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ میں ہونٹ کاٹتا رہ گیا۔

"ہمیں یقین نہیں تھا کہ ہم دوبارہ کبھی آپ سے مل سکیں گے۔" پہلے لمحے میں بولی "لیکن ہماری تمنا تھی کہ ہم، ہم۔۔" وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

"آپ کیسی ہیں؟" میں نے بمشکل تمام کہا۔

"ہم کیا بتائیں" وہ اضطراری انداز سے بولی۔ "ہم نے زندگی میں کبھی ایسا سکون، ایسا سکھ نہیں دیکھا تھا۔ سب آپ کا دیا ہوا ہے۔ ہم آپ کا کس طرح، کن لفظوں میں۔۔۔"

"نہیں، نہیں" میں نے حواس باختگی سے کہا۔ "آپ کچھ نہ کہیے۔ ازراہ نوازش اب آپ کچھ نہ کہیے۔ رات بڑے نواب صاحب ہی بہت کچھ کہہ چکے ہیں۔"

"ہمیں اندازہ ہے، انھوں نے کس طرح اپنے آپ کو سنبھالا ہوگا۔ ہمیں بھی آپ کے سامنے آنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی لیکن پھر شاید ہم اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکتے تھے۔"

"ہم نے آپ سے پہلے کہا تھا" میں نے زیر لب کہا۔ "ہم یہاں سے نکل کر سیدھے خانم آپا جی کے پاس جائیں گے اور کوشش کریں گے کہ انھیں یہاں آنے پر آمادہ کر لیں مگر۔۔۔"

"ہمیں یقین آگیا تھا" وہ بے قراری سے بولی۔ "یقین کیجیے ہمارے اختیار میں ہوتا تو ہم ایک لمحے کی تاخیر نہ کرتے اور ہمارے اختیار میں ہوتا تو ہم کبھی ایسا کرتے بھی نہیں۔ یہاں شہر میں آپ کی موجودگی کا علم ہونے پر ہم آپ کی خدمت میں یوں بھی حاضر ہو جاتے۔ آپ کے یہاں سے آنے کے بعد ہم لوگ مسلسل اپنی جیسی کوششیں کرتے رہے۔ ہم نے آپ کی نگرانی کرنے والے خادموں سے رابطہ قائم کیا اور انھیں ایک لمحے کی غفلت کے لیے انعام و اکرام یا یوں کہیے کہ رشوت کی پیش کش بھی کی لیکن کوئی تدبیر کارگر نہ ہو سکی۔ آخر ہم نے زندگی میں پہلی مرتبہ ایک جرأت کی، ہم دونوں نے بھائی جان کے پاس جا کے آپ کا ذکر کیا۔"

"آپ نے بڑے نواب صاحب کو بتایا تھا کہ آپ ہمارے پاس آئی تھیں؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"نہیں، ہم ان سے یہ اعتراف کس طرح کر سکتے تھے بھلا گھر کے مردوں کے معاملات میں زنان خانے کی بی بیاں تو

دینے کی رسم نہیں ہے لیکن ہم نے یہ رسم توڑ ڈالی۔ ہمیں ڈر تھا کہ جمالی بھائی ہماری اس گستاخی پر بہت برہم ہوں گے۔ ہم اشارۃً ہی اُن سے آپ کا تذکرہ کر سکتے تھے۔ وہ ہماری زبان پر آپ کا ذکر سُن کر بہت حیران ہوئے۔ یقیناً انھیں غصہ بھی آیا ہوگا۔ ہماری توقع کے خلاف اُنھوں نے بہت برداشت کا ثبوت دیا۔ اُنھوں نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ آپ دونوں کے متعلق کس نے ہم سے مخبری کی ہے۔ غالباً اس لیے کہ اتنے ملازموں کی موجودگی میں کوئی بھی، اُن کے خیال میں کوئی بھی ہمارے کان بھر سکتا تھا۔ وہ یہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ ہم آپ سے کوئی رابطہ قائم کر سکتے ہیں اور اگر خدانخواستہ انھیں اس کا علم ہو جاتا تو ہم اب تک اس دنیا میں نہ ہوتے۔"

"آپ کو نہیں آنا چاہیے تھا۔" میری آواز دھڑک رہی تھی۔ وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ یہ سُن کر نواب کوئی بھی انتہا پسندانہ فیصلہ کر سکتا تھا۔ اس وقت اُس کا کچھ یہی عالم تھا۔

"آپ سمجھتے ہیں، ہم نے غور نہیں کیا ہوگا؟" وہ سیمابی لہجے میں بولی۔ "ہمارے لیے یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں تھا مگر ہم ایک آخری جتن کے طور پر آپ کے پاس آئے تھے۔ ہمارے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ جمالی بھائی آپ تک جو کچھ منتقل کرنے میں ناکام ہو گئے تھے۔ ہم نے سوچا کہ ایک بار ہم بھی اپنا دامن پھیلا کر دیکھیں۔ شاید ہماری بات کا زیادہ اثر ہو۔ شاید ہماری التجا رائیگاں نہ جائے۔ ہم نے بہت غور کیا تھا اور آخر ہم اور برجیس اسی نتیجے پر پہنچے کہ ہمیں یہ کوشش بھی کر کے دیکھ لینا چاہیے۔"

"آپ نے بڑا حوصلہ کیا تھا لیکن آپ کے آنے کی ضرورت نہیں تھی۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "ہم پہلے ہی اچھی طرح صورتِ حال سمجھ چکے تھے۔ بڑے نواب کی بات ہم تک منتقل ہونے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی اور اُنھوں نے پہلے ہم سے نرم رویّہ ہی اختیار کیا تھا۔ ہم نے اُن سے صاف کہہ دیا تھا کہ اس وقت تک ہم کوئی وعدہ نہیں کر سکتے جب تک خانم آپی سے مل نہ لیں۔ کاش آپ کو بھی کسی طرح معلوم ہو جاتا کہ ہمارے پاس جواب میں کہنے کے لیے صرف یہی ہے، کچھ اور نہیں ہے۔ پھر آپ کو ہم تک پہنچنے کی اذیت نہ اٹھانی پڑتی۔ آپ کے سامنے ہمیں بھی اپنے انکار سے بہت دُکھ ہوا تھا۔ ہمیں اپنی بے بسی کا احساس اور سوا ہو گیا تھا ادھر واقعی اگر بڑے نواب صاحب کو علم ہو جاتا تو . . ."

"ہمیں اسی پر حیرت ہے کہ اُنھوں نے ہماری لب کشائی درگزر کیسے کر دی۔ ہمیں سزا کیوں نہیں سُنائی۔ اُنھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہماری درخواست سُن کر سر ہلا کے رہ گئے۔ ہمیں محسوس ہو گیا تھا کہ وہ زیادہ آزردہ اور شکستہ ہو گئے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں، اُن کے لیے یہ کوئی خوش گوار بات ہرگز نہ ہوگی کہ دو بے قصور آدمی اُن کے زنداں میں اسیر ہیں۔ ایک بار غلط فیصلہ کرنے کے بعد آپ کی رہائی بھی تو کچھ ارزاں ہو سکتا تھا، وہ اُلٹا اصرار کرتے رہے۔ اس طرح اُنھوں نے صرف آپ ہی پر ستم نہیں کیا، اپنے آپ پر بھی کیا۔ ہماری دخل اندازی پر اُن کی آزردگی پشیمانی کے اسی احساس کے سبب ہوگی یا وہ آپ سے ملنے پر تیار نہیں ہوئے تھے۔ یقیناً اُن کے ذہن میں اُمید کی کوئی رمق موجود تھی کہ آخر کبھی تو کسی طور تو آپ کا حوصلہ ٹوٹے گا۔ ہم اُن سے نہیں کہہ سکتے کہ ہم آپ سے مل کے، آپ کو دیکھ کے آئے ہیں۔ انھیں اپنی جان سے زیادہ اپنی وضع عزیز ہے۔ وہ لوگ دوسرے ہیں۔ کاش ہم انھیں یہ باور کرا سکتے۔"

یہ کہتے ہوئے چھوٹے نواب کی بیگم گیتی آرا کی آواز بھرّانے لگی تھی۔ اُس کا چہرہ کچھ اور سُرخ ہو گیا تھا۔ اُس کے لہجے میں پہلے کوئی جھجک اور لکنت تھی تو اب بڑی حد تک ٹھہراؤ آ گیا تھا اور اتنی دیر میں مجھے بھی اپنے حواس یک جا کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ اُس نے ایک لمحے ٹھیر کے جھلملاتی آنکھوں سے پہلے میری جانب دیکھا پھر اپنے قریب بیٹھی ہوئی نند کی جانب جس کا نام مجھے ابھی چند لمحے پہلے معلوم ہوا تھا۔ برجیس بظاہر کسی مورتی کی طرح خاموش بیٹھی تھی لیکن اُس کی آنکھیں خاموش نہیں تھیں۔ اُس کے چہرے پر آتے جاتے رنگ بدل رہے تھے۔ کتنی بار بے اختیار میری اُس کی نگاہیں چار ہوئی تھیں اور ہر بار اُس کی پلکیں تھرتھرا اُٹھی تھیں۔ اُس نے درمیان میں کوئی دخل نہیں دیا تھا لیکن اُس کا اضطراب آمیز انداز، اُس کا تلاطم سا نمک بتا رہا تھا کہ گیتی کی آواز میں اُس کی آواز بھی شامل ہے اور کہیں گیتی سے کوئی کوتاہی ہوگی تو وہ فوراً ٹوک دے گی۔ کئی اعتبار سے دونوں ایک دوسرے کا عکس معلوم ہوتی تھیں۔ عمروں میں بھی بس چند برس کا فرق ہوگا۔ اُن کے لباس اور نشست و برخاست کی یکسانی ایک دوسرے سے گہری رفاقت کی شاہد تھی۔ یوں بھی نند بھاوج کے علاوہ رشتے میں وہ ایک دوسرے کی بہنیں بھی تھیں۔

"ہم کچھ بھی نہ کر سکے۔" ایک لمحے کے تحمل کے بعد چھوٹے نواب کی بیگم مایوسی سے بولی۔ "اور پہلی مرتبہ ہمیں یہاں اس حویلی میں اپنی بے چارگی، اپنی کم حیثیتی کا اندازہ ہوا۔ برجیس بار بار ہمیں ٹوکتی تھیں کہ گیتی خدا کے لیے کوئی تدبیر کرو۔ اُن لوگوں پر بہت ظلم ہو رہا ہے مگر ہم کیا کر سکتے تھے۔ ایک ہی صورت تھی کہ ہم اپنے بھائی حشمت جنگ کو سب کچھ بتا دیں۔ جمالی بھائی کے لیے اُن کی بات رد کرنا مشکل ہو جاتا تھا لیکن برجیس نے ہمیں منع کر دیا۔ واقعی جمالی بھائی پھر ہمیں کبھی معاف نہ کرتے۔ ہمیں یہ بھی اندیشہ تھا کہ اس غم اور غصے میں وہ آپ کے متعلق کوئی جنونی فیصلہ نہ کر بیٹھیں۔ بس ہم آپ کے لیے دعائیں ہی کرتے رہے۔ گو ان پر سے ہمارا یقین اُٹھ گیا تھا لیکن ایک یہی چارہ ہمارے پاس تھا۔ برجیس ابتدا ہی سے بہت حساس اور نازک طبع ہیں۔ برجیس کا دل پھولوں کی طرح مرجھا جاتا ہے، پھولوں کی طرح کھل اُٹھتا ہے ہمیں معلوم ہے، اس رات کے بعد انھیں کسی پل نیند نہیں آئی۔" میں نے بے چینی سے برجیس کی جانب دیکھا تو اُس کا چہرہ گلنار ہو گیا اور اس کی شیشے جیسی آنکھیں چھلک چھلک پڑیں۔ میری آنکھیں بھی اُمڈنے لگیں اور ایک ثانیے کے لیے میرا سارا جسم سُن سا ہو گیا۔

"یہ بھی سب کچھ کہہ سکتی ہیں۔" چھوٹے نواب کی بیگم بولی۔ "بچپن سے ہم دونوں تقریباً ساتھ ہی رہے ہیں۔ یہ سامنے بیٹھی ہیں۔ آپ دونوں کے لیے یہ مجھے اس طرح تلقین کرتی تھیں جیسے آپ کے پاس صرف یہی گئی تھیں۔ جیسے ہم نے آپ کو نہیں دیکھا تھا اور آپ کا دُکھ محسوس نہیں کیا تھا۔ یہ ہم سے کہتی تھیں، گیتی! خدانخواستہ اُن لوگوں کے ساتھ کچھ ہو گیا تو ہمیں کبھی سکون نہیں ملے گا۔ یہ ہمیں جتاتی تھیں کہ ہم کن لوگوں سے مل کر آئے ہیں۔ جو حویلی اُن کے لیے قید خانہ بنی ہوئی ہے، اُسی حویلی کی دو نوجوان خواتین کا اُنھوں نے کیسا احترام کیا تھا۔ ابھی آپ کہہ رہے تھے کہ ہمیں آپ کے پاس نہیں آنا چاہیے تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے لیے یہ فیصلہ کرنا پُل صراط پر گزرنے سے کم نہیں تھا۔ آپ کے متعلق ہم سے بہت ڈراؤنی باتیں کہی گئی تھیں۔ آپ کی سرکشی اور شوریدہ سری کی ایسی تصویر ہمارے سامنے پیش کی گئی تھی کہ کبھی ایسا ارادہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ہمیں اس کے سنگین نتائج کا اچھی طرح احساس تھا لیکن ہمارا تو گھر جل رہا تھا اور ہمیں ایک طرف اپنے آپ پر اعتماد تھا، اپنے صدق پر یقین تو دوسری طرف ایک یہ پہلو بھی ہمیں طمانیت دیتا تھا کہ بہرحال آپ آدمی ہی ہیں، آدمی کی بات آدمی ہی سنتا ہے۔ گوشت پوست سے مختلف تو آپ نہیں بنے ہوں گے۔ گھر تو آپ کا بھی ہوگا اور ہم ایسے متعلقین بھی۔ ہم آپ کو بتائیں کہ ہم اپنے ساتھ خنجر لے کے گئے تھے۔ آپ کے لیے نہیں، اپنے لیے۔ کہ بصورتِ دیگر ہمیں اپنے گناہ کا کفّارہ ادا کرنے میں دیر نہ لگ جائے۔ ہم اپنا سب کچھ ترک کر کے، اپنی ساری کشتیاں جلا کے آپ کے پاس پہنچے تھے۔ ہمیں یاد ہے ہم نے آپ سے کیا کہا تھا۔ ہم نے کہا تھا، ہم بہرحال، ہر قیمت میں خانم سے رابطہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ زر و جواہر کے علاوہ بے شک وہ قیمت ہم بھی ہو سکتے تھے۔ ہم اپنے شوہر کے لیے اور برجیس اپنے بھائی کے لیے یہ رقت ادا کرنے پر آمادہ تھے۔ کیا ہم اتنا نہیں جانتے تھے کہ وہ ابھی زندانی اپنی بازی پر کتنے مشتعل ہو سکتے ہیں۔ ہمیں سامنے دیکھ کے اُن کے غضب کا کیا عالم ہو سکتا ہے۔"

میں بے حس و حرکت بیٹھا اُسے تک رہا تھا۔ اُسے جھرجھری سی آ گئی اور وہ گہری سانس بھر کے بولی۔ "ہم واپس آ گئے تھے لیکن ہمیں ایک قلبی اطمینان حاصل تھا کہ ہم اتمامِ حجت کر کے آئے ہیں اور ہمارے دامن، ہمارے آنچل پر کسی گناہ کا کوئی نشان نہیں ہے۔ برجیس بار بار یہی سب دہراتی تھیں۔ آپ کی نجابت اور نکوکاری کے یہی حوالے دیتی تھیں۔ برجیس کو معلوم تھا کہ ہماری حالت اُن سے مختلف نہیں ہے۔ اگر کوئی فرق ہے تو اتنا کہ ہمارا ذہن اپنے زخم چھپانے پر کس قدر قادر ہو گیا ہے۔ برجیس میں شاید ابھی یہ حوصلہ نہیں۔"

اُس نے اپنے سر سے ڈھلکتا ہوا دوپٹا ٹھیک کیا۔ میں نے اُسے نہیں ٹوکا کہ اب بیتا ہوا دُہرانے سے کیا حاصل ہے۔ بہتر ہے اسے کوئی بُرا خواب سمجھ کے بھلا دیا جائے۔ ایسا کرنے سے بہت گھٹن ہوتی ہے مگر ایسا نہیں تھا۔ مجھے اُس کی زبانی یہ سب سُن کے کچھ اچھا ہی لگ رہا تھا۔ بیچ میں کتنی مرتبہ میں نے اُسے روکنا چاہا لیکن پھر یہ سوچ کے خاموش رہا کہ پھر اس کے پاس کہنے کو رہ بھی کیا جاتا ہے۔ تب میں نے اُس سے کہا کہ انھیں ہم سے ایسا خوف کھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ تاہم ہم بھی جان سکتے تھے کہ حویلی کی معزز خواتین نے کس بڑی مجبوری کے عالم میں ہمارے پاس آنے کا قصد کیا ہوگا۔ مجھے ڈر تھا کہ میرے کچھ کہنے سے اُس کے اُمڈتے ہوئے انداز میں کوئی فرق نہ پڑ جائے۔ بعض لوگ باتیں کرتے ہوئے اور دل کش ہو جاتے ہیں۔ اُس کی آواز کے اضطراب میں بھی ایک شگفتگی قائم تھی۔ آدمی سنتا ہے تو کھو جاتا ہے۔ مُنھ سے پھول جھڑنے کی تشبیہ لوگوں نے یوں ہی نہیں تراشی ہوگی۔ مجھے اُن کے سامنے بیٹھے ہوئے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ابھی تھوڑی دیر پہلے میں جھروکے کے پاس سے پھیلا ہوا باغ دیکھ رہا تھا۔ آدمی بھی تو پھولوں اور پتھروں کی طرح ہوتے ہیں اور کچھ وقت کی دھوپ چھاؤں کی بات بھی ہوتی ہے۔ اُس رات بھی زنداں میں وہ آئی تھیں مگر اُس رات مجھے اُن کی شائستگی اور دل آویزی کا اتنا احساس نہیں ہوا تھا۔ چھوٹے نواب کی بیگم نے سارا وقت حویلی کی جنت میں عیش و آرام سے نہیں گزارا ہوگا۔ وہ تعلیم یافتہ بھی خوب لگ رہی تھی اور علم تو سر سے آتا ہے۔ تحمل سے آتا ہے اور علم و فاضل لگتا

سے زیادہ اپنی طلب ہے۔ جیل میں کتابوں کے سوا میرا کبھی کوئی اُستاد نہیں تھا، تاہم کتابیں امید نہیں سکھاتیں۔ مجھے شبہ تھا کہ مجھے بات کرنے کا سلیقہ آتا ہے۔ گیتی کو آتا تھا۔ اُس کی آواز بجائے خود ایک ساز تھی جیسے دریا بہتا ہو۔ اُس کے لہجے میں کوئی بناوٹ نہیں تھی۔ بناوٹ میں شاید ایسی روانی نہ ہوتی۔ ہر دم میرا تجسس بڑھتا جاتا تھا کہ آگے اُس کے بول کیا کیا ادا ہوتا ہے۔ کیسی کیسی حیرانیاں سنانے والے ایسے ہوں تو آدمی کو خود پہ بیتا ہوا بھی کتنا عجیب معلوم ہوتا ہے۔

"اور جب خادموں کی زبانی ہمیں اطلاع ملی کہ آپ جہانی بھائی کو بندوق کی زد پہ حویلی سے لے گئے ہیں تو ہم سناٹے میں آ گئے لیکن دوسرے ہی لمحے ہم نے اپنے سر سے کوئی بوجھ اُترتا ہوا محسوس کیا۔ یہاں خادموں میں افراتفری مچی ہوئی تھی۔ ہر شخص کی نگاہیں ہم پہ مرکوز ہو گئی تھیں۔ ہمیں طرح طرح کے مشورے دیے جا رہے تھے۔ ہم سے کہا گیا کہ ہم فوراً اپنے بھائی حشمت جنگ سے رابطہ قائم کریں اور کہا گیا کہ مسلح خادموں کو تعاقب کا حکم دیا جائے۔ گو آپ نے انھیں تنبیہ کر دی تھی کہ کسی نے کوئی غلطی کی تو آپ جہانی بھائی..." اُس کی زبان اٹکنے لگی اور بولی۔ "اگر حویلی سے جاتے وقت نہیں تو حویلی سے آپ کے نکل جانے کے بعد ہم حشمت بھائی کو فون کر سکتے تھے یا کسی کو بھی مگر ہم نے نہیں کیا۔ برجیس نے بھی منع کیا۔ ہمیں معلوم تھا کہ جہانی بھائی کن ہاتھوں میں ہیں اس لیے یقین تھا کہ جلد واپس آ جائیں گے۔"

"آپ کو یقین تھا؟" میں نے تعجب آمیز آواز میں کہا۔

"ہاں، ہمیں اچھی طرح معلوم تھا۔ شاید عورتیں مردوں سے زیادہ نگاہ شناس ہوتی ہیں۔ ہم نے آپ کو دیکھا تھا اور ہم خود جو اپنے گواہ تھے۔ اُن کے جانے کے بعد ہمیں شدت سے احساس ہوا کہ آپ نے ہم سے کیسا خسروانہ سلوک کیا تھا۔ ہمیں بھی تو آپ یرغمال بنا سکتے تھے۔ جہانی بھائی کے مقابلے میں یہ نسبتاً آسان تھا۔ ہمیں شاید اپنا خنجر نکالنے کی بھی مہلت نہ ملتی۔ اس طرح آپ کو بچا اور پہلے یہاں سے نجات مل سکتی تھی۔ یقین کیجیے، ہمیں ذرا بھی تشویش نہیں تھی البتہ ہم اور برجیس جہانی بھائی کی جلد از جلد واپسی کے منتظر تھے اور ہمیں یہاں حویلی کے حواس باختہ مکینوں کو قابو میں رکھنے میں بہت دشواری ہو رہی تھی۔ وہ ہمیں مسلسل ٹوک رہے تھے۔ ہم انھیں اپنے اطمینان کا کوئی جواز پیش نہیں کر پا رہے تھے۔ بہرحال زیادہ دیر نہیں لگی کہ ہمیں جہانی بھائی کی واپسی کی خوش خبری سنائی گئی اور بتایا گیا کہ انھیں کوئی گزند نہیں پہنچا۔ یہ سن کے ہمیں ایسا محسوس ہوا جیسے ہم حویلی کے پریشان حال مکینوں کے سامنے سرخ رو ہو گئے ہیں، جیسے جہانی بھائی ہماری سفارش پر واپس آئے ہوں اور آپ نے ہمارا مرتبہ بڑھایا ہو۔ اُس وقت جہانی بھائی کے سامنے ہمارا جانا مناسب نہیں تھا لیکن ہم مسلسل ٹوہ میں لگے رہے کہ واپسی کے بعد وہ آپ کے خلاف کیا قدم اٹھاتے ہیں۔ ہمارے بعض خادموں نے اُس موقع پر ہم سے مہربانی کی کہ ہماری ہدایت پر ٹیلی فون کا سلسلہ ناکارہ کر دیا۔ ہم نے یہ ہدایت انھیں بروقت دی تھی۔ حویلی میں تیز رفتار سواریاں ہمہ وقت موجود رہتی ہیں لیکن اُن میں اور ٹیلی فون کے رابطے میں بڑا فرق ہے۔ ہماری آرزو تھی کہ آپ یہاں سے جتنی دُور ہو سکتے ہیں، ہو جائیں اور ہم نے طے کر لیا تھا کہ اگر جہانی بھائی نے حشمت بھائی سے آپ کے سلسلے میں کوئی بات کی تو ہمیں آخر زبان کھولنی پڑے گی۔ گو جہانی بھائی کے مقابلے میں ہماری التجا کی پزیرائی کا کم ہی امکان تھا لیکن ہم نے طے کر لیا تھا کہ ہم حشمت بھائی کو منع کر دیں گے۔ چاہے ہماری اس جسارت پر وہ کتنے ہی برافروختہ ہوں۔ شکر ہے، ہمیں یہ سب کچھ نہیں کرنا پڑا۔ واپسی پر جہانی بھائی بہت دل گرفتہ تھے۔ اُس رات ہمیں اُن کی ایک ہی جھلک دیکھنے کو ملی تھی لیکن ہم مطمئن ہو گئے تھے کہ اُن کے چہرے پر چھایا ہوا غبار غیظ و عناد کا نہیں ہے، پشیمانی و خستگی کا ہے۔"

میری مبہوت نظریں اُسی پر جمی ہوئی تھیں۔ اتنے میں دو خادمائیں شانوں پر طشت اٹھائے بے آواز قدموں سے اندر داخل ہوئیں۔ میرے ساتھ وہ دونوں بھی چونک سی گئیں۔ خادماؤں نے دوزانو بیٹھ کے طشت چھوٹی تپائیوں پر رکھ دیے۔ ڈھکی ہوئی ریشمی جالیوں میں چاندی کے برتن چمک رہے تھے۔ برجیس نے خادمہ کے کان میں جھک کے کچھ کہا تو وہ خفیف سی ہو گئی، بھاگی ہوئی باہر چلی گئی اور کسی تاخیر کے بغیر سلفچی اور ہاتھ دھونے کا آفتابہ لیے ہوئے پھولی سانسوں سے کمرے میں واپس آئی۔ گیتی نے خوان پوش ہٹا دیا تھا۔ طشت میں چائے کے علاوہ قابوں اور طشتریوں میں مختلف چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ وہی خادمہ جو مجھے یہاں لائی تھی، برجیس کے اشارے پر آفتابہ ہاتھوں میں اٹھائے میری طرف بڑھی۔ میں گھبرا سا گیا اور نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے اُس کی طرف ہاتھ بڑھا دیے۔ میں اُن سے کہنا چاہتا تھا کہ اس وقت کسی چیز کی خواہش نہیں ہے لیکن میری زبان گنگ ہو گئی تھی۔ دوسری خادمہ نے تولیا میری طرف بڑھا دیا اور جیسے ہی میں نے ہاتھ خشک کیے، اُنھوں نے سلفچی میرے سامنے سے ہٹا لی۔ "میرے لیے صرف چائے۔" میں نے دبے لہجے میں بمشکل کہا۔

"مگر آپ نے تو ابھی ناشتہ بھی نہیں کیا ہے۔" برجیس کھنکتی آواز میں پہلی بار مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"جی ہاں۔" میں نے سٹ پٹاتے ہوئے کہا۔ "وہ میں اُوپر سب لوگوں کے ساتھ کر لوں گا۔ آپ نے بہت زحمت کی۔" شکریے کا لفظ میری زبان سے ادا نہ ہو سکا۔

اُس نے گیتی کی طرف پریشان نظروں سے دیکھا۔ گیتی بایوسی سے کہنے لگی۔ "زحمت کیسی، ہم آپ کس طرح کہیں کہ ہمیں اس میزبانی سے کیسی مسرت ہو رہی ہے۔ ہماری التجا ہے کہ آپ کوئی تکلف نہ کریں۔"

میں سوچتا رہ گیا کہ کیا کہوں۔ گیتی نے مجھ سے کچھ اور قریب ہو جانے کو کہا۔ خود اُنھوں نے بھی میرے اور اپنے درمیان فاصلہ کم کر لیا تھا۔ خادماؤں نے ہمارے بیچ میں تپائیاں رکھ دیں۔ قابوں سے اشتہا انگیز بھاپ اُٹھ رہی تھی لیکن مجھے اُن کے ساتھ اس طرح آمنے سامنے بیٹھ کے کھاتے ہوئے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ اُن کے اتنے قریب ہو جانے پر اُن کے لباسوں میں بسی ہوئی خوشبو بھی اور قریب ہو گئی تھی۔ برجیس کی مرمریں کلائیوں میں طلائی چوڑیاں جگمگا رہی تھیں۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ اُس کی کلائیاں زیادہ دیدہ زیب تھیں یا سونے کی چوڑیاں۔ سونا بھی اُس کے شہابی رنگ سے کچھ پھیکا پڑ رہا تھا۔ میں اپنا جسم سکیڑے سوچ رہا تھا کہ ایسے وقت کون سے لفظ مناسب ہوتے ہیں۔ لفظوں کی کتنی ترکیبیں میرے ذہن میں بنتی تھیں اور منتشر ہو جاتی تھیں۔ برجیس نے طشتریاں میرے اور اپنے سامنے سجانے میں کوئی وقت نہیں لیا۔ "اب آپ کوئی تکلف نہیں کریں گے۔" گیتی نے مجھ سے کہا۔ اُس کے لہجے میں عاجزی بھی تھی، حکم بھی تھا۔

"یہ تو بہت سا سامان ہے۔" میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"دیکھیے، کچھ بھی نہیں ہے۔" گیتی نے ملتجی لہجے میں کہا۔ "ہم نے پہلے ہی احتیاط کی ہے کہ تکلف کا شائبہ تک نہ ہو۔"

میں نے قیمے کی پلیٹ سے تھوڑا سا قیمہ اپنی طشتری میں ڈال لیا۔ میرے منع کرنے کے باوجود گیتی نے اپنے ہاتھ سے اُسے دُگنا کر دیا۔ میری انگلیاں ٹھٹھر رہی تھیں۔ پراٹھے کا ایک ٹکڑا توڑ کے میں نے پہلا لقمہ لیا تو وہ حلق میں اٹک گیا۔ گیتی کو شاید کچھ احساس ہو گیا تھا۔ وہ میری توجہ ہٹانے کے لیے جھکتی آواز میں بولی۔ "ہمیں یہ سب کچھ خواب سا معلوم ہو رہا ہے۔ ہم آپ کو کیسے بتائیں کہ ہم اس ساعت کے کتنی بے چینی سے منتظر تھے۔ کبھی آپ ہمیں زنداں سے ملاقات کی آرزو مند تھے کہ کبھی آپ سے ملاقات ہو جائے تو ہم آپ کی خدمت میں اپنے جذبات یہاں پیش کر سکیں یا اپنی ندامتوں کا اظہار کر سکیں۔ برجیس ہم سے کہتی تھیں، گیتی ہمارا دل کہتا ہے، اُن لوگوں سے ضرور ملاقات ہوگی۔ ہمیں بھی ایسی خوش گمانی ہوتی تھی۔"

"آپ کو کچھ ایسی اُمید تھی کہ ہم، ہم..."

"سب کچھ تو ہمارے سامنے تھا۔" اُس نے رومال اپنے ہونٹوں سے مَس کیا اور کھنکتے لہجے میں بولی۔ "آپ نے ہم سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا اور اُس وقت ہم بہت مایوس ہو گئے تھے لیکن بعد میں جیسے جیسے ہماری آنکھوں سے دُھند چھٹتی گئی اور گزرے ہوئے لمحے ہم پر اجاگر ہوتے گئے، ہماری مایوسی بھی اُسی نسبت سے کم ہوتی گئی اور آپ کا حتمی وعدہ نہ کرنا ہی کچھ ہماری اُمید کا باعث بنا۔ اُس قید و بند کے عالم میں آپ ہم سے کچھ بھی کہہ سکتے تھے۔ ہمیں یاد تھا کہ آپ کے ساتھ جو بزرگ تھے، اُنھوں نے ہم سے کیسی شفقت کا برتاؤ کیا تھا۔ اُنھوں نے ہمارا دوپٹا اپنی آنکھوں سے لگا لیا تھا اور ہمارے سر پہ ہاتھ رکھ کے ہمیں رخصت کیا تھا۔ اُنھوں نے ہم سے کہا تھا کہ وہ خانم کو آمادہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ وہ لوگ جنھوں نے بے شمار خادموں کی موجودگی میں اپنی نجات کا عزم کیا تھا، قید کی شدید اذیتوں اور داد و فریاد کا ہر دروازہ بند ہونے کے باوجود جن کا حوصلہ اتنا توانا تھا، جنھوں نے بے عزتی میں واپس کر دیا تھا اور جہانی بھائی کو اُن کی ستم کاری کے جواب میں کشادہ قلبی سے نوازا تھا۔ اُنھوں نے یہاں حویلی میں کسی کا خون بہانے سے اجتناب کیا تھا حالانکہ وہ ایسا کر سکتے تھے۔ اُن کے ہاتھ میں بھری ہوئی بندوق تھی اور سامنے کوئی اُن کا دوست نہیں تھا۔ انھی ملازموں میں سے کسی نے اُن کے جسم بیدوں سے داغ دار کیے تھے۔ ہم نے کہیں سُنا تھا کہ بہادری کی پہلی شرط عزم کا صدق ہے، نیت کی سچائی ہے۔ ایسے لوگوں کے سامنے ہم نے دامن پھیلایا تھا اور ایسے لوگ ہم سے کچھ کہہ گئے تھے۔ اُن کے قول و قرار پہ ہمیں اعتبار کرنا چاہیے تھا۔"

میرے جسم پہ سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہ کیسی باتیں کر رہی تھی۔ "تو آپ کو، آپ کو خانم آپا کی آمد کی بھی اُمید تھی؟" میں نے مدھم آواز میں پوچھا۔

"ہاں، بڑی حد تک بلکہ کسی حد تک۔" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ "کوئی شبہ نہیں تھا کہ آپ خانم کے پاس جا کے ہماری عرض بہ تمام و کمال منتقل کر دیں گے مگر آپ کا اُن سے کچھ کہنا اور خانم کا آمادہ ہونا دو مختلف باتیں تھیں۔ آپ نے کہا تھا کہ فیصلہ خانم پر منحصر ہے۔

ہمیں یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ خانم ہمیں انکار نہ کر دیں، وہ جانے کیا سمجھیں، انھیں کتنے زمانے کی تمناؤں کے بعد یہ جنت ملی ہے، وہ اب کوئی رخنہ اندازی کیوں کر پسند کریں گی۔ خانم کی جگہ ہم ہوتے تو ہمیں بھی یہ فیصلہ کرنے میں دشواری پیش آتی۔ آپ نے ہمیں اُن کے متعلق زیادہ تفصیلات بھی نہیں بتائی تھیں۔ ہمیں کچھ نہیں معلوم تھا کہ وہ اپنی نئی زندگی کی کن زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہیں۔ زنجیریں شاید ہم غلط کہہ گئے ہیں۔" وہ پشیمانی سے بولی۔ "ہماری مراد سلسلوں سے ہے کہ وہ اپنی نئی زندگی میں کس حد تک شامل ہو چکی ہیں۔

ہمارا دل یہ سوچ سوچ کر لرزنے لگتا تھا کہ اگر خانم نے انکار کر دیا تو ہم کہاں جائیں گے۔ کسی لمحے آس بندھتی تھی، دوسرے لمحے ٹوٹ جاتی تھی۔ ہم سوچتے تھے کہ اگر دیر ہو گئی تو ۔ دیر پہلے ہی بہت ہو گئی تھی۔ جب تک آپ زنداں میں تھے، ہم آپ کی رہائی کے لیے حویلی کے خادموں سے التجائیں کر رہے تھے کیوں کہ آپ کی رہائی سے خانم کی آمد کی توقع مشروط تھی۔ آپ کے جانے کے بعد ہمارے سر سے کوئی بوجھ اُترا تھا تو دوسری طرف ہم پر یہ وحشت طاری رہی کہ اگر خانم نے . . . " اُس کی آواز ڈوبنے لگی لیکن اُس نے جلدی خود پر قابو پا لیا۔ "مگر ایسا اندھیرا بھی نہیں رہا تھا جو آپ کے یہاں قید ہونے پر چھایا ہوا تھا۔ اب کوئی چراغ تو ٹمٹما رہا تھا۔ آپ کے جانے کے بعد ہمیں ایک عذاب ناک انتظار سے دوچار ہونا تھا کب ہمارا نصیبہ کھلتا ہے۔ ہمارے سان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ آپ کے جانے کی دیر ہوگی اور خانم کی صورت ہمیں اتنی جلدی دیکھنے کو مل جائے گی یا یوں کوئی کرشمہ سا ہو جائے گا۔ وقت ہی کتنا گزرا تھا۔ پرسوں رات تو آپ یہاں سے گئے تھے اور ہم آپ کے لیے دعائیں کر رہے تھے کہ آپ بہ عافیت جلد سے جلد ریاست سے دُور ہو جائیں اور کسی طور خانم کے پاس پہنچ جائیں اور اللہ پاک خانم کے دل میں کچھ ڈال دے۔ ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ خدا ہم پر اتنا مہربان ہو جائے گا۔ ایک ہی دن درمیان میں گزرے گا کہ خانم آجائیں گی۔ کل رات ہماری مرادیں برآنے کی رات تھی۔ ہم کچھ اور بھی مانگتے تو . . . . کچھ مگر، مگر ہم اس سے زیادہ مانگ بھی کیا سکتے تھے۔"

دو تین لمحے سے کے میرا ہاتھ رُک گیا تھا اور میں دم بخود بیٹھا تھا۔ وہ خاموش ہوئی تو ایسا لگا جیسے کمرے میں اچانک کسی چیز کی کمی ہو گئی ہو اور سب کچھ منجمد ہو گیا ہو، ستار کا تار ٹوٹ گیا ہو۔ چند لمحے یہ سکوت مسلط رہا اور پھر میں نے مترنم آواز میں مجھے ٹوکا کر میں نے تو کچھ لیا ہی نہیں ہے۔ گیتی کو بھی احساس ہوا اور وہ مجھل آواز میں بولی: "ہم تو بھول ہی گئے۔ آپ نے ہاتھ کیوں روک لیا ہے۔ اب ہم اُس وقت تک اپنی زبان بند رکھیں گے جب تک آپ دل جمعی سے ناشتہ نہ کر لیں۔"

"یقین کیجیے میرا جی نہیں چاہ رہا ہے۔"

"شاید ہم نے بہت زیادہ باتیں کی ہیں مگر آپ کو سامنے دیکھ کے ہمیں احساس ہی نہیں رہا۔" وہ معذرت خواہانہ لہجے میں بولی۔ "آپ کیا سوچتے ہوں گے۔"

"نہیں، ایسا نہیں ہے۔" میں نے بے چینی سے کہا۔ "کاش یہ سب اس طرح نہ ہوتا۔"

"شاید خدا کو یہی منظور تھا۔ اس بہانے ہمیں کچھ دکھانا، کچھ لوگوں کا جلوہ دکھانا مقصود تھا جس سے ہم اب تک ناآشنا تھے۔"

"آپ اتنا کچھ مت کہیے، شرمندگی ہوتی ہے۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "کوئی ایسی بڑی بات نہیں۔ میرے خیال سے اتنا کچھ جان کے ہر شخص یہی کرتا۔"

"یہ آپ کی اعلاظرفی ہے۔ آپ کو ایسا ہی کہنا چاہیے لیکن جو ہم پہ گزری ہے، وہ ہمی جانتے ہیں۔" وہ کرب آمیز لہجے میں بولی۔ "کوئی بھی ایسا نہیں کرتا۔ ہماری تو جان پہ بنی ہوئی تھی۔ وہ کیا (نواب عالم تاب) روٹھے تھے کہ زندگی ہم سے روٹھ گئی تھی۔ ہم نے آپ کو بتایا تھا کہ ہم نے ہر دروازے پر جا کے دستک دی اور کہیں سے ہمیں کچھ نہ مل سکا۔ کتنے مسیحا یہاں آئے اور تماشا دکھا کے چلے گئے۔ ہم آپ کو کیا کیا بتائیں، ہم پہ کیسی کیسی راتیں، کیسے کیسے دن گزرے ہیں۔ جتنا ہم انھیں منانے کی کوشش کرتے تھے، اتنی ہی اُن کی ضد بڑھ جاتی تھی۔ اور اب تو انھوں نے کسی سے بات کرنا بھی بند کر دیا تھا، اپنوں کو پہچاننا بھی چھوڑ دیا تھا۔ وہ اپنی ماں بہن، اپنے بھائی، ہمیں اور اپنے جاں سپار خادموں کو بھول گئے تھے۔ کتنے دنوں سے وہ بستر نشین ہیں، آنکھیں کھولتے تھے تو صرف اپنے آپ کو دیکھتے تھے۔ انھیں اپنے سوا ارد گرد بیٹھے، کھڑے ہوئے اپنے شیدائی نظر نہیں آتے تھے۔ ایسے میں خانم کا آجانا ہمارے لیے کتنی بڑی دولت اور نعمت کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہمارے پاس ممنونیت کے لیے الفاظ نہیں۔" اُس کی آواز رُندھنے لگی۔ "خدا آپ کو دُنیا بھر کی خوشیاں نصیب کرے۔ ہم تو کچھ دے نہیں سکتے لیکن خدا آپ کو اس کا اجر ضرور دے گا۔"

"از راہِ کرم اب آپ کچھ مت کہیے۔" میں نے بھنچی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ اجر کے لیے کہہ رہی تھی، اجر میں تو مجھے عذاب ہی ملنا

چاہیے تھا۔ میں اُس سے کہہ دینا چاہتا تھا کہ یہ سب کچھ تو اُسے مُغل کے سامنے کہنا چاہیے۔ اس داد و امتنان کا سب سے زیادہ مستحق تو وہی ہے۔ خانم کو ہم نے نہیں، اُس نے بُلایا ہے اور ہماری زنداں کی مجبوری سے زیادہ نواب عالم تاب کی حالت دیکھ کے ورنہ ہماری رہائی کے بعد خانم کو یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی۔ میں تو پرسوں رات یہاں سے جانے کے بعد مسلسل اسی جستجو میں لگا ہوا تھا کہ اب ہمیں فوراً یہاں سے بمبئی کے لیے روانہ ہو جانا چاہیے۔ میں نے بہت چاہا اُسے صاف صاف بتا دوں کہ سزاوارِ احسان میں نہیں ہوں، مُغل ہے اور ہیرو ہے اور خود خانم ہے۔ کانتے سے خانم کی آمد کا ذکر سُن کے میں نے یہی جانا تھا کہ مُغل کو ہماری نجات کا ایک ہی راستہ نظر آیا ہوگا۔ بے شک نواب عالم تاب کی جاں کنی نے بھی مُغل کو کچھ متاثر کیا ہوگا مگر اُس کی نگاہوں کا مرکز تو ہمی ہوں گے۔ حویلی سے نکل کے اڈے پہنچنے کے بعد مُغل کے وہیں اڈے پر جمے رہنے کا مطلب بھی میں نے یہی سمجھا تھا کہ اب چونکہ خانم کو دورانِ سفر روکا نہیں جا سکتا اس لیے مُغل کو صرف اُس کا انتظار ہے اور دوسری کسی جگہ کی نسبت ہمارے لیے اس وقت اڈا ہی زیادہ محفوظ جگہ ہے۔ میں نے تو گزشتہ رات یہاں آتے ہوئے ہیرو سے باقاعدہ حجت کی تھی۔ میں قمر نگر سے اُتر کے آگے مُغل کی گاڑی روک دینا چاہتا تھا۔ میں نے خانم کو یہاں آنے سے روکنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی تھی۔ یہاں اتنا ضرور ہے کہ بمبئی پہنچ کے جلد از جلد فیض آباد واپس جانے اور خانم کو سب کچھ بتا دینے کا خیال کئی بار میرے دل میں آیا تھا۔ ممکن تھا میں ایسا ہی کرتا لیکن خانم کے انکار پر میں اُس سے کوئی اصرار بھی نہ کرتا۔ گیتی جتنا کچھ مجھ سے کہہ رہی تھی، مجھے اپنا وجود اتنا ہی بوجھل لگ رہا تھا۔ میں اُس سے یہ اعتراف کرنے کی ہمت اپنے اندر استوار کرتا رہا کہ وہ میں نہیں ہوں۔ میں تو کل رات سے ہیرو کی شعلہ بار نگاہوں کی زد پر ہوں۔ گو اُس نے اپنی [illegible] پریشانی کا اظہار کیا تھا لیکن یہ تو میں جانتا ہوں کہ ابھی تک مجھ میں اُس کے سامنے جانے اور اُس سے آنکھیں ملانے کی جرأت نہیں ہو رہی ہے۔ جیسے کسی نے بر وقت کسی کو چونکا دیا ہو اور وہ ایک بڑے گناہ، ایک بے جرم سے بچ گیا ہو، میری حالت اُس شخص جیسی ہے۔ لیکن اپنے بارے میں اتنا کچھ سُننے کے بعد اب مجھ میں گیتی سے یہ کہنے کا حوصلہ نہیں تھا کہ ایک غلط آدمی اُن کے سامنے ہے اور اُن کی یہ اضطراب آمیز سرخوشی، اُن کی آنکھوں میں حیرت بھرے تشکر کی یہ دمک اصل میں مُغل کا حق ہے۔ دوسرے کا حق حاصل کر کے آدمی پھر اپنے کے سامنے کس طرح جا سکتا ہے، اور یہ آئینہ تو آدمی کے ساتھ ہی رہتا ہے۔ اُس کے سینے میں چھپا ہوا۔ اس کے لیے بینائی کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ مجھ سے کچھ نہیں کہا جا سکا۔ اس سے حاصل بھی کیا تھا۔ میں زبان کھولتا تو وہ اسے میرے انکسار پر محمول کرتیں۔ شاید مجھے اُن کی نظروں میں اپنا رتبہ کم کرنے کا یارا بھی نہیں تھا۔ اس طرح اپنی بڑائی کا کوئی تاثر بھی قائم ہو سکتا تھا جو اچھی بات نہیں تھی۔ میں جلتے ہوئے کانوں اور ٹھٹکی ہوئی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتا اور سُنتا رہا۔ اگر یہ سب کچھ مُغل کے لیے تھا تو کسی اور کا تو نہیں تھا۔ مُغل کا انعام بھی تو میرا ہی تھا۔ میرے سر میں اندھیرا سا چھایا ہوا تھا۔ اس دوران گیتی نے مجھ سے کیا کہا تھا جو میں نہیں سُن سکا۔ اس کا اندازہ مجھے برہمیں کی آواز کی دستک سے ہوا۔ "آپ کیا سوچ رہے ہیں؟" وہ مضطربانہ مجھ سے پوچھ رہی تھی۔ اُس کے چہرے کی سُرخی اور گہری ہو گئی تھی۔

"کچھ نہیں۔" میں نے مختصر لہجے میں کہا۔

"آپ سے ایک گزارش ہے۔" گیتی شائستگی سے بولی۔ "ہماری عرض ہے کہ آپ جب تک حویلی میں قیام فرما ہیں، کوئی غیریت نہیں برتیں گے ورنہ ہمیں بہت دُکھ ہوگا۔"

"جی۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "نہیں، نہیں۔"

"رات جہانی بھائی ہمیں اور گھر کے تمام مکینوں کو ہدایتیں دے رہے تھے۔ اچھا ہوا جو ہمیں زبان نہیں کھولنی پڑی، بصورتِ دیگر ہم نے اور برہمیں نے طے کر لیا تھا کہ اگر وہ تلطف اور ترحم کا کوئی درس بھول رہے ہیں تو ہم اس جانب اُنھیں توجہ دلانے کی جسارت ضرور کریں گے۔ ہم اُن سے کہیں گے کہ ایک صاحبِ دل کا شیوہ کیا ہونا چاہیے اور ہمارے آبا کی روحیں اُن کے کس طرزِ عمل سے خوش ہوں گی۔ لیکن اُن کے سامنے کسی ناروا صورتِ حال سے دوچار ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ رات جہانی بھائی اُلٹی ہمیں تلقین کر رہے تھے کہ آنے والوں کی پذیرائی میں حویلی کا ہر دروازہ، دریچہ کھلا ہونا چاہیے۔ پہلی مرتبہ ہمارے یہاں اتنے بڑے مہمان آئے ہیں۔ اُنھوں نے ہمارے منہ کی بات چھین لی۔ بہت عرصے بعد ہم نے جہانی بھائی کے چہرے پر ایسا سکون دیکھا ہے۔ اُنھوں نے ہم سے اور بھی بہت کچھ کہا تھا۔ شاید آپ سے بھی کہا ہو تاہم ممکن ہے وہ کھل کے کہہ نہ پائے ہوں تو ہم اُن کی جانب سے آپ کے آگے ہاتھ جوڑتے ہیں۔ آپ ہمیں، ہمیں . . . ."

"آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟"

"ہم اپنے دل کی بات کر رہے ہیں۔" وہ جلتی آواز میں بولی۔ "آپ

یہاں کوئی اجنبیت محسوس نہیں کریں گے تو ہم سمجھیں گے آپ نے ہمارے گناہ معاف نہیں کیے۔ جہانی بھائی کی غلط اندیشی اور ذہنی انتشار کے سبب آپ کو یہ ستم برداشت کرنے پڑے ہیں لیکن اس حویلی کے ایک فرد کی حیثیت سے ہم خود کو بھی کم مجرم نہیں سمجھتے۔ خاموشی اور پردہ پوشی بھی جرم میں اعانت کے مترادف ہے۔"

"خدا کے لیے اب اُسے بھول جائیے۔"

"ہم بھی یہی کہہ رہے ہیں۔" وہ تیزی سے بولی۔ "اسی لیے ہماری درخواست ہے کہ آپ اس حویلی کو اپنا گھر ہی تصور کریں اور اس کے مکینوں کو اپنے دوست، اپنے عزیز۔ بخدا ہم یہ کوئی رسم ادا نہیں کر رہے ہیں، بہ صمیمِ قلب منت گزار ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے بہکی ہوئی آواز میں کہا۔

"کتنا عجیب ہے کہ اس بار بھی ہم ہی کچھ طلب کر رہے ہیں لیکن شاید قرار یہی پایا ہے کہ ہم ستم توڑیں، ہم ہی داد رسی چاہیں۔ ہم نے آپ کو اس لیے یہاں بلایا تھا بلکہ ہم خود حاضر ہونا چاہتے تھے کہ آپ سے ایک اور سلوک کی التجا کریں۔ آپ نے خانم کو یہاں لا کے اس ساری حویلی کو زندگی کی نوید دی مگر آپ کی آمد بھی ہمارے لیے اسی نوید کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ کو دوبارہ دیکھنے کی ہمیں بہت آرزو تھی۔ رات سے ہم آپ کے پاس آنے کے لیے بے چین تھے۔ ہمیں خوف تھا کہیں آپ باہر نہ چلے جائیں اور ہم اپنے احساسات کے اظہار سے قاصر نہ رہ جائیں۔ کچھ ایسا ہی تھا، رات ہی آپ واپس جانا چاہتے تھے کیونکہ خانم کو یہاں پہنچا دینے کے بعد آپ کا کام ختم ہو گیا ہے۔ آپ یوں چلے جاتے تو جانے پھر کب آتے۔ ہم جانتے ہیں کہ درمیان کا یہ عرصہ ہم پر کسی پہاڑ کی طرح گزرتا۔ وقت کا بھی کچھ طے نہیں ہے کہ کب کیسی کیسی گرہیں ڈال دے۔ سو ہمارا بس چلتا تو ہم رات ہی کو آپ کے پاس آ جاتے۔ ہم بار بار خادماؤں سے پوچھتے رہے مگر آپ رات گئے تک جہانی بھائی کے ساتھ رہے اور ہمیں آنے کا موقع نہ مل سکا۔"

"میرا بھی جی چاہتا تھا کہ آپ سے کبھی دوبارہ ملاقات ہو۔" اُس سے اتنا کچھ سُننے کے بعد میری زبان سے بھی کچھ تو نکلنا ہی۔ میں نے نرمی سے کہا۔ "اُس رات زنداں میں آپ کے جانے کے بعد دیر تک خیال رہا کہ آپ کتنی دیواریں عبور کر کے کس اُمید سے آئی تھیں اور ہم آپ کو کچھ بھی نہ دے سکے، ہم تو ٹھیک طرح بات بھی نہ کر سکے۔"

"آپ نے کچھ نہ دے کے بھی ہمیں بہت کچھ عطا کیا تھا، اُمید، حوصلہ، آپ نے ہمیں صبر دیا تھا اور . . . اور بھی بہت کچھ جو ہمیں پہلے کبھی نہیں ملا تھا، جو ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ہمارے لیے وہ سب نیا تھا۔" اُس کی آواز ترنّج رہی تھی۔ "بہرحال، اب تو سب ختم ہو گیا ہے۔" میں نے شگفتگی سے کہنے کی کوشش کی لیکن میری آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

"ہاں، ایک باب ختم ہو گیا، دوسرا شروع ہوا ہے۔" اُس نے نوید لہجے میں کہا۔ "ہم یہی کہنا چاہتے ہیں کہ خانم کی آمد سے جو نئی ڈوری بندھی ہے، اُسے ٹوٹنا نہیں چاہیے۔ خانم تو یہاں آ گئی ہیں لیکن اُن کے لانے والے بھی ہمیں اُنھی کی طرح محترم، اُنھی کی طرح عزیز ہیں۔ ہم نے اب تک بہت کچھ کہا ہے لیکن ہمیں ہر لفظ حقیر معلوم ہوتا ہے۔ ہر لمحے یہ احساس فزوں ہوتا ہے کہ ہماری زبان ہمارا ساتھ نہیں دے رہی۔ ہمیں کہنے دیجیے کہ صرف خانم ہی ہمیں نہیں ملیں، اُن کے ساتھ ہم نے اور بھی بہت کچھ پایا ہے اور ہم اُسے کھونا نہیں چاہتے۔"

"جی، جی ہاں، کھونے کا کیا، یہ سلسلہ تو قائم رہے گا۔" میں نے اٹکتی زبان سے کہا۔ "آپ کی نوازش ہے جو آپ ایسا سمجھتی ہیں، میرے لیے یہ اعزاز ہے۔ کم از کم میری طرف سے، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری طرف سے آپ کو کوئی شکایت نہ ہو گی۔"

"نہیں نہیں، شکایت نہیں۔" وہ تڑپتی آواز میں بولی۔ "صرف شکایت ہی نہیں، ہماری مراد ہے . . . ہم چاہتے ہیں کہ ہم اس سے سوا کے خواست گار ہیں۔ ہم کس طرح کہیں۔ شاید ہماری آواز اسی سبب سے گھٹ رہی ہے کہ یہ سب کچھ قبل از وقت ہے، بہت بے محل ہے لیکن موسموں کا کیا اعتبار، پھر وقت ملے نہ ملے، اس لیے ہم سب آج ہی کہہ دینا چاہتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ہمیں کسی مطالبے کا کوئی اختیار نہیں مگر ہم تو محض اپنی خواہش کا اظہار کر رہے ہیں۔ ہمارا جی چاہتا ہے۔" وہ ڈوبے ہوئے لہجے میں بولی۔ "کہ اس حویلی سے آپ کی نسبت کسی طور قائم رہے۔ ہم آپ کو آپ کو اس حویلی ہی کے ایک فرد کے طور پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ جیسے ہم ہیں اِن درودیوار کا ایک حصہ جیسے جیسے۔" اُس کی آواز ٹوٹ گئی۔ مجھے اپنے سُنے ہوئے پر بار بار شبہ ہوتا تھا۔ وہ کہنے لگی: "آپ جانے کیا کہیں لیکن کچھ بھی ہے، ہمارے لیے یہ دوسرا ہی موقع ہے کہ ہم حویلی کی ہزار روایتیں توڑ کے یوں آپ کے سامنے بیٹھے ہیں۔ صرف اس لیے نہیں کہ خانم کی آمد کی خوشی میں جہانی بھائی پر ایک بے خودی سی طاری ہے اور آپ سے تپاک کے لیے اُن کی جانب سے ہمیں خاص ہدایتیں ملی ہیں۔ یہ رعایت اپنی جگہ لیکن ہم تو آپ کے پاس اپنے ارادے سے حاضر ہونا چاہتے تھے اور خدا جانتا ہے اب ہم میں جہانی بھائی کا سامنا کرنے کی استقامت بھی موجود تھی۔ ہم بار اور

نہیں کریں گے کہ یہ محض ہمارے اندر چھپی ہوئی ندامتیں ہیں، جو ہمیں آپ کے سامنے بے اختیار کیے ہوئے ہیں۔ کیا کوئی ازالہ کوئی تدارک ممکن ہے۔ یہ صلہ نہیں ہے اور ہم صلہ دے بھی کیا سکتے ہیں؛ مال و دولت آپ نے پہلے ہی ٹھکرا دیا ہے، اس کے سوا ہمارے پاس اور ہے بھی کیا۔ ہم تو اُلٹا آپ سے کچھ مانگ رہے ہیں۔ اسے حُسنِ ظن بھی نہ سمجھا جائے۔ پشیمانی کا احساس اپنے اظہار پر تمام ہو جاتا ہے اور صلہ اگر ممکن ہوتا یا آپ طے کر دیتے تو ہم مقدور بھر کوشش کرتے۔ اگر اتنا ہوتا تو کیا ہماری سیری ہو جاتی۔ ہماری طلب تو پھر بھی اپنی جگہ قائم رہتی۔ ہم ایک محسن سے ضرور مخاطب ہیں لیکن یقین کیجیے ہماری نظروں میں آپ کا درجہ اسی قدر نہیں ہے۔ ہمیں کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا کوئی کھویا ہوا مل گیا ہے۔" اُس کی آواز لرزنے لگی تھی۔ "ہم اُس شخص سے مخاطب ہیں جسے ہم نے اُس رات زنداں میں دیکھا تھا جس کی آواز ہمیں بہت شناسا معلوم ہوئی تھی۔ سو ہم تو اپنے دل کی بات کر رہے ہیں جس میں آپ کے لیے کوئی دریا سا موجزن ہے۔ ہمارا دل چاہتا ہے کہ ہم آپ کے کسی کام آئیں۔ ہمارا اس طرح بے محابا آپ کے پاس آنا کیا صرف اظہارِ ممنونیت کی بے کلی کے سبب ہے؟ ہم سارے حجابات ترک کر کے آئے ہیں کہ آپ کو کچھ باور کرا سکیں۔ آپ کے قدم حویلی کے در و بام کی طرف بڑھتے ہوئے رکاوٹ محسوس کریں، درمیان کوئی بھید بھاؤ نہ رہے۔ آپ جان لیں کہ یہاں آپ کے کیسے کیسے طلب گار موجود ہیں۔ یہ حویلی آپ کا زنداں ہو سکتی ہے تو آپ کا گھر بھی۔ یہاں کے مکین آپ کے صیاد ہو سکتے ہیں تو آپ کے صید بھی۔ آپ سے کسی رفاقت کا احساس ہمارا اعزاز ہے اور یہ تو ہماری طلب کی بات ہے جو آپ کے قرینۂ عطا سے مشروط نہیں۔ اگر ہماری طلب میں کوئی نقص ہے تو یقیناً یہ بار آور نہیں ہو گی۔"

میرے کان سنسنا رہے تھے اور سارا جسم جیسے پتھر ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے کوئی بھی جواب دینے کا یارا نہیں تھا۔ گیتی چُپ ہو گئی تھی لیکن اُس کی آواز کی بازگشت میرے سینے میں دھمک رہی تھی۔ پھر مجھے یہی گمان ہوتا تھا کہ یہ سب میرے حواس کی بے توازنی کا فشار ہے۔ میرے حواس میرا ساتھ نہیں دے رہے یا میں کسی بہت عجیب خواب سے دوچار ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کتنی دیر کمرے میں خاموشی مسلط رہی، پھر گیتی کی آواز پر ایک دم میرا وجود جیسے جھنجھنا اُٹھا۔ "رات ہمیں خانم سے بات کرنے کا موقع مل گیا تھا۔"

"کیسی بات؟" میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"یونہی کچھ۔" وہ ٹھیرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "گو رات کوئی مکمل تو نہ تھا لیکن اُن کا رسمی شکریہ ادا کرتے ہوئے ہمیں اُن سے چند غیر رسمی باتیں کرنے کا موقع بھی مل گیا۔ وہ ایک نہایت شائستہ خاتون ہیں۔ ہمیں اپنے شوہر کی پسند و ناپسند کا اچھی طرح علم ہے۔ وہ ہمیشہ سے گوہر شناس رہے ہیں، سو ہم خانم کو دیکھنے اُن سے بات کرنے کے لیے بے تاب تھے۔ بے شک وہ کسی گہر ہی کے مانند ہیں۔ ہمیں تو ہم سوچتے تھے، وہ شخص کیسا ہو گا جو انھیں اس قدر مرغوب ہے۔ خانم کو صورت سیرت میں خدا نے بہترین صفات سے نوازا ہے لیکن یہ خوبیاں تو مستزاد ہیں۔ وہ کیسی بھی ہوتیں، ہمارے لیے ہر حال میں معزز و محترم تھیں۔ باتوں باتوں میں ہمیں نے آپ کا ذکر چھیڑ دیا اور ہمیں اپنے اندازوں کی سند مل گئی۔"

"انھوں نے آپ سے کچھ کہا ہے؟" میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"وہی سب جو ہم نے آپ کو دیکھ کے اخذ کیا تھا۔ جو ہمارے لیے نیا نہیں تھا لیکن خانم کی زبانی سُن کے ہمارا اشتیاق و اضطراب اور بڑھ گیا۔"

"آپی نے آپ کو کیا بتایا؟" میں نے اٹکتے لہجے میں پوچھا۔

"انھوں نے نہایت فخر اور مسرت سے آپ کا ذکر کیا تھا۔ وہ کیفیت جو کسی کی شدید وابستگی کے اعتماد ہی میں ممکن ہے۔" گیتی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لرزنے لگی۔ "یقین کیجیے، ہمیں بہت رشک آیا۔ آپ کے نام پر اُن کی آنکھوں سے روشنی پھوٹنے لگی تھی۔"

"مگر آپی! وہ کیا کہہ رہی تھیں؟"

"زیادہ وقت کہاں مل سکا۔ پہلی ہی ملاقات تو تھی۔ ہم تو اُن کی اجنبیت کا احساس دور کرنے اُن کے پاس گئے تھے۔ صورتِ حال ہی کچھ ایسی تھی، ہم اُن سے کتنی باتیں کر سکتے تھے۔ بس اشارے کنائے تھے اور ہم نے آپ کو بتایا تا کہ وہ بھی بس ہمارے جانے ہوئے کی تصدیق کی حیثیت رکھتے تھے۔ ہم نے خود بھی تو کچھ بتانا ہوتا تھا۔ اُس رات زنداں میں ہم نے آپ کو قریب سے دیکھا تھا اور ہمیں اجازت دیجیے، اگر ہم کہیں کہ ہم نے قریب سے محسوس کیا تھا۔ آپ کے ساتھی بزرگ کے بارے میں ہم ایک اچھی رائے کے سوا کوئی واضح تصور اپنے ذہن میں قائم نہیں کر سکتے تھے لیکن آپ کی بات دوسری تھی۔ آپ ہماری توقع سے بالکل مختلف تھے اور ہم بتائیں کہ آپ کو دیکھ کے ہمارے جسم و جاں پر چھائے ہوئے طرح طرح کے اندیشے یکسر نہیں تو ایک حد تک چھٹ گئے تھے اور ہمیں کم از کم یہ گداز مل گیا تھا کہ ہمارا واسطہ اہلِ دل لوگوں سے ہے۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ آپ بہت خطرناک لوگ ہیں، کم از کم آپ کی حد تک یہ بہتان ہی معلوم

ہوتا تھا۔ ابتدا میں ہمیں اندازہ ہو گیا تھا کہ ہمارا مخاطب کون ہو سکتا ہے۔ لب و لہجہ بتا رہا تھا کہ حسب و نسب کے امتیاز کے علاوہ وہ تعلیمی مناصب سے بھی آراستہ ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی نے شاید اُس سے اچھا برتاؤ نہیں کیا۔ اُس کی آواز کی یہ پژمردگی بے سبب نہیں ہوگی۔ اور یہ تو کلام کی بات ہے۔ ممکن ہے جیسے آپ ابتدا میں خاموش تھے، خاموش ہی رہتے تو بھی آپ کی آنکھیں، آپ کا چہرہ تو ہمارے سامنے تھا۔ ہم جان گئے تھے کہ ہمارا مخاطب نوجوان ایک اسی زنداں میں نہیں، زندگی بھی اس کے لیے زنداں بنی رہی ہے۔ اس کے چہرے پر یہ دھواں سا کیوں چھایا جاتا ہے اور اُس کی آنکھوں میں یکایک یہ ویرانیاں کہاں سے سمٹ آتی ہیں۔ اس کی نگاہیں اچانک بھٹکنے، منڈلانے لگتی تھیں جیسے کسی کو کچھ یاد آ جائے اور اُس میں جو استقامت نظر آتی ہے، وہ امید ہی کی علامت ہوگی۔ اُس کی اُمید نہیں ٹوٹی ہے۔ اُمید ٹوٹ جائے تو بہت سے دُکھ ہلکے ہو جاتے ہیں لیکن یہ اُمید بڑا عذاب ہے۔ یہ استقامت، یہ اوسان بحال رکھنے کی کوشش تو دوسرا ستم ہے۔ آدمی ذرا سی ٹھیس لگنے پر رنگ بدل لیتا ہے۔ سامنے راستے میں کانٹے بچھے ہوں تو دوسرا راستہ اختیار کر لیتا ہے مگر یہ بے حوصلہ لوگوں کا شیوہ ہے۔ جانے کیوں ہمیں ایسا محسوس ہوا کہ آپ کی حالت ہم سے مختلف نہیں ہے بلکہ ہم سے کچھ سوا ہی ہے۔ ہم نے کبھی کوئی شعر پڑھا تھا۔ یاد تو نہیں آ رہا، مفہوم کچھ ایسا تھا کہ جن کے پاس ہم چارہ گری کی آس میں گئے، وہ ہم سے بھی زیادہ طلب گارِ نگاہ تھے۔ وہاں سے آ کے ہرجبیں بہت روئیں۔ ہم سے کہنے لگیں، گیتی! تم نے انھیں دیکھا! ہم کیا کہتے، چپ ہو گئے۔ ہم نے ان سے نہیں کہا کہ ہماری آنکھوں پر شاید تم سے کچھ زیادہ ہی عذاب گزرا ہے۔"

میرے ہاتھ اپنا چہرہ چھپانے کے لیے اُٹھتے تھے اور تھم کے رہ جاتے تھے۔ ضرور خانم نے اُس سے کچھ کہا ہوگا۔ جانے کیا کیا کہا ہوگا۔ میرے دل کی بات جیسے گیتی تک منتقل ہو گئی۔ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی: "خانم کے کسی حوالے سے نہیں، ہم نے سب اپنے طور پر قیاس کیا تھا۔ اس پہلی اور سرسری ملاقات میں خانم ہمیں بتا بھی کیا سکتی تھیں۔ ہمیں اُن کی تائید کی ضرورت نہیں تھی۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے لہجے میں پھر ایسا تیقن، ایسا وثوق نہ ہوتا۔ ہماری آپ کی یہ دوسری ملاقات ہے لیکن یہ بھی جانتے ہیں کہ ہم آپ کو کتنی بار دیکھ چکے، آپ سے کتنی بار مل چکے ہیں۔ خانم کی آمد سے پہلے بھی آپ سے ہماری شناسائی میں کوئی کمی نہیں تھی۔ جب آپ یہاں تھے تو آپ کے زندانی ہونے کا دُکھ تھا اور اپنی بے چارگی کا۔ آپ یہاں سے چلے گئے تو خوشی کے ساتھ ساتھ یہ خلش بھی ڈستی رہی کہ آپ ہم سے دُور ہو گئے ہیں۔ ہم کچھ بھی نہ کر سکے، کچھ بھی نہ کہہ سکے۔"

میرا سینہ اندر سے جیسے کوئی دھنک رہا تھا۔ تمام میں نے آنسو اپنی آنکھوں سے چھپائے رکھنے کی کوشش کی۔ نہ مجھ میں وہاں سے اُٹھ کے بھاگنے کی طاقت تھی، نہ اُس سے یہ کہنے کی کہ خدا کے لیے وہ خاموش ہو جائے، اتنا ہی بہت ہے۔ میں نے نہیں دیکھا، ہرجبیں نے یا تو کوئی اشارہ کیا تھا یا گیتی کو خود ہی احساس ہو گیا تھا، وہ چپ ہو گئی تھی۔ اتنے میں ایک خادمہ طشت اُٹھائے نپے تلے قدموں سے اندر داخل ہوئی۔ اُن دونوں کی نگاہیں اُس کی جانب مبذول ہوئیں، مجھے اپنی سانسیں استوار کرنے کی فرصت مل گئی۔ خادمہ نے چائے کا پہلا طشت اُٹھا کے اُس کی جگہ دُوسرا رکھ دیا۔

"آپ نے کچھ بھی نہیں لیا، چائے بھی رکھے رکھے ٹھنڈی ہو گئی۔" ہرجبیں کی آواز نسبتاً کھلی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، اُس نے شرمگیں لہجے میں مجھ سے شکر کے لیے پوچھا۔ اُس کی بڑی بڑی سوالیہ آنکھیں مجھ پر مرکوز تھیں۔ میں نے سٹ پٹاتے ہوئے انداز میں اُسے بتایا کہ دو چمچوں کے بہ قدر۔ ہرجبیں کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ جب وہ شکر گھول رہی تھی تو پیالی کی کھنک میں اُس کی چوڑیوں کی کھنک بھی شامل ہو گئی۔ چائے بنا کے اُس نے پیالی میری طرف بڑھائی، ایک ثانیے کے لیے میرے سارے جسم میں اندھیرا سا چھا گیا۔ اُس کے ہاتھ سے پیالی تھامتے ہوئے میرے ہاتھ ڈگمگا رہے تھے۔ میں نے جلدی سے پیالی ہونٹوں سے لگائی، میرا منہ جل گیا۔ پیالی ہاتھ سے گرتے گرتے رہ گئی۔

"وقت کا کچھ احساس ہی نہیں ہوا۔" گیتی آہستگی سے بولی۔ "دن خاصا روشن ہو گیا ہے۔" میں نے بے چینی سے اثبات میں سر ہلایا تو وہ کہنے لگی: "آپ نے تو کوئی بات ہی نہیں کی، اور ہم نے اس کا موقع بھی کب دیا لیکن اب ہمارے پاس کہنے کو شاید کچھ نہیں ہے۔ یقین کیجیے کہ اب ہمیں پہلے جیسی گراں باری محسوس نہیں ہو رہی۔ البتہ آپ کی خاموشی سے یہ خیال آتا ہے کہ کہیں۔۔۔ کہیں ہمارا اصرار آپ کی سرگرانی کا سبب نہ بن گیا ہو۔ بخدا ہمارا یہ مقصد نہیں تھا۔ ہم نے آپ سے پہلے کہہ دیا ہے کہ ہماری عرضِ حال کے لیے آپ کی تائید و تردید لازم نہیں۔ آپ اطمینان رکھیں۔ ہمیں ہر طور آپ کی خوشی عزیز ہے۔"

"نہیں، نہیں!" میں نے ہکلاتے لہجے میں کہا۔ "سرگرانی کیسی!

اپنے بارے میں ایسی باتیں سُن کے کسے خوشی نہیں ہوگی۔ کون ایسا ہوگا جو یہ سب جان کے خود پر ناز نہیں کرے گا لیکن۔۔۔" مجھے خدشہ ہوا کہ میری زبان سے کوئی اُلٹی سیدھی بات نہ نکل جائے اس لیے میں نے اسی پر اکتفا کیا۔

"آپ چُپ کیوں ہو گئے؟" ہرجبیں بے تابانہ بولی۔

"کچھ نہیں۔" میں نے بے ترتیبی سے کہا۔ "میں کہنا چاہتا تھا کہ میں کسی طرح اِس عزت اور احترام کے لائق نہیں۔ میں تو ایک بہت معمولی بلکہ ایک ناکارہ آدمی ہوں، اور یہ میں کسی انکسار میں نہیں کہہ رہا ہوں، حقیقت یہی ہے۔ بہرحال یہ سب کچھ میرے لیے ایک شرف ہے۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں۔۔۔ جہاں میرے ایسے تپاک کرنے والے، مجھے اتنی عزت دینے والے موجود ہوں، وہ گھر میرا کیوں نہ ہوگا۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ اب مجھے یہاں کسی قسم کی اجنبیت کا احساس نہیں ہو رہا ہے۔" میں نے یک بارگی سر اُٹھا کے دیکھا۔ اُن کی آنکھیں دمک رہی تھیں اور ہرجبیں کے رخساروں پر تو بجلیاں سی چمک رہی تھیں۔ میرا دل بھی اُمڈنے لگا تھا۔ اُن کے چہروں پر وہی شفق پھوٹ رہی تھی جو کوئی اُمید بر آنے پر ہوتی ہے یا کسی بچھڑے ہوئے کے اچانک مل جانے پر۔ اُن کا یہ عالم دیکھ کے میرا جی چاہا کہ میں اُن سے مزید کچھ کہوں تاکہ وہ اور گلنار ہو جائیں۔ وہ منظر اتنا دل نشین تھا کہ چند لمحوں کے لیے مجھے اپنی سدھ بدھ نہ رہی۔ ہرجبیں تو بالکل دُلھنوں کے مانند شرما رہی تھی اور ایسا لگتا تھا جیسے اُس کے سارے بدن سے اُمڈ اُمڈ کے آنسو آنکھوں میں سمٹ آئے ہوں۔ میرے لیے یہ سب کچھ دیدنی تھا۔ ان جیسی نازک اندام، حور شمائل کی نظر میں، میں ایسا معتبر ہوں کہ میری ایک جنبشِ لب سے ان کے رنگ دھندلے پڑ جاتے ہیں، ان کے رنگ کھل اُٹھتے ہیں۔ یہ جان کے مجھے بہت آرام مل رہا تھا اور ایک توانائی، برتری سی محسوس ہو رہی تھی اور میں کہیں کھو سا گیا تھا۔

"ہمیں آپ کے ظرف کا اتنا ہی یقین تھا۔ یقیناً اب ہمارے بُرے دن ہم سے دُور ہو گئے ہیں۔ یہ قبولیت کی گھڑیاں ہیں جو پہنچی ہیں، ہم اپنے خدا سے اور کیا مانگیں۔ خانم کے قدم واقعی بڑے مبارک ہیں۔" گیتی کی آواز کمرے میں منڈلا رہی تھی۔ "خدا کرے، یہ جوڑی بھی خانم کو راس آئے۔"

خانم کے نام پر مجھے اچانک خیال آیا کہ مجھے اُس سے نواب عالم تاب کے بارے میں پوچھنا چاہیے۔ خانم کب اور کس طرح اس کے سامنے گئی۔ خانم کو دیکھ کے تو اُس پر قیامت گزر گئی ہوگی۔ اچھا ہوا کہ مجھے وقت پر نامناسبت کا احساس ہو گیا اور الفاظ میری زبان پر تلملا کے رہ گئے۔ یہ اس سے پوچھنے کی بات نہیں تھی۔ مجھے بالکل خیال نہیں رہا تھا کہ وہ نواب عالم تاب کی بیگم بھی ہے۔ وہ کیا کہہ سکتی ہے، وہ تو وہاں موجود بھی نہیں ہوگی۔ اس کا اندازہ تو اُس کے چہرے سے بھی ہو سکتا ہے۔ نواب عالم تاب کی طرف سے غافل ہو کے ہی وہ دونوں میری طرف آئی ہوں گی۔ یہ فراغت اطمینان کے بغیر ممکن نہیں تھی۔ نواب کو اُس کا سنبھالا لگ گیا تھا۔ میں یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ ہرجبیں کی آواز نے مجھے منتشر کر دیا۔ "آپ کے بابا جان بھی تو آپ کے ساتھ ہیں؟" اُس کے لہجے میں پہلے سے زیادہ اعتماد تھا۔

"جی ہاں۔" میں نے پہلو بدل کے کہا۔ "اُن کا یہاں ہونا بھی ایک اتفاق ہے اور ہم سب کا حیدرآباد میں ہونا بھی۔ ہم کہیں اور جا رہے تھے کہ راستے میں ہم نے حیدرآباد کا ارادہ کر لیا۔ ابا جان کی فکر ہی سب سے زیادہ تھی۔ کسی کو خبر نہیں تھی کہ ہم یہاں ایک حویلی میں قید ہیں۔"

"بے شک۔۔۔ ہم سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کتنے پریشان ہوں گے۔ وہ کیسا صبر آزما وقت کاٹا ہوگا انھوں نے۔" گیتی اداس لہجے میں بولی۔ "ہم تسلیمات اور معافی کے لیے اُن کی خدمت میں ضرور حاضری دیں گے۔ کاش آپ اُس وقت ہماری گزارش توجہ سے سُن لیتے۔ یاد ہے، ہم نے عرض کیا تھا کہ ہم آپ کے پُرسانِ حال کو آپ کی خیریت کی اطلاع پہنچانے کی ایک کوشش کر سکتے ہیں۔"

"یاد ہے، اور ہمیں آپ پر پورا بھروسا بھی تھا لیکن یہ خبر سُن کے کہ ہم ریاست کے ایک بڑے نواب کے ہاں قید ہیں، وہ وحشت میں کوئی بھی ایسا قدم اُٹھا سکتے تھے جو صورتِ حال مزید پیچیدہ کر سکتا تھا۔"

"آہ! آپ نے خود پر کتنا جبر کیا تھا۔" گیتی جذبات سے بولی۔ "ایسی حالت میں یہ تحمل انھی سے ممکن ہے جن میں خدا نے صبر و ضبط اور عقل و ہوش کی اعلا خوبیاں ودیعت کی ہوں۔"

میں نے چائے کی پیالی ختم کر لی تھی۔ ہرجبیں نے مجھ سے مزید چائے کے لیے پوچھا۔ اُس کے انداز و اطوار میں تمکنت اور ناز کے علاوہ ایک لپک سی تھی۔ ایک ایک لفظ ترازو میں تُلا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اُس کی آواز میں ایسی لپک اور کھنک تھی کہ منع کرنا مشکل ہو جاتا تھا لیکن میں نے انکار کر دیا۔ اُس نے بھی اصرار نہیں کیا اور خاص دان میری جانب بڑھا دیا۔ خادمہ ابھی خاص دان رکھ کے

گئی تھی۔ رات کے پان کا ذائقہ مجھے ابھی تک یاد تھا۔ میں نے چاندی کے ورق میں لپٹی ہوئی ایک گلوری منہ میں رکھ لی۔ "سنا ہے آپ جلد از جلد یہاں سے روانہ ہو جانا چاہتے ہیں۔" گیتی نے مختصر سکوت کے بعد مجھ سے پوچھا اور حسرت آمیز لہجے میں کہنے لگی۔ "کیا ہی اچھا ہو کہ آپ چند دن یہیں قیام فرمائیں۔"

میں نے دھیمی آواز میں کہا کہ مجھے ابا جان اور دوسروں کی بابت کچھ علم نہیں کہ انھوں نے روانگی کے لیے کیا طے کیا ہے البتہ اتنا میں ضرور جانتا ہوں کہ جتنی جلد ممکن ہو سکے، ہمیں یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے۔ میرے جی میں آئی، انھیں بتا دوں کہ ہم کن لوگوں کے پاس جا رہے ہیں، ان کے پاس، جن سے بچھڑے ہوئے مجھے ایک زمانہ گزر گیا ہے۔ میں انھیں اگر یہ بتا دیتا تو اور بہت سی باتیں نکل آتیں۔ ویسے بھی ہر لمحے مجھے یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہیں وہ ادھر ادھر کے سوال نہ کرنے لگیں۔ نہ معلوم خانم نے انھیں کیا کیا اور کس طرح بتایا ہے مگر انھوں نے مجھ سے ایسا کوئی سوال نہیں کیا۔ یقیناً وہ مجھ سے متعلق اپنے ذہن میں جھلکنے والے بے شمار سوالوں سے دانستہ اجتناب کر رہی ہوں گی۔ ان کے اطمینان میں ایک خوف بھی نمایاں تھا کہ کہیں ان سے کوئی بھول نہ ہو جائے اور میری دل شکنی میرے لیے الجھن کا سبب نہ بن جائے۔

"خانم کے سکون کے لیے چند دن آپ کا یہاں قیام کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس عرصے میں وہ حویلی کے ماحول سے مانوس ہو جائیں گی۔" گیتی رک رک کے بولی۔ "اور ہمارا، ہمارا بھی یہی جی چاہتا ہے۔"

"میں ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا۔ اگر ابا جان نے ارادہ کر لیا تو ان کے ساتھ جانا پڑے گا۔ رات بڑے نواب صاحب بھی اسی خواہش کا اظہار کر رہے تھے۔ میں پھر آ جاؤں گا اور جلد ہی آؤں گا۔"

"ہم ابا جان سے خود درخواست کریں گے۔" برجیس نے چہکتی آواز میں کہا۔ "ہمیں یقین ہے، وہ ہماری بات مسترد نہیں کریں گے۔"

"لیکن وہ بٹے ہوئے رہیں گے۔ جب تک انھیں جہاں جانا ہے، وہ نہیں آئیں گے، ان کا دل بے چین رہے گا۔"

"ایسی کوئی بات ہے تو ہم ان سے اصرار نہیں کریں گے۔ یوں بھی آپ کی بات مناسب معلوم ہوتی ہے۔" گیتی مایوسی سے بولی۔ "آپ کو منزل مقصود پر پہنچنے میں پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔"

دھوپ کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ کمرہ خوب روشن ہو گیا تھا۔ میرا ایک دل وہاں سے اٹھنے کو کہتا تھا تو دوسرا یوں ہی ان کے پاس بیٹھے رہنے کو۔ لیکن اتنی دیر سے وہ حویلی کے دوسرے مکینوں کی نظروں سے دور تھیں۔ یہ خیال آتے ہی میں نے دبے لہجے میں ان سے اجازت چاہی۔ انھوں نے مجھ سے تھوڑی دیر اور ٹھہرنے کے لیے اصرار کیا۔ میں بیٹھا رہا۔ وہ کن انکھیوں سے مجھے دیکھا کیں اور میں انھیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھیں لیکن کہہ نہ سکیں۔ میں بھی ان سے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کیا، یہ ذہن میں کہیں گم ہو گیا تھا۔ دریچوں سے نرم نرم ہوا اندر آ رہی تھی۔ کبھی کوئی تیز جھونکا آتا تو کمرے میں بیلی گلاب کی خوشبو منتشر ہو جاتی۔ دور دروازے کے قریب ایک خادمہ بت کی طرح ساکت کھڑی تھی۔ برجیس کی تیز سانسیں اس کے چہرے سے صاف عیاں تھیں۔ اچانک اس کے نتھنے اور ہونٹ پھڑکنے لگے تھے۔ میری سمجھ میں کچھ اور نہیں آیا تو میں نے کہا: "آپ کو دیر ہو رہی ہوگی۔ میں پھر کسی وقت آ جاؤں گا۔"

"ہم بھی یہی کہنے والے تھے۔" گیتی ہکلاتی آواز میں بولی۔ "اور ہمیں ابھی تک یہ شبہ ستا رہا ہے کہ ہمیں از سر نو سب کچھ دہرانا چاہیے۔"

"نہیں، نہیں۔" مجھے اپنی زبان پر اختیار نہیں رہا تھا۔ "سب کچھ میرے دل پر نقش ہے۔" میں نے بھری ہوئی آواز میں کہا اور میں اسی وقت اٹھ گیا۔

"ہم منتظر رہیں گے۔" برجیس مضطرب لہجے میں بولی۔

"اب آپ کو یہ راستے یاد رہیں گے نا!" گیتی نے اشتیاق سے کہا۔ "ورنہ کسی بھی خادمہ سے کہہ دیجیے گا، ہم خود حاضر ہو جائیں گے۔"

وہ دونوں بھی میرے ساتھ اٹھ گئی تھیں۔ برجیس نے سر سے ڈھلکتا ہوا دوپٹا ٹھیک کیا اور چہکتے لہجے میں بولی: "آپ گل دستہ بھولے جا رہے ہیں۔"

"اوہ۔" میں نے تیزی سے مڑ کے دیکھا۔ جو گل دستہ خادمہ بالائی منزل پر میرے لیے لائی تھی، وہ میں یہاں ساتھ لے آیا تھا اور اب اسے چھوڑے جا رہا تھا۔ مجھے بڑی خفت ہوئی۔ میں نے گل دستہ قالین سے اٹھا لیا۔ وہ دونوں میرے پہلو بہ پہلو چلتی ہوئی کمرے سے باہر آئیں۔ میرے قدم بہک رہے تھے۔ باہر راہداری میں وہ اس مختصر فاصلے تک میرے ساتھ رہیں جہاں سے بالائی منزل کے لیے زینہ جاتا تھا۔ وہ زینے پر بھی میرے ساتھ آنا چاہتی تھیں۔ میں نے انھیں روک دیا۔ زینے پر قدم رکھنے سے پہلے میں نے انھیں آداب کہا اور شکریہ ادا کرنا چاہا لیکن شکریے کا لفظ میری زبان پر آ کے رہ گیا۔ گیتی سر اٹھائے میرے بالکل مقابل کھڑی تھی اور برجیس اس سے ایک قدم پیچھے۔ دونوں کی آنکھیں جگمگا رہی تھیں، اور رخساروں پر سرخی چھلک رہی

تھی۔ برجیس کے سراپا کا ارتعاش میری نگاہوں سے چھپا نہ رہ سکا۔ جیسے میں ان سے بہت دنوں کے لیے رخصت ہو رہا ہوں، ان کے چہروں پر کچھ ایسا ہی ہیجان چھایا ہوا تھا۔ میری رگوں میں بھی خون کی گردش جیسے رک گئی تھی۔ اس موقع پر کون سا رویہ مناسب ہوتا ہے۔ یقیناً مجھ سے کوئی چوک ہو رہی ہے۔ مسلسل یہی گمان میرے ہاتھ پیر جکڑے لے رہا تھا۔ بہتر یہی تھا کہ میں جلد سے جلد ان کے سامنے سے ہٹ جاؤں۔

میں نے ابھی زینے پر قدم رکھا تھا کہ گیتی کی گونجتی آواز نے مجھے روک لیا۔ "ہم حویلی سے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہیں۔" وہ جھجکتے ہوئے بولی۔ "یہ حویلی خاصی پیچیدہ ہے لیکن یہاں ایسے کئی مقامات اور مناظر ہیں، جو شاید آپ کی دل بستگی کا باعث ہو سکیں۔ گو خادموں کو ہدایت کر دی گئی ہے لیکن آپ جب ضرورت سمجھیں، انھیں طلب کرنے میں کوئی تکلف نہ کیجیے گا۔ وہ آپ کے قریب ہی رہیں گے۔ حویلی میں نہانے کا تالاب، مختلف کھیلوں کے انتظامات، ان کے لیے مخصوص کمرے اور سیر کے لیے دوسرے کئی مقامات ہیں۔ ایک مختصر وقت کی رعایت دی جائے تو خادم موسیقی کا اہتمام بھی کر سکتے ہیں۔ حویلی سے تین میل کی دوری پر گول کنڈے کی جانب شکار گاہ ہے۔ چاروں طرف پہاڑوں سے گھرا یہ سبزہ زار اب کسی قدرتی جنگل کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ موٹریں آپ کو ایک گھنٹے سے کم مدت میں وہاں تک پہنچا سکتی ہیں۔ وہاں فیل خانہ بھی ہے اور گھڑ سواری کا انتظام بھی۔ مصنوعی جھیل میں کشتی چلتی ہے۔ غرضیکہ وہاں شکار کے علاوہ دل کش مناظر بھی کثرت سے موجود ہیں۔ ہر چند کہ اس تفصیل کی ضرورت نہیں تھی لیکن ہم نے سوچا، آپ کے گوش گزار کر دیں تو بہتر ہے۔"

میں سنتا رہا۔ گیتی چپ ہوئی ہی تھی کہ برجیس مسکراتے ہوئے بولی۔ "اور یہاں ایک زنداں بھی ہے۔"

"جی، جی ہاں۔" میں نے بے خیالی میں سر ہلا دیا تھا لیکن دوسرے لمحے بے ساختہ مجھے ہنسی آ گئی۔ ان کے موتیوں جیسے دانت بھی دمکنے لگے۔ میں نے انھیں اس عالم میں پہلی بار دیکھا تھا۔ ایسا لگا جیسے ہر جانب چنچل چڑیاں سی چھوٹ پڑی ہوں۔ کسی نے غلط نہیں کہا ہوگا۔ اس لمحے خود مجھے ایسا لگا جیسے فضا میں جل ترنگ بج اٹھے ہوں، ہر سو پھول کھل اٹھے ہوں مگر جلد ہی وہ میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئیں۔

بالائی منزل پر ان میں سے کوئی نہیں تھا۔ خادم سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ناشتے کے بعد ابھی ابھی سب بڑے نواب کے ساتھ باغ کی طرف نکل گئے ہیں۔ میں بھی نیچے اتر آیا۔ عمارت سے کچھ پرے باغ کے ابتدائی حصے میں، بنی ہوئی سرخ پتھروں کی بارہ دری میں وہ مجھے نظر آ گئے۔ بارہ دری کے فرش پر۔ چاندنی بچھی ہوئی تھی اور گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے جاتے ہوئے میرے پیر اٹک رہے تھے۔ انھوں نے ضرور میری تلاش کی ہو گی۔ میں انھیں اپنی غیر حاضری کی وجہ کیا بتاؤں گا۔ درمیان میں بڑا نواب بیٹھا تھا۔ اس کے پاس دائیں طرف ابا جان اور افضل، ادھر بائیں طرف منیر علی اور پیرو۔ خاں صاحب بھی وہیں بیٹھے ہوئے تھے اور تین چار دوسرے آدمی، شیروانی میں ملبوس۔ میں نے انھیں پہلے نہیں دیکھا تھا۔ زورا اور کالے وہاں نہیں تھے۔ چلتے چلتے میں ان کے اتنے قریب پہنچ چکا تھا کہ کسی اور طرف نکل بھی نہیں سکتا تھا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ انھوں نے اگر کچھ پوچھا تو صاف صاف بتا دوں گا۔ مجھے دیکھ کے وہ سب شگفتہ انداز میں چونک پڑے اور بڑے نواب نے بے اختیارانہ میری طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے اسے آداب کیا اور اس کے پاس ہی جا بیٹھا۔ نواب نے اپنے اٹھے ہوئے ہاتھ سے مجھے دبوچ لیا اور میری پیشانی چوم لی۔ میری سانس پھول رہی تھی لیکن کسی نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔ میرا خیال تھا، نواب ناشتے کے بارے میں ضرور پوچھے گا مگر میرے بیٹھتے ہی وہ باتوں میں مصروف ہو گیا۔ ظاہر ہے، اسے معلوم ہو گیا ہو گا کہ میں نے اتنا وقت زنان خانے میں گزارا ہے اور وہاں سے ناشتے کے بغیر نہیں آیا ہوں گا۔ میں نے دزدیدہ نظروں سے دیکھا، اس کی پیشانی پر کوئی شکن نہیں تھی۔ سبھی ہشاش بشاش نظر آ رہے تھے۔ افضل کے سامنے طشت میں بڑی فرشی، اودے نقش پیچے کا حقہ رکھا ہوا تھا اور مشک کی نقرئی منال اس کے لبوں سے لگی ہوئی تھی۔ وہ اطمینان اور توجہ سے نواب کی باتیں سن رہے تھے جو ریاست کی سرکاری عمارتوں میں انفرادیت قائم رکھنے کے بارے میں کچھ کہہ رہا تھا۔ انھیں دیکھ کے کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ نواب سے ان کی شناسائی کا دوسرا دن ہے۔ میں نے بھی نواب کی باتیں توجہ سے سننے کی کوشش کی لیکن کچھ دیر بعد ہی میرا جی گھبرانے لگا۔ آتے ہی ان کے درمیان سے اٹھ جانا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ یوں اپنے آپ کو باندھے بیٹھا رہا۔ بارہ دری کے مقابل فوارہ چل رہا تھا اور سامنے دور تک نظر آنے والی نہر میں شفاف پانی رواں تھا۔ اگر بلا ارادہ رخ مغرب

کی طرف تھا تو یہ نہر مشرق سے چلتی اور بارہ دری کی چوکی کے نیچے سے گزرتی ہمارے سامنے مغرب میں کہیں دُور جا کے مُڑ گئی تھی۔ نہر کے دونوں اطراف کوئی دس دس قدم بعد اونچے درخت لگے ہوئے تھے اور جگہ جگہ پھولوں کے چھوٹے چھوٹے ٹیلے سے بنے ہوئے تھے۔ بڑا نواب انھیں حویلی کے نہایت خوب صورت مقام پر لایا تھا۔ بارہ دری کے پیچھے متعدد خادم سر جھکائے کھڑے تھے۔ میں وہاں سے کسی بہانے اُٹھنے کے لیے پر تولتا رہا۔ میری آنکھوں کے سامنے بار بار گیتی اور پروین کے چہرے آ جاتے تھے۔ دیر ہو گئی تو مجھے وحشت سی ہونے لگی۔ اب ایک ہی صورت تھی اور میں ایسے کسی موزوں وقت کا منتظر ہی تھا۔ کسی خادم کو ہدایت دینے کے لیے نواب کی توجہ چند لمحوں کے لیے اُس طرف مبذول ہوئی تھی کہ میں نے بیرو سے کالتے اور زورا کے متعلق پوچھا۔ اُس نے بتایا کہ وہ اِدھر ہی کہیں باغ میں ٹہل رہے ہوں گے۔ میں فوراً اُٹھ گیا اور اُن کی طرف دیکھے بغیر نیچے اُتر آیا۔ انھوں نے مجھے روکا بھی نہیں۔ باغ طول و عرض میں پھیلا ہوا تھا۔ کالتے اور زورا مجھے بہت دور جا کے ایک جگہ بید مجنوں کی طرف ملے۔ وہ بڑی بڑی جالیوں میں اچھلتی کودتی رنگ برنگی چڑیوں کو اتنے انہماک سے دیکھ رہے تھے کہ میری آہٹ کا احساس بھی نہیں ہوا لیکن جیسے ہی مجھ پر اُن کی نظر پڑی، دونوں بےقابو سے ہو گئے۔ "کدھر چلا گیا تھا رے؟" کالتے شکایتی لہجے میں بولا۔ "کم از کم اپنے کو تو بول کے جانا چاہیے تھا۔"

میں نے اُسے بتایا کہ اس کا وقت ہی نہیں ملا اور مجھے یہ خیال نہیں تھا کہ اتنی دیر لگ جائے گی۔ "کیا تمھیں نہیں معلوم تھا کہ میں کس طرف گیا ہوں؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"اپن کو نوکر لوگ نے بولا تھا کہ تم اُدھر پیچھے کو گیا ہے اور ابھی اُدھر ہی بیٹھا ہے۔" زورا نے مجھے بتایا۔

"اور اُس نے کیا کہا تھا؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"اور وہ کچھ نہیں بولا۔" زورا نے تردد سے کہا۔ "کیا بات ہے راجا! ابھی سب ٹھیک تو ہے؟"

"ہاں، ہاں۔" میں نے جلدی سے سر ہلا کے کہا۔

"اپن سمجھ گیا تھا، اُدھر خانم آپی نے تم کو مانگا ہوگا۔ ایسا ہی تھا نا؟ کیسا ہے وہ؟"

"نہیں۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "میں اُن کے پاس نہیں گیا تھا۔"

"پھر کدھر کو گیا تھا؟" کالتے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ میں نے توقف کیا اور سوچتا رہا کہ اُسے کیا بتاؤں۔ میری خاموشی پر کالتے کی جستجو بڑھ گئی۔ "کیا بات ہے لاڈلے؟"

"ایسی کوئی بات نہیں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مجھے چھوٹے نواب کی بیگم نے شکریہ ادا کرنے بلایا تھا۔"

"اتنی سی بات ہے سائیں تو پھر تیرا رنگ کیوں اُڑ رہا ہے۔ لگتا ہے ابھی چوری کر کے اُدھر سے آیا ہے۔"

"کیسی بات کر رہے ہو؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"کالتے بھائی ابھی ایک دم ٹھیک بولتا ہے راجا!" زورا دانت نکالتے ہوئے بولا۔ "تم سے اپن کو بھی ایسا ہی کچھ جان پڑتا ہے۔"

مجھے اُن کا یہ مذاق بڑا لگ رہا تھا۔ "تم دونوں پاگل ہو گئے ہو۔" میں نے تنک کے کہا۔ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ آخر اس تندی و برہمی کی کیا ضرورت تھی۔ "بس دیر لگ گئی۔" میں نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی۔ "وہاں چھوٹے نواب کی بیگم نے ناشتے وغیرہ کا اہتمام بھی کر دیا تھا۔"

"مگر تجھی کو کیوں بلایا تھا؟" کالتے معنی خیز لہجے میں بولا۔

"مجھی کو؟" میری آواز سٹپٹانے لگی۔ "میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" میں نے ترشی سے کہا۔

"باپ، ابھی اپن سچ بولتا ہے۔" زورا دیر سے مسکراتے ہوئے بولا۔ "اپن کو لگتا ہے، تم کچھ چھپا رہا ہے۔"

"کیا چھپا رہا ہوں؟"

"اپنے کو یہ جان کاری ہوتی تو تجھ سے کیوں پوچھتے۔"

"تم نہ جانے کیا سمجھ رہے ہو۔"

"جانے دے جانی!" کالتے مجھے دھکیلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ میں وضاحت کرنا چاہتا تھا مگر کس بات کی وضاحت؟ میں اُسے بتا بھی کیا۔ سو میں نے حجت کے بجائے خاموشی مناسب سمجھی اور اُن کے ساتھ باغ میں گھومتا رہا۔ جیسا کہ گیتی نے بتایا تھا، حویلی کے عقب میں ذرا فاصلے پر سرخ پتھر سے کٹی ہوئی جالیوں کے اندر نہانے کا تالاب بنا ہوا تھا۔ بالکل انگلش طرز کا۔ جالیوں پر لمبے لمبے پردے پڑے تھے جو ضرورت پڑنے پر کھینچ دیے جاتے ہوں گے۔ وہاں کے چوکی دار نے ہم سے نہانے کے لیے پوچھا بھی۔ پانی بھی ایسا نکھرا ستھرا آئینے کے مانند تھا کہ خود بخود نہانے کے لیے آدمی کا جی چاہے لیکن ہم اور آگے بڑھ گئے۔ باغ میں درختوں کے بیچ چھوٹی چھوٹی کئی عمارتیں بنی ہوئی تھیں۔ سب کی طرز منفرد تھی۔ جہاں جہاں سے ہم گزرتے، خادم سر جھکا کے اور ہاتھ باندھ کے ہمیں تعظیم دیتے۔ حویلی کے سارے ملازموں کو نئے مہمانوں کے متعلق ہدایات دی گئی تھیں۔ ٹینس کورٹ کی طرف

سے گزرتے ہوئے زورا حیرتی لہجے میں بولا۔ "راجا! ابھی تم دیکھتا ہے، سالا بادشاہ بھی ایسا ہی مالک محل دو محلے میں رہتا ہوگا۔"

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "یہ تو بادشاہ، بادشاہ پر منحصر ہے۔ شاید بہت سے بادشاہوں کو بھی ایسی جگہ نصیب نہ ہو۔"

"ایدر ہی زمین کا لوگ نے اُوپر جیسا جگہ بنا لیا ہے، اُوپر پھر کیسا ہوگا۔ اس سے جاستی کیا ہوئے گا؟"

"ابے، ابھی تُو نے دیکھا ہی کیا ہے۔" کالتے مُنہ بنا کے بولا۔ "اُدھر ولایت میں گورے لوگ سے آگے۔ لوگ بولتے ہیں سب سالے پانی بھرتے ہیں۔ اُدھر اندر باہر سب جگہ جنت ہے۔"

وہ یہی فضول باتیں کر رہے تھے کہ ایک جگہ زورا نے اشارہ کیا۔ ہمارے دائیں جانب کچھ دُوری پر لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ یہ حویلی کا دوسرا دروازہ تھا جو ملازموں کی آمد و رفت کے لیے مخصوص ہوگا کیونکہ اطراف میں بنے ہوئے مکانات ملازموں ہی کے ہو سکتے تھے۔ ہم قریب پہنچے تو اُن کی تعداد، وضع قطع اور موجودگی کے سبب کا اندازہ ہوا۔ ایک جانب میدان میں دری بچھی ہوئی تھی اور بہت سے بچے بڑے قرآن پاک کی تلاوت میں مصروف تھے۔ ایک طرف دیگیں چڑھی ہوئی تھیں اور دروازے کے قریب چوکیوں پر رکھے ہوئے ملبوسات کے سامنے قطار در قطار لوگ بیٹھے تھے۔ کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ خانم کی آمد ہی کے سلسلے میں غربا اور مساکین کو لباس اور کھانا تقسیم کرنے کا اہتمام کیا گیا ہوگا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور باہر سے باری باری اور بہت سے لوگ اندر آ رہے تھے اور ملازمین انھیں نظم و ضبط کی تلقین کر رہے تھے تاہم شور مچا ہوا تھا اور لوگ اپنی باری جلد آنے کے لیے ایک دوسرے کو پیچھے دھکیلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہماری آمد سے ملازمین میں کسی قدر افراتفری سی ہو گئی۔ ہم پر توجہ دینے کے لیے وہ اپنے کام سے غافل ہو گئے تھے، اس لیے ہم وہاں نہیں ٹھیرے۔ چلتے چلتے پیر دُکھنے لگ گئے تھے۔ میں تو بس یوں ہی اُن کا ساتھ دے رہا تھا۔ بارہ دری سے اُٹھ کے مجھے کالتے اور زورا کی تلاش میں جانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ میں اپنے کمرے میں جا کے سارے دروازے بند کر کے لیٹ جانا چاہتا تھا۔ پروین اور گیتی کی باتیں میرے دماغ میں گونج رہی تھیں جیسے سب از سرِ نو سُن رہا ہوں اور جیسے اب کچھ اُن کے معانی منکشف ہو رہے ہوں۔ اُس وقت تو میں نے کچھ سُنا ہی نہیں تھا، سُنا تھا تو اُس کا مفہوم میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ میں بار بار انھیں ترتیب دے رہا تھا اور سب کچھ جیسے کسی جھونکے سے منتشر ہو جاتا۔ کالتے ابھی اور آگے جانا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں دخل دیتا، زورا نے میری مدد کر دی۔ اُس نے تھوڑی دیر سستانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ کالتے نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ وہ بھی تھکا تھکا سا معلوم ہوتا تھا۔ میں اپنی طرف سے کچھ کہتا تو وہ اُلٹی سیدھی باتیں شروع کر دیتا۔

مجھے اندیشہ تھا کہ دونوں دوبارہ بارہ دری کی طرف جانے کا ارادہ نہ کر لیں لیکن وہ بالائی منزل پر آ گئے۔ یہیں ہماری شب بسری کا بندوبست کیا گیا تھا۔ یہ بھی مناسب نہیں تھا کہ انھیں چھوڑ کے میں سیدھا اپنے کمرے کا رُخ کر لیتا چنانچہ مجھے اُن کے ساتھ کالتے کے کمرے میں جانا پڑا۔ خادم وہاں موجود تھا۔ اُس کے پوچھنے پر زورا نے اُسے چائے لانے کی ہدایت کی۔ دوپہر ہو رہی تھی، کھانے کا وقت ہوا ہی چاہتا تھا لیکن زورا کو بار بار چائے کی طلب ہونے لگتی تھی۔ پلنگ کے قریب ایک آبنوسی ڈبے میں سگریٹ رکھے تھے۔ ولایتی لائٹر بھی اُس سے پیوست تھا۔ کالتے نے بستر پہ پھیل کے اور نوابوں کی طرح ٹانگ پر ٹانگ رکھ کے سگریٹ سلگائی اور گہرے گہرے کش لینے لگا پھر صرف دو تین کشوں میں اُس نے سگریٹ بجھا دیا اور جیب سے بیڑی کا بنڈل نکال کر بیڑی پینے لگا۔ مجھے اُن سے بہت سی باتیں پوچھنی تھیں۔ انھیں شاید معلوم ہو کہ ابا جان اور عقیل نے روانگی کے لیے کیا طے کیا ہے۔ نواب خانم کے بارے میں اُن کی کوئی گفتگو ضرور ہوئی ہوگی۔ اُدھر ابا جان کی حویلی میں ہمارے منتظر ماریں، شاہو، جیرو اور ننگو کو اطلاع دے دی گئی ہے کہ ہم ابھی یہیں رہیں گے یا انھیں بھی یہیں بلا لیا گیا ہے؟ ہو سکتا ہے کالتے اور زورا کو بڑے نواب سے نواب عالم تاب کے بارے میں کوئی سُن گُن ملی ہو؟ میں نے اُن سے کچھ نہیں پوچھا جانے کیوں مجھے اندیشہ تھا کہ کالتے تلخ ہو جائے گا۔ اُن کے چہروں سے بظاہر بے دلی یا بے زاری ظاہر نہیں ہو رہی تھی لیکن اندر کا کیا معلوم، نہ جانے اندر کتنا دھواں بھرا ہو۔ میرے ٹوکنے پر انھیں کوئی بھی تاثر مل سکتا تھا کہ شاید میں پہلے کی طرح یہاں سے جانے کے لیے بہت مضطرب ہوں۔ یا میں یہ رائے ظاہر کرتا کہ کیا حرج ہے اگر وہ چند دن اور ٹھیر جائیں۔ دونوں عورتوں کی طرح طرح کی باتیں اُن کے ذہن میں گھر کر رہی تھیں۔ نہ مجھ میں وہ سب پوچھنے کی ہمت تھی، نہ مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ میں انھیں کیا کیا بتاتا کہ گیتی اور پروین نے کیسی کیسی التجائیں کی ہیں، ایسی التجائیں کہ اب نہ رُکنا بد دماغی ہوگی۔ انھوں نے اُن دونوں کو نہیں دیکھا تھا کہ وہ کسی پھول کی طرح نرم و نازک ہیں، بالکل پریوں کے مانند۔ وہ تو شیشے کی بنی ہوئی لگتی ہیں، ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹنے کا ڈر لگے۔ وہ خود گیتی اور پروین کے سامنے ہوتے تو یہی کہتے۔ غرض میں نے اپنی زبان بندی کر لی تھی

اور برجیس نے وہ سب کچھ میرے اعتماد میں کہا تھا، صرف مجھ سے۔ مجھے وہ خود تک ہی محدود رکھنا چاہیے تھا۔

تھوڑی دیر میں غلام چائے لے آیا تھا۔ میں نے بھی پی۔ وہ خاموش نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ زورلا اڈے کی باتیں کرنے لگا کہ اِدھر حیدرآباد میں اڈا گیری ایسی مشکل بات نہیں ہے ورنہ آکا جیسا آدمی اوپر نہ آتا۔

"آکا میاں کچھ نہیں تھا، بس سالا کھوپڑی کا اُلٹا تھا۔" کالے بولا۔ "نظر کا بھی تھوڑا گرا ہوا تھا۔ ایک دو پھیروں میں ہی سونگھ لینا چاہیے تھا کہ سامنے کون ہے۔ اُستاد تو جان کے سالے کو گھمائی دیتا رہا۔ اُدھر لوگ بھی کم نہیں تھے۔ اُستاد کو، اُن کو بھی تو کچھ بولنا تھا۔"

زورلا نے بے اختیار سینے پر ہاتھ رکھ لیے اور ملکتے لہجے میں بولا "قسم سے کالے بھائی! ابھی اپن کا جی کرتا ہے۔ پوری عمر بس اُستاد کے چرن میں کاٹ دے۔" وہ کالے سے التجا کرنے لگا کہ اگر وہ سفارش کرے تو شاید مجھل اُسے اپنے ساتھ رکھنے پر تیار ہو جائے۔ کالے نے وعدہ کیا کہ وہ موقع دیکھ کے مجھل سے بات کرے گا۔ اڈے کی باتیں کرتے کرتے بھورے دادا کا ذکر آ گیا۔ زورلا کہنے لگا "اپن کو شک لگتا ہے کہ بھورے دادا سے اس عمر میں اڈا اُٹھایا جا سکے گا۔" مگر کالے کا خیال زیادہ درست معلوم ہوتا تھا کہ اب بہت دنوں تک اڈے پر تبدیلی نہیں آنے کی۔ کوئی آکا نمودار نہیں ہوگا اور اس عرصے میں بھورے دادا اڈے کے لیے مناسب آدمی تیار کرے گا۔ کالے دادا کے ذکر پر دونوں ہنسنے لگے۔ زورلا نے اُس کے حیدرآبادی لہجے اور کولھے مٹکانے کی نقل اُتارنے کی ناکام کوشش کی۔ میں نے بھی اس خیال سے درمیان میں کئی مرتبہ دخل دیا کہ کہیں میری خاموشی انھیں مکدر نہ کر دے اور وہ دوبارہ مجھ سے کوئی تکرار نہ کرنے لگیں۔ ہمیں آئے زیادہ وقت نہ گزرا ہوگا کہ دوپہر کے کھانے پر ہماری طلبی ہو گئی۔ وہیں بالائی منزل کے ایک لمبے چوڑے کمرے میں کھانے کا فرشی اہتمام کیا گیا تھا۔ یہاں سے وہاں تک بچھے ہوئے دسترخوان پر اتنی اقسام کے کھانے چنے گئے تھے کہ انتخاب تو درکنار سب کا ایک ایک لقمہ چکھنا بھی ممکن نہیں تھا۔ کئی ملازم دونے اِدھر سے اُدھر منتقل کرنے کی خدمت پر مامور تھے۔ مجھے پہلے ہی بھوک نہیں لگ رہی تھی، آغا جان نے اور کم کر دی تھی لیکن میں نے کسی کو احساس نہیں ہونے دیا کہ صرف نخرے ٹونگ رہا ہوں۔ کھانے کے دوران میری نگاہیں بیشتر اُن کے چہروں پر بھٹکتی رہیں۔ اُن پر کوئی بوجھل پن طاری نہیں تھا بلکہ وہ بڑے نواب سے کچھ اور مانوس معلوم ہو رہے تھے اور بڑے نواب بھی۔ مجھے سب سے زیادہ آغا جان کی طرف سے بے چینی تھی۔ لیکن آغا جان اور منیر علی تو سب سے زیادہ خوش و خرم نظر آ رہے تھے۔ پیرو نواب کے پہلو میں بیٹھا کھانوں کی تعریف کرتا تھا۔ کہنے لگا کہ اگر زنداں میں ہمیں ایسے کھانے کھلائے جاتے تو ہم کبھی فرار کا ارادہ نہ کرتے۔ اس جملے پر نواب کی آنکھیں بجھ گئیں، ہر چند کہ دوسرے ہی لمحے وہ کھل کھلا پڑا تھا لیکن اُس کی ہنسی بے ساختہ نہیں تھی۔ پیرو کو ایسی بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ اُسے خود بھی احساس ہو گیا۔ اُس نے فوراً موضوع بدل دیا اور بڑے نواب سے پوچھنے لگا کہ کیا اُس نے کبھی جلتی ریت میں بھنی ہوئی مچھلی کھائی ہے؟ نواب نے بتایا کہ کبھی اتفاق نہیں ہوا لیکن سُنا ہے کہ نہایت لذیذ ہوتی ہے۔

وہ دسترخوان سے اُٹھ کے منتشر ہوئے ہی تھے کہ میں آہستگی سے نکل آیا۔ میں نے اپنے کمرے ہی میں آ کے دم لیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میرے قدم ٹھٹک پڑے۔ کہیں میں کسی دوسرے کمرے میں تو نہیں آ گیا؟ تمام سازو سامان اپنی جگہ موجود تھا لیکن سب کچھ بدلا بدلا معلوم ہو رہا تھا۔ پلنگ پر نئی چادریں، نئے تکیے غلاف، میز پوش بھی کچھ بدلا ہوا تھا۔ سرہانے کی چھوٹی میز پر نئے میز پوش پر پھلوں کی قاب، پانی ٹھنڈا رکھنے والا تھرماس، پلنگ کی دوسری جانب ایک گول میز پر ریڈیو گرامو فون کا ڈبہ، خاص دان میں گلوریاں، عطر دان اور کئی تہہ کیے ہوئے سفید رومال رکھے تھے۔ سگریٹ کیس بھی تھا۔ گل دستوں میں تازہ تازہ پھول سجے ہوئے تھے اور سارے کمرے میں موتیا کی بھینی بھینی خوشبو بسی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ ابھی ابھی کوئی یہاں سے گیا ہے۔ ہر چیز ایک نفاست اور سلیقے سے رکھی گئی تھی۔ میں بھٹکی ہوئی نظروں سے سب کچھ دیکھتا رہا۔ کہیں نگاہ جمتی ہی نہیں تھی۔ یہ آرائش تو تمام کمروں میں کی گئی ہوگی لیکن ابھی کچھ دیر ہوئی، کھانے سے پہلے میں کالے کے کمرے میں بیٹھا تھا، وہاں تو یہ سب چیزیں نہیں تھیں۔ میں نے ایک بار سارے کمرے کا چکر لگا کے دیکھا۔ یک بارگی مجھے محسوس ہوا کہ کمرے میں کوئی اور بھی موجود ہے مگر یہ محض میرا وہم تھا۔ سارا کمرہ روشن تھا۔ مجھے اپنے آپ سے گھٹن ہونے لگی۔ کوئی ہوتا تو اُسے چھپنے کی کیا ضرورت تھی۔ سامنے کی بڑی میز پر لکڑی کے ریک میں چند کتابیں چُنی ہوئی تھیں اور انگریزی، اُردو کے نئے پرانے رسالے۔ پلنگ پر آ کے میں اُن کی ورق گردانی کرتا اور تصویریں دیکھتا رہا۔ چند تصویریں دیکھ کے میرا جی اُکتا گیا۔ میں نے آنکھیں موندنے کی کوشش کی۔ میرا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ پلنگ پر پڑے پڑے میں ہانپتا رہا۔ دروازہ بند کرنے کے لیے مجھے دوبارہ اُٹھنا پڑا۔ کھلے دروازے سے کوئی بھی اندر

آ سکتا تھا۔ کچھ دیر کے لیے میں اپنے پاس ہی رہنا چاہتا تھا۔ کمرے میں سکوت چھایا ہوا تھا۔ ہوا بھی بند بند سی تھی۔ ابھی مجھے بستر پر لیٹے چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ میں ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھا۔ پہلے تو میں اسے اپنے دماغ کا خلل سمجھا تھا لیکن دستک کی آواز پھر میرے کانوں میں گونجی، میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دروازے کی طرف دیکھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر لگی کہ دستک اُس دروازے پر ہوئی ہے جو خادموں کی آمد و رفت کے لیے مخصوص ہے۔ میں اُٹھ کے تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا لیکن اُسی لمحے مجھے یاد آیا کہ ملازموں کی دستک پر اُٹھ کے دروازہ کھولنے کے بجائے پلنگ کے قریب لٹکی ہوئی ریشمی ڈوری کھینچنی چاہیے، بشرطیکہ اُن کی طلبی مقصود ہو۔ یہ بات رات خاں صاحب نے مجھے یہاں کمرے میں پہنچاتے وقت بتائی تھی۔ میں کمرے کے درمیان ششدر و پیچ میں کھڑا رہا کہ کیوں نہ خاموش رہوں مگر کوئی اور بھی تو ہو سکتا ہے۔ اس خیال سے میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ معاً دستک ایک بار پھر ہوئی۔ میں نے ڈوری کی طرف واپس جاتے جاتے بڑھ کے دروازہ کھول ہی دیا۔

ایک لمحے کے لیے میری آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ سر تا پا سفید لباس پہنے ایک نوجوان لڑکی کھڑی تھی۔ گندمی رنگ، کشیدہ قامت، ہاتھوں میں گجرے، گلے میں موتیوں کا ہار، آڑا پاجامہ اور لمبا کُرتا۔ چادر کی طرح پھیلا ہوا دوپٹا اُس کا بدن ڈھانپے ہوئے تھا۔ مجھے یوں اچانک سامنے دیکھ کے وہ اچھل سی گئی اور اُس نے بہ عجلت مجھے تسلیم کی۔ حویلی کی ہر چیز کی طرح خادمائیں بھی منتخب کر کے رکھی گئی ہوں گی۔ پہلی دو خادماؤں کو میں قریب سے دیکھ چکا تھا چنانچہ مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوئی کہ یہ خادمہ ہی ہو سکتی ہے۔ میری سوالیہ نظریں اُس پر مرکوز تھیں۔ معاً وہ ہچکچاتے ہوئے بولی "بندی کو نفیس کہتے ہیں۔"

"جی!" میں نے سر ہلا کے کہا۔

"آپ کو زحمت ہوئی۔" وہ کسی قدر ٹھیرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "بندی صرف یہ عرض کرنے حاضر ہوئی ہے کہ آپ کو اپنی موجودگی کی اطلاع دے دے۔"

"اطلاع!" میں نے تذبذب سے کہا۔

"بندی کو آپ کی خدمت کے لیے مامور کیا گیا ہے۔" وہ آہستگی سے بولی۔ "بندی یہیں آپ کے کمرے سے ملحق گوشے میں موجود رہے گی۔"

"مگر... مگر مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "یہاں بھی کچھ تو موجود ہے۔ آپ کو کس نے یہ ہدایت دی ہے؟"

"چھوٹی سرکار نے۔" وہ سر جھکائے جھکائے بولی۔

"چھوٹی سرکار؟ چھوٹی بیگم صاحب نے؟"

"برجیس بی بی نے۔" وہ جھجکتی آواز میں بولی۔ "مگر چھوٹی بیگم صاحب کی خواہش بھی یہی ہے۔"

میں نے ایک گہری سانس لی۔ "اُن سے میرا آداب کہیے گا اور بہت بہت شکریہ۔ اور اُن سے کہیے گا کہ کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو میں خود بھی کہہ سکتا ہوں۔ ویسے بھی یہاں ملازموں کی کمی نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ آپ... آپ پیچھے زنان خانے میں واپس چلی جائیں۔"

اُس نے نگاہیں اُٹھا کے بے چارگی سے میری طرف دیکھا اور کھڑی رہی۔ اُس کا چہرہ تمتمانے لگا تھا۔ مجھے بھی اُس کے سامنے سے اس طرح ہٹ جانا ٹھیک معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ میں بھی کھڑا رہا۔ وہ لاکھ خادمہ سہی، آدمی کی اپنی حیثیت بھی تو ہوتی ہے۔ اُس کے سراپا میں بڑا وقار تھا۔ "بندی کو جناب کی خدمت سے بہت خوشی ہوگی۔ بندی کے لیے یہ عزت ہے۔" اتنی دیر تک کھڑی وہ شاید یہی الفاظ سوچ رہی تھی۔

"مگر... مگر کس لیے؟ کس لیے؟" میں نے بدحواسی سے کہا۔ "خواہ مخواہ آپ کا وقت ضائع ہوگا۔" اُسے تم کہہ کر مخاطب کرنے کو میرا جی نہیں چاہا۔

چند لمحے وہ گم صم رہی، پھر اُس نے جھکنے کے انداز میں مجھے آداب کیا اور اُلٹے قدموں واپس ہونے لگی۔ مجھے اچھا نہیں لگا۔ وہ بہت مایوس دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے دروازہ بند نہیں کیا۔ وہ چند ہی قدم گئی ہوگی کہ میں نے ٹھیرنے کے لیے کہا۔ اُس کا بدن لہرا سا گیا۔ "اندر آ جائیے۔" میری آواز جھرجھرا رہی تھی۔ وہ جھجکتی ہوئی اندر آ گئی۔ میں نے اُسے بیٹھ جانے کو کہا لیکن وہ کھڑی رہی۔ میں نے دوبارہ کہا تب بھی اُس کے سراپا میں جنبش نہیں ہوئی تاہم وہ لرزتی ہوئی سی آواز میں بولی "بندی حکم کی منتظر ہے۔"

"بیٹھ جائیے۔" میرے لہجے میں غالباً کسی حد تک حکم شامل تھا۔ اُس نے گھبرا کے اِدھر اُدھر دیکھا اور قریب رکھی ہوئی کرسی کے کنارے بیٹھ گئی۔ اُس کا گندمی رنگ سفید ہو گیا تھا۔ یہ حالت دیکھ کے میں بھول گیا کہ میں نے اُسے اندر آنے کے لیے کیوں کہا تھا۔ برجیس اور گیتی کے بارے میں کچھ معلوم کرنے کے لیے یا نواب عالم تاب کے متعلق کچھ جاننے کے لیے۔ مگر میں اس سے کس طرح پوچھوں۔ زبان سے کہیں کوئی نامناسب لفظ نہ نکل جائے۔ برجیس اور گیتی کی خادمہ سے اُن کے سلسلے میں کچھ معلوم کرنا نازیبا تھا اور وہ چھوٹے نواب اور خانم کے بارے میں بھی کتنا بتا سکتی تھی۔ لیکن میں نے اُسے روکا تھا تو اب کوئی نہ کوئی بات کرنی ہی تھی۔ میں نے دبے لہجے میں اُس سے نواب عالم تاب

کے بارے میں پوچھا۔

"سُنا ہے، خدائے پاک کا شکر ہے مگر بندی کو . . . " وہ کہتے کہتے رک گئی۔

"آپ کو زیادہ علم نہیں ہے؟"

"جی، وہ دھیمی آواز میں بولی۔ "میر کسی کو اُس طرف جانے کی اجازت نہیں ہے۔"

"سب خیریت تو ہے نا؟"

"جی ہاں۔" وہ جھُرجھُری لیتے ہوئے بولی۔ "خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہی ہو گا۔"

"آپ بڑی بیگم صاحبہ یا بی بی کی، میرا مطلب ہے بقول آپ کے، آپ دونوں میں سے کس کی خدمت پر مامور ہیں؟"

"دونوں کی۔"

ایک دم میرے جی میں آئی، پوچھوں کہ اُسے دونوں میں سے کون زیادہ پسند ہے مگر میری زبان ہچکتے ہچکتے رہ گئی۔ بہتر یہی تھا کہ میں اسے واپس چلی جانے دوں۔ آخر وہ گیتی اور پری جبیں کی خادمہ ہے۔ میرا ایک ایک لفظ انھیں منتقل کرے گی اور نہ جانے کس انداز میں بیان کرے لیکن اندر ہلا کے کچھ کہے بغیر اُسے واپس کر دیتا اور یوں خاموش بیٹھے رہنا دونوں باتیں عجیب تھیں۔ اُس کے جھکے ہوئے سر کے باعث مجھے کم سے کم اُس کا چہرہ ٹٹولنے کی آسانی تھی۔ مجھ پر ایک ایک لمحہ بھاری گزر رہا تھا، اُس کا بھی یہی حال معلوم ہوتا تھا۔ "آپ یہاں حویلی میں کب سے ہیں؟" کچھ اور سمجھ میں نہیں آیا تو میں نے پوچھا۔

وہ اُڑی اُڑی آواز میں بولی۔ "بندی نے دوسرا گھر نہیں دیکھا۔"

"یعنی آپ نے بس یہی دنیا دیکھی ہے؟"

"بندی کی یہی دُنیا جنت ہے۔"

"واقعی یہ جگہ بہت خوب صورت ہے۔ جنّت نظیر ہے۔"

"بندی کا خیال ہے کہ مناظر اور عمارتوں سے زیادہ جنّت کی دل کشی کا باعث اُس کے نیک مکیں ہوں گے۔" وہ زیرِ لبی سے بولی۔

"بے شک، یقیناً" میں نے تعجب سے کہا مگر تعجب کی کیا بات تھی، گیتی اور پری جبیں کی خادمہ کا لب و لہجہ بھی کم و بیش ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ کبھی میں نے سُنا تھا کہ ملازم اپنے آقاؤں سے پہچانے جاتے ہیں، گو یہی بات آقاؤں پر بھی تو صادق آتی ہوگی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ گیتی اور پری جبیں کی کچھ زیادہ ہی مقرب تھی۔ انھوں نے اپنی خاص ہی خادمہ کو بھیجا بھی ہوگا۔ اُس کا جواب سُن کے میری جستجو بڑھ گئی ۔ لیکن مجھے اُس کے سامنے بے سوچے سمجھے زبان نہیں کھولنی چاہیے تھی۔

میں سوچتا ہی رہ گیا۔ ذہن میں نہ جانے کتنے سوال گردش کر رہے تھے لیکن کوئی موزوں نہیں لگتا تھا۔ شاید میں اُسے ایسے ہی جانے کی اجازت دے دیتا کیونکہ خاموشی نہایت ناروا تھی لیکن معاً میرے ذہن میں آیا کہ اُسے کمرے میں بلانے کے جواز کے طور پر کیوں نہ اُس سے کوئی فرمائش کروں۔ فرمائش کتابوں سے بہتر نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے اُس سے کہا کہ کیا حیدرآباد کی تاریخ پر کچھ کتابیں فراہم کی جا سکتی ہیں؟

اُس کے لبوں پر پہلی بار مسکراہٹ کھِلی اور وہ سر اُٹھا کے مستعد آواز میں بولی۔ "بندی کا علم محدود ہے لیکن اسے کتب خانے کی کچھ شُدبُد ہے۔ وہاں کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ ہے۔ اُس موضوع پر بھی ضرور کتابیں ہوں گی بلکہ اس موضوع پر تو وافر ہوں گی کیوں نہ جناب زحمت فرما کے ایک بار کتب خانہ ملاحظہ فرمالیں۔" مجھے خیال آیا، اُس سے کہوں کہ وہ اس انداز میں مجھے مخاطب نہ کرے لیکن میں نے بیچ میں دخل نہیں دیا۔ اُس کے لہجے میں سنجیدگی کے ساتھ ایک ہیجان بھی تھا، جیسے کچھ ایک سانس میں کہہ دینے کی بے تابی۔ وہ روانی سے کتب خانے کے متعلق مجھے بتاتی رہی کہ وہاں مطالعے کے لیے سکون کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ پرندوں کا شور غل کم سے کم کرنے کی غرض سے اطراف میں اونچے درختوں اور بیلوں سے پرہیز کیا گیا ہے۔ کتابوں کے سلسلے میں اُس کی معلومات میرے لیے حیران کن تھیں۔ وہ تو بہت کچھ جانتی تھی۔ مثلاً فلاں کتاب بڑے نواب نے کس طرح حاصل کی اور نگ زیب کے زمانے کا لکھا ہوا قرآن شریف کا ایک مخطوطہ حاصل کرنے کے لیے اُس نے کیسی تگ و دو کی تھی۔ باتیں کرتے وقت اُس کے چہرے کے رنگ بدلتے رہتے تھے۔ پل میں دھوپ پل میں چھاؤں۔ میں نے کتب خانے کے بارے میں کرید کرید کے پوچھا تاکہ وہ بولتی رہے۔ وہ اپنے آپ سے بے خبر سی ہو جاتی ہیں اُسے سُنتا کم، دیکھتا زیادہ رہا۔ وہ لائبریری کی خصوصیات کا ذکر بڑے اشتیاق سے کر رہی تھی۔ میں نے درمیان میں پوچھا۔ "آپ کو کس موضوع سے دلچسپی ہے؟"

وہ خفیف سی ہو گئی۔ "بندی کو داستانیں زیادہ پسند ہیں۔"

"اور، اور شاعری؟"

"جی ہاں، کچھ وہ بھی۔" وہ شرمگیں لہجے میں بولی۔ "مگر جناب کو کس نے بتایا؟"

"کسی نے نہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "خود ہی اندازہ لگایا۔" اُس کی آنکھیں جھلملانے لگیں اور اُس کا بدن اس طرح سمٹنے لگا

جیسے اُس کی کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔ "کیا آپ شعر کہتی ہیں؟" اُس کی خاموشی پر میں نے دوبارہ پوچھا۔

اُس نے سر جھکا لیا۔ "بندی کیا عرض کرے، یوں ہی کوشش کرتی ہے۔" وہ رک رک کے بولی۔

"چھوٹی بیگم صاحب اور بی بی کو بھی تو شاعری سے خاص دلچسپی ہوگی؟" میں نے پیچھے سے پوچھا۔

"بہت بہت زیادہ، چھوٹی سرکار تو بہت عمدہ شعر موزوں کرتی ہیں۔ کاش بندی کو اس کا عشرِ عشیر بھی مل جاتا۔" وہ حسرت آمیز لہجے میں بولی۔

"کیا وہ بہت اچھے شعر کہتی ہیں؟"

"بندی کس منہ سے تعریف کرے کہ خدا نے انھیں کیسا نوازا ہے۔ لیکن یہ سب حویلی تک محدود رہتا ہے۔ چند قریبی لوگوں تک۔ خصوصاً بی بی سرکار کے سوا وہ کسی کو بھی نہیں سُناتیں۔"

"اور بی بی؟" میں نے آہستگی سے پوچھا۔

"بی بی سرکار شعر نہیں کہتیں لیکن بلا کی سخن فہم ہیں۔ ایسی کہ کبھی کبھی تو شک گزرتا ہے، ضرور کچھ چھپاتی ہیں لیکن یہ تو سب بیتی ہوئی باتیں ہیں۔" اچانک اُس کی آواز پر غبار چھا گیا۔ کہنے لگی کہ "ایک زمانہ تھا کہ ہر وقت یہی چرچے، یہی مشاغل رہتے تھے۔"

"اب کیا بات ہے؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"اب تو سب کچھ اُجڑ گیا ہے۔ جب سے چھوٹے سرکار نے . . ."

اُس کی آواز بھرّا گئی۔

اس سے پہلے کہ اُس کی آنکھوں میں اُمڈتے ہوئے آنسو چھلک پڑتے، میں نے بات کاٹ کے کہا۔ "ہاں، ہاں، مجھے معلوم ہے۔"

"بہت دنوں کے بعد جناب کے آنے سے حویلی میں کہیں پُرانے دنوں کی جھلک نظر آئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب ہوا کا رُخ بدل گیا ہے۔ جناب کے قدم بڑے مبارک ہیں۔"

"اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے اُسے تسلی دی۔

"بندی کو یقین ہے۔" وہ یاس بھرے لہجے میں بولی۔

"آپ کو اس حویلی سے بہت محبت ہے؟"

"یہ حویلی بہت سے لوگوں کا سایہ ہے۔"

"بے شک، یہاں آ کے یہی معلوم ہوتا ہے۔" میں نے بہلاتے ہوئے کہا۔

وہ پھر کہیں کھو گئی۔ چھوٹے نواب کے ذکر ہی نے اُسے منتشر کیا تھا ورنہ وہ کتنی دل چسپ اور دل نشیں باتیں کر رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ کسی طرح اُس کی دل جوئی کروں اور موضوع بدل دوں۔ مجھے گُم دیکھ کے چند لمحوں بعد وہ خود ہی بولی۔ "کیا جناب کچھ نوش فرمانا پسند کریں گے؟"

"نہیں۔" میں نے بے خیالی میں کہا۔ "میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

"اوہ۔" وہ ندامت سے بولی۔ "بندی مخلِ ہوئی۔"

"نہیں، بلکہ آپ کے آنے سے آرام ہی ملا۔ سر میں کچھ درد محسوس ہو رہا تھا، نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔" میں نے اُس کا دل رکھنے کے لیے یوں ہی کہہ دیا۔

"اب کچھ افاقہ ہے؟" وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"بڑی حد تک۔"

"اجازت ہو تو بندی مالش کر دے۔"

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ میں نے اضطراری نظروں سے اُس کی طرف دیکھا مگر اُس کے چہرے پر اطمینان چھایا ہوا تھا۔ "جناب کی خدمت بندی کے لیے عزت ہے۔" وہ دھیمی آواز میں بولی۔

"مگر آپ، آپ . . ."

"بندی کو جناب کے آرام کے لیے بھیجا گیا ہے۔"

"جی، جی ہاں۔" میری آواز گھٹ رہی تھی۔

"جناب کو ضرور سکون ملے گا۔"

"جی ہاں۔" میں نے بدحواسی سے کہا۔ "مگر مجھے عادت نہیں ہے۔"

اُس نے دوبارہ نہیں کہا لیکن میرے جواب سے اُسے مایوسی ضرور ہوئی تھی اسی لیے اُس نے اجازت طلب کی اور اپنی نشست سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس کی اجازت طلبی پر میں نے بےدلی سے سر ہلا دیا تھا۔ پھر میں اُسے دیکھتا اور پکارتا ہی رہ گیا۔ ایک لمحے میں اُس نے سر جھکا کے مجھے آداب کیا۔ دوسرے لمحے وہ کمرے میں نہیں تھی۔

اُس کے جانے سے کمرہ خالی خالی ہو گیا تھا۔ میں دیر تک مسہری کے پائنتی بے حس و حرکت بیٹھا دروازہ تکتا رہا۔ وہ جاتے جاتے دروازہ آہستگی سے بند کر گئی تھی۔ دیواری گھڑی کی ٹک ٹک نے کمرے میں ادھم سا برپا کر رکھا تھا۔ اُس سے تو میں نے سرور کا اہتمام کیا تھا لیکن بسوا تھی میرا سر چکرا رہا تھا۔ گھڑی نے چار بجائے تو مجھے وقت کا اندازہ ہوا۔ جانے کتنی بار مجھے دروازے پر دستک کا شبہ ہوا تھا لیکن وہ دوبارہ نہیں آئی۔ اب شاید وہ کبھی نہ آئے۔ وہ میرے بارے میں کوئی اچھا تاثر لے کے نہیں گئی ہوگی۔ مجھے بات کرنا ہی کہاں آتا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر مجھے یہ کیا ہو جاتا ہے۔ آخر مجھے اُس کی بات ماننے میں تامل کیوں تھا۔ اُس نے خود ہی تو پیش کش کی تھی۔ چند لمحوں کے لیے

سی، مجھے اجازت د... دری چاہیے تھی۔ کیسے دل کش اور دل نشیں انداز سے باتیں کر رہی تھی۔ اُتنا ہی اُس کے سر دبانے کے انداز میں نفاست اور دل کشی ہوگی۔ اُس کے نرم ریشم جیسے ہاتھ میں نے اچھی طرح دیکھے تھے۔ لمبی لمبی انگلیاں، ہتھیلی اور پوروں پر مہندی لگی ہوئی۔ اس طرح اُتنی دیر میں وہ مجھ سے اور مانوس ہو سکتی تھی اور مجھے بہت سی باتیں بتا سکتی تھی جنھیں جاننے کی جستجو مجھ میں کم نہیں تھی اور پھر اُسے تو اُنھوں نے ہی بھیجا تھا جس کا کوئی لحاظ مجھے مانع ہو سکتا تھا۔ میں نے کتنی مرتبہ ارادہ کیا، خادموں کو بلانے کی ڈوری کھینچ کے دیکھوں کہ وہ پھر آتی ہے یا نہیں، اگر وہ اب کے آگئی تو میں اپنے آپ کو مجتمع رکھوں گا مگر میں نے ڈوری نہیں کھینچی، بس بستر پر پڑا اپنے آپ کو نوچتا کھسوٹتا رہا۔

کیا عجب کہ اس مرتبہ وہ خود آجائیں یا اُن میں سے کوئی ایک۔ میں نے اُن کی بھیجی ہوئی خادمہ کی پذیرائی نہیں کی ہے لہٰذا وہ خود آ سکتی ہیں۔ اُن کی آمد کے تصور ہی سے میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں نے بستر سے اُٹھ کے کمرے کا عام دروازہ دیکھا کہ کہیں ایسا نہ ہو، ایک طرف وہ اندرونی دروازے سے داخل ہوں تو دوسری طرف کاشے اور زورا وغیرہ میں سے کوئی آجائے۔ عام دروازہ بند ہی تھا۔ سورج غروب ہونے کی وجہ سے کمرے میں روشنی بتدریج کم ہو رہی تھی۔ میں نے ایک بار یوں ہی سارے کمرے کا چکر لگایا اور کھڑکی سے باہر جھانک کے دیکھا۔ اطراف میں سکوت چھایا ہوا تھا۔ پھر میں بستر پہ آگیا۔ کوئی نہیں آیا۔ میں نے خود کو سمجھانے کی کوشش کی کہ آخر یہ سب کیا ہے۔ مجھے کاہے کی بے کلی ہے۔ جانے کب تک میں خود سے باتیں کرتا رہا اور جانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔

دوبارہ دستک کی آواز پہ میری آنکھ کھلی اور میں لیٹے لیٹے اُچھل گیا۔ کمرے میں گہرا اندھیرا طاری تھا۔ میری نظریں سیدھی اندرونی دروازے پر گئیں۔ اندھیرے کی وجہ سے دروازہ بالکل نظر نہیں آرہا تھا لیکن کان بھی تو سنتے دیکھتے ہیں۔ اُس طرف کے بجائے کوئی شخص عام دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ جی میں آئی کہ یوں ہی کانوں پڑا رہوں۔ زورا اور کاشے میں سے کوئی ہوگا۔ خود ہی واپس چلے جائیں گے مگر پھر میں نے اُٹھ کے دروازے کی چٹخنی گرا دی۔ کاشے تھا۔ "سو رہا تھا کیا؟" وہ دروازے پر کھڑے کھڑے بولا۔

"ہاں۔" میں نے آنکھیں مسلتے ہوئے کہا۔ "نیند آگئی تھی۔"

"تو پھر سو ہی جا۔ میں چلتا ہوں۔" وہ جانے لگا۔

میں نے اُس کا بازو پکڑ کے روک لیا۔ "بیٹھو نا۔ کوئی خاص بات ہے کیا؟"

"کچھ نہیں لاڈلے! دوپہر کھانے کے بعد سے دکھائی نہیں پڑا تھا، سوچا جا کے پوچھتا کر لوں۔"

"کیا وقت ہوا ہے اب؟"

"آٹھ بج رہے ہوں گے رے۔"

"آٹھ!۔" میں نے حیرت سے کہا۔

"نیند آرہی ہے تو تھوڑی سی اور کھینچ لے، ساری کب کی رُکی ہوئی ہوگی۔"

میں نے اُسے اندر کھینچ لیا اور دیوارگیروں کے روشنی کی بلا ہوتے ہی وہ سیٹیاں بجانے ... "لاڈلے! لاڈلے!" دوسراتی آواز میں بولا۔ "یہ تیرا ہی ٹھکانا ہے کیا؟"

"ہاں! کیوں؟"

"اِدھر تو نقشہ ہی دوسرا لگتا ہے۔"

"کیسا نقشہ؟"

"ریڈیو، باجا اور ... اور ..." وہ دیدے نکال کے بولا۔

"اِدھر تو ساری دنیا ہی بدلی پڑی ہے۔"

"ہاں۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔ "تمھارے کمرے میں اُدھر نہیں ہے۔"

"تو نے دیکھا نہیں کیا؟"

"میں اُدھر کب گیا ہوں۔"

"دوپہر کھانے سے پہلے تو اُدھر ہی بیٹھا تھا۔"

"ہاں، میں تو بھول ہی گیا۔" میں نے تجاہل سے کہا۔

"کیا ہو گیا ہے رے تجھ کو؟"

"کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ مجھے یہ کمرہ مل گیا۔ کسی نے انتخاب تو نہیں کیا تھا۔"

"پر سو بیٹے! اُدھر یہ سارا مال پانی نہیں تھا، تجھ کو پتہ نہیں کہ سویرے ہم لوگ اِدھر جھانک کے گئے تھے جب تو نیچے گیا تھا۔"

"مگر، مگر میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" میں نے تندی سے کہا۔

"چکر کیا ہے لاڈلے؟"

"کاہے کا چکر؟"

"کوٹ کھانے کو کیوں دوڑتا ہے، قسم سے اپنے کو تیرا رنگ ہی برا لگتا ہے۔" وہ تیکھے لہجے میں بولا اور میری تھوڑی اُٹھا کے آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ میں نے اُس سے نگاہیں ملانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ وہ ہنکاری بھرتا ہوا بولا۔ "ایک بات بولیں لاڈلے؟"

"کیا ہے؟"

"اچھے لوگ جان پڑتے ہیں۔"

"کون لوگ؟" میں نے تنک کے کہا۔

"یہی حویلی کے لوگ باگ۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"اپنے کو کچھ نہیں بولنا ہے لاڈلے ... " وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اُس کا چہرہ بھاری ہو گیا تھا۔

"کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں بھائی! جا، جا کے منہ ہاتھ دھو لے۔"

"نہیں بتاؤ، تم کیا کہہ رہے تھے؟"

وہ آنا کانی کرنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ میری ضد سے وہ ٹل جائے گا لیکن مجھے بے چینی رہی۔ اُس کے کہنے پر میں نے غسل خانے جا کے جلدی جلدی منہ ہاتھ دھویا اور کنگھی کی۔ کاشے نے خاص دان سے پان نکال کے ایک بیڑا مجھے کھلایا، ایک خود کھایا اور مسہری کے سرہانے نصب شیشے میں اپنا چہرہ دیکھتا ہوا باہر آگیا۔ باہر ہلکی ہوا چل رہی تھی اور حویلی میں دُور و نزدیک روشنیاں جل رہی تھیں۔ کاشے نے بتایا کہ شام تک سبھی اپنے اپنے کمروں میں آرام کر رہے تھے، ابھی کچھ دیر پہلے نیچے اُترے ہیں۔ وہ سب نچلی منزل کی اُس نشست گاہ میں موجود تھے جہاں ہم کل رات بیٹھے تھے۔ اُن کے علاوہ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ تمام دروازے اور کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور درمیان کے بڑے فانوس نے سارا کمرہ بقعۂ نور بنایا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بجھل نے پاس بلا لیا اور میری گردن پکڑ کے کئی جھٹکے دیے۔ میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ "کیسے ہو میاں؟" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہوں۔" میں نے آزردگی سے جواب دیا اور بے ارادہ میرے منہ سے روانگی کے بارے میں نکل گیا، شاید اُس کے چہرے پہ خوش گواری دیکھ کے۔

"چلیں گے رے، جلدی چلیں گے۔" وہ میرا ہاتھ تھپکتے ہوئے بولا۔ "جیا نہیں لگ رہا ہے کیا؟"

"نہیں، نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "میں تو یوں ہی پوچھ رہا تھا۔" میں نے یہ جتانا ضروری سمجھا کہ میں اُسے ٹوک نہیں رہا ہوں۔

"ہاں، ہاں، اپنے کو پتہ ہے۔ منہ تیرا کچھ صاف دکھائی دے رہا ہے۔ اچھا ہے، ذرا کمر ایک دو دن سیدھی کرلے۔"

وہ مجھ سے یہ کہہ ہی رہا تھا کہ بڑا نواب کمرے میں داخل ہوا۔ اُس نے کچھ دیر ضرور آرام کیا ہوگا، تازہ دم نظر آرہا تھا۔ سب اُٹھ گئے تھے لیکن نواب تیزی سے ابا جان اور منیر علی کے پاس چوکی پہ بیٹھ گیا اور باری باری ہم سب کا حال پوچھنے لگا۔ اُسے آئے ابھی چند لمحے ہوئے تھے کہ ایک خادم لپکتا ہوا اندر آیا۔ اُس نے نواب کے پاس جا کے سرگوشی میں کچھ کہا۔ "کہاں ہیں؟" نواب اونچی آواز میں بولا۔

"باہر تشریف فرما ہیں۔" خادم نے مؤدبانہ جواب دیا۔

نواب نے اضطراب سے ابا جان کی طرف دیکھا پھر بجھل کی جانب اور شادمانی سے بولا۔ "ہمارے عم زاد نواب حشمت جنگ آئے ہوئے ہیں۔"

ابا جان کوئی جواب نہ دے سکے۔ اُن کی متفسرانہ نظر فوراً بجھل کی جانب اُٹھی۔ بجھل نے بوجھل آواز میں کہا۔ "اُن کو اندر بلا لیا جائے۔"

"ہمارا بھی یہی خیال ہے۔ آپ حضرات اُن سے مل کے یقیناً خوش ہوں گے۔" نواب تمتماتے لہجے میں بولا۔ "وہ ایک نفیس آدمی ہیں۔ اُنھوں نے فون پر آپ صاحبان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔"

"ہم بھی اُن کو دیکھنا چاہتے تھے۔" اگر نواب کے لہجے میں کوئی معنی خیزی نہیں تھی تو بجھل کی آواز بھی آلودگی سے صاف تھی۔

"آپ انھیں جانتے ہیں؟"

"تھوڑا بہت۔" بجھل نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "رات آپ بھی اُن کے بارے میں کچھ بول رہے تھے۔"

"جی ہاں، وہی۔" نواب خوش دلی سے بولا اور چوکی سے اُٹھ گیا۔ "اُن سے ہمارے کئی رشتے ہیں بلکہ یہ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ اسی گھر کے ایک فرد ہیں۔"

نواب کے منع کرنے کے باوجود ابا جان اور منیر علی بھی اُس کے ساتھ اُٹھ گئے۔ میں، چیرو، بجھل، زورا اور کاشے بھی کھڑے ہو گئے۔ ابا جان اور زورا کو یہاں دیکھ کے نواب حشمت جنگ کا کیا حال ہو سکتا ہے۔ آنے والے لمحوں کا تصور میری طرح سبھی کے لیے ہیجان انگیز ہوگا۔ میں نے ابا جان اور زورا کے چہرے دیکھنے چاہے لیکن وہ دونوں آگے بڑھ چکے تھے۔ خادم پہلے ہی باہر چلا گیا تھا۔ بڑا نواب ابھی اندر ہی تھا۔ معاً دروازے پر درمیانے قد، گہرے سُرخ رنگ کی ترکی ٹوپی اور ریشمی شیروانی پہنے ایک بھاری بھرکم شخص اندر داخل ہوا۔ وہ نواب حشمت جنگ ہی ہوگا۔ اتنا بھاری بھی نہیں تھا کہ اُسے موٹا کہا جائے۔ دروازے ہی سے اُس نے سب کو آداب کیا۔ بڑے نواب نے ہمارے بارے میں کچھ کہنا چاہا مگر دوسرے ہی لمحے جیسے سب کچھ غت ربود ہو گیا۔ نواب حشمت جنگ صرف چند قدم بعد ٹھٹک کے رُک گیا۔ اُس کی آنکھیں اچانک پھیل گئیں۔ ابا جان

اور زورا پر اُس کی نظر پڑ گئی تھی مگر ابّا جان نے اُسے حیرانی کی اتنی مہلت نہیں دی۔ اُٹھ کر اُنھوں نے مسکراتے لبوں سے اُسے سلام کیا اور دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ نواب حشمت جنگ استعجاب کے عالم میں اُن سے بغل گیر ہوا۔ ”آپ؟ . . .“

”شاید صدقِ طلب کا کرشمہ ہے۔“ ابّا جان کی آواز چہک رہی تھی۔ نواب کو پھر بھی یقین نہیں آیا۔ اُس نے سر گھما کے متوحش نظروں سے ہم سب کو دیکھا پھر اُس کی نظریں ابّا جان کے چہرے پر آ کے جم گئیں۔ ”ہمیں شبہ ہے کہ ہم کسی خواب سے دوچار ہیں۔“

”ایک اچھے خواب سے۔“ ابّا جان نے چہکتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”بے شک بے شک۔“ نواب حشمت جنگ سٹ پٹاتے انداز میں بولا۔ ”ہمیں آپ کو یہاں دیکھ کے مسرت ہوئی۔ یہ بھی ہمارا ہی گھر ہے مگر بخدا ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔“

”آپ تشریف تو رکھیے۔ ملنے ملانے پر آئے تو قسمت عجب تماشے دکھاتی ہے۔“ ابّا جان نے سکون سے کہا۔ ”ہمارے لیے بھی اس حویلی سے آپ کے تعلق کی خبر بہت حیران کن تھی۔ رات ہی نواب صاحب قبلہ نے آپ کی نسبت کچھ فرمایا تھا۔“

”آپ ہمارے بھائی سے واقف ہیں؟“ بڑے نواب نے بے کلی سے کہا۔ ”مگر آپ نے ہمیں نہیں بتایا تھا؟“

”ہم اس ملاقات کا لطف کھونا نہیں چاہتے تھے۔“ ابّا جان نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”اور کوئی معتبر حوالہ دینے کی ضرورت بھی پیش نہیں آئی اور پھر نواب صاحب قبلہ سے ہماری شناسائی کو دن بھی کتنے ہوئے ہیں۔“

”چند دن، محض چند دن۔“ نواب حشمت جنگ تیزی سے بولا۔ ”بھائی میاں! ہم نے آپ کو بزرگ محترم کے متعلق بتایا نہیں تھا؟ یاد نہیں آپ کو؟ اوہ، یہ سب کتنا عجیب ہے۔ بھائی میاں! یہ بھی وہی کرم فرما ہیں جنھوں نے بہ کمال عنایت ہمیں وہ نادر و بیش بہا پتھر عطا فرمایا تھا۔“

بڑے نواب کی پیشانی شکن آلود تھی۔ سنسناتے لہجے میں بولا۔ ”آپ سچ کہہ رہے ہیں حشمت بھائی؟“

”ہاں ہاں، اور ہم نے آپ سے کہا نہیں تھا کہ ہم کسی مناسب وقت پر اپنے اجنبی بزرگ، اپنے حاتم صفت محسن سے آپ کو ملوائیں گے۔ آپ اُدھر اپنی پریشانیوں میں گھرے ہوئے تھے اس لیے ہم ٹھیرے رہے مگر دیکھیے، یہ سب کیسے ہوا؟“ وہ متلاطم آواز میں بولا۔ ”بھائی میاں! براہِ کرم ہمیں بتائیے۔“

”کیا عرض کریں، ایک طویل رُوداد ہے۔“ بڑے نواب نے بکھرے لہجے میں کہا۔ ”یوں سمجھیے حشمت بھائی! ہماری باری آ گئی تھی۔ اس بار ہمارے مہربان بزرگ کے جود و سخا کے لیے ہمارے خانوادے کی باری آ گئی تھی۔ قبلہ محترم نے اگر آپ کو ایک بے نظیر ہیرے سے نوازا ہے تو ہمارے لیے سبب بے بہا سوغات لائے ہیں۔ یقین کیجیے، ہمیں آپ سے زیادہ عطا ہوا ہے۔ اس کا کوئی مول نہیں ہے۔“

”کہیں قبلۂ عالم کا تعلق بھی اُنھی حضرات سے تو نہیں جو عالم آب . . .“ نواب حشمت جنگ کی حیرت زدہ آواز حلق میں اٹک گئی۔

بڑے نواب نے سر جھکا لیا۔ ”آپ کو اگر اپنے گرامی قدر روشناساؤں کی دید سے ہمیں مشرف کرانے کا اشتیاق تھا تو ہم بھی اُدھر اپنے مسیحا نفس، اپنے والا مرتبت مہمانوں سے آپ کو ملوانے کے لیے بے تاب تھے۔“

نواب حشمت جنگ کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ جلتی بجھتی آنکھیں۔ وہ کشمکش و پیچ کی کیفیت میں دو چار لمحوں تک ساکت کھڑا رہا۔ جھجک، حیرت اور ہم سب بھی خاموش کھڑے کبھی ابّا جان کو دیکھ رہے تھے، کبھی بڑے نواب کو اور کبھی اُسے۔ پھر ابّا جان ہی نے پہل کی۔ اُنھوں نے ایک قدم آگے بڑھ کے نواب حشمت جنگ کے شانے پہ ہاتھ رکھا تو اُس نے دیوانہ وار اُنھیں گلے لگا لیا۔ بڑے نواب اور ابّا جان کے ساتھ وہ تخت پہ آ گیا تھا۔ اُس کا سارا وجود کھلا ہوا تھا۔ ابّا جان نے اُس کی خیریت پوچھی تو اُس نے شکایت آمیز شائستگی سے جواب دیا کہ وہ کل رات ابّا جان کی نئی حویلی گیا تھا۔ پھر صبح دفتر جاتے جاتے گیا تھا۔ رات اُسے بتایا گیا تھا کہ ابّا جان کسی ضروری کام سے دُور گئے ہیں۔ صبح اُسے بتایا گیا کہ شہر سے دُور گئے ہیں۔ اُسے حیرت تھی کہ ابّا جان نے اچانک کہاں کا قصد کر لیا۔ اُس سے ذکر بھی نہیں کیا۔ کہنے لگا کہ یہ تو اُس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ ابّا جان اُس کے اتنے قریب ہیں، اُس کے اپنے گھر میں ہیں۔ پھر ابھی وہ ابّا جان کے پہلو سے لگا شیفتہ و وارفتہ انداز میں یہ باتیں کر رہا تھا کہ خان صاحب نے آ کے کھانا چُنے جانے کی اطلاع دی۔ نواب حشمت جنگ بھی ابّا جان کا ہاتھ تھامے تھامے کھانے کے کمرے میں آیا اور اُس نے میزبان ہی کی طرح ہم سب کو بٹھایا۔ مجھے اندازہ تھا کہ جلد یا بدیر اُس پہ نئی نئی حیرتیں مسلط ہوتی جائیں گی۔ اُس کی یہ بے ساختگی غیر اختیاری تھی۔ ابّا جان کو یہاں دیکھ کے پہلا فطری ردِ عمل لیکن رفتہ رفتہ اُس کے ذہن میں طرح طرح کے سوال گونجنے بھی لازم تھے اور یہی ہوا۔ کھانے کے دوران وہ کھویا کھویا نظر

آنے لگا۔ اُس کا لمحہ بہ لمحہ بڑھتا ہوا اضطراب اُس کے چہرے سے نمایاں تھا۔ یہ مجلس آداب کے خلاف تھا کہ ستے لوگوں میں وہ کوئی ایسا سوال کرے جس کا جواب ماحول کی شگفتگی مُرجھا دے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ بڑے نواب نے اس دوران اُسے کب کیا بتایا ہو گا کہ قاسم کو ساتھ لانے والے لوگ کون ہیں۔ یہ تو اُسے معلوم ہی ہو گا کہ قاسم بازار سے کن لوگوں کے ساتھ گئی تھی، جنھوں نے اس وقت شاہ کبیر جیسے آدمی سے بازار کا اڈا چھین لیا تھا اور جنھوں نے بھرے اسٹیشن پر نواب عالم آب کی گردن پر چاقو رکھ دیا تھا۔ بازار کی ایک عورت ابّا جان اور اُن کے ساتھ آنے والوں سے وابستہ تھی۔ یہ سب کچھ نواب حشمت جنگ کو بہت پُراسرار نظر آ رہا ہو گا۔ ابّا جان حیدرآباد کے سب سے بڑے ہوٹل میں قیام، اُس کے گھر کسی تعارف کے بغیر آمد اور کسی جائز و ناجائز کام کی گزارش و سفارش کے بغیر ایک غیر معمولی ہیرے کا نذرانہ۔ ایک بڑی حویلی کی نقد خریداری اور یہاں اُن کے ساتھ موجود سے لوگوں کے چہرے۔ ابّا جان اور زورا کے سوا ہم میں سے کسی کو اُس نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ خود بڑے نواب کو ابّا جان اور حشمت جنگ کے تعلق، ہیرے کی سخاوت وغیرہ کی حیرت کم نہیں ہو گی لیکن اُس کی بات دوسری تھی۔ درمیان میں ایک مکمل دن گزر چکا تھا۔ اڈے پر آنے والے لوگوں اور وہاں گزرنے والے واقعات سے وہ پہلے ہی واقف تھا۔ اتنی اُلجھی باتیں جاننے کے بعد اُس کے خیال میں اب سب کچھ ممکن ہو گا۔ اُس کی معلوم ہستی قاسم بہر حال حویلی میں موجود تھی اس لیے باقی سب عجوبوں کا آنا بھی قبول کر لینا چاہیے تھا۔ قاسم کی آمد کے بعد سارے سوال غیر ضروری تھے۔

”ہمیں بھی وہ نادرِ روزگار ہیرا دیکھنے کا موقع ملا ہے، یقیناً بے مثال آپ ہے۔ ایک عرصے بعد ہم نے ایسا نفیس پتھر دیکھا ہے۔“ کھانے کے دوران بڑے نواب نے کہا۔ اُسے نواب حشمت جنگ کی مضطربانہ کیفیت کا کچھ احساس ہو چلا تھا۔ حشمت جنگ چند لمحے پہلے گم سم سا ہو گیا تھا۔ یہ بات اُسے ٹوکنے کے مترادف تھی۔

نواب حشمت جنگ سنبھل گیا اور مچلتے لہجے میں بولا۔ ”روز بہ روز ہم پہ اُس کی قدر و قیمت منکشف ہو رہی ہے۔ ہم سے رہا نہ گیا تھا، سوچا پہلے اُسے لے کے ہم اپنے بھائی جانی میاں ہی کے ہاں آئے تھے۔ یہ اُسے دیکھ کے دنگ رہ گئے تھے۔ پوچھنے لگے، حشمت بھائی! سچ بتائیے، کہاں سے دستیاب ہوا۔ ہم نے کہا، بس ایک سخی دے گیا۔ سمجھو آسمان سے بھیجا گیا ہے۔ دروازے پہ سوالی کھڑے رہتے ہیں، اب کے ایک سخی آیا تھا۔ انھیں یقین نہیں آیا۔ کسی کو بھی نہیں آتا۔ اُدھر ہم نے ریاست کے ایک جوہر شناس کو دکھایا تھا۔ وہ رنگ زاویے بدل بدل کے نظارہ کرتے رہے۔ پوچھا کس سے ملا؟ ہم نے وہی بات بتائی جو بھائی میاں کو بتائی تھی۔ انھیں بھی کیوں یقین آتا۔ چنانچہ اُن کی تسلی کے لیے ہمیں بات بنانی پڑی کہ ہمارے خاندان کے ایک قدیم مربی، ایک بزرگ زمانے سے ولایت تشریف لے گئے تھے۔ اُنھوں نے ہمارے جد سے اپنی کہنہ وابستگی کے اظہار میں ازراہِ لطف و عنایت ہمیں عطا فرمایا ہے۔ اُن کے خیال میں ہمارے سوا اب اور کوئی اس کا مستحق نہیں تھا۔“ نواب حشمت جنگ نے پشیمانی کے انداز میں ابّا جان سے کہا۔ ”ہم یہی کچھ کہہ سکتے تھے، مگر انھیں دکھانا ہی غلط ہوا۔ پھر جانے ریاست کے کس کس صاحبِ ذوق نے ہم سے فرمائش کی۔ بات رنگ محل تک بھی پہنچ گئی۔ اتفاق سے ان دنوں مہاراجا بنسی دھر بھی حیدرآباد آئے ہوئے ہیں۔ اُن کے بارے میں مشہور ہے کہ والیانِ ریاست کو چھوڑ کے اگر کسی کے پاس نادر ترین ہیروں کا ذخیرہ ہے تو مہاراجا بنسی دھر کے پاس۔ کیوں بھائی میاں؟“

”جی ہاں، ہیروں سے مہاراجا کے شوق کی تو عجیب حکایتیں مشہور ہیں۔“ بڑے نواب نے متجسس لہجے میں حشمت جنگ کی تائید کی اور ابّا جان کو بتایا کہ کہیں اُسے کسی اچھے ہیرے کی بھنک پڑ جائے مہاراجا کو اُس وقت تک چین نہیں آتا جب تک اُسے دیکھ نہ لے اور دیکھنے کے بعد اگر کہیں پسند آ جائے تو سمجھیے مہاراجا کی نیندیں حرام ہو گئیں۔

”اس مرتبہ بھی کچھ یہی ہوا۔“ نواب حشمت جنگ دھیمی آواز میں بولا۔ ”مہاراجا نہایت ذوق و شوق کے عالم میں آئے تھے۔ ہم نے ہیرا سامنے رکھ دیا۔ نہ پوچھیے کیا حال ہوا اور سچ پوچھیے تو اُس وقت ہمیں اُس کی اصلی قدر و قیمت کا اندازہ ہوا۔ مہاراجا کی خیرہ آنکھیں اور اُن کے چہرے پر آتے جاتے رنگ دیکھ کے۔ ہیروں کی تھوڑی بہت پہچان ہمیں بھی ہے لیکن مہاراجا کا تو شغل ہی یہی ہے۔ اس معاملے میں اُن کی نگاہ مستند ہے۔ مہاراجا نے بے تابانہ وہی سوال کیا، ہمارے جواب سے مطمئن نہیں ہوئے، جھجکتے ہوئے کہنے لگے، آپ کا کچھ اور خیال تو نہیں ہے۔ ہم نے عرض کیا، جناب والا یہ ایک تحفہ ہے۔ وہ خاموش ہو گئے، کچھ توقف کے بعد بولے: کون ایسا دریا دل تھا جس نے آپ کو یہ انمول چیز بھینٹ کی ہے۔ ہمیں بتائیے، شاید ہم بھی جانتے ہوں۔ آپ کے والدِ گرامی کے بیشتر اعزا و احباب سے ہمیں نیاز حاصل ہے۔ ہم نے جواب دیا۔ ایک زمانے بعد وہ ریاست تشریف لائے

ہیں۔ والدِ محترم کے حوالے کے بغیر ہمارے لیے بھی وہ اجنبی ہی تھے
اُن کا تعلق ریاست سے نہیں، شمالی ہندوستان سے ہے۔ مہاراجا
سے اور لُطف لینے کے لیے ہم نے کہا، گمان ہے کہ اُن کے پاس
اور بھی نادر پتھر ہوں گے۔ سر ہلانے لگے اور فرمایا، کیا اُن سے ہماری
ملاقات ممکن ہے؟ جواب میں ہمارے تامّل و تذبذب سے وہ بے قرار
ہوگئے۔ بولے، برِّصغیر اور کسی حد تک یورپ میں بھی شاید ہی ہیروں
کا کوئی بڑا بیوپاری رہ گیا ہو جس سے ہم واقف نہ ہوں۔ مہاراجا غلط نہیں
کہہ رہے تھے۔ ہم نے عرض کیا، ہم اپنے بزرگ کو ملاقات کی خواہش
ضرور منتقل کر دیں گے، ہر چند کہ وہ ایک گوشہ نشین شخص ہیں، انھیں
حیدرآباد سے جانے کی بھی جلدی ہے۔ اگر قیام طویل ہوا تو اب ورنہ
دوبارہ واپسی پر انشا اللہ۔ فرمایا، ہم اسے عزت افزائی سمجھیں گے۔"
"گویا آپ نے مہاراجا کی آتشِ شوق اور بھڑکا دی ہے؟"
بڑے نواب نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"اُن کی حالت دیدنی تھی۔ بعد میں احساس بھی ہوا کہ ہمیں
صاف منع کر دینا چاہیے تھا۔ ہم کوئی بھی عذر کر دیتے۔ مہاراجا کی حالت
بے چارگی کی سی تھی، اور بخدا، حویلی کی کسی اور چیز میں وہ ایسی رغبت
ظاہر کرتے تو ہم اُن کی نذر کر دیتے۔ ہم تو گھبرانے لگے تھے کہ مہاراجا
ہم سے زیادہ تفصیلات نہ پوچھنے لگیں، ہم انھیں کیا بتا پائیں گے۔
کیوں کہ اس سے زیادہ ہم خود کتنا جانتے ہیں۔ ہم اُن سے کیا عرض کرتے
کہ ابھی تو خود ہم پر ایک طلسم حیرت طاری ہے۔ ہم اپنے اس بزرگ
کی اس نوازش کی ہزار تشریحیں کرتے ہیں اور اس نتیجے پر پہنچتے ہیں
کہ یہ ضرور ہماری کوئی آزمائش ہے۔ ہم اس بے کراں، بے پناہ شفقت و
محبت کے متحمل بھی ہو سکیں گے کہ نہیں؟" نواب حشمت جنگ کے لہجے
میں معذرت اور تشکّر کے علاوہ تشویش بھی شامل تھی۔ وہ بڑے نواب
سے پوچھنے لگا۔ "جمالی میاں! آپ ہی بتائیے، اگر مہاراجا واقعی اِدھر
اُدھر کے سوال کرنے لگتے، قبلۂ عالم سے؟" اُس کا اشارہ اباجان کی طرف
تھا۔ "کوئی بات کیے بغیر، کچھ جانے بغیر ہم واضح طور پر کیا کہہ سکتے تھے۔
مہاراجا، ہمارے گھر تشریف لائے تھے۔ اُن سے قدیم روابط کا تقاضا
تھا کہ ہم اسی طرح کچھ عرض کریں اور کم و بیش یہی کچھ تھا۔"
"آئندہ کبھی ضرور مہاراجا سے نیاز حاصل کریں گے۔" اباجان
نے تیزی سے کہا۔ اُن کے ہونٹوں پر پھیکی پھیکی مسکراہٹ پھیلی ہوئی
تھی۔ "ہمیں جلد ہی واپس جانا چاہیے۔ قبلہ نواب صاحب کا اصرار ٹالنا
مشکل ہو گیا۔ انشا اللہ جلد واپسی ہوگی۔"
"ہمیں یقین ہے کہ کل صبح مہاراجا کا کوئی قاصد آئے گا یا اُن کو
وہ خود بھی تشریف لا سکتے ہیں۔" نواب حشمت جنگ نے کسی قدر جھجکتے
ہوئے انداز میں کہا۔
"سرِ دست تو ہماری طرف سے معذرت ہی چاہیے۔"
اباجان اُکھڑی آواز میں بولے۔
"ہماری بھی یہی منشا ہے مگر اندیشہ یہ ہے کہ مہاراجا کچھ اور نہ
خیال فرمائیں۔ جمالی میاں کے بہ قول یہ عذر کہیں مہمیز کا کام نہ دے۔
بہر حال ہم اُن سے کسی طرح نمٹ لیں گے۔ اپنے محترم بزرگ کے لیے
کسی طرح بھی بارِ خاطر ہونا ہمیں گوارا نہیں۔ یہ ذکر تو یوں ہی آ گیا تھا۔
یہاں ملاقات کا یہ خوش گوار حادثہ پیش نہیں آ جاتا تو شاید ہم ذکر بھی
نہ کرتے۔ اصل میں بات آئی بھی اس باعث تھی کہ ہمیں کچھ ایسا گمان
ہوتا ہے، ہمارے محترم نے فرمایا تھا کہ آپ کے پاس کچھ اور بھی نوادر
ہیں۔ یہ بات ہمارے ذہن میں کہیں محفوظ تھی چنانچہ ہماری یہ خواہش
غیر ارادی سہی مگر غیر شعوری نہیں تھی کہ مہاراجا سے بہتر کون ان کا
قدر داں ہو سکتا ہے۔"
میں نے دیکھا کہ جُگل کے ماتھے پر سلوٹیں پڑی ہوئی ہیں مگر
اُسے درمیان میں نہیں بولنا چاہیے تھا، وہ نہیں بولا۔ قہوہ پینے کے سب
کھانے کے کمرے سے اُٹھ گئے اور موضوع خود بہ خود بدل گیا۔
نشست گاہ کی طرف آتے ہوئے راستے میں بڑے نواب نے میری
طرف اشارہ کرکے نواب حشمت جنگ کو میری اور اباجان کی نسبت
بتائی۔ حشمت جنگ چلتے چلتے رُک گیا۔ اُس کی آنکھوں میں تیز چمک
پیدا ہوئی۔ میرے قریب آ کے اُس نے مجھے گلے لگا لیا۔ "ماشاء اللہ
ماشاء اللہ۔ ہم یہی سوچ رہے تھے کہ عزیزِ من کے خال و خط میں آپ کا ہم
سے کون سی مشابہت موجود ہے۔" وہ میرے شانے پکڑ کر زور زور
سے ہلانے لگا۔ "کیا خوب! آپ سے مل کے عجب شادمانی محسوس ہو رہی
ہے۔" میں نے مسکراتے ہونٹوں سے اُس کا شکریہ ادا کیا۔ اُس کی
آنکھیں سراپا میرے گرد منڈلا رہی تھیں۔ "یہی صحت اور تناسب
رکھیے گا۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "ہماری طرح نہیں۔ کسی زمانے میں ہم
بھی آپ کے مانند دل کش اور چاق و چوبند نظر آتے تھے۔"
"اب بھی آپ لاکھوں میں منفرد ہیں۔" بڑے نواب نے ہنس
کے لقمہ دیا۔
"کہاں جمالی میاں! اب تو آئینہ دیکھتے ہوئے شُبہ ہوتا ہے
جب سے ٹینس چھوٹی ہے، سارا جسم ناقص ہو گیا ہے۔" معاً وہ مجھ
سے مخاطب ہو کے بولا۔ "آپ بھی کچھ کھیلتے ہیں؟"
"جی، جی ہاں۔" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"یقیناً کسی میں کمال بھی حاصل ہو گا؟"
"کسی میں بھی نہیں۔"
"دل چسپی کس میں ہے؟" وہ اشتیاق سے بولا۔
میں اُسے کیا بتاتا۔ چاقو بازی، لاٹھی، بنوٹ، پٹا، بل اور داؤ گیری،
میں نے یہی کھیل کھیلے ہیں۔ میں کون کون سے کرتب کا نام لیتا۔ اسکول
کے زمانے میں فٹ بال، بیڈمنٹن اور کبڈی تھوڑی بہت کھیلی تھی۔
اُس کے بعد موقع ہی نہیں ملا۔ دونوں کی سوالیہ نظریں کچھ بڑھتی ہوئی تھیں
مجھے کچھ نہ کچھ تو بتانا تھا۔ اگر میں یوں ہی کسی کھیل کے بارے میں کہہ
دیتا تو وہ مجھ سے اور تفصیلات پوچھنے لگتا۔ میرے منہ سے نکل گیا
"نشانے بازی۔"
"اچھا!" اُس کی آنکھیں کھِل گئیں۔ بڑے نواب کی نگاہیں بھی
مجھ سے چار ہوئی تھیں مگر دوسرے لمحے اُس نے اپنا سر جھکا لیا تھا۔ "کون سا
نشانہ؟" نواب حشمت جنگ نے تعجب سے پوچھا۔ "ہماری مراد
ہے کس ہتھیار کی نشانے بازی سے آپ کو شغف ہے؟"
"سبھی سے تھوڑا بہت۔" میں نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔
"پھر تو ہماری آپ سے خوب چھنے گی۔" وہ جوشیلی آواز میں بولا۔
"جواں مردوں کو یہی شوق ہونا چاہیے لیکن کوئی خاص ہتھیار، ہمارا
خیال ہے بندوق؟"
"ہتھیار کوئی بھی ہو نشانہ تو نگاہ کا ہوتا ہے۔" مجھے جُگل کی
بات یاد آ گئی، میں نے دُہرا دی۔
"کیا خوب!" وہ اُچھل کے بولا۔ "بے شک، بے شک۔"
بڑے نواب نے اُس سے دوسرے لوگوں کا تعارف نہیں
کرایا تھا۔ حشمت جنگ نے بھی جستجو ظاہر نہیں کی۔ وہ ایک معاملہ فہم
اور مجلسی آدمی معلوم ہوتا تھا۔ بڑے نواب نے باقاعدہ تعارفی رسم
انجام نہیں دی تھی لہٰذا اُسے بھی کرید نہیں کرنی چاہیے تھی۔ اس حویلی
سے اُس کا تعلق بڑے نواب جتنا نہیں تو کم بھی نہیں تھا۔
عالم کے آنے کی خبر نواب حشمت جنگ نے کسی بھی طرح سُنی ہو، عالم
کی موجودگی اُس کے لیے کوئی معمولی واقعہ نہیں ہوگی۔ اُس کی بہن بھی
نواب عالم جاہ کی بیگم کی حیثیت سے حویلی میں موجود تھی مگر تیقن کے
ساتھ اُس کے چہرے پر کوئی تردد دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یہ دوسری بات
ہے کہ بعض لوگ چہرہ چھپانے میں بہت حاذق ہوتے ہیں۔ ایسے تو یہ
ہنر کسی نہ کسی حد تک سبھی کو آتا ہے اور ہمیشہ لوگ ایک دوسرے سے
دھوکا کھا جاتے ہیں۔
نشست گاہ میں وہ کچھ ہی دیر بیٹھے۔ پھر خادم کی اطلاع
پر حویلی کے ایک اور حصے میں چلے آئے۔ یہاں قالین بچھے ہوئے
اور گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ مخمل کے بے حد بھی نیا تھا۔ فرش
کے وسط میں گلابوں کے ڈھیر میں آگ روشن رکھا تھا۔ اگر بتیاں سلگ
رہی تھیں اور ہر طرف خوشبو بکھری ہوئی تھی۔ یہ ایک ہال کمرہ تھا،
حویلی کے دوسرے مرصّع کمروں کے مانند۔ یہاں آ کے علم ہوا کہ
موسیقی کا اہتمام ہے۔ ہمارے لیے مخصوص نشستوں کے عین مقابل کچھ
فاصلے پر سیاہ شیروانیوں میں ملبوس قوّال بیٹھے تھے۔ یہ منظر دیکھ کے
کاتنے اور زورا مجھ سے چمٹ گئے۔ "قسم سے راجا! ابھی تو مزا جان
بنے گا۔" زورا بے تابی سے بولا۔ کاتنے نے پیچھے سے میرے کان
میں کہا۔ "نواب تو ناتھیا کا ڈول ڈال رہا تھا۔ دونوں بابوں کی دیر سے
دبا رہ گیا۔"
"اُس نے اباجان اور منیر علی سے پوچھا تھا کیا؟"
"اشارہ کیا تھا۔" وہ سرگوشی میں بولا۔ "دونوں گردن ڈالے
بیٹھے رہے۔ پھر قوّالی پہ ہی اُترنا تھا اُس کو۔ اِدھر کا خرچہ ہی سالا ایک
ہو گیا لاڈلے! سوچا، استاد کو ٹھیکا لگاؤں کہ لنگ لنگ، تھوڑا دو پر سالی
زبان آگے کو نہیں چلی۔"
"کاتنے بھائی!" میں نے اُس کا شانہ تھام کے کہا۔ "میں جاتا ہوں۔"
"کیوں لاڈلے؟" وہ ترشی سے بولا۔
"میں کمرے میں جا کے آرام کروں گا۔"
"آرام تو نے ابھی تھوڑا کیا ہے۔"
"مگر مجھے نیند آ رہی ہے۔ ابھی موقع ہے میں جا سکتا ہوں۔"
"ایسی کیا جلدی ہے تجھ کو؟"
"کیا ضروری ہے کہ میں بھی شریک ہوں۔"
"چھوٹے موٹے لوگ نہیں آنے ہوں گے لاڈلے! اصیلوں
کو ہی بلایا گیا ہوگا۔ اِدھر آئیں مال تیرے مال بیٹھا۔ تھوڑی دیر تجھے یار رنگ
دیکھ کے فیصلہ کرنا۔ اُدھر کمرے میں اکیلا بیٹھا جھونکے گا کیا؟"
"پھر مجھے جانے ہی دو کاتنے بھائی!"
مجھی سے غلطی ہوئی تھی۔ کاش دوپہر کی طرح کھانے کے کمرے
سے ہی چپکے سے نکل پڑتا۔ کاتنے نے مجھے آگے کی طرف دھکیل دیا
اور اس سے پہلے کہ میں لوٹ کے دروازے کا رُخ کرتا، نواب حشمت جنگ
میرے پاس آ گیا اور رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "آپ نے نشانے بازی کا
کہہ کے بے قرار کر دیا ہے۔ دل یہی کہتا ہے کہ ابھی ریوالور نکال کے
باہر چلیں اور آپ کا کمال دیکھیں۔"
"میں نے آپ سے پہلے کہا تھا کہ مجھے کوئی کمال حاصل نہیں ہے۔"

"مگر ہم نے اس طرح نہیں سنا جس طرح آپ نے کہا ہے۔" وہ کانا پھوسی کے انداز میں بولا۔ "ہم بھی کچھ اسی طرح کہتے ہیں۔"

"آپ اچھے نشانے باز معلوم ہوتے ہیں۔"

"اگر یوں کہیے تو زیادہ مناسب ہوگا کہ ہمیں اچھی نشانے بازی بہت مرغوب ہے۔ نہ پوچھیے کتنے دنوں بعد کوئی ہم شوق نصیب ہوا ہے۔"

"لیکن مجھے آپ میری عمر کا مارجن تو دیں گے؟"

"اور ہمیں آپ ہماری جاتی عمر کا؟" وہ قہقہہ لگا کر بولا۔

چلتے چلتے ہم اس جگہ آ گئے تھے جو ہمارے لیے مخصوص تھی۔ اب واپسی کا کوئی موقع نہیں تھا۔ ہمارے اندر داخل ہوتے ہی قوال اُٹھ کھڑے ہوئے، آدھا جھک کے انھوں نے ہمیں سلام کیا اور اس وقت تک کھڑے رہے جب تک ہم سب بیٹھ نہیں گئے اور نواب حشمت جنگ نے انھیں باقاعدہ اجازت نہیں دے دی۔ اب کچھ دیر ہمارا میزبان معلوم ہوتا تھا۔ اسی نے قوالوں کے بارے میں مختصراً بتایا کہ عرصہ ہوا، دلّی سے آئے تھے پھر لوٹ کے نہیں گئے۔ دربار تک باریاب ہوئے ہیں اور کئی خطابات پاچکے ہیں۔ کم گاتے ہیں اور اپنی خاص طرز بنانے میں کوشاں ہیں۔ نواب حشمت جنگ، ابا جان کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ چھوٹا نواب اُن کے پہلو میں۔ میں، کالے تے اور زورا پیچھے ایک کونے میں سمٹ گئے تھے، اس طرح کہ ان کی آڑ بھی ہو گئی تھی۔ کالے تے نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ حویلی میں آئے ہیں تو نامی گرامی لوگ ہی ہوں گے۔ نواب حشمت جنگ نے ان کے بارے میں بتاتے ہوئے احتیاط سے کام لیا تھا۔ ابتدا میں تو وہ تانیں ملاتے رہے مگر پھر انھوں نے سب کو سحر زدہ سا کر دیا۔ ابا جان گنگ ہو گئے تھے۔ منیر علی باقاعدہ جھوم رہے تھے اور سبحان اللہ، سبحان اللہ کا ورد کر رہے تھے۔ پیرو پر اضطراری کیفیت طاری تھی۔ جگل کی آنکھیں بھی بھاری بھاری ہو گئی تھیں۔ میں شروع ہی سے اُٹھنے کی تدبیریں سوچ رہا تھا مگر کوئی معقول عذر سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ نیند آنے کا عذر بد ذوقی کی بات تھی۔ طبیعت کی خرابی کا بہانہ اُن کے رنگ میں بھنگ ڈالنے کے مترادف تھا۔ رفتہ رفتہ قوالوں کی آواز کھل رہی تھی۔ درمیان درمیان میں وہ فارسی کلام کی آمیزش کر دیتے تھے۔ اُن کی صدائیں سازوں میں رل مل کے تھوڑی دیر میں کیا سے کیا ہو گئی تھیں۔ میں نے اُن کی طرف سے اپنے کان اور آنکھیں بند رکھنے کی کوشش کی تھی لیکن یہ ممکن نہیں رہا۔ اُن کی آوازیں کبھی کبھی تو سارا جسم جھنجھنا رہی تھیں۔ میں بھی جانے کہاں بھٹک گیا تھا۔ مجھے تو اس وقت کچھ ہوش آیا جب اُن کے سُر خاموش ہوئے۔ جیسے ہی وہ سانس لینے ٹھیرے، مجھے پھر وقت گزرنے اور دیر ہو جانے کی الجھن ہونے لگی۔ ابھی اُٹھا جا سکتا تھا ورنہ دوسرے کلام کے خاتمے تک بیٹھنا پڑتا۔ میں اُسی لمحے اُٹھ گیا لیکن کھڑے ہو جانے کے بعد مجھے اپنی دہشت کا احساس ہوا۔ میں ان سے کیا کہوں گا۔ سب کی نگاہیں مجھ پر مرکوز تھیں۔ "میں اجازت چاہوں گا۔" بہ دقّت تمام یہ الفاظ میری زبان سے ادا ہوئے۔ وجہ معلوم کرنا بھی شاید آداب کے خلاف تھا۔ کسی نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔ البتہ سبھی کے چہروں پر لکیریں کھنچ گئیں۔ کالے تے نے اُسی وقت میرا ہاتھ پکڑا تھا لیکن جب میں نے آگے قدم بڑھایا تو اُس نے فوراً ہاتھ ہٹا لیا۔ میں نے پھر کسی سے نگاہیں نہیں ملائیں، نہ پیچھے مڑ کے دیکھا اور لپکتا ہوا کمرے سے آ گیا۔ آتے وقت مجھے جگل کی آواز سنائی دی تھی، وہ ان سے کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ وہاں موجود ہی تھا۔ اُس نے ضرور میری طرف سے کوئی مناسب عذر کر دیا ہو گا۔

ابھی ایسا زیادہ وقت نہیں ہوا تھا۔ تقریباً ساری روشنیاں جل رہی تھیں۔ راہ داریوں میں چہل پہل بھی نظر آ رہی تھی۔ میں تیز قدموں سے چند منٹوں میں بالائی منزل پر آ گیا اور کمرے میں جانے سے پہلے کچھ دیر باہر ٹہلتا رہا۔ فوارہ بند ہو چکا تھا لیکن وہاں اکا دکا آدمی تھے۔ انھوں نے مجھے دیکھ لیا ہو گا۔ کمرے میں داخل ہوتے وقت میرے پیر ڈگمگا رہے تھے۔ اندر ہر چیز روشن تھی۔ وہاں کوئی نہیں تھا لیکن کوئی آیا ضرور تھا۔ بستر کی چادر بے شکن تھی اور تکیے ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ مسہری کے سرھانے میز پر مجھے کئی کتابیں نظر آئیں۔ میں نے انھیں اُلٹ پلٹ کے دیکھا۔ سب حیدرآباد کی تاریخ سے متعلق تھیں۔ میں نے کتابیں رکھ دیں اور پہلے اپنی اکھڑی ہوئی سانسیں بحال کرنے کی کوشش کی۔ ٹھنڈے پانی کی بوتل سے پانی نکال کر پیا اور خاص دان کھول کے دیکھا۔ تازہ گلوریاں رکھی تھیں گویا کسی کو گئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ نہ معلوم کون آیا ہو گا۔ میں نے گراموفون ریکارڈ ٹٹول کے دیکھا اور خراب ہو جانے کے خیال سے یوں ہی چھوڑ دیا۔ میں کچھ دیر کبھی اِدھر کبھی اُدھر کمرے میں گھومتا رہا۔ کبھی یہ اور کبھی وہ چیز ٹٹولتا رہا۔ پھر کتاب لے کے آرام کرسی میں بیٹھ گیا لیکن مجھ سے ایک صفحہ بھی نہ پڑھا جا سکا۔ تھوڑی ہی دیر میں احساس ہونے لگا کہ میں یہاں بے کار آ گیا۔ جانے مجھ پہ وہاں کیا آفت ٹوٹ رہی تھی۔ کیا مجھے یہاں کسی کے منتظر ہونے کی توقع تھی؟ مجھے یہاں کس نے وقت دیا تھا؟ وہ لوگ کیا سمجھ رہے ہوں گے۔ انھوں نے ضرور

ہماری خاطر یہ بزم آرائی کی تھی۔ یہاں کمرے میں تو وحشت ناک تنہائی چھائی ہوئی تھی۔ اب میرا لوٹنا بھی مناسب نہیں تھا۔ پھر میں کیا کروں۔ بیٹھے بیٹھے مجھے خفقان سا ہونے لگا۔ میں یہاں کیوں آیا تھا؟ میں نے کتنی ہی بار خود سے یہ سوال کیا۔ یقیناً مجھے توقع تھی کہ کمرے میں دوسرا منظر ہو گا۔ کوئی کمرے میں موجود ہو گا۔ نہیں ہو گا تو میرے پہنچتے ہی آ جائے گا حالانکہ دوپہر کو میں نے خود آنے والی خادمہ کو منع کر دیا تھا۔ ویسے بھی اب گیارہ بج رہے ہیں۔ میرے جی میں آئی، کیوں نہ ایک بار ڈوری کھینچ کے دیکھوں۔ وہ تو میں نے کہا تھا اور اُس نے سُن لیا تھا۔ لیکن اگر وہ آ گئی تو میں اُس سے کیا بات کروں گا۔ دوپہر کون سی بات ادھوری رہ گئی تھی۔ اب بھی اگر مجھ سے کوئی بات نہ ہو سکی تو؟ بہتر یہ ہے کہ ایک مرتبہ مجھے باہر جا کے خادموں کو دکھا دینا چاہیے کہ میں آ گیا ہوں، سماع کی محفل میں شریک نہیں ہوں۔ ممکن ہے، ابھی انھوں نے مجھے نہ دیکھا ہو مگر اس سے پہلے ایک مرتبہ ڈوری کھینچ لینے میں کیا حرج ہے۔ میں نے کسی تاخیر کے بغیر ڈوری کھینچ دی۔ لمحے گزر گئے۔ دروازے پر کوئی آہٹ نہیں ہوئی۔ میری آنکھیں دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ اُسے بلانے کا یہ کوئی وقت نہیں تھا۔ اچھا ہی ہوا کہ کوئی نہیں آیا۔ میرا ہیجان خود بہ خود بڑی حد تک کم ہو گیا تھا لیکن ابھی ڈوری کھینچے پانچ منٹ سے زیادہ نہ گزرے ہوں گے کہ دروازے پر چاپ اُبھری اور چوڑیوں کی کھن کھناہٹ ہوئی۔ میرا دل دھڑ دھڑانے لگا۔ جس وقت دروازہ کھلا، میری آنکھوں میں اندھیرا سا اُتر آیا تھا۔ وہی سامنے تھی۔ دوپہر والی خادمہ جس کا نام نفیس تھا۔ اُس کی آنکھیں جگمگا رہی تھیں۔ اُس کا سارا چہرہ ہی جگمگا رہا تھا۔ وہ دوسرا لباس پہنے ہوئے تھی۔ گہرے نیلے رنگ کا لمبا کُرتا، سفید پاجامہ، کُرتے پر بڑے بڑے پھول کڑھے ہوئے تھے۔ دوپٹا بھی نیلا تھا۔ روشنی میں اُس پر ٹنکے ہوئے ستارے دمک رہے تھے۔ اُس کی "تسلیم" پر چند لمحوں تک میں چپ چاپ آنکھوں سے اُسے گھورتا رہا۔ "بندی اُمید کرتی ہے، جناب کے مزاج بخیر ہوں گے۔" اُس کی آواز میں پہلے سے زیادہ کھنک تھی۔

"جی ہاں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "آپ کی کتابوں کا شکریہ۔"

"سر دست یہی دستیاب ہو سکیں۔ مہتمم کتب خانہ کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ کل وہ جناب کے لیے اس موضوع پر مستند کتابوں کی ایک فہرست مرتب کر دے۔"

"میں نے ابھی انھیں سرسری طور پر دیکھا ہے۔"

"بندی کو علم ہے، جناب کو مہلت ہی کتنی ملی تھی۔" وہ شرماتے ہوئے بولی۔ "مہتمم کا کہنا ہے کہ اگر جناب کو ضرورت پیش آئی تو وہ ریاست کے کتب خانے سے بھی بعض نادر نسخے فراہم کر سکتا ہے۔"

"آپ بیٹھیے گا نہیں؟" میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ جھجکتی ہوئی میرے مقابل کرسی پر ترچھی ہو کے بیٹھ گئی۔ میں نے اُس سے کہا۔ "میں نے آپ کو اس وقت زحمت دی۔"

"بندی کب سے منتظر تھی۔" وہ برجستہ بولی۔

"آپ یہیں موجود تھیں؟"

"جب تک جناب آرام فرما رہے تھے۔"

"آپ کے جانے کے بعد مجھے گہری نیند آ گئی تھی۔"

"بندی نے اسی لیے زحمت نہیں دی۔"

"آپ کو معلوم تھا کہ میں ۔ ۔ ۔ میں۔"

"کمرے میں رات تک روشنی نہیں تھی۔" وہ چہکتی آواز میں بولی۔ "دروازے بھی بند تھے۔"

"ہاں!" میں نے سانس لے کے کہا۔ "دنوں بعد مجھ پر ایسی غفلت طاری ہوئی تھی۔"

"گہری نیند تو نعمت ہوتی ہے۔" وہ شستگی سے بولی۔ "چھوٹی سرکار اور بی بی آنا چاہتی تھیں۔ انھوں نے آداب کہا ہے اور زیارت کی ہدایت کی ہے۔"

"میری طرف سے انھیں بہت بہت سلام عرض کر دیجیے گا۔ میں خود آتا لیکن وقت ہی نہیں ملا۔ کیا وہ ابھی تک جاگ رہی ہیں؟"

"اب تو عرصے سے کوئی وقت نہیں ہے۔"

"جی، جی۔" میں نے سر ہلا کے کہا۔ "میں سمجھتا ہوں، لیکن سب خیریت تو ہے؟"

"پروردگار کا شکر ہے۔"

اُس سے پوچھنے کے لیے مجھے کوئی اور بات سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ اُسے شاید میری اس خالی الذہنی کا احساس ہو گیا تھا۔ گنگناتی سی آواز میں بولی۔ "جناب کچھ نوش فرمانا پسند فرمائیں گے؟" میں نے انکار کر دیا تھا لیکن پھر میں نے جلدی سے کہا۔ "آپ کو زحمت ہو گی۔"

"بندی جناب کی خادمہ ہے۔"

"مگر میرے لیے تو آپ خادمہ نہیں ہیں۔"

"جناب کی نوازش ہے کہ بندی کو نوازتے رہتے ہیں لیکن اسے جو منصب سونپا گیا ہے، اُس کی مستعد ادائی میں کسی قدر لغزش آ گئی تھی۔"

"آپ بہت اچھی باتیں کرتی ہیں۔"

اُس کے رُخسار لال ہو گئے۔ "آپ کا حُسنِ سماعت ہے۔"

اُسے یہی جواب دینا چاہیے تھا لیکن مجھے پھر کیا کہنا چاہیے؟ دوپہر کی طرح میرے ذہن میں ایک ساتھ بہت سی باتیں آئی تھیں۔ میں ایک ایک کرکے ہر بات رد کرتا رہا۔ یہ اندیشہ میری زبان پکڑ لیتا تھا کہ میرے منہ سے نکلی ہوئی کوئی ایسی ویسی بات کہیں اور بر عکس کے لیے سرگرانی کا سبب نہ بن جائے۔ سو میں خاموش بیٹھا اُسے دیکھتا رہا۔ کمرے کی روشنی میں اُس کا گندمی رنگ اور نکھرا ہو گیا تھا۔ وہ بار بار اپنا دوپٹا درست کرتی تھی اور لمحے لمحے اُس کے بدن میں کوئی لرزش اُٹھتی تھی۔ یکایک میرے ہاتھ میں جیسے کوئی سرا آ گیا۔ میں نے اشتیاق آمیز لہجے میں پوچھا۔ "آپ کی چھوٹی سرکار اور بی بی اس وقت کیا کر رہی تھیں؟"

اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ شگفتگی سے بولی۔ "کچھ دیر پہلے تک چھوٹی سرکار خادماؤں کو ہدایات دے رہی تھیں۔ اس کے بعد بندی سے ملاقات نہیں ہوئی۔"

"اور مہ جبیں بی بی؟"

"بندی اُن کے ساتھ تھی۔" اُس کی آواز ٹمٹمانے لگی۔

"وہ کیا کر رہی تھیں؟" میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "مناسب ہو تو بتائیں۔"

"نہیں نہیں۔" وہ گھبرا کے بولی۔ "بی بی سرکار اپنے کمرے میں موجود ہیں۔"

"آرام کر رہی ہیں؟"

"بندی کیا عرض کرے۔" وہ پریشانی سے بولی۔ "سچ پوچھیے تو بی بی اپنے کمرے میں اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہیں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"بی بی سرکار پر کبھی کبھی ایسی خاموشی چھا جاتی ہے۔"

"اچھا! مگر ایسا کیوں؟"

"بندی کچھ نہیں کہہ سکتی۔ کب سے اپنے کمرے میں خاموش بیٹھی ہیں۔" وہ اداسی سے بولی۔

"اُن کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"بظاہر خدانخواستہ ایسی کوئی علامت نظر نہیں آئی۔ ابھی شام تک تو ہنس ہنس کے باتیں کر رہی تھیں۔ اچانک انھیں نہ جانے کیا ہو جاتا ہے؟"

"آپ کی بی بی بہت بہت اچھی لڑکی ہیں۔"

"بے شک۔" وہ وارفتگی سے بولی۔ "خدا انھیں ہمیشہ خوش رکھے۔ بی بی سرکار تو پھولوں کی طرح ہیں، آئینے کے مانند ہیں۔"

"ایک بات پوچھوں، بتائیں گی؟" میں نے سرگوشیانہ کہا۔

"بندی تعمیلِ حکم کے لیے بھیجی گئی ہے تاہم اس کی درخواست ہے کہ اس کی بساط ملحوظِ خاطر رہے۔"

"نہیں نہیں۔ یونہی ایک بات ذہن میں آ گئی۔ آپ سے پوچھا کہ دونوں میں آپ کو کون زیادہ پسند ہے؟" میں نے جان بوجھ کے ایک فضول بات کہی۔

"بندی نے کبھی انھیں جُدا جُدا تصور نہیں کیا۔"

"مجھے یقین تھا کہ آپ یہی جواب دیں گی۔"

"بندی نے احوالِ واقعی عرض کیا ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"اور وہ اور یہ چھوٹی بیگم صاحب اور مہ جبیں بی بی کے مشاغل کیا رہتے ہیں؟" میں نے بظاہر سرسری انداز میں پوچھا۔

"مشاغل کی بات تو پہلے کبھی تھی۔" وہ ڈوبے ہوئے لہجے میں بولی۔ "اب تو عرصے سے ایک ہی شغل رہ گیا تھا۔ دعاؤں کا، تیمارداری کا اور عیادت کے لیے آنے والوں کی پرسش کا۔ پہلے کبھی چھوٹی بیگم صاحب کو ایک پل کی فرصت نہیں ملتی تھی۔ حویلی میں اُن کے آنے کے بعد بڑی سرکار نے سارا انتظام اُن کے سپرد کر دیا تھا۔ ساری حویلی کی دیکھ بھال، ایک ایک گوشے پر اُن کی نگاہ رہتی تھی۔ ملازموں کا خیال، اُن کی غمی خوشی میں شرکت، تقریبات کا اہتمام، آنے جانے والے اعزا اور مہمانوں کی پذیرائی۔ انھوں نے اپنے ذمے کتنے کام لیے ہوئے تھے۔ حویلی کے مصارف کی بھی وہی نگرانی کرتی تھیں۔ ان تمام مصروفیات کے علاوہ مطالعے کے لیے بھی وقت نکال لیتی تھیں۔ کبھی شطرنج سے بھی شوق فرما لیتی تھیں۔ شادی سے پہلے سنا ہے بیڈمنٹن خوب کھیلا کرتی تھیں۔ شادی کے بعد ترک کر دیا لیکن چھوٹی سرکار کی خواہش پر دوبارہ مشق شروع کر دی تھی۔"

"اور مہ جبیں بی بی؟"

"دونوں کو ایک دوسرے کا سایہ سمجھیے۔"

"واقعی یہی محسوس ہوتا ہے۔"

میری نظروں میں مہ جبیں اور گیتی کے سراپا گھوم رہے تھے۔ اُن کا ذکر کرتے ہوئے خادمہ نفیس کی آواز مجھے پگھلنے لگتی تھی جیسے وہ اپنا ہی ذکر کر رہی ہو۔ میں نے طے کیا کہ صبح ہوتے ہی زنان خانے کی طرف جاؤں گا لیکن یہ میں نے اُسے نہیں بتایا۔ وہ میرے سامنے بیٹھی اپنے دوپٹے کے کنارے کرید رہی تھی جیسے ہی اُسے احساس ہوتا کہ میری نگاہیں اُس کے چہرے پر مرکوز ہیں، اُس کا بدن سمٹنے لگتا اور اس کی لمبی لمبی پلکوں پر ارتعاش طاری ہو جاتا۔ وہ شش و پنج میں تھی

کہ میں اُس سے کچھ اور پوچھوں گا، اُسے کوئی حکم دوں گا یا اُسے جانے کی اجازت ہی دے دوں گا۔ میری خاموشی اُسے بہت گراں گزر رہی ہوگی لیکن میرے سر میں پھر سب کچھ منتشر ہو گیا۔ کیا میں اُس سے یہی کچھ جاننا چاہتا تھا؟ مگر اتنا کم دیش میں بھی جانتا تھا۔ پھر میں نے آتی رات گئے اُسے زحمت کیوں دی اور اُسے بے جواز آتنی دیر روکا بھی ٹھیک نہیں ہے۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ وہ بُت کی طرح بیٹھی رہے اور میں اُس کی صورت دیکھتا رہوں۔ جو لمحہ گزر رہا تھا میرے ذہن کا سناٹا بڑھتا جاتا تھا اور رفتہ رفتہ میرے ہاتھ پیر ٹوٹنے سے لگے تھے۔ میں ایک عجیب، ایک فضول آدمی ہوں۔ میری زبان بار بار بہکنے لگتی ہے۔ جب تک یہ موجود رہے گی، میرے رگ و پے میں یہ آگ سی سلگتی رہے گی۔ بہتر یہی ہے کہ وہ چلی جائے۔ میرا اندازہ درست تھا۔ وہ اس سکوت سے اُکتا گئی تھی۔ کتراتے ہوئے لہجے میں کہنے لگی

"بندی لب کشائی پہ معذرت خواہ ہے۔ ناچیز کا گمان ہے کہ آپ کچھ بھول رہے ہیں۔ جناب نے بندی کو یاد فرمایا تھا۔"

"ہاں ہاں۔" میں نے بدحواسی سے کہا۔ "آپ کو جلدی ہے؟"

"بندی کی یہ مراد نہیں۔" وہ سراسیمگی سے بولی۔ "اُس نے محض یاد دہانی کے لیے یہ جسارت کی ہے۔"

"میں آپ کو سچ بتاؤں۔" میں نے بکھری ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھے یہاں آ کے بہت تنہائی محسوس ہو رہی تھی جب کہ میں اس تنہائی کے لیے سماع کی ایک بہت اچھی محفل چھوڑ کے آیا تھا مگر اب سب ٹھیک ہے۔ اب کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ آپ چاہیں تو جا سکتی ہیں۔"

"بندی نہایت شرمندہ ہے لیکن خدا گواہ، اس کا کوئی اور مقصد نہیں تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بندی خود کو گناہ گار سمجھ رہی ہے۔"

"نہیں، ایسا نہیں ہے۔ ایسا مت سمجھیے۔ میں آپ سے کسی غبار میں نہیں، صاف دل سے کہہ رہا ہوں۔" میں نے اُس کی خاطر کہنا ضروری سمجھا۔ "ضرورت پڑنے پر اُسے پھر بلا لوں گا۔"

"جی جی۔" وہ لرزتے ہونٹوں سے بولی۔

یوں اس صورت میں اُس کے لیے خود کو کمرے سے چلے جانے پر آمادہ کر لینا آسان نہیں تھا۔ نہ مجھے اُس سے دوبارہ کہنا چاہیے تھا۔ میرے ذہن میں یہی بات آئی۔ میں نے اُس کی دل دہی کے لیے کہا۔ "اس وقت دست یابی ممکن ہو تو مجھے نزلے کی کوئی دوا فراہم کر دی جائے۔"

"نصیبِ دشمناں، بندی کو پہلے ہی خبر تھا کہ جناب کے مزاج ناساز ہیں۔"

"کوئی خاص بات نہیں لیکن احتیاط واجب ہے۔"

"بندی ابھی لے کے حاضر ہوتی ہے۔ حویلی میں ہر وقت ایسی ادویات موجود رہتی ہیں۔ طبیب آنے میں بھی کوئی دیر نہیں لگے گی۔ فون پر ڈاکٹر کو بھی بلایا جا سکتا ہے۔ جناب کے لیے انگریزی دوائیں زیادہ مناسب ہوتی ہیں یا یونانی؟"

"کوئی بھی جو آسانی سے فراہم ہو سکے۔ کسی حکیم ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہے۔"

"یقیناً سردردی کی بھی شکایت ہو گی۔"

میں نے سر ہلا کے اقرار کیا۔ وہ دوبارہ جلد واپسی کا کہہ کے کمرے سے فوراً چلی گئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کمرے سے اچانک شور کم ہو گیا ہو اور میں کسی چھاؤں میں آ گیا ہوں۔ جیسے میں اپنے آپ سے دُور چلا گیا تھا اور اب اپنے آپ تک واپس آ گیا ہوں لیکن کشادگی و طمانیت کا یہ وہم سب عارضی تھا۔ چند لمحوں بعد ہی مجھے سب کچھ یاد آنے لگا اور میرے جسم سے پسینہ چھوٹتا رہا۔ وہ کیا سوچتی ہوگی۔ وہ میرے حواس کی درستی پر ضرور شش و پنج میں مبتلا ہو گئی ہوگی۔ یہ رویّہ اُس کے لیے ناقابلِ فہم ہوگا۔ وہ تو بہت نرم و نازک، بہت خوب صورت لڑکی ہے۔ اتنے دل نشیں انداز میں باتیں کرتی ہے۔ میرا کیسا خیال رکھ رہی تھی۔ میں اُس سے دُنیا جہان کی باتیں کر سکتا تھا۔ شہر کے متعلق، حویلی کے متعلق، موسموں کے بارے میں مگر میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ میرا دماغ جو خراب ہونے لگتا ہے۔

اُسے جلد ہی واپس آ جانا چاہیے تھا لیکن دیر ہو گئی اور وہ نہیں لوٹی۔ میرے ذہن میں طرح طرح کے وسوسے اُبھرنے لگے۔ اچھا ہے کہ وہ واپس نہیں آئے۔ میں اس دوران خود کو طمانچے ہی مارتا رہا۔ اب کے وہ آ گئی تو میں اس طرح نہیں کروں گا۔ میں نے ایک بار پھر عزم کیا اور آرام کرسی سے اُٹھ کے ایک گلاس پانی پیا۔ بیٹھے بیٹھے میرا جسم اکڑ سا گیا تھا۔ سامنے ہی آئینہ نصب تھا۔ میں نے ایک نظر اپنا چہرہ دیکھا۔ سُتا ہوا چہرہ، بکھرے بال، گریبان کے اوپر کا بٹن بھی کھلا ہوا۔ غسل خانے جا کے میں نے منہ پہ کئی چھپکے مارے۔ بالوں میں کنگھی پھیر کے میں جلد سے جلد کمرے میں واپس آیا۔ وہ نہیں آئی تھی لیکن میرے آرام کرسی پہ بیٹھنے کی دیر تھی کہ دروازے پہ آہٹ ہوئی۔ وہ ہانپتی ہوئی اندر آئی۔ ہاتھ میں ایک چھوٹی ٹرے تھی جس پر ریشمی کپڑے سے ڈھکا ہوا مگ رکھا تھا۔ آتے ہی اُس نے بھولی

سانسوں سے مجھے بتایا کہ وہ میرے لیے جوشاندہ تیار کر کے لائی ہے اور کڑواہٹ کے خیال سے اُس نے ذرا سی شکر بھی ملا دی ہے۔ ابھی گرم ہے۔ جوشاندہ ذرا ٹھنڈا ہو جائے تو پینے کے لائق ہو جائے گا۔ میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور بیٹھ جانے کو کہا۔ وہ کھڑی رہی۔

"جناب سے ایک گزارش کرنی ہے۔" وہ رُکی رُکی آواز میں بولی۔

میں نے چونک کر پوچھا "کیا بات ہے؟"

"بی بی سرکار یہاں آنے کی خواہش مند ہیں۔"

"بی بی سرکار، یعنی بی بی؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"وہ جناب کی مزاج پُرسی کے لیے آنا چاہتی ہیں۔"

"مگر میں تو بالکل ٹھیک ہوں، مجھے کوئی ایسی خاص۔۔۔"

میں نے اپنی ہی بات کاٹ کے کہا "لیکن اگر اُن کی یہی خواہش ہے، وہ تشریف ہی لانا چاہتی ہیں تو بسر و چشم لیکن رات خاصی ہو گئی ہے۔ اُنھیں خواہ مخواہ زحمت ہو گی۔ آپ نے اُن سے کچھ زیادہ تو نہیں کہہ دیا؟"

"بندی نے اپنی جانب سے احتیاط کی تھی لیکن بی بی سرکار پریشان ہو گئیں۔ اُنھوں نے ہی یہ جوشاندہ تجویز کیا ہے۔ وہ تو طبیب کو بلانے کے لیے اصرار کر رہی تھیں۔ بندی نے اُن سے عرض کیا کہ جناب نے منع کیا ہے۔"

"ارے!" میں نے خجالت سے کہا "وہ کیوں تکلیف کرتی ہیں۔" میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اور کیا کہوں۔

"اُنھیں کوئی تکلیف نہیں ہو گی، بس جناب کا خیال ہے۔ اجازت ہو تو بندی اُن سے جا کے کہہ دے۔"

میں نے تذبذب سے کہا "بہرحال اگر اُن کی یہی مرضی ہے تو۔۔۔"

اس نے میری بات پوری بھی نہیں ہونے دی۔ اتنا سنتے ہی تیزی کے ساتھ کمرے سے اوجھل ہو گئی۔ میری رگوں میں خون منجمد ہونے لگا تھا۔ کچھ دیر تک تو میں کرسی پر گم سم بیٹھا رہا۔ ایک دم میری نظریں گھڑی پر گئیں۔ اُس وقت پونے بارہ بج رہے تھے۔ میں فوراً کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور سیدھا آمد و رفت کے عام دروازے کی طرف لپکا۔ وہ بند ہی تھا۔ پھر میں نے کمرے پر ایک نظر ڈالی۔ فرش پر میرے پیر بہک رہے تھے۔ مجھے اپنے آپ کو مجتمع کرنے کی بھی مہلت نہ ملی۔ اِدھر خادمہ نفیس گئی، اُدھر اُس کی آہٹ گونجی۔ گویا برجیس پہلے ہی اُدھر آ گئی تھی۔ اُسی لمحے میرا سارا جسم جھنجھنانے لگا تھا جب میں نے خادمہ کے پیچھے برجیس کا چہرہ دیکھا۔ وہ برجیس ہی تھی۔ جیسے بدلیوں سے اچانک چاند نکل آئے۔ عنابی رنگ کا جوڑا پہنے، اسی رنگ کے دوپٹے سے اُس کا سر ڈھکا ہوا تھا جس کی وجہ سے چہرے کا شہابی رنگ اور کھل اُٹھا تھا۔ وہ نپے تُلے قدموں سے اندر داخل ہوئی تھی۔ میں دزدیدہ نگاہوں سے اُسے تکتے دیکھتا رہا۔ اُس کی تسلیم کا جواب بھی میں نے جانے کس طرح دیا۔ "نفیس کی زبانی معلوم ہوا کہ آپ اِس وقت کچھ بہتر محسوس نہیں کر رہے ہیں۔" ایسا لگا جیسے کمرے میں اُس کی آواز کی کرچیاں بکھر گئی ہوں۔

"جی! مگر کوئی پریشانی کی بات نہیں تھی۔" میں نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں کہا۔ "آپ نے ناحق، آتی۔۔۔"

"نہیں نہیں، ہم جاگ ہی رہے تھے۔" وہ سبھاؤ لہجے میں بولی۔ "اب کیسے ہیں آپ؟"

میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "بس یوں ہی ذرا سر بھاری بھاری سا تھا۔"

"موسم بھی کچھ تبدیل ہو رہا ہے۔ آج خنکی نسبتاً زیادہ ہے۔" وہ چہکتی آواز میں بولی۔ "ہم تو سمجھ رہے تھے کہ آپ محفل سماع میں شامل ہوں گے۔"

"وہاں کچھ دیر ہی بیٹھا جا سکا۔"

"کیا اچھے قوال نہیں تھے؟"

"وہ تو اپنے فن میں یکتا تھے، بس جی نہیں لگا۔"

"اچھا ہوا، آپ اس طرف چلے آئے۔"

مجھے خیال نہیں رہا تھا، وہ ابھی تک کھڑی تھی۔ میں نے معذرت کرتے ہوئے اُس سے بیٹھنے کی درخواست کی۔ وہ تمکنت سے کہنے لگی کہ بس اب ہم چلیں گے۔ آپ کو آرام کرنا چاہیے، رات بہت ہو گئی ہے۔

"مگر کچھ دیر تو بیٹھیے۔ میں دن میں خاصا سو چکا ہوں۔ شام کو اِدھر آنے کا ارادہ تھا لیکن کھانے کے بعد ایسی نیند آئی کہ ہوش ہی نہیں رہا۔"

"ہم بھی یہی توقع کر رہے تھے کہ شاید آپ آ جائیں۔" اُس کی آواز اُمڈ رہی تھی۔ "خود ہم بھی شام کو آنے کی سوچ رہے تھے لیکن یہی اطلاع ملتی رہی کہ آپ آرام کر رہے ہیں۔"

"بیٹھیے نا!" میں نے التجائی لہجے میں کہا۔ اُس نے نگاہیں اُٹھا کے میری جانب دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں بجلیاں سی کوند رہی تھیں۔ اُس نے پھر انکار نہیں کیا، اپنا بدن سمیٹے سامنے کے صوفے پر بیٹھ گئی۔ چند ثانیوں تک میں خاموش رہا پھر میں نے تھمے ہوئے لہجے میں کہا "چھوٹی بیگم صاحب کیسی ہیں؟"

"اُنھیں بھی آپ کا انتظار تھا۔" وہ بے تابی سے بولی۔ "وہ عالم بھائی کی طرف گئی ہوئی ہیں ورنہ ہمارے ساتھ ضرور آتیں۔"

"چھوٹے نواب صاحب کا کیا حال ہے؟" میں نے بے ساختہ پوچھا۔ اُس کے چہرے پر ایک دھواں سا چھا گیا۔ مجھے فوراً اپنے سوال کی نامناسبی کا احساس ہو گیا تھا لیکن میں کیا کرتا، منہ سے نکلی ہوئی بات لوٹائی نہیں جا سکتی۔

"ہمیں اُن کی جانب سے اب ایسی فکر نہیں ہے۔" وہ ڈوبے لہجے میں بولی۔ "اس کے بعد سب کچھ خدا پر چھوڑ دینا بہتر ہو گا اور اُس نے اپنے کرم کے دروازے ہم پر کھول ہی دیے ہیں۔"

میں نے اس بابت پھر کچھ نہیں پوچھا۔ خادمہ نفیس دروازے کے پاس ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔ مجھے اُس سے بھی بیٹھ جانے کو کہنا چاہیے تھا لیکن برجیس کے خیال سے چُپ رہا۔ دوبارہ جب میری نظر اُس طرف گئی تو وہ کمرے میں نہیں تھی۔ اندرونی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ نیچے تو نہیں گئی ہو گی۔ یہیں کمرے سے ملحق ملازموں کے گوشے میں موجود ہو گی۔ میں اور برجیس کمرے میں اکیلے رہ گئے تھے۔ نفیس نہ جاتی تو اچھا تھا۔ اُس کے جاتے ہی میرا جسم سُن سا ہونے لگا اور میری زبان اینٹھنے لگی۔ اس سے کہنے کے لیے میں کوئی برمحل اور خوش اثر بات سوچ رہا تھا کہ اُس کی سُریلی آواز کمرے میں گونجی۔ "یہاں آپ کو کسی چیز کی شکایت تو نہیں ہے؟"

"کاہے کی شکایت؟" میں نے تعجب سے کہا اور مجھے ہنسی آ گئی۔ "کیا شکایت ہو سکتی ہے۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ اتنے تکلفات سے ہمیں کبھی سابقہ نہیں پڑا۔"

"تکلفات کہاں ہیں؟" وہ شائستگی سے بولی۔ "یقین کیجیے ہمیں ہر لحظے یہ احساس کھٹکتا ہے کہ ہم سے۔۔۔ ہم سے۔۔۔"

"کیا آپ سے کوئی کوتاہی تو نہیں ہو رہی ہے؟" میں نے اُس کی بات مکمل کر دی۔ "ہم سے پوچھیے تو اب ہمیں شرمندگی ہونے لگی ہے۔"

"نہیں، نہیں۔" وہ بے تابانہ بولی۔ "ایسا مت سوچیے۔ ہم سے تو کچھ بھی نہیں ہو رہا ہے۔ ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔"

"اِس سے زیادہ کیا ممکن ہے۔"

"یقیناً ہمارے پاس اِس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔"

"میں آپ سے التجا کرتا ہوں، اب اِسے نہ دُہرائیے۔" میں نے اُس کی منت کی۔ "ہمارے لیے یہی کیا کم ہے کہ اس بہانے اتنے اچھے لوگوں سے مل لیے اور اور کسی کے کام آ جانے کی خوشی کچھ کم ہوتی ہے کیا؟"

"یہ آپ کا حوصلہ ہے۔ ہم سے آپ کے سامنے سر نہیں اُٹھایا جاتا۔ اچھے ہونے کا ثبوت ہم نے پہلے بہت دے دیا ہے۔"

"دیکھیے پھر وہی!" میں نے شکایتی لہجے میں کہا۔ "آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ یہ تو کچھ بھی نہیں تھا۔ میں آپ کو کیا بتاؤں، زندگی ہم سے کیسا سلوک کرتی رہی ہے۔ میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ یہ ہمارے لیے کوئی نیا نہیں تھا بلکہ پہلے سے کچھ کم ہی تھا۔"

"یہ بھی خوب ستم ہے کہ آپ ہی کو یہ باور کرا رہے ہیں۔"

"میں آپ سے غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔" میں نے شکستہ آواز میں کہا۔ "اس مشقت اور آپ کے دیے ہوئے اُس عذاب کے بعد اگر ایسا ثمر ملتا ہے تو آدمی بہت سے عذابوں سے گزر سکتا ہے۔ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ عذاب، وہ گھر ہمارے لیے نیا نہیں تھا۔ یہ ثمر البتہ بالکل نیا ہے۔"

اُس کی آنکھیں جھلملانے لگیں۔ کپکپاتے ہونٹوں سے بولی "آپ بہت مہربان ہیں۔" پھر خود ہی کہنے لگی "آپ درست کہتے ہیں، ہمیں اس ذکر سے اجتناب ہی کرنا چاہیے۔"

"جی ہاں، بہتر یہی ہے۔" میں نے تیزی سے کہا "میں آپ کو بتاؤں کہ اگر بڑے نواب صاحب کی جگہ ہم ہوتے تو ہم بھی اِس صورت حال میں شاید یہی کچھ کرتے۔"

"شاید کبھی نہ کرتے۔" وہ مچلتی آواز میں بولی۔ "آپ پہلے بھی ہمیں یہ دلاسا دے چکے ہیں لیکن ہم جانتے ہیں، آپ ایسا کبھی نہ کرتے۔"

"بہرحال!" میں نے پہلو بدل کے کہا۔ "اور بھی بہت سی باتیں، بہت سے موضوعات ہیں۔ کیا یہ ضروری ہے کہ ہم جب بھی ملیں اِسی اندھیرے کو تازہ کریں۔"

"ہم بہت کوشش کرتے ہیں لیکن ہماری آنکھوں سے وہ رات اوجھل نہیں ہوتی جو ہم زنداں میں دیکھ کر آئے تھے۔"

"وہ رات اگر جہنم تھی تو یہ رات جنت بھی تو۔۔۔" الفاظ میرے حلق میں گڈمڈ ہو گئے اور ایک ثانیے کے لیے میرا سر گھوم کے رہ گیا۔ اُس کی چمکتی آنکھیں میرے سارے جسم کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ شرارے سے لپک رہے تھے۔ میں سمجھ نہیں پایا کہ یہ کون سی کیفیت ہے۔ سو میرا وجود اندر ہی اندر لرزتا رہا۔ اُس کے رخساروں پہ بجلی کی سی روشنی تھی اور ناک کے گوشے پھڑک رہے تھے۔ اُس کے نیم وا ہونٹوں میں جنبش ہوئی تو میرے دل کی دھڑکن بند ہونے لگی۔ "ہمارے لیے اس سے بڑی مسرت اور عزت کیا ہو سکتی ہے کہ آپ ایسا محسوس کرتے ہیں۔" اُس کی آواز دھڑک رہی تھی۔ "لیکن یہ کانٹا ہماری رگِ جاں میں شاید ہمیشہ پیوست رہے کہ وہ جہنم بھی تو ہماری طرف سے تھا۔"

میں نے ایک گہری سانس بھری۔ "وہ آپ کی طرف سے کب تھا؟"

میری آواز بھر بھرا رہی تھی۔ "دیکھیے، اب آپ اپنے دل سے یہ غبار نکال دیجیے۔"

وہ خاموش رہی۔ اس اثنا میں میں اپنے آپ سے نبرد آزما رہا۔ اس لمحاتی عرصے میں مجھے جیسے اپنی بکھری ہوئی توانائی سمیٹنے کی فرصت مل گئی تھی۔ میں نے شگفتگی سے کہا: "سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ کی کیا خاطر کی جائے۔ اس وقت تو میزبان میں ہوں۔"

اُس کا چہرہ پھول کی طرح کھل اُٹھا۔ "شکر ہے کہ آپ ایسا سمجھ رہے ہیں۔"

"کیا آپ اس وقت میری مہمان نہیں ہیں؟"

"گھر بن جائے۔" وہ چہکتی آواز میں بولی۔

"بظاہر تو یہی ہے مگر یہ بات شاید ایسا نہیں۔"

"کیوں؟ کیا آپ، آپ۔" وہ اضطراب سے بولی۔ "کیا آپ ہمارے بارے میں سوچ رہے تھے؟"

"کچھ یہی سمجھیے۔" میں نے آہستہ زبان سے کہا۔

"تو پھر آپ نے خادمہ سے کہہ کیوں نہیں دیا؟"

"بس کہتے کہتے رہ گیا۔" میں نے اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یاد ہے، آپ نے کیا وعدہ کیا تھا؟"

"کون سا وعدہ؟" میں نے تذبذب سے کہا۔

"کہ آپ کوئی تکلف نہیں کریں گے۔" وہ تمتماتی آواز میں بولی

ع "اے ذوقِ تکلف میں ہے تکلیف سراسر"

"مجھے یاد ہے مگر دیکھیے نا، وقت ہی کہاں ملا۔ شام ہی کو ممکن تھا اور شام سونے میں غارت ہوگئی۔ پھر رات کو کھانے پر بلا لیا گیا، وہاں سے واپسی میں دیر ہی اتنی ہوگئی تھی۔"

"اب آپ کا یہاں دل لگ رہا ہے نا؟" وہ سرسراتے لہجے میں بولی۔

"یہ جگہ تو ایسی ہے کہ یہاں ساری زندگی گزار دی جائے۔"

"اس سے بہتر بات کیا ہوگی۔" اُس کی آواز دمک رہی تھی۔

"آپ چاہیں تو ساری زندگی رہیے۔ یہ تو ہمارے لیے سب سے بڑی راحت ہوگی۔"

"میں نے طے کیا ہے کہ جلد ہی یہاں آؤں گا۔"

"ابھی جلد جانے کا ارادہ تو نہیں ہے؟"

"میرا ارادہ دوسروں سے مشروط ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ ہمیں جلد جانا چاہیے، پہلے ہی دیر ہوگئی ہے۔ کچھ ایسی ہی بات ہے، آپ کو کیا بتاؤں۔"

"ایسا ہے تو ہم اصرار نہیں کریں گے مگر جلد واپس آئیے گا، اور اپنا گھر سمجھ کے۔"

"لیکن ایک بات کا خیال رکھیے گا، تکلف سے میرا جی بہت گھبراتا ہے۔ میرا خیال ہے آپ کا جی بھی گھبراتا ہوگا۔ میں اسے اپنا گھر ہی سمجھ کے آؤں گا۔"

"ہم نے خود آپ سے یہ سبھی آداب و قواعد ترک کر دینے کی گزارش کی ہے اور ایک بات، ہم اور کہنا چاہتے ہیں۔" وہ بولتے بولتے ٹھہر گئی۔

"کیوں؟ آپ رک کیوں گئیں؟"

"ہم مناسب الفاظ ڈھونڈ رہے تھے۔" وہ بے کلی سے بولی۔ "ہم چاہتے ہیں، وہی جو کہتی آپ سے کہہ چکی ہیں کہ ان حوالوں سے الگ بھی کچھ ہے۔ ان سے الگ بھی آپ کی ذات ہے، ہماری ذات ہے، نہ جانے کیوں بار بار ہمیں اس صراحت کی خلش ستاتی ہے۔"

"آپ یہی کہنا چاہتی ہیں نا کہ اگر یہ سب اس طرح نہ پیش آتا تو بھی۔۔۔ تو بھی۔۔۔ لازم نہیں کہ لوگ ایک دوسرے کو ایسے حادثوں ہی کے سبب جانیں پہچانیں۔"

"ہاں ہاں، یہی کچھ۔"

"وہ بات جو آپ کے دل میں کھٹکتی ہے، میرے سینے میں بھی کبھی کبھی چبھتی ہے۔ کسی وبال یا جبر کا احساس آپ کے لیے شاید اتنا تکلیف دہ نہ ہو جتنا میرے لیے ہے مگر یقین کیجیے کہ میں کسی ایسے کرب سے دوچار نہیں ہوں۔ کوئی اچھا برا حادثہ آدمی کو آدمی کے قریب لے آنے کا جواز ضرور بنتا ہے لیکن یہ محض بہانہ ہے۔ آدمی آدمی کے متعلق تمام فیصلے ایک ہی مرحلے پر تو نہیں کر لیتا اور کبھی کر لیتا ہے تو اُس سے حادثے کے منفی اور مثبت پہلو کا آپس میں کوئی تعلق ضروری نہیں کیونکہ ایک ہی پیمانہ تو نہیں ہوتا۔" میں نے کسمساتے ہوئے کہا۔ "شاید میں وضاحت نہیں کر پا رہا ہوں۔"

"نہیں نہیں، ہم سمجھ رہے ہیں۔" وہ جھپکتی پلکوں سے بولی۔

"میری مراد ہے کہ کسی صراحت کی ضرورت نہیں۔ صراحت کے لیے کیا لفظ ہی ضروری ہیں۔ آپ میرے سامنے ہیں، میں آپ کے سامنے۔"

اُس کی آنکھوں میں یکایک آنسو منڈلانے لگے۔ "آپ نے ہماری مشکل حل کر دی۔" وہ گھٹی ہوئی آواز میں بولی۔ "ہماری ایک گزارش ہے۔ جس طرح آپ کی ذات کے سوا ہمارے لیے آپ کا کوئی حوالہ سند نہیں ہے، نہ ہمیں اسے جاننے کی جستجو ہے، اسی طرح ہماری بھی یہ التجا ہے کہ آپ ہمیں اس حویلی کی نسبت سے نہ جانیے۔ اب ہم اپنے لیے اس حویلی کا حوالہ معتبر نہیں سمجھتے۔ یہ ہمارے لیے کسی افتخار کا سبب

نہیں ہے۔ پہلے ہمیں اس نسبت پر ضرور فخر تھا لیکن یہ تب کی بات ہے جب ہم آپ سے نہیں ملے تھے۔ آپ ہی نے ہمیں یہ عزم دیا ہے۔ اب ہم اپنے اندر ایک عجب توانائی محسوس کرتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری بھی تو ایک حیثیت ہے۔ یہ حویلی ہمارے قد سے بڑی نہیں ہے۔ ہمارے جذبہ و احساس سے بڑا نہیں ہے۔ ہمیں اس کی عزت بہت عزیز ہے لیکن یہ ہماری قیمت پر نہیں، اُن اقدار کی قیمت پر نہیں جو ہم پر پہلی بار منکشف ہوئی ہیں۔" اُس کی آواز میں لکنت کے ساتھ ساتھ تند و تیز برہمی کی آمیزش بھی تھی۔ لوگوں نے غلط نہیں کہا ہے، اُس کے منہ سے پھول جھڑ رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے پھل جھڑیاں چھوٹ رہی ہوں۔ اُس کے گلابی چہرے میں سفید دانت جگ مگ جگ مگ کر رہے تھے۔ میں حیران نظروں سے اُسے دیکھتا رہا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ آزردگی سے بولی۔ "آپ چپ کیوں ہوگئے؟ کیا سوچ رہے ہیں، کیا ہم غلط کہہ رہے ہیں؟"

"نہیں۔" میں نے ہڑبڑا کے کہا۔ "سوچ رہا ہوں کہ کیا کہوں۔ کون سی بات جواب طلب ہے۔ سب کچھ تو آپ نے خود کہہ دیا ہے۔ کچھ یوں ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے منہ کی بات چھین رہے ہیں بلکہ ہم تینوں۔ مجھے چھوٹی بیگم صاحبہ بھی تو یہی کچھ کہہ رہی تھیں۔ شاید صورتِ حال کی نیرنگی اور نزاکت اس تکرار کا سبب ہے تاہم میں آپ سے ایک بات کہوں کہ جو حوالے عزت و مرتبت کا سبب ہوں، اُن سے دست برداری کیوں کی جائے۔ یہ حویلی بے شک آپ سے بڑی نہیں ہے لیکن یہ کوئی کم تر حوالہ بھی نہیں ہے۔ اچھی نسبتوں کو یوں مسترد نہیں کیا جانا چاہیے۔ رہی اقدار کی بات، تو آپ کے بقول اُن کے انکشاف سے تو اب ایک اور بہتر تناسب قائم ہو سکتا ہے۔ کیا حویلی ان اقدار سے منحرف ہے، ان کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ کیا حویلی کے حوالے سے ان اقدار کا خیال نہیں رکھا جا سکتا۔ آپ کوئی توانائی سی محسوس کرتی ہیں تو کیا حویلی کی نسبت سے اس میں کوئی فرق پڑنے کا امکان ہے۔ کوئی اچھا حوالہ ہو تو اُسے رد کیوں کیا جائے۔" نہیں معلوم میں نے یہ سب کس طرح کہہ دیا لیکن اچانک میری زبان بہکنے لگی اور میں نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔ "کہیں آپ کو میرے گمنام ہونے کا تو خیال نہیں کہ میرا کوئی حوالہ آپ کے سامنے نہیں ہے اور جو ہے وہ نہایت اذیت ناک ہے؟"

"بخدا ایسا نہیں ہے۔" وہ بے ساختہ بولی۔ "اور اگر، اور اگر بھی ہے تو کیا مناسب نہیں ہے۔ ہم اس طرح آپ کے تئیں کچھ اظہار ہی کرنا چاہتے ہیں۔"

"یقیناً۔" میں نے خجالت سے کہا۔ "بس یوں ہی یکایک ایک خیال آگیا اور میں نے آپ سے کہہ دیا۔ میرا مقصد کچھ اور نہیں تھا، اُسے درگزر کر دیجیے۔ نہ جانے میں کیا کہہ رہا تھا؟"

"آپ نسبتوں کے بارے میں کہہ رہے تھے۔" وہ اشتیاق سے بولی۔

"ہاں، میں کہہ رہا تھا کہ وقت، مقام، حادثے اور آدمی کا تناسب بھی کوئی چیز ہوتا ہے۔ کبھی کوئی ایسی کوشش، میری مراد ہے صورت وجود میں آجاتی ہے جس سے کوئی نسبت الگ نہیں کی جا سکتی۔"

"لیکن اصل تو فرد ہوتا ہے، باقی سب کچھ ضمنی ہے۔"

"بے شک اصل تو فرد ہے، اس سے برتر کچھ نہیں۔"

"ہم حویلی سے اپنی نسبت ترک کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ ہم تو دوسری بات کہہ رہے ہیں کہ حویلی کو اپنی ناموس سے زیادہ اپنے مکینوں کے جذبوں کا احترام کرنا چاہیے۔"

وہ یہی کہہ رہی تھی کہ خادمہ نفیس کمرے میں نمودار ہوئی۔ اُس کی آمد سے پہلے چاپیں کمرے میں آچکی تھیں۔ نفیس اپنے ہاتھوں میں خوان پوش سے ڈھکا ہوا طشت اٹھائے ہوئے تھی۔ "یہ کیا ہے؟" میں نے تردد سے پوچھا۔ "آپ کیا لے آئی ہیں؟"

"ہم آپ کے لیے لونگ کی چائے کہہ کے آئے تھے۔ نزلے میں مفید ہوتی ہے۔" نفیس کے بجائے برجیس نے جواب دیا۔ "یہ ہماری اتی جان کا نسخہ ہے۔ زعفران کے علاوہ وہ اس میں جانے کیا کیا آمیزش کرتی ہیں کہ مسکّن ہو جاتی ہے اور نیند میں حارج نہیں ہوتی۔"

"آپ نے انھیں اس وقت زحمت دی تھی؟"

"نہیں، یہ تو خادماؤں نے اُن کے نسخے پر بنائی ہوگی۔"

"آپ انھیں اتی جان ہی کہتی ہیں؟"

"ہمیں یہی اچھا لگتا ہے۔" وہ لجائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "خود وہ بھی اسے پسند کرتی ہیں۔"

"میں بھی اپنی ماں کو اتی کہا کرتا تھا۔"

"کہا کرتے تھے؟" وہ چونک کے بولی۔ "کیا وہ، وہ خدانخواستہ۔۔۔" وہ کہتے کہتے رُک گئی۔

"ہاں وہ چلی گئیں۔ اب تو زمانہ ہو گیا۔"

"ارے! ہمیں یہ سُن کے دکھ ہوا۔" وہ اداسی سے بولی۔ "کب اُن کا انتقال ہوا؟"

"کئی سال ہو گئے۔" میری آواز بھرّانے لگی۔ اُس نے پھر مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ میری آنکھوں کے سامنے اتی جان کا چہرہ گھومنے لگا اور بے اختیار آنسو اُمڈ آئے۔

"معلوم ہوتا ہے آپ کو اُن سے بہت محبت تھی۔" وہ دھیما اور

شفیق آواز میں بولی۔

"نہیں!" میں نے تندی سے کہا۔ "مجھے اُن کا کوئی خیال نہیں تھا۔"

"جی!" وہ پلکیں پٹ پٹانے لگی۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ مجھے اُن سے محبت ہوتی تو تو میں . . ."

میں نے اپنی آواز حلق میں گھونٹ لی۔ مجھے اُس سے یہ سب کچھ نہیں کہنا چاہیے تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی تجسس ظاہر کرتی، میں نے اُس سے کہا کہ کل صبح جب میں نیچے آؤں تو وہ مجھے اپنی امی جان سے ضرور ملائے۔ میں اُن کی خدمت میں سلام کے لیے حاضر ہونا چاہتا ہوں۔

"ضرور، ضرور۔" وہ شادمانی سے بولی۔ "وہ آپ کو دیکھ کے بہت خوش ہوں گی۔ ہم بتا نہیں سکتے کہ خانم آپا کے آنے سے وہ کس قدر پُرسکون ہو گئی ہیں۔"

خادمہ نفیس چائے رکھ کے واپس چلی گئی تھی۔ رجیں نے اپنے ہاتھ سے فنجانوں میں چائے انڈیلی اور اب کے مجھ سے شکر کے لیے نہیں پوچھا۔ وہ دُودھ کے بغیر نہایت خوش ذائقہ چائے تھی۔ میں نے ایک کے بجائے دو فنجان پیے۔ "اور اب جوشاندے کا کیا ہوگا؟" میں نے مسکراتے ہوئے اُسے ٹوکا۔

"ارے ہاں، ہم تو بھول ہی گئے۔" وہ پریشان سی ہو گئی اور معصومیت سے بولی۔ "اب تو ٹھنڈا بھی ہو گیا ہوگا۔ ویسے سوتے وقت ہی پینا مناسب ہوتا ہے۔ بہتر ہے ہم دوسرا پیالہ بھیج دیتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے اس چائے والے نسخے پر اکتفا کرنا چاہیے۔"

"آزمودہ ہے۔ انشا اللہ اسی سے افاقہ ہو جائے گا لیکن بہتر ہے کہ اُسے بھی پی لیجیے۔"

"آپ رہنے دیجیے۔ رات کو بے آرامی رہی تو کسی کو بلا کے کہہ دوں گا۔"

اُسے آئے ہوئے دیر ہو گئی تھی۔ میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ وہ چلی جائے۔ اُس کے چہرے سے بھی یہی ظاہر ہوتا تھا مگر رات بہت ہو گئی تھی۔ چائے پیتے ہی وہ اُٹھ گئی۔ "ہمیں اُمید ہے صبح تک آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"میں تو ابھی سے بہت بہتر محسوس کر رہا ہوں۔"

"ہم اور بیٹھتے لیکن اب ہمیں جانا چاہیے۔"

"مجھے بھی اس کا خیال ہے ورنہ میں آپ سے درخواست کرتا۔"

"ہم پھر آ جائیں گے۔ ہو سکا تو کل ہی۔ ویسے کل صبح تو آپ آئیں گے ہی؟"

"ہاں، ہاں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ کل اس طرف نہ آئیں۔"

"ہم ضرور آئیں گے، کل اسی وقت بلکہ کچھ پہلے۔"

"میں انتظار کروں گا۔"

"ہم بھی رات آنے کے منتظر رہیں گے۔" وہ سر جھکا کے آہستگی سے بولی۔ لرزتے ہونٹوں سے اُس نے شب بخیر کہا۔ اُس کے رخساروں پر شفق سی پھوٹ رہی تھی۔ جاتے ہوئے اُس نے ایک اچٹتی نگاہ سے مجھے دیکھا اور معاً اندرونی دروازے میں چھپ گئی۔

اُس کے جاتے ہی میں نے بستر پہ اپنا جسم پھیلا دیا تھا۔ میں نے دھڑکیوں کے پردے ہٹائے نہ روشنی گل کی۔ نہ آمد و رفت کے عام راستے کی چٹخنی گرائی اور نہ چپل اُتارے۔ میں یُوں ہی بے سُدھ سا بستر پہ لیٹا رہا۔ آدمی کی اپنی بھی ایک خوشبو ہوتی ہے۔ وہ کمرے میں اپنی خوشبو چھوڑ گئی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کرنی چاہیں لیکن نیند نہیں آئی۔ بار بار اُس کا چہرہ، اُس کا سراپا سامنے آتا تھا۔ شاید میں خود سونا نہیں چاہتا تھا کیونکہ نیند سے وہ سب کچھ معدوم ہو جانے کا خدشہ تھا جو اُس کے جانے کے بعد بھی موجود تھا۔ اُس کی آواز، اُس کی آہٹیں اور اُس کی خوشبو۔ بھینی بھینی، لطیف سی، عجیب سی جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ وہ خوشبو چھپا گئی تھی۔ نہ جوہی کی، نہ گلاب کی۔ وہ تو کچھ اور ہی تھی۔ وہ خوشبو میری سانسوں میں بسی ہوئی تھی۔ جب تک وہ بیٹھی رہی، میرا جسم بندھا ہوا سا، کھنچا ہوا سا رہا۔ میری نگاہ اُس پر جمتی ہی نہیں تھی۔ ایک نظر اُسے دیکھتا اور آنکھیں خیرہ ہونے لگتیں۔ وہ سامنے نہیں تھی تو اب جیسے میں اُسے اطمینان سے دیکھ سکتا تھا۔ یہ اتفاق کا خوب ہوا میرا یہاں آنا اور نفیس سے یوں ہی نزلے کی شکایت کر دینا۔ اگر میں نہ آتا اور نفیس سے یہ نہ کہتا تو وہ کہاں کم اِس وقت کبھی اوپر نہ آتی۔ یہیں تو میرا دل کہہ رہا تھا کہ مجھے اپنے کمرے میں جانا چاہیے۔ شاید وہاں کوئی میرا منتظر ہو۔ اچھا ہی ہوا جو میں قوالی چھوڑ کے اِدھر آ گیا۔ قوالی سے لاکھ درجے دلکش اُس کی بزم تھی۔ قوال تو گاتا ہے کوشش کر کے ہیں۔ ساز اور آواز کے ساتھ ساتھ کلام بھی پُر اثر ہونا ضروری ہے تب بھی بات بنتی ہے۔ اُس کی تو آواز ہی ساز ہے۔ سر بسر نغمہ۔ اُس کے لہجے میں ترنم کوٹ کوٹ کے بھرا ہے۔ صناعِ فطرت نے اُس کے سلسلے میں ہر اعتبار سے فیاضی برتی ہے۔ کرنیں سی اُس کے گلابی اشتہائی رنگ سے پھوٹتی تھیں۔ پھول توڑتے وقت آدمی کے ہاتھ نرم پڑ جاتے ہیں۔ پھول کیا، کسی بھی نازک چیز کے سامنے آدمی میں احتیاط خود بخود آ جاتی ہے کہ کہیں چھونے سے میلی نہ ہو جائے، اُس پہ شکن نہ آ جائے، کہیں وہ ٹوٹ نہ جائے۔ میں بستر پہ پڑا پڑا اُس کی ادا ادا، ایک ایک بات دہراتا

رہا کہ کہیں میں نے اُس سے کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں کہہ دی ہے جس سے اُس کی دل شکنی کا پہلو نکلتا ہو۔ اُس کے سامنے تو اونچی آواز میں بات بھی نہیں کی جا سکتی۔ میں نے اپنے طور پر پوری احتیاط کی تھی تاہم اب مجھے بہت سی باتوں کا خیال آ رہا تھا۔ میں اُس سے اور نرم اور سُبک لہجے میں بات کر سکتا تھا۔

کمرے میں سکوت چھایا ہوا تھا۔ اندرونی دروازے کے اُس طرف دالانوں کے گوشے میں خادمہ نفیس ضرور موجود ہوگی۔ میں اُسے بلا سکتا تھا۔ اس مرتبہ اُس کے سامنے زبان کھولتے ہوئے شاید مجھے اتنی دشواری نہ ہو۔ میرے جی میں ایک بار آئی تھی لیکن میں نے ارادہ ترک کر دیا۔ اس سناٹے میں بہت سکون چھپا ہوا تھا۔ گھڑی نے دو بجائے۔ پھر ڈھائی کا گھنٹہ بجا اور پھر تین کا۔ میں مسہری سے اُٹھ کے کھڑکی پر آ گیا۔ کھڑکی کے پردے اور پٹ کھولنے پر ٹھنڈی ہوا در آئی۔ باہر تا حدِ نظر فرش، ایوان اور جھروکے چاندنی میں نہائے ہوئے تھے اور جھینگروں، مینڈکوں کی صداؤں سے فضا گونج رہی تھی۔ کتنا عجیب ہے کہ یہ صدائیں رات کی خاموشی اور بڑھا دیتی ہیں۔ کوئی اور وقت ہوتا تو میں باہر نکل پڑتا۔ میرے باہر نکلتے ہی جگہ جگہ تعینات حویلی کے غلام خواہ مخواہ پریشان ہوتے۔ اس لیے میں وہیں کھڑکی سے لگا انگڑائیاں لیتا، ہاتھ پیر کھولتا اور تازہ تازہ ہوا سینے میں بھرتا رہا۔ میرا بند بند جیسے کھل رہا تھا۔ پھر کھڑکی سے ہٹ کے میں نے دو ایک روشنیاں گل کر دیں لیکن کمرے کی مدھم روشنی سے مجھے اُلجھن ہونے لگی تو میں نے سارے قمقمے دوبارہ روشن کر دیے اور کتابوں کے ورق پلٹنے لگا۔ کسی کتاب کا ایک پیرا بھی دھیان سے نہ پڑھ سکا۔ بیٹھک میں کرشنا جی کے گھر بھی ریڈیو موجود تھا۔ میں نے اُس کا بٹن گھما پھرا کے دیکھا تو ہر جگہ سے انگریزی اور غیر ملکی پروگرام آ رہے تھے۔ گڑگڑاہٹ بھی بہت تھی۔ میں نے ریڈیو بھی بند کر دیا۔ سکوت ہی زیادہ بھلا تھا۔ نیند اور بیداری کے درمیان جو کیفیت ہوتی ہے جس میں آدمی سوتا بھی ہے، جاگتا بھی ہے۔ نہ جاگتا ہے اور نہ سوتا ہے۔ میری بھی کچھ یہی حالت تھی۔ دل و دماغ پر غنودگی سی چھائی ہوئی تھی کہ مجھے اپنے ہوش و حواس کا بھی پورا یقین نہ تھا۔ دن میں میں نے کئی پان کھائے تھے۔ دانت مانجھ کے میں نے پھر آنکھیں موندنے کی کوشش کی اور پھر ابھی چار نہیں بجے پائے تھے کیونکہ میں نے چار بجنے کی آواز نہیں سنی تھی، جانے کس وقت مجھے نیند آ گئی۔

کمرے میں قمقموں کی تیز روشنی میں صبح کی روشنی بھی شامل ہو گئی تھی۔ میں نے ہڑبڑا کے آنکھیں کھول دیں۔ کالے تے بُری طرح مجھے جھنجھوڑ رہا تھا۔ اُس کے چہرے اور آواز پر وحشت چھائی ہوئی تھی۔ "لاڈلے! لاڈلے! اُٹھ جا۔ جلدی سے اُٹھ جا۔"

میں نے تُرش نگاہوں سے اُسے دیکھا۔ "کچھ دیر اور سونے دو کالے تے بھائی! رات کو بہت دیر سے آنکھ لگی تھی۔" میں نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔

"پر بھائی! اس ٹائم اُٹھ جانا ہی ٹھیک ہے۔"

"کیوں؟ کیا بات ہے؟" میں نے چونک کے پوچھا۔

"بس جلدی سے منہ ہاتھ دھو لے۔"

اُس کی آواز مجھے ٹھیک نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ "بتاؤ نا، کیا بات ہے؟" میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"پہلے منہ ہاتھ دھو لے، پھر نیچے کو چلنا ہے۔"

"نیچے کیا ہے؟ بتاتے کیوں نہیں؟"

"ضد مت کر لاڈلے! جو بولتا ہوں، پہلے وہ کر۔" کالے تے نے تلخی سے کہا۔ "ہر بات پر تو ایسا کیوں کرنے لگتا ہے؟"

"جب تک تم بتاؤ گے نہیں، مجھ سے کچھ نہیں ہوگا۔"

"تجھ کو بولنے ہی آیا ہوں۔"

میں نے جھپٹ کے اُس کے شانے پکڑ لیے۔ کالے تے کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور وہ مجھ سے نظریں چرا رہا تھا۔ "کالے تے بھائی!" میں نے لرزتی آواز میں اُس سے پوچھنا چاہا۔

"کیا بولوں لاڈلے!" وہ بھینچے ہوئے ہونٹوں سے بولا۔ "چھوٹا نواب چلا گیا۔"

"کیا؟ . . ."

"ہاں لاڈلے! وہ چلا گیا۔"

کالے تے نے جیسے میرے سینے میں خنجر اُتار دیا ہو۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھتا رہا۔

"ابھی نیچے اندر سے خبر آئی ہے۔" کالے تے جیسے بہت دُور سے بول رہا تھا۔ مجھے سکتہ سا ہو گیا۔ کالے تے میرے گلے سے لپٹ کے بلکنے لگا۔ "اپنے کو پتہ تھا لاڈلے، سُن کر تیرا بھی یہی حال ہوگا۔"

"نہیں نہیں کالے تے بھائی! یہ غلط ہے۔"

"تیرا بھائی بھی یہی جان رہا تھا پر اُدھر نیچے ساری حویلی میں کہرام پڑا ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ہو گیا لاڈلے! ہو گیا۔" کالے تے رو رہا تھا۔ "چل اُٹھ کھڑا ہو۔ نیچے بڑا نواب بیٹھا ہے۔"

میں فوراً بستر سے اُٹھ گیا لیکن مجھ سے اپنے قدموں پر کھڑا نہ ہوا جا سکا۔ میرا سارا جسم پتھر ہو گیا تھا۔ کالتے نے مجھے سنبھال لیا۔ مجھے بستر پر بٹھا کے لوٹا پانی، تولیا اور سلفچی لے آیا۔ میرے ہاتھ کام نہیں کر رہے تھے۔ کالتے بھیگی تولیا سے میرا منہ خشک کرنے لگا۔ میں اُسے ایک طرف ہٹا کے اندرونی دروازے کی جانب بھاگا۔ کالتے نے مجھے دالان کے پاس پکڑ لیا۔ "کدھر کو جا رہا ہے؟"

"تم ٹھیرو کالتے بھائی! میں ابھی آتا ہوں۔ میں نیچے نانا جان کے میں جا رہا ہوں۔" میں نے دروازہ عبور کر لیا اور نیچے آخری سیڑھیوں تک چلا گیا لیکن میرے قدم وہیں جم کے رہ گئے۔ لمحوں تک میں زینے میں بیٹھا ہانپتا رہا۔ اندر سے بھاگ دوڑ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ مجھے وہاں کوئی دیکھ لیتا، میں کمرے میں واپس آ گیا۔ کالتے دروازے کے پاس ہی کھڑا تھا۔ اُس کے کہنے پر میں نے منہ پر پانی کے دو چھپکے مارے تھے اور بالوں میں کنگھی بھی کر لی تھی۔ باہر صحن اور دالان ویران پڑے تھے۔ کالتے کا ہاتھ پکڑے پکڑے میں نے سیڑھیاں طے کیں۔ پیچھے چند قدم کے فاصلے پر نشست گاہ کے باہر بنے ہوئے چبوترے پر وہ سب موجود تھے۔ سب سے پہلے میری نگاہ بڑے نواب ہی پر پڑی تھی۔ میر علی، اباجان، تجمل اور پیرو اُس کے اردگرد دم بخود بیٹھے تھے۔ بڑا نواب سر جھکائے جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوبا نظر آتا تھا۔ ہماری آہٹ پر اُس نے ایک بار سر اُٹھا کے مجھے دیکھا۔ میرا جسم لرز کے رہ گیا۔ اُس نے ہاتھ اُٹھا کے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اُس کی آنکھیں بھاری بھاری تھیں اور اُن میں آنسوؤں کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا۔ شیروانی کے سارے بٹن بند تھے اور مانگ بھی سلیقے سے کڑھی ہوئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے ایسا لگا جیسے کالتے نے مجھ سے بہت بڑا مذاق کیا ہو، جیسے سب مجھے دھوکا دے رہے ہوں اور جیسے سب نے جان بوجھ کے مجھے ستانے کے لیے یہ خاموشی اختیار کی ہو یا جیسے یہ سب میرے دماغ کا خلل ہو۔ جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ کاش ایسا ہی ہوتا۔ بڑے نواب کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے لیکن اُس کا سارا وجود ریت کا ڈھیر معلوم ہوتا تھا۔ میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ میں نے تجمل کی طرف دیکھا، وہ بھی بُت کی طرح ساکت بیٹھا تھا۔ چبوترے کے باہر حویلی کے کام اِدھر اُدھر لپک رہے تھے۔ کالتے مجھے یہاں کیوں لے آیا تھا؟ مجھ سے ایک پل کے لیے بھی نہیں ٹھیرا جا رہا تھا۔ بار بار میری نگاہ بڑے نواب کی طرف اُٹھتی تھی۔ اُس کے جسم میں کوئی جنبش نہیں تھی۔ پلکیں بھی بے حرکت تھیں۔ میں وہاں سے اُٹھ جانا چاہتا تھا کہ میں چبوترے کے سامنے ایک موٹر آ کے رُکی اور نواب حشمت جنگ تیزی سے باہر نکلا۔ وہ تقریباً بھاگتا ہوا چبوترے پر چڑھا۔ بڑے نواب نے چونک کے اُس کی طرف دیکھا اور کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ ہم سب کھڑے ہو گئے تھے۔ نواب حشمت جنگ پر دیوانگی طاری تھی۔ ہماری جانب منتظرانہ نظروں سے دیکھتا ہوا بڑے نواب سے لپٹ گیا اور چیخیں مارنے لگا۔ "یہ کیا ہو گیا بھائی میاں! یہ کیا ہو گیا؟" بڑے نواب کے نتھنے پھولے ہوئے تھے اور ہونٹ کپکپا رہے تھے لیکن اُس کی زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہیں ہوا۔ نواب حشمت جنگ اُس کے شانوں سے سر رگڑنے اور چھتے پر سر مارنے لگا۔ اُسے اس حالت میں دیکھ کے میری سسکیاں نکل پڑیں۔ کالتے بھی رونے لگا۔ زورا نے کمر سے میرا کرتا پکڑ لیا تھا مگر وہ خود سسک رہا تھا۔ اباجان نے نواب حشمت جنگ کو بڑے نواب سے الگ کیا تو وہ اُن کے چیتے سے لپٹ گیا۔ اباجان اُسے تھپکیاں دیتے اور بُدبُداتے ہوئے جانے کیا کیا تلقین کرتے رہے۔ میر علی نے بھی اُسے کرسی پر بٹھانا چاہا لیکن وہ اُن سے اپنا بازو چھڑا کے اندر نشست گاہ کی طرف بھاگ پڑا۔ بڑا نواب وہیں بیٹھا رہا۔ ابھی حشمت جنگ کو آئے دیر نہیں ہوئی تھی کہ ایک دوسری موٹر آ کے رُکی، پھر تیسری، چوتھی۔ تجمل، پیرو اور میر علی بڑے نواب کے پاس سے ہٹ گئے۔ دیکھتے دیکھتے آنے والوں سے چبوترا بھر گیا تھا۔

وہاں سے اُٹھنا اب کوئی مشکل نہیں تھا۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی۔ میں چبوترے سے اُتر آیا۔ میں اُتر تو آیا تھا لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں، کہاں جاؤں، مجھے کیا کرنا چاہیے؟ بڑے دروازے سے لوگ مسلسل چبوترے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں حویلی کے عقب میں ایک طرف نکل گیا۔ تھوڑی دیر چلنے کے بعد میری سانس پھولنے لگی۔ میں قریبی پتھر کی ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ یہ باغ کا ایک حصہ تھا اور یہاں بہت سناٹا تھا۔ مجھے کسی ایسی ہی جگہ کی ضرورت تھی جہاں ذرا دیر ٹھیر کے خود کو یکسو کر سکوں اور سمجھ سکوں کہ یہ سب کیا ہے لیکن اچانک میرے جسم میں کوئی جھٹکا سا لگتا تھا اور میرا سر دھکنے لگتا تھا۔ مجھے یہاں آئے چند ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ یکلخت میں بنچ سے اُٹھ گیا اور میں نے چبوترے کی جانب واپس جانے کا ارادہ کیا۔ وہاں لوگ اکٹھے ہو رہے ہوں گے اور میں یہاں آ گیا ہوں۔ کسی نے مجھے یہاں دیکھ لیا تو کیا ہو گا اور اُس طرف کوئی مجھے ڈھونڈ رہا ہو۔ میں نے صرف ایک دو قدم طے کیے تھے کہ مجھے چکر سا آنے لگا اور میں دوبارہ بنچ پر ڈھیر ہو گیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں زمین میں دھنسا جا رہا ہوں۔ اندھیرے میں ڈوب رہا ہوں۔ جیسے سب کچھ ختم ہونے کو ہے۔ یہ باغ، یہ پھول، یہ پتے، سب آن کی آن میں ختم ہو جائیں گے۔

میری آنکھیں جیسے میری آنکھیں نہیں رہی تھیں۔ مجھے سب کچھ اجنبی اور مصنوعی لگ رہا تھا۔ پھولوں کے رنگ، پرندوں کی آوازیں، اپنا وجود، یہ سب ایک فریبِ نظر ہے۔ سب اکارت۔ ابھی کوئی آدمی چلے گا، آگ بھڑکے گی اور سارا کچھ اپنی اصل شکل میں آ جائے گا۔

کوئی اندازہ نہیں تھا کہ مجھے یہاں آئے کتنا وقت گزر چکا ہے اور زورا نہ آ جاتے تو شاید میرا جسم وہیں بیٹھے بیٹھے اکڑ جاتا۔ کالتے نے آتے ہی مجھے دبوچ لیا تھا۔ "کدھر چھپا بیٹھا ہے تو؟" وہ برہمی سے بولا۔ "سارے میں چھان مارا۔" میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مجھ میں جواب دینے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ زورا نے میرے ہاتھ پکڑ لیے اور اپنے سینے سے لگا کے بولا۔ "قسم سے راجا! اپن نے اس کو ایک دم نہیں دیکھا تھا پر ابھی اپن کو ایسا لگتا ہے کہ اپنا کوئی بھائی چلا گیا، اپنا ماں باپ مر گیا ہے۔" زورا رندھی ہوئی آواز میں بولا۔

"اُدھر لوگ باگ بہت آ گئے ہیں لاڈلے!" کالتے نے سرگوشی میں مجھے ٹوکا۔

"ہاں راجا! اور اُودھر استاد نے بولا ہے کہ ابھی تُرت اس کو ادھر لے کے آؤ۔ اس کو ادھر ہی ہونا چاہیے۔ ابھی کچھ دیر میں میت اُٹھنے والا ہے۔"

میں نے شدلاتی نگاہوں سے اُسے دیکھا۔ کالتے نے میری کمر میں ہاتھ ڈال کے ایک جھٹکے سے مجھے کھڑا کر دیا۔ اُن دونوں نے دونوں جانب سے میرے ہاتھ پکڑ رکھے تھے لیکن میں اپنے ہی پیروں سے واپس آیا۔ ہر طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور چبوترے کے پاس ایک اژدہام نظر آ رہا تھا۔ اُس طرف جانے کے بجائے کالتے اور زورا پیچھے ہی ایک سیڑھی پر چڑھ گئے اور راہداری سے ایک کمرے میں آ گئے۔ تجمل اور پیرو کے سوا وہاں کوئی نہیں تھا۔ دونوں آرام کرسیوں پر ایک دوسرے کے قریب خاموش بیٹھے تھے۔ میرے داخل ہوتے ہی تجمل نے بوجھل آواز میں مجھ سے پوچھا۔ "کدھر چلا گیا تھا رے؟"

"کہیں۔ میں کہیں نہیں تھا۔" میں نے منمناتے ہوئے کہا۔

"بیٹھ جا، برات اُٹھنے ہی والی ہے۔"

میرے سینے میں ایک ہوک سی اُٹھی۔ میں نے بے ساختہ اُس کی طرف دیکھا۔ تجمل کی آنکھوں میں خون بھرا ہوا تھا۔

"اور جانی! اندر جا کے کپڑے ذرا بدل لے۔" پیرو نے جھکے جھکے لہجے میں مجھ سے کہا۔ وہ بھی اُجلے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔

"یہی ٹھیک ہیں دادا!" میں نے آہستگی سے کہا۔

"بدل لے رے!" تجمل تنک کر بولا۔ "بابا نے اُدھر حویلی سے خاص کر منگوائے ہیں۔"

"دادا! ابھی تمھی اس کو بولو۔" زورا نے جھلتی آواز میں تجمل سے کہا۔ "ابھی کوئی کیا کر سکتا ہے؟"

تجمل ہنکارا بھر کے رہ گیا۔

"اپن کو یاد ہے۔" پیرو کہنے لگا۔ "اپن کا جانی بائی بھی ایک گانا گاتا تھا جس کا بول تھا کہ مرنے کا ایک دن لکھا ہے۔ اُس کا مطلب تھا کہ آدمی اپنا وقت لے کر آتا ہے۔"

"کدھر کو دادا؟" کالتے کے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ عود کر آئی۔ "ہر دن سالا موت کا دن ہے۔ کوئی بھی طے نہیں لگتا دادا! بس آگے کو ٹلتا، کھسکتا رہتا ہے۔ لکھا ہو اگر کسی کو سوجھتا نہیں تو سب برابر ہے۔"

پیرو سر ہلانے لگا۔ زورا نے میرے کپڑے لا کے سامنے رکھ دیے تھے اور کہنے لگا کہ میں یہ عجلت پہن لوں کیونکہ کسی وقت بھی جنازہ اُٹھنے کی اطلاع آ سکتی ہے۔ میں نے ضد نہیں کی۔ وہیں کمرے سے ملحق غسل خانہ بنا ہوا تھا۔ زورا میرا ہاتھ تھام کے مجھے وہاں لے آیا جیسے میں کوئی بچہ ہوں، جیسے میں اندھا ہو گیا ہوں۔ میں نے اندر جا کے لباس تبدیل کر لیا۔ وہ میرے ہی کپڑے تھے۔ کرتا، پاجامہ اور واسکٹ۔ میرے باہر نکلتے ہی وہ چاروں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میری آنکھیں جل رہی تھیں۔ تجمل نے دروازہ عبور کرتے ہوئے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ "سنبھل کے لیے" وہ جھنجھناتے لہجے میں مجھ سے کہنے لگا۔

چبوترا دور نہیں تھا۔ وہاں بڑی تعداد میں لوگ موجود تھے۔ سرگوشیوں، دھیمی دھیمی آوازوں اور سسکیوں کا ملا جلا شور گونج رہا تھا۔ بیچ میں جنازہ رکھا تھا۔ سب اُس کے اطراف گھومتے ہوئے چھوٹے نواب کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ کالتے نے مجھے بھی اس حلقے کی طرف دھکیلنا چاہا لیکن مجھ سے آگے نہ جایا جا سکا۔ مجھے چھوڑ کے وہ سب ہجوم میں شامل ہو گئے تھے۔ میں ایک ستون سے کمر لگائے وہیں پیچھے کھڑا رہا۔ اسی دوران خان صاحب میرے سامنے سے گزرے۔ اُن پر گریہ طاری تھا۔ کئی آدمی اُنھیں کھینچتے گھسیٹتے ہوئے ایک جانب لے گئے۔ جنازہ جس وقت اُٹھا، ایسا لگا جیسے ساری حویلی بین کر رہی ہو، در و دیوار بلک رہے ہوں۔ حویلی کے کتنے خادم خود کو نوچ کھسوٹ رہے تھے، پھوٹ پھوٹ کے رو رہے تھے۔ میں کسی تماشائی کی طرح نظارہ کرتا رہا۔ جب وہ آگے بڑھے تو میں بھی اُن کے ساتھ چلنے لگا۔ بڑے دروازے تک جانے والے راستے پر آدمی ہی آدمی نظر آ رہے تھے۔ بڑا دروازہ پورا کھلا ہوا تھا۔ وہاں سے گزر کے وہ حویلی کی فصیلوں کے باہر میدان میں آئے پھر سڑک پر آ گئے۔ آگے کسی جگہ کالتے اور زورا نے مجھے ڈھونڈ لیا۔ "تو نے دیکھا

لاڈلے!" کاتے سناتے لہجے میں بولا "لگتا تھا، کوئی سپنا دیکھ رہا ہے، کوئی بہت اچھا سپنا۔ سپنا دیکھتے دیکھتے جیسے کسی بات پر کھل اٹھا ہو۔ کیوں زورا؟"

"ہاں راجا! اپن نے بہت لوگوں کو کندھا دیا ہے پر ایسا کبھی نہیں دیکھا، منہ پھولوں کے ماتک کھلا ہوا تھا۔"

"پر وہ مرا ہوا ہی تھا نا؟" میں نے اُس سے پوچھا۔

"ہاں لاڈلے!" کاتے مرجھائے لہجے میں بولا "پر اپن کو یقین ہے، وہ بہت آرام سے گیا ہے۔ اُس کو ادھر دیکھے ہوئے اپنے کو دن ہی کتنے ہوئے تھے۔ جب میں ادھر اُستاد کے ساتھ آیا تھا اور بڑا نواب ہم کو اُسے دکھانے لے گیا تھا۔ لاڈلے! اُس وقت وہ مرا ہوا لگتا تھا، اب تو وہ زندہ معلوم ہوتا تھا۔ اُدھر جو دیکھتا تھا، یہی بولتا تھا۔ اُس کا تو رنگ ہی ایک دم بدلا ہوا تھا۔ مُندی ہوئی انکھیاں، جیسے آدمی جاگ رہا ہو اور جاگتے میں کچھ سوچ رہا ہو، کوئی بہت اچھی بات سوچ رہا ہو۔ ابھی قبر کے پاس شاید دوبارہ منہ دکھائیں تو خود دیکھ لینا۔"

قبرستان حویلی سے میل بھر کے فاصلے پر تھا۔ وسیع و عریض احاطے کے اندر صرف چند قبریں بنی ہوئی تھیں اور باغ کا سا منظر تھا۔ ایک طرف بنی ہوئی چھوٹی سی لال مسجد کے صحن میں پہلے سے کلامِ پاک کی تلاوت ہو رہی تھی۔ احاطے میں آ کے سب بکھر گئے تھے۔ طرح طرح کے لوگ وہاں موجود تھے۔ کہتے ہیں اتنا بڑا مجمع کسی خوش بخت کسی جنتی کی موت پر ہوتا ہے۔ دھوتی اور بند گلے کے کوٹ میں ملبوس سو ڈیڑھ سو آدمیوں کے سوا تقریباً سبھی شیروانیوں اور ترکی ٹوپی میں ملبوس تھے۔ ابا جان اور منیر علی بھی شیروانی پہنے ہوئے تھے۔ صرف ہم ہی چند سب سے مختلف نظر آ رہے ہوں گے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ لوگوں کی نظریں بار بار ہماری جانب اُٹھتی تھیں۔ نواب عالم صاحب کا گہوارہ مسجد کے صحن میں رکھ دیا گیا۔ بہت سے لوگ راستے بھر سسکتے رہے تھے۔ یہاں بھی اُن کا یہی حال تھا۔ میرا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ اس لیے میں مسجد سے کچھ دور ایک اونچی جگہ بیٹھ گیا تھا۔ کاتے کسی طرف نکل گیا تھا مگر تھوڑی ہی دیر میں لپکتا ہوا میرے پاس آیا اور سرگوشی کے انداز میں مجھ سے کہنے لگا۔

"لاڈلے! وہ پولیس افسر ادھر بھی موجود ہے۔"

"کون پولیس افسر؟" میں نے اُچھل کے پوچھا۔

"وہی جو اڈے پر اُستاد کے پاس آیا تھا۔" کاتے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا "وہی اکڑی بازو اپنے آپ کو بڑا تُنکاری بولتا تھا، بولتا تھا کہ اس رستم کے بچے کو ریاست میں خاص کر کے بلایا گیا ہے۔ وہی جو اُستاد سے الٹی سیدھی بانک رہا تھا اور اُستاد نے اُس کو آنکا دیکھا تھا کہ

کے ہاتھ ڈالنے کو بولا تھا۔ میں نے تجھ کو سارا بتایا تھا نا؟"

"ہاں، ہاں۔" میں نے تذبذب سے سر ہلایا۔

"وہ ادھر بھی ہے، وردی میں نہیں ہے۔ پتہ نہیں، اُس نے اُستاد کو ابھی دیکھا ہے کہ نہیں۔ میں تو ادھر سے کنّی کاٹ کے آ گیا ہوں۔" کاتے مضطرب آواز میں بولا۔

"تو کیا ہوا؟" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"کھوپڑی کا سیدھا نہیں ہے لاڈلے!" وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولا۔

"یہاں تو ایسے اور بھی لوگ ہوں گے۔ اڈے اور بازار کا کوئی آدمی یہاں نہیں ہو سکتا کیا؟ اور پولیس کا کوئی اور شخص؟ اتنے ان کے پر تم پرے میں تو نہیں بیٹھے رہے تھے۔"

"پر اس کی بات دوسری ہے۔" کاتے جز بز ہو کے بولا۔

"کیا کرے گا؟"

"خار سے کے گیا تھا لاڈلے! اُستاد کو ادھر دیکھ کے بھڑک سکتا ہے۔ مجھ پہ تو اُس نے ایسا دھیان نہیں دیا تھا پر اُستاد کا نقشہ بھی نہیں بھول سکتا۔ اچھی تو تکرار ہوئی تھی، کم کرٹ کہتا نہیں ہے۔ شتے یا کوئی بھی بات اٹک گئی تو ......"

"تو کیا ہو جائے گا؟" میں نے ترشی سے کہا۔

"خواہ مخواہ کا اڑنگا لگ سکتا ہے۔"

"اس سے زیادہ تو کچھ نہیں ہو سکتا کاتے بھائی!" میں نے چھوٹے نواب کی میت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں لاڈلے!" اُس کی آواز بجھ گئی۔

"یہ بات تو یہاں آنے سے پہلے سوچنی چاہیے تھی۔"

"میرے جی میں آیا تھا کہ اُستاد کو منع کر دوں۔"

"یہ کیسے ممکن تھا، گھر میں ٹھہرے ہوئے مہمان، گھر کے آدمی کے مرنے پر پیچھے بیٹھے آرام کرتے رہیں۔"

مجھے معلوم تھا کہ کاتے کے پاس کوئی جواب نہیں ہو گا۔ وہ چپ ہو گیا لیکن مطمئن نہیں تھا۔ میرے پاس سے اٹھ کے چلا گیا۔ صرف ایک پولیس افسر کا کیا ذکر، کاتے نے بے وردی لوگوں کے متعلق غور نہیں کیا۔ ان کی صبح سے حویلی میں قطار بندھی ہوئی تھی۔ ابا جان اور منیر علی تو مستقل بڑے نواب کے ارد گرد موجود رہے تھے اور انھیں رہنا بھی چاہیے تھا لیکن تعزیت داروں کے لیے بڑے نواب کے قریب ان اجنبیوں کی موجودگی تجسس کا باعث نہ رہی ہو گی کیا۔ نواب حشمت جنگ کے علاوہ بڑے نواب کے کتنے اعزا اور قرابت دار وہاں آئے ہوں گے اور یہاں موجود ہوں گے۔ ہمارے بارے میں اُن کے اشارے پر بڑے نواب سے نہیں

تو حویلی کے خادموں نے تو کچھ نہ کچھ ضرور بتایا ہو گا کہ یہی سبز قدم دو دن پہلے حویلی میں وارد ہوئے تھے۔ آدمی کی زبان سب سے بےقابو چیز ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں کسی کو کتنا احساس ہو سکتا ہے کہ کون سی بات مناسب ہے، کون سی نہیں۔ ابا جان، منیر علی، انجل اور پیرو بھی کیا یہ سب کچھ نہیں جان رہے ہوں گے۔

کاتے کو یہ اندیشے ڈسنے لگے تھے۔ سامنے مسجد کے صحن میں ایک کنارے چھوٹے نواب کی میت رکھی ہوئی تھی۔ کاتے نہیں جانتا تھا کہ جو نظر آتا ہے، وہی ایک مرنے والا نہیں ہوتا۔ مرنے والے کو ایک بار مر کے چین پڑ جاتا ہے لیکن اُس کے رونے والے بار بار مرتے ہیں اور انھیں کبھی چین نہیں ملتا۔ کاتے نے اتنا کہاں دیکھا اور سنا تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ ایک آدمی کے چلے جانے سے کہیں کتنا اندھیرا ہو جاتا ہے۔ میں اُس سے کیا کہتا کہ ذرا ایک لمحے کے لیے میری آنکھوں سے دیکھے، میرے کانوں سے سننے کی کوشش کرے۔ کیسی کیسی صدائیں، کیسے کیسے چہرے اُس کا سینہ جلاتے ہیں۔ اُن سوالی چہروں کے سامنے پولیس افسر کیا حیثیت رکھتا ہے۔

ظہر کی نماز کے فوراً بعد لوگ جنازے کی نماز کے لیے صفیں باندھنے لگے۔ میں وہیں بیٹھا رہا۔ صبح مجھے غسل کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی لیکن اور بھی بے شمار لوگ مسجد سے دور الگ کھڑے تھے۔ ان میں غیر مسلم بھی ہوں گے اور وہ بھی جو میری طرح نماز میں شریک نہیں ہو سکتے تھے۔ نماز ختم ہوتے ہی چھوٹے نواب کی سواری صحن سے اُٹھا کے سنگِ مرمر کے سائبان میں رکھ دی گئی تھی۔ ایک ہی موقع تو آتا ہے۔ زندگی بھر ایک ہی بار ایک ہی بار گھوڑا اَنہ ہاتھی، جب اتنے بہت سے آدمی کسی کی سواری اُٹھاتے ہیں۔ شاید دوبارہ رونمائی ہو رہی تھی جو سائبان کے اطراف ہجوم جمع ہو گیا تھا اور قبرستان کی فضا سسکیوں اور چیخوں سے گونجنے لگی تھی۔ ہر جانب لوگ سمٹ سمٹ کر اُس طرف بڑھ رہے تھے۔ مجھے بھی اُٹھنا چاہیے تھا ورنہ میں اکیلا سب کی نظروں میں آ جاتا۔ میرے دل میں بھی اُس کا چہرہ دیکھنے کی ہمک اُٹھی تھی مگر وہاں بہت بھیڑ تھی۔ میں سائبان کے قریب ایک درخت کے نیچے کھڑا لوگوں کے ہٹ جانے کا انتظار کر رہا تھا کہ منیر علی نے مجھے دیکھ لیا: "بابر میاں!" وہ گلوگیر آواز میں بولے۔ "دیکھا تم نے! بس یہی آدمی کا کُل ہے۔ ہر شخص کی زندگی اُس پر قرض ہے جو ایک دن اُسے چکانا لازم ہے۔" میں خاموشی سے سنتا رہا۔ مجھ سے پوچھنے لگے: "چہرہ دیکھا؟" میں نے انکار میں سر ہلایا تو بولے "دیکھو کیسا نور برس رہا ہے۔ خدا جانتا ہے کہ اس عاجز نے کبھی ایسا شگفتہ اور پُرسکون چہرہ نہیں دیکھا۔"

میری کمر تھپکتے ہوئے انھوں نے مجھے آگے کر دیا۔ میں لوگوں سے ٹکراتا ہوا جنازے کے قریب پہنچ چکا تھا لیکن یک بارگی مجھے بڑے نواب کا چہرہ نظر آ گیا۔ اُس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے بڑا نواب جھپٹ کر میرا گریبان پکڑے گا اور بھرے مجمع میں مجھے طمانچے مارنے لگے گا۔ اُس کی آنکھوں میں آگ بھڑک رہی تھی۔ میرا دل بُری طرح ہولنے لگا تھا۔ پیچھے آ کے ہی مجھے کچھ سکون ملا۔ پھر میں نے دوبارہ اُس طرف رُخ نہیں کیا۔ منیر علی بھی کہیں گم ہو گئے تھے۔ میں اور پیچھے چلا آیا۔

نیچے حویلی میں کچھ دیر ٹھہر کے منیر علی اور ابا جان کے سوا ہم چاروں بالائی منزل پر چلے آئے تھے۔ دوپہر کے کھانے کے لیے بڑے ہال میں انتظام کیا گیا تھا۔ بہت سے لوگ اس میں شریک تھے۔ نہایت سادہ کھانا تھا۔ کئی قطاروں میں فرشی نشست کا اہتمام تھا۔ موت کا کھانا مجھ سے ویسے بھی نہیں کھایا جاتا۔ ایک لقمہ بھی میرے حلق سے نہیں اُترا۔ میں نے منیر علی کو منع کیا تھا لیکن اُنھوں نے اصرار کیا کہ شریک ہونا ہی مناسب ہے چنانچہ میں بھی ایک قطار کے آخری سرے پر بیٹھ گیا تھا بلکہ ہم میں بھی کسی سے بھی کچھ نہیں کھایا گیا۔ سب دکھاوا کرتے رہے تھے اور اُوپر پہنچے اپنے کمروں میں جانے کے بجائے جُگل کے کمرے میں آ گئے تھے۔ کمرے میں گنجائش ہی گنجائش تھی۔ پیرو کا کمرہ بھی بازو ہی میں تھا۔ اندر سے ایک دروازہ دونوں کمرے ملا دیتا تھا لیکن پیرو جُگل کے ساتھ ہی بستر پر لیٹ گیا۔ ہم تینوں صوفوں اور آرام کرسیوں پر دراز ہو گئے۔ ہمیں آئے دس پندرہ منٹ ہوئے تھے کہ ایک خادم نے آ کے جُگل کے سامنے تازہ حقہ رکھ دیا اور چائے کے لیے پوچھا۔ جُگل نے انکار کر دیا۔ خادم کے اُٹھنے پر کانتے اور زورا کو بہت حیرت ہوئی۔ وہ مستقل اُس کی شکل دیکھتے رہے تاہم اُنھوں نے ایک دوسرے سے کوئی تبصرہ نہیں کیا اور کسی نے کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ کمرے میں سانسوں اور کروٹوں کی آہٹیں یا گھڑی کی ٹِک ٹِک اور گاہے گاہے جُگل کے حقے کی گڑگڑاہٹ گونجتی رہی۔ زورا کانتے سے قبرستان میں آنے والے اُن دو آدمیوں کے بارے میں تجسس ظاہر کیا تھا جو مسلح سپاہیوں کی نگرانی میں عین دفن کے وقت پہنچے تھے اور جن کی آمد پر باہر سے سیٹیوں کی گونج سنائی دی تھی۔ اُنھوں نے چھوٹے نواب کی قبر پر پھولوں کی چادر چڑھائی تھی اور اُن کے ساتھ آنے والے سپاہیوں نے سیلوٹ کیا تھا۔ کانتے مُنہ بنا کے رہ گیا تو زورا بھی چُپ ہو گیا۔ سب جیسے گونگے ہو گئے تھے۔ کسی کی بھی آنکھ ایک پل کے لیے نہیں لگی تھی۔ شام ہو جانے کا اندازہ بھی ایک خادم کی مداخلت پر ہوا۔ اس مرتبہ ہم سے پوچھے بغیر وہ چائے لانے کی اطلاع دینے آیا تھا۔ جُگل نے بھی پھر اُسے نہیں روکا۔ چائے کے ساتھ دیگر لوازم بھی تھے لیکن مُنہ ہاتھ دھو کے اور ایک ایک پیالی انڈیل کے ہم نیچے اُتر آئے۔

چبوترے کے باہر اب بھی موٹروں کی قطار لگی تھی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ بڑا نواب نشست گاہ میں موجود ہے۔ ابا جان اور منیر علی بھی وہیں ہیں۔ یہ سنتے ہی میرے پاؤں اٹکنے لگے۔ ایک ہی صورت تھی کہ میں اُن سے کچھ پیچھے ہو جاؤں۔ نشست گاہ میں جاتے وقت کسی کو خیال نہیں رہا کہ میں اُن کے ساتھ نہیں ہوں۔ دروازے تک جا کے میں آہستہ قدموں سے لوٹ آیا اور کوئی مجھے بلانے بھی نہیں آیا۔ کچھ ہی دُور جا کے مجھے احساس ہونے لگا کہ مجھ سے غلطی ہو گئی ہے۔ اُن سے الگ ہو کے میں اپنے آپ کو بہت اکیلا اور غیر محفوظ محسوس کر رہا تھا۔ میری کوئی حس کہہ رہی تھی کہ میرے گرد نشانے تنے ہوئے ہیں۔ راستے میں کئی خادم مجھ سے ٹکرائے۔ مجھے دیکھ کے گو اُنھوں نے نظریں نیچی کر لی تھیں اور سلام کرتے ہوئے گزر گئے تھے لیکن ہر قدم پر مجھے شبہ ہوتا تھا کہ وہ کسی جگہ بھی میرا راستہ روک سکتے ہیں۔ کچھ ہی آگے آ کے کوئی سمت طے کرنے کے لیے میں رُک گیا اور دیر تک ٹھٹکا کھڑا رہا۔ مجھے کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آ رہی تھی جہاں میں خود کو چھپا سکوں۔ اپنے کمرے ہی میں واپس جایا جا سکتا تھا لیکن وہاں جانے کے خیال سے میرا جسم اینٹھنے لگتا تھا پھر بھی اس طرح کب تک میں بیچ راستے میں کھڑا رہتا۔ میرے سر میں یہی سمایا کہ واپس ہو جاؤں اور نشست گاہ کے کسی کونے میں بیٹھ جاؤں لیکن اندر جاتے جاتے باہر چبوترے پر مجھے کرسیاں نظر آ گئی تھیں۔ وہاں میں اکیلا نہیں تھا۔ چند بوڑھے اور ادھیڑ لوگ بیٹھے چھوٹے نواب کی عادات و خصائل کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ میرے کان اُس وقت کھڑے ہوئے جب اُنھی میں سے کسی کی زبانی میں نے گیتی کا نام سُنا۔ کوئی سرگوشی میں گیتی کی حالت زار پر افسوس کا اظہار کر رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ اُس کی عمر یہ قیامت ٹوٹنے کی نہیں تھی۔ خدا اس پر رحم کرے۔ اُسے سُکھ کا وقت ہی کتنا ملا تھا۔ کسی نے کہا کہ حشمت جنگ سے زندگی میں ایک ہی غلطی ہوئی تھی لیکن وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔ وہ انکار کیسے کر دیتے۔ یہ تو گیتی کے نصیب کی بات تھی۔ اس کے رشتے تو دُور دُور سے آئے تھے۔ کاش وہ نصیب بھی اپنی صورت جیسا لاتی۔ اُن کی کانا پھوسیوں سے میرا دل اور ڈوبنے لگا تھا۔ میں نے طے کیا کہ منیر اور ابا جان سے کہہ کے آج ہی بلکہ ابھی یہاں سے چلا جاؤں گا۔ وہ میری طرف سے کوئی بھی عذر کر سکتے ہیں۔ ایک آدمی کے نہ ہونے سے کیا فرق پڑے گا لیکن یہ تو سبھی کا حال ہو گا۔ کیا وہ سب پتھر کے بنے ہوئے ہیں۔ میری کرسی کا رُخ عام دروازے کی طرف نہیں تھا۔ اس عرصے میں موٹروں کی تعداد کم ہو گئی تھی اور چبوترے پر بھی متعدد کرسیاں خالی ہو گئی تھیں۔ حویلی میں کل کی طرح اتنی ہی روشنیاں جل رہی تھیں لیکن روشنی اور رنگ کا تعلق تو بینائی سے بھی ہے۔

چبوترے پر صرف میں بیٹھا رہ گیا تھا۔ اتفاق سے نواب حشمت جنگ اُدھر سے گزرا۔ وہ کسی کو چھوڑ کے واپس جا رہا تھا۔ مجھ پر نظر پڑ گئی۔ وہ سیدھا میرے پاس آ گیا اور حیرانی سے بولا۔ ”ارے آپ

یہاں تنہا بیٹھے ہیں؟“

میں کھڑا ہو گیا۔ میں نے سٹپٹاتے ہوئے اُسے سلام کیا اور کہا، ”جی ہاں! ابھی یہیں بیٹھ گیا۔“

”آئیے، اندر آئیے۔ ہم تو آپ کو پوچھ ہی رہے تھے۔ ابھی ہمارے بھائی بھی آپ کے والد سے معلوم کر رہے تھے۔“ اُس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا تو میں کسی رد و قدح کے بغیر اُس کے ساتھ چل پڑا۔ نواب حشمت کی آواز کی شکستگی صاف نمایاں تھی۔ نشست گاہ میں داخل ہوتے وقت میری رگوں میں برف جمنے لگی۔ بڑا نواب کسی شخص کو رُخصت کرنے کے لیے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ وہی خون اُبھری اُس کی آنکھیں تھیں۔ اُبلی اُبلی شعلہ سی۔ میں دروازے کے قریب ہی بیٹھ جانا چاہتا تھا مگر بڑے نواب نے براہِ راست مجھ سے مخاطب ہو کے قریب آنے کو کہا۔ میرا سارا جسم سُن ہو گیا۔ نواب حشمت جنگ رُخصت ہونے والے شخص کی طرف متوجہ ہو گیا تھا لیکن بڑے نواب کی آنکھیں مجھی پر مرکوز تھیں۔ میں ڈگمگاتے پیروں سے اُس کے پاس پہنچا تو اُس نے میرے دونوں بازو تھام لیے اور بے اختیار مجھے گلے لگا لیا۔ مجھے جانے کیا ہوا، اُس کے سینے سے لگتے ہی میری آنکھیں کھولنے لگیں۔ میں نے خود کو روکنے کی کوشش کی لیکن میری سسکیاں نکل پڑیں۔ اُس نے مجھے اور زور سے بھینچ لیا۔ ”ہمیں اندازہ ہے، ہمیں اندازہ ہے کہ آپ . . .“ خود اُس کی آواز رندھنے لگی، جیسے کوئی سوتا اُبل گیا ہو۔ اُس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ اُس کے سینے سے لگ کے مجھے ایسا لگا جیسے اُس میں کوئی بھٹی سُلگ رہی ہو، جیسے اندر ایک سمندر متلاطم ہو۔ میری طرح اُن چند لمحوں میں شاید اُسے بھی یاد نہیں رہا تھا کہ وہ کون ہے، کہاں ہے، کس کے سامنے ہے۔ اُس کی گردن میرے شانے پر ڈھلک گئی تھی اور بازوؤں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ خود بہ خود میرے ہاتھوں میں سختی آ گئی۔ میں گر اُسے تھام نہ لیتا تو شاید وہ نڈھال ہو کے گر جاتا۔ نواب حشمت جنگ اور جُگل نے درمیان میں آ کے اُسے مجھ سے الگ کیا۔ حشمت جنگ نے مجھے تھاما، جُگل نے اُسے۔ بڑے نواب کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیل جاری تھا۔ ابا جان نے اُس کی کمر تھپکی تو جُگل نے اُنھیں روک دیا۔ ”بہہ جانے دو بابا! ان کا رُکنا ٹھیک نہیں ہوتا۔“

بہت دیر تک بڑا نواب جُگل کے بازوؤں میں سمٹا سسکتا بلکتا رہا، پھر نواب حشمت جنگ کی دخل اندازی پر اُسے کچھ ہوش آیا۔ خود نواب حشمت جنگ کے ہونٹ پھڑپھڑا رہے تھے۔ ”مشیت ایزدی میں کسی کو کیا دخل ہے۔“ منیر علی کہنے لگے۔ ”ہماری باری کی بات ہے۔ کسی کی پہلے، کسی کی بعد میں۔ ٹھہرنے والا یہاں کوئی نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ ہم مغفرت کی دُعا کریں۔“ منیر علی بھی کچھ بڑبڑاتے رہے۔ بڑا نواب گردن ڈالے بیٹھا رہا اور رومال سے آنسو خشک کرتا رہا۔ اچھا ہوا کہ اُس وقت خادم نے ایک شخص کے آنے کی اطلاع دی۔ نواب حشمت جنگ نے تُند نظروں سے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ساڑھے نو بج رہے تھے۔ آنے والا ریاست کا کوئی بڑا آدمی ہی ہو گا۔ وہ دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اُن کی پیروی میں ہم سب بھی۔ نو وارد آتے ہی دوپہر کو اپنی غیر حاضری کا عذر پیش کرنے لگا اور وہی سب دُہراتا رہا جو ایسے موقعوں پر کہا جاتا ہے۔ ایک ہی دلیل، ایک ہی انداز۔ معلوم نہیں تعزیت کرنے والے کیا کہنے کیا جتانے آتے ہیں۔ حکیم ڈاکٹر کی طرح موت کی وجہ پوچھتے ہیں جیسے ابھی کوئی مداوا کوئی تدارک باقی ہے۔ موت کے بعد پوچھنے کو کیا رہ جاتا ہے۔ تعزیت کرنے والے بار بار یہ احساس دلانے آتے ہیں کہ کوئی مر گیا ہے۔ وہ شخص بھی بڑے نواب کو چھیڑنے، اُسے تنگ کرنے آیا تھا۔ لوگ کہتے ہیں تعزیت کا مقصد دُکھ بٹانا ہوتا ہے۔ یہ باور کرانا کہ صرف تم ہی اکیلے نہیں مگر اس سے کیا حاصل؟ کیا دُکھ تقسیم ہو جاتا ہے۔ ہزار آدمی شامل ہو جائیں مگر ایک آدمی کے چلے جانے کی کمی تو پھر بھی رہتی ہے۔ آنے والا جلد ہی واپس چلا گیا اور خاں صاحب کے اشارے پر نواب حشمت جنگ نے بڑے نواب کو فوراً وہاں سے اُٹھا دیا۔ سب مختصر کھانے کے کمرے میں آ گئے جہاں ہمارے ساتھ آنے والے لوگوں کے علاوہ پہلے سے لوگ موجود تھے۔ دسترخوان پر سب رسمی طور پر بیٹھے تھے۔ ویسے بھی آدمی کو صرف خوشی کے لیے توانائی کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کھانے کے بعد بہت کم لوگ رہ گئے تھے۔ حویلی کے خاص ملازم، بڑے نواب کے چند اعزا، نواب حشمت جنگ، خاں صاحب اور ہم سب۔ بڑا نواب جیسے بھیڑ چھٹنے کا منتظر تھا۔ جھجکتے جھجکتے ابا جان مخاطب ہو کے بولے۔ ”اس وقت آپ سبھی یہاں موجود ہیں۔ ہم آپ سے ایک گزارش کرنا چاہتے ہیں۔“ اُن کی آواز پر نقاہت طاری تھی۔ ابا جان بھی جھجکنے لگے تھے۔ ابھی وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا کہ جُگل نے بھاری آواز میں کہا۔ ”ہم کو پتہ ہے نواب صاحب! آپ کو بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”ابھی ابھی ادھر ہی ہے۔“ پیرو نے تیزی سے کہا۔ ”آپ ایسا ہی بولنا چاہتے ہو نا؟“

”ہاں جی ہاں!“ وہ کھوئی ہوئی آواز میں بولا۔ ”ہم کہنا چاہتے ہیں کہ اُس کے جانے سے . . .“

”ہم کو معلوم ہے۔“ جُگل نے پھر بیچ میں دخل دیا۔ نواب حشمت جنگ نے بھی جُگل کی تائید کی کہ ابھی سب یہیں حویلی میں موجود ہیں۔ بڑے نواب کی وحشت زدہ نگاہیں ہم پر منڈلا

رہی تھیں۔ اُس کا مدعا کچھ اور بھی معلوم ہوتا تھا لیکن وہ چُپ ہوگیا۔ کاش آدمی کا دُکھ بیچنے کی صلاحیت آدمی میں ہوا کرتی۔ کاش آدمی کا بدل آدمی ہوا کرتا۔ آدمی کو آدمی کی عمر لگ جایا کرتی۔ میں اپنی ساری عمر چھوٹے نواب کو دے دیتا۔ میں اسی لیے بڑے نواب کے سامنے آنا نہیں چاہتا تھا۔ اُس کے چہرے سے جیسے دھواں اُٹھ رہا تھا۔

ہم لوگ جلد ہی اُٹھ گئے۔ وہ دن بھر لوگوں کے درمیان گھرا رہا اور بہت بڑا گرا نظر آرہا تھا۔ نواب حشمت جنگ اُسے اندر لے گیا، گو وہ ہمارے ساتھ ہی بیٹھا رہنا چاہتا تھا۔

اُس رات میں اپنے کمرے میں نہیں گیا۔ کاتتے کے ساتھ اُس کے کمرے میں چلا آیا۔ زورا بھی وہیں آگیا تھا۔ رات بھر میں صبح ہو جانے کا انتظار کرتا رہا اور علی الصباح تیار ہو کے کمرے سے نکل گیا لیکن بالائی منزل کے فوارے تک چکر کاٹ کے واپس آگیا۔ نیچے جانے والے راستے کی طرف بڑھتے ہوئے میری آنکھوں میں دُھند اُترنے لگتی تھی۔ نیچے بڑے نواب کے سامنے کچھ دیر بیٹھے رہنے کے سوا سارا دن میں کاتتے ہی کے کمرے میں پڑا رہا۔ دوسرے دن بھی حویلی میں لوگوں کا آنا جانا رہا۔ ایک رات اور گزر گئی۔ دن میں کتنی ہی بار میں نے ارادے باندھے کہ ایک بار اپنے کمرے میں جا کے دیکھنا تو چاہیے کہ خادمہ نفیس وہاں موجود ہے یا نہیں۔ جب اِدھر سارے ملازم حویلی کے کونوں میں موجود ہیں تو وہ بھی وہیں خادماؤں کے گوشے میں موجود ہوگی۔ نہ ہوگی تو میرے آنے کی اطلاع سُن کے آجائے گی۔ نیچے زنان خانے میں گیتی اور پریس کے سامنے جانے کے تصور سے میرے ہاتھ پیر ٹوٹنے لگتے ہیں تو کیا ہوا، میں نفیس کو بُلا کے کچھ کہہ سکتا ہوں مگر مجھے اُس سے کیا پوچھنا ہے، کیا کہنا ہے؟ تیسرے دن حویلی میں قرآن خوانی کا اہتمام تھا۔ اُس روز بڑے ہال میں اور باہر چبوترے پر تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ دوپہر کو کھانے پر بھی بہتیرے لوگ موجود تھے۔ اوپر بالائی منزل پر چلے جانے اور نیچے لوگوں کے درمیان آجانے کے سوا ہمیں کوئی کام نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ رات تخلیے کے وقت جب سب لوگ چلے جائیں گے تو ابا جان بالفعل زبان کھولنے کی کوشش کریں گے۔ رات گئے تک وہ بڑے نواب کے ساتھ رہے اور کچھ نہیں بولے لیکن اب وہ کسی وقت بھی وہ بات اُس کے سامنے کہہ سکتے تھے جو اُن کی زبان پر آ کے رہ جاتی ہوگی۔ پہلے کی بات اور تھی میری موجودگی میں حویلی کے در و دیوار انھیں سے گھٹتے ہوں گے۔ سوئم سے پہلے تو ویسے بھی کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا تھا لیکن سوئم کے بعد روانگی کی اجازت کے لیے انھیں بڑے نواب کو اشارہ کرنا ہی چاہیے۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، اپنی کوتاہی کا احساس میرے سینے پر بوجھ بنتا جا رہا تھا۔ میں خود بھی عذر تراشتا رہا، مہرواسے کی طرح زنان خانے میں بھی بڑا ہجوم ہوگا۔ پہلے کی بات اور تھی جب اُنھوں نے مجھے زنان خانے میں آنے کے لیے اطلاع و اجازت کی رسم سے مستثنیٰ قرار دیا تھا اور اس سے سوا بھی بہت کچھ کہا تھا۔ اب تو انھیں کسی طرف دیکھنے کا ہوش ہی کہاں ہوگا اور میں اُنھیں کیا تسلی دے سکوں گا۔ کیا مجھے اُن کے پاس جا کے وہی لفظ دُہرا دینے چاہئیں جو میں یہاں آنے والوں سے سُنتا رہا ہوں؟ وہ مجھ سے اتنی ہی توقع کرتی ہوں گی مگر میں اور کیا کر سکتا ہوں۔ میری کوئی بات اُن کے بوجھل کو ہوا دینے کا سبب بھی تو بن سکتی ہے۔ وہاں جا کے میری زبان ٹھٹھری رہی تو یہ اور بھی نامناسب ہوگا۔ اُنھوں نے کس کس طرح مجھ سے منت کی تھی کہ میں اسے اپنا ہی گھر سمجھوں۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ اُنھوں نے از رہِ وضع ہی نہیں کہہ دیا تھا۔ وہ لہجہ دوسرا ہوتا ہے۔ میں ایک لمحے اپنا عزم استوار کرتا تھا مگر دوسرے ہی لمحے وہ پگھلا ہوا ہوتا تھا اور جیسے کوئی میری جان کھینچنے لگتا تھا۔ میرے نہ جانے سے کوئی بدگمانی اُن کے دلوں میں نہ بیٹھ جائے۔ کبھی مجھے خیال آتا تھا کہ رسم بھی تو کوئی چیز ہے۔ کہیں وہ میرا انتظار نہ کر رہی ہوں۔ انھیں اس عالم میں میرا خیال تو آیا ہوگا۔ خانم تو اُن کے سامنے ہی تھی۔ اُسے دیکھ کے میں اُن کی نظر میں مزید گنہگار ہوتا ہوں گا۔ ممکن ہے، میرے دو ایک ہی لفظ اُن کے لیے سہارا ثابت ہوں۔ وقت کا کچھ اعتبار نہیں، پھر ملے نہ ملے۔ اگر میں یوں ہی چلا گیا تو شاید پھر کبھی اس کی تلافی نہ ہو سکے۔ جانے پھر کب یہاں آنا ہو، آنا ہو بھی یا نہیں۔ کون انھیں جا کے بتائے کہ میں اُن کے سامنے نہیں گیا ہوں لیکن وہ مسلسل میرے سامنے رہی ہیں۔ میں اُن کے لیے آرزو ہی کرتا رہا ہوں۔ آرزو بھی تو دعاؤں کا درجہ رکھتی ہے۔ خدا انھیں صبر دے۔ وہ خود بہت ہوش مند ہیں، بہت تحمل ہے اُن میں۔ سمجھتی ہوں گی کہ کوئی احساس میرے قدم روک لیتا ہے۔ میرے پاس اُنھیں قائل کرنے کے لیے کوئی دلیل نہ ہوگی۔

وہی ہوا، چوتھے دن سویرے ناشتے کے وقت بڑا نواب کسی قدر نکھرا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ابا جان نے اشارۃً اُس سے ذکر کیا۔ اُنھوں نے ہر ممکن احتیاط کی تھی لیکن بڑے نواب کا چہرہ بھاری ہو گیا۔ اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سوچتا رہا، پھر بولا: "ہم کیا کہیں، ہم خود کو بہت بے جواز محسوس کرتے ہیں۔"

"نہیں، نہیں۔" ابا جان نے بے تابی سے کہا۔ "آپ کیا فرما رہے ہیں۔ آپ کے پاس تمام جواز ہیں، آپ خود سب سے بڑا جواز ہیں۔"

"ہم، ہم بہت اکیلے ہو جائیں گے۔" وہ پژمردگی سے بولا۔

"بخدا! ایسے عالم میں یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا لیکن عرض کریں۔ جانا بھی ضروری ہے لیکن ہم جلد ہی واپس آئیں گے۔"

"ہمیں احساس ہے، ہم نے پہلے ہی آپ کا راستہ کم کھوٹا نہیں کیا ہے۔"

"نہیں نواب صاحب! ابھی ایسا مت بولو۔" پیرو نے مضطربانہ کہا۔ "اپن نے اِدھر آ کے بہت کچھ پایا ہے پر اپن کو دُکھ ہے کہ اپن..." پیرو کی آواز بھرا گئی۔

نواب نے ڈوبی ہوئی آنکھوں سے اُسے دیکھا اور ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گیا۔

"خدا آپ کو حوصلہ دے۔" میر علی لجاجت سے بولے۔ "ہماری یہی دُعا ہے۔ یقین کیجیے ہمارا دل یہیں اٹکا رہے گا۔"

"ہم بھی آپ سے یہی کہنا چاہتے تھے کہ اُس کے جانے کے بعد ہمیں آپ کی ضرورت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ کاش آپ کچھ دن اور قیام کرتے۔"

"ہم نے عرض کیا کہ ہم جلد واپس آنے کی کوشش کریں گے، یوں بھی کسی دن تو جانا ہی ہے نواب صاحب!"

"ضروری نہیں ہے، یہ حویلی بھی تو آپ کا گھر ہے۔"

"یہ آپ کی کرم گستری ہے۔ بے شک یہ ہمارا ہی گھر ہے۔ ہم یہی سمجھ کے یہاں آتے رہیں گے۔"

"اُس کے جانے سے یہ مراد نہیں ہے کہ ہماری سزا ختم ہو گئی ہے یا آپ کے سلوک و نوازش کا وزن کم ہو گیا ہے۔ وہ کبھی اتنے سکون سے نہ جاتا۔ ہم آپ سے سچ عرض کریں کہ اُسے دیکھ کے ہمیں ایک اطمینان بھی نصیب ہوا تھا کہ وہ اپنی مراد پا کے گیا ہے۔ اِس کے بعد اُس کے لیے کیا رہ گیا تھا۔" بڑے نواب کی آواز حلق میں پھنس گئی۔

کمرے میں سکوت چھایا ہوا تھا۔ کسی نے کچھ نہ کہا تو بڑا نواب پھر بھرائے لہجے میں بولا: "آپ کو معلوم ہے، اُس نے خانم کے زانوؤں پر آنکھیں بند کی ہیں۔ یقیناً اُسے اندیشہ تھا کہ کہیں یہ سحر ٹوٹ نہ جائے، کہیں یہ حقیقت پھر کسی عذاب سے دوچار نہ ہو جائے۔ اُس نے بے شمار شب و روز انتظار کی جاں کنی میں گزارے تھے، اب اُس میں مزید سکت نہیں تھی۔ کب سے وہ اپنے آپ پر بوجھ بنا ہوا تھا۔ اُسے جیسے ہی یقین آیا کہ اُس کی آنکھیں دھوکا نہیں کھا رہی ہیں، اُس کی منزل آسان ہو گئی۔" بڑے نواب کی آواز کپکپا رہی تھی، کہنے لگا: "ہم نے کچھ اور نہیں تو اُس کی موت آسان کر دی تھی۔"

"بس کرو جانی میاں!" نواب حشمت جنگ عاجزی سے بولا۔ "کوئی نہ کوئی بہانہ ہی بنتا ہے۔ آدمی نہ اپنے وقت سے پہلے جاتا ہے، نہ بعد میں۔" پھر ابا جان سے مخاطب ہو کے بولا: "قبلہ عالم! کیسا یہ مناسب نہ ہوگا کہ آپ دو ایک دن اور قیام فرمائیں؟"

"ضرور، ضرور۔" ابا جان نے تیزی سے کہا۔ "یوں بھی ہم یہاں سے جاتے ہی روانہ نہیں ہو جائیں گے، اُدھر شہر میں بھی کچھ دیکھنا بھالنا ہے۔ دو ایک دن، عجب نہیں شہر میں ہی رہیں، یہاں آمد و رفت رہے گی۔"

"ہماری گزارش ہے کہ آپ کل تک ضرور ٹھہریں۔" نواب حشمت جنگ شائستگی سے بولا۔ "کل صبح ختم شریف ہو رہا ہے۔ اتفاق سے کل ہی آنجہانی عالم تاب کی سالگرہ کا دن بھی ہے۔"

گھر گر اور نظام آباد کے شہروں کے چند لوگ بڑے نواب سے ملنے آ گئے تھے اس لیے موضوع بدل گیا۔ میں فوراً وہاں سے اُٹھ گیا۔ صرف ایک دن باقی رہ گیا تھا۔ یہ ایک دن بھی یوں ہی گزر جائے گا۔ مجھے اپنے کمرے میں جا کے خادمہ نفیس کو ٹٹول کے دیکھنا چاہیے۔ اسی طرح زنان خانے اور اُن کے حال کے بارے میں کوئی صحیح اندازہ ہو سکے گا مگر وہ جو کچھ بتائے گی، کیا میں نہیں جانتا ہوں۔ اُس کی کوئی ایسی ویسی بات میرا رہا سہا ارادہ بھی نہ چھین لے۔ اس طرح مجھے اُن کے پاس نہ جانے کا ایک اور عذر مل جائے گا۔ اچانک مجھے خیال آیا، کیوں نہ خانم سے ملنے کے لیے زنان خانے کا رُخ کروں۔ یہ عذر نسبتاً معقول ہے۔ جب سے وہ آئی ہے، میں اُس سے ملا بھی نہیں ہوں۔ وہیں کوئی صورت نکل آئے گی۔ پھر میں نے یہ خیال بھی مسترد کر دیا۔ خانم کا حال بھی اُن سے کچھ مختلف نہ ہوگا۔ کچھ دیر میں انھیں علم ہو جائے گا کہ ہم لوگ کب یہاں سے جا رہے ہیں۔ گیتی کو شاید ہوش نہ ہو۔ ممکن ہے، پریس خود مجھ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرے اور اس کے لیے ایک خادمہ نفیس ہی لازم نہیں ہے۔

میرے قدم خود بخود مجھے بالائی منزل کی طرف لے گئے۔ اپنے کمرے میں داخل ہو کے مجھے احساس ہوا کہ کہاں آ گیا ہوں۔ کمرے میں

آنکے میرا دل دھڑ دھڑانے لگا۔ ہر چیز سلیقے سے رکھی تھی،
کسی جگہ گرد کی ذرا سی بھی تہہ نہیں تھی، نہ بستر پر کوئی
شکن۔ میں نے ٹھنڈے پانی کی بوتل دیکھی، اُس میں ٹھنڈا پانی موجود
تھا۔ دوسری بوتل میں گرم چائے بھری ہوئی تھی۔ خاص دان میں گلوریاں
بھی تازہ تھیں۔ ابھی نہیں تو کچھ دیر پہلے ہی یہاں سے کوئی گیا تھا۔ گویا
نفیس ابھی تک ملازموں کے گوشے میں تعینات ہے۔ میرے ہاتھ اُسے
بلانے کی ڈوری کھینچنے کے لیے بڑھتے بڑھتے رہ گئے۔ پہلے مجھے اپنے دماغ
درست کر لینے چاہئیں۔ میں یہاں آ گیا ہوں تو کسی وقت بھی اُسے بلا سکتا
ہوں۔ پہلے مجھے اچھی طرح سوچ لینا چاہیے کہ اُس سے کیا کہنا ہے۔ کیا
پوچھنا ہے۔ کیا میں اُس سے صرف پریمیس سے ملنے کی خواہش کا اظہار کروں۔
کیوں نہ میں پریمیس کو ایک رقعہ ہی لکھ دوں۔ یہ طریقہ سب سے مناسب رہے
گا۔ میں جو کچھ اُس کے سامنے نہیں کہہ سکوں گا، وہ خط میں لکھ سکتا ہوں۔
میں اُسے لکھوں گا کہ اُس کی ایک ایک بات میرے دل پر نقش ہے۔
اسی اعتماد میں یہ عریضہ لکھنے کی بھی جسارت کر رہا ہوں اور سر دست
اُس سے تخاطب کے لیے اس سے بہتر کوئی صورت سمجھ میں نہیں
آ رہی ہے۔ مجھے شبہ ہوا کہیں یہ سب کچھ میرے ذہن سے نکل نہ جائے۔ میں
نے پنسل اور کاغذ تلاش کیا۔ مسہری کے ساتھ رکھی ہوئی میز کی دراز
میں دوات قلم موجود تھا۔ میرے دماغ میں جو بھی اُس وقت آتا گیا، میں
نے کاغذ پر اُتارنا شروع کر دیا۔ میں نے لکھا، مجھے اندازہ ہے کہ آپ کس قلبی و
ذہنی کیفیت سے دوچار ہوں گی۔ میں آپ کو کیا بتاؤں۔ میں سوچتا رہا
کہ اس عالم میں میرا جانا مناسب بھی ہے یا نہیں۔ پھر مجھے اس مناسبت
نامناسبت کا خیال آڑے آتا رہا اور یہ بھی کہ کہیں میری آمد آپ کے دکھ
اور نہ بڑھا دے، آپ کو اور نہ منتشر کر دے۔ زنان خانے میں عزادار
خواتین کے ہجوم نے بھی مجھے روکے رکھا اور میں یہ بھی سوچتا رہا کہ
وہاں جا کے کروں گا کیا۔ اگر محض بر بنائے رسم میرا جانا ضروری ہے تو بہتر
ہے کہ نہ جاؤں۔ کبھی کبھی یہ رسم و وضع بھی بہت اذیت پہنچاتی ہے۔
کم از کم آپ مجھ سے اس کی توقع نہ کرتی ہوں گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ
کو بھی میری کیفیت کا بخوبی احساس ہوگا اور مجھے ایسی وضاحت کرنے
کی ضرورت نہیں ہے۔

میں نے قلم روک دیا کہ الجھاؤ کے بجائے مجھے سیدھے سادے
لفظوں میں لکھنا چاہیے۔ سو چند لمحے توقف کے بعد میں نے لکھا، ہم
کل کسی وقت یہاں سے چلے جائیں گے۔ میں دوسرے لوگوں کے ساتھ
نہ ہوتا تو یقیناً رک جاتا لیکن جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا تھا میرا جانا بھی
اتنا ہی ضروری ہے۔ مجھے ہر دم یہاں کا خیال رہے گا۔ اُمید ہے کہ مجھے
وہاں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ بہرحال میری کوشش یہی ہوگی کہ جلد از جلد واپس
آ جاؤں۔ اُس وقت تک حویلی میں آنے والوں کی بھیڑ بھی ختم ہو جائے گی
اور اس عرصے میں آپ کو بھی کچھ استقامت ضرور نصیب ہوگی۔ خدا آپ
کو صبر و سکون دے۔ آپ کا اور چھوٹی بیگم کا خیال آتا ہے تو دل بہت
گھبراتا ہے۔ دکھ میں آدمی خود کو بہت تنہا اور کمزور محسوس کرتا ہے۔ شاید
یہی احساس مٹانے کے لیے لوگ اُس کے گرد اکٹھے ہو جاتے ہیں مگر وقت
تو اپنی گردش ضرور پوری کرتا ہے۔ کاش آدمی کے بس میں اس سے سوا
ہوا کرتا۔ میں آپ کے لیے دعا کرتا رہوں گا۔ میری طرف سے چھوٹی بیگم صاحبہ
کو بہت بہت پوچھ لیجیے گا۔ اُس وقت تو آپ نے سب کچھ کہا تھا، میں
سُنتا رہا تھا۔ اب میری درخواست ہے کہ آپ میرا انتظار ضرور کیجیے گا۔

میری انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ اتنا لکھ کے میں نے سانس لینے
کے لیے قلم روک دیا اور لکھے ہوئے کاغذ پر ایک نظر ڈالی۔ وہ مجھے اپنا خط
ہی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ ایک لفظ ادھر، ایک اُدھر۔ میں نے بہت جلدی
جلدی لکھا تھا۔ قلم دماغ کا ساتھ ہی نہیں دے رہا تھا۔ دماغ میں ایک
ساتھ اتنی بہت سی باتیں آ رہی تھیں کہ قلم تک پہنچتے پہنچتے گم ہو جاتی تھیں۔
میں نے شروع سے آخر تک اسے دوبارہ پڑھا۔ مجھے سب بکھرا بکھرا،
بے ربط معلوم ہوتا تھا۔ اس طرح کا خط میں نے پہلے کبھی کسی کو نہیں لکھا تھا۔
میں دیر تک لفظ اور جملے بدلتا رہا۔ بعد میں میں نے اُسے پڑھا تو وہ
کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ اُڑا، اُڑا، بے ہنگم۔ میں جو کہنا چاہتا تھا، وہ لکھ ہی
نہیں سکا تھا۔ شاید میں لکھنا ہی بھول گیا ہوں۔ جیل سے آنے کے بعد مجھے
لکھنے پڑھنے کی مہلت ہی کتنی ملی ہے۔ اتنے طول طویل متن کے بجائے
مجھے چند سطری تحریر پر اکتفا کرنا چاہیے۔ میں نے وہ کاغذ پھاڑ دیا اور دوبارہ
لکھنے کا ارادہ کیا۔ میرا قلم اٹک رہا تھا تاہم میں نے لکھا کہ کتنی ہی بار آنے
کا ارادہ کیا مگر نہ آ سکا۔ اب میں جا رہا ہوں۔ مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔ کم از کم
ایک بار یہاں ضرور آؤں گا اور جلد ہی۔ اس یقین کے ساتھ کہ آپ میری
منتظر ہوں گی۔

اختصار ہی مناسب ہے۔ میں نے تحریر صاف کرنے کے لیے نیا ورق
لیا اور ابھی ایک لفظ بھی نہ لکھ پایا تھا کہ لقب کا خیال آیا۔ مجھے کس ذکی
لقب سے تو اُسے مخاطب کرنا ہے۔ کوئی موزوں لقب ہی سمجھ میں نہیں آ رہا
تھا۔ زیادہ ادب و احترام سے تخاطب اُسے گراں گزر سکتا ہے۔ صرف
اُس کا نام لکھنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے کچھ لکھنے کے بجائے صرف
تسلیم لکھ دیا۔ میں نے ایک ایک لفظ ٹھہر ٹھہر کے لکھا تھا کیونکہ میری
انگلیاں تھرتھری جا رہی تھیں۔ آخر میں، میں نے اپنا نام بھی نہیں لکھا۔ خط
لکھنے کے بعد مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا، کوئی انہونی سی بات۔ اس
خیال سے کہ کہیں میں نے کوئی نازیبا بات تو نہیں لکھ دی ہے، میں نے
اپنی تحریر متعدد بار پڑھی۔ ہر بار اپنی تحریر مجھے پہلے سے زیادہ اکھڑی
بھدی اور بے جان نظر آتی تھی۔ اس کے مقابلے میں تو پہلے والا خط زیادہ
مؤثر تھا۔ اتنا زیادہ اختصار بھی اچھا نہیں ہوتا۔ یہ محض رسمی سی تحریر
ہے۔ اُس میں کچھ محسوس تو ہو رہا تھا اور ایک اور بات میرے سینے میں
کھٹکنے لگی تھی کہ اس مراسلت میں آداب سے متجاوز ہونے کا کوئی پہلو تو نہیں
نکلتا ہے۔ میں نے رقعہ چاک کر دیا اور میرے جی میں آئی کہ ساتھ ہی
اپنا گریبان بھی چاک کر لوں۔ کمرے کی ساری چیزیں توڑ پھوڑ ڈالوں۔
مجھے اپنے آپ سے بہت چڑ ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ کمرے میں میری
موجودگی کی سن گن خادمہ نفیس کو مل جائے اور وہ میری اس ابتری کے
دوران اندر داخل ہو، مجھے باہر نکل جانا چاہیے۔ ابھی کچھ وقت ہے، کسی
اور تدبیر کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔

صبح سے شام ہو گئی اور شام سے رات۔ ایک ہی رات درمیان
میں باقی تھی۔ میں اُس رات بھی اپنے کمرے میں نہیں گیا۔ جیسے جیسے روانگی
کا وقت قریب آ رہا تھا، میری ہمت جواب دیتی جا رہی تھی۔ وقت کھو
جانے کا احساس ہو رہا تھا۔ اپنے آپ سے نگاہیں نہیں ملائی جا رہی تھیں۔ کانٹے
اور زورا کے ساتھ بیٹھے سے میں اپنے ساتھ کم رہتا تھا، اس لیے ایک
لمحے کو بھی اُن سے دور نہیں ہوا تھا۔ ساری رات کانٹے کے بستر پر آنکھیں
کھولے پڑا رہا۔ صبح دس بجے سے ختم شریف شروع ہو گیا تھا، تیجہ کریمہ
کا ہوا تھا۔ اُس دن بھی بڑی تعداد میں لوگ موجود تھے لیکن میں وہاں
کچھ ہی دیر بیٹھا۔ ظاہر ہے ختم کے بعد کھانے کا اہتمام ہوگا اور کھانے
کے بعد ہی ہماری روانگی ممکن ہو سکتی ہے۔ پھر میں نے یہی طے کیا کہ
اپنے کمرے میں جا کے خادمہ نفیس کو بلاؤں اور کوئی عریضہ سپرد کرنے
کے بجائے سب کچھ اُسی سے کہہ دوں۔ میں اُس سے بہانہ کروں گا کہ
اس دوران میری طبیعت ہی ٹھیک نہیں رہی تھی اور میں یہ بتا کے کسی کو
پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں تیز قدموں سے اوپر کی طرف جا رہا تھا
کہ کھانے کے بعد شاید موقع نہ مل پائے مگر ابھی میں نے آدھا زینہ ہی
عبور کیا ہوگا کہ پیچھے سے کانٹے کی آواز پر مجھے ٹھٹکنا پڑا۔ وہ سیڑھیاں
پھلانگتا ہوا اوپر ہی چلا آیا۔ "کدھر کو جا رہا ہے؟"
"بس یوں ہی اُوپر کی طرف۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔
"اپنے کو بھی تھوڑی پان کی طلب ہو رہی تھی۔"
"تم ایسے تو پان نہیں کھاتے۔"
"ادھر کی گلوریوں کی بات ہی اور ہے لاڈلے! نہ جانے پھر
کب کھانے کو ملیں۔ سوچا چلتے وقت دو چار اور ڈال لوں۔"
"یہاں سے ہم کب چل رہے ہیں؟"
"اُستاد کھانے کے بعد کو بول رہے تھے۔" اُس نے سرسری لہجے میں
کہا اور اچانک میرا ہاتھ دبا کے کہنے لگا "تو نے کچھ اور بھی سُنا؟"
"کیا!..." میرے پیر وہیں جم گئے۔
"خانم آپا اپنے ساتھ نہیں جا رہی ہیں؟"
"کیا، آپا نہیں جا رہی ہیں؟"
"ہاں لاڈلے! اپنے کو ابھی پتہ چلا۔ آپا نے انکار بول دیا ہے۔
بولا ہے کہ ابھی وہ ادھری رہیں گی۔"
میں اُسے حیرت بھری نظروں سے دیکھ گیا۔
"اُستاد اور پیرو دادا بھی ابھی اُدھر اندر کو گئے تھے۔ لوٹ
کے اُن لوگ نے ابا جان اور بڑے صاحب کو ایسا ہی بولا ہے۔"
"تم نے کچھ غلط تو نہیں سُنا ہے؟"
"اپنے کو خود بھی بہت اچنبھا ہوا تھا۔"
"یہ کیسے ممکن ہے! آپا یہاں اکیلی رہیں گی؟"
"آپا نے بولا ہے جب اُن کو آنا ہوگا، وہ چٹھی بھیج دیں گی۔
اُنھوں نے ہم سب کے لیے بولا ہے کہ ہم لوگ چلے جائیں۔"
"نہیں کانٹے بھائی!" میں نے تذبذب کے کہا۔ "اور اور مغل بھائی
کیا کہہ رہے تھے؟"
"اور کچھ نہیں، ابا جان اور بڑے صاحب بھی سُن کے چپ ہو گئے۔
اُدھر اندر اُستاد نے آپا کو کچھ بولا ضرور ہوگا۔ ایسے لوٹ کے آگیا ہے تو
کوئی بات ہی ہوگی۔"

میں اُس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ خانم نے یہ فیصلہ کیوں کیا ہے۔
وہ تو یہاں آنے پر آمادہ ہی نہیں تھی۔ کانٹے کچھ اور نہیں جانتا تھا۔ کمرے
میں آ کے اُس نے منہ ہاتھ دھویا، بال سنوارے اور چائے پی کے پان چبانے
لگا۔ میں گم سُم بیٹھا رہا۔ مجھے خانم سے ملنا چاہیے، مجھے خود جا کے دیکھنا چاہیے
کہ آخر اُس نے یہاں ٹھہرنے کا ارادہ کیوں کر لیا ہے۔ اب وہ یہاں کے
مطلوب ہے۔ ہو سکتا ہے گیتی آرا نے اصرار کیا ہو مگر وہ زیادہ دنوں تک
یہاں گیتی کے بغیر کیسے رہ سکتی ہے اور زریں کے بغیر بھی۔ دونوں ایک
دوسری کی بہنیں لگتی ہیں۔ اُن میں بہنوں سے زیادہ یگانگت ہے۔ کچھ دیر
کے لیے کوئی ایک نظروں سے اوجھل رہے تو دوسری پریشان ہو جاتی ہے۔
زریں کی حویلی تو اُس کا گھر ہے، اُس کی جائے پناہ۔ زریں نے حویلی کی ساری
چابیاں اُس کے حوالے کر دی تھیں۔ یہاں کسی کے مجبور کرنے کا بھی اب
سوال پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے اپنے کمرے میں جا کے خادمہ نفیس کو بلانے
کا ارادہ ترک کیا۔ مگر مجھے زنان خانے کی طرف جانا ہی ہے تو پہلے وہاں

صورتِ حال کا جائزہ لے لوں۔ میں نے گھڑی دیکھی، ایک بجنے والا تھا۔ کانتے کسی رسالے کی تصویریں دیکھ رہا تھا۔ میں اُس سے کچھ کہے بغیر باہر نکل آیا۔ مجھے اب بھی جھجک تھی۔ میں عمارت کی پشت پر خاص زنان خانے جانے والے راستے کی طرف مُڑ گیا۔ قریب پہنچ کے میں نے ایک خادم سے کہا کہ وہ اندر جا کے خانم کو مطلع کر دے۔ خادم کی واپسی میں دیر لگ گئی، لیکن میں وہیں کھڑا اُس کا انتظار کرتا رہا۔ واپس آنے پر وہ مجھے دُور تک میرے ساتھ چلا۔ اُس کے اشارے پر جیسے ہی میں ایک دروازے میں داخل ہوا، ایک خادمہ نے مجھے آداب کیا اور بتایا کہ اندر خانم میری منتظر ہے۔ میرے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ دوسرے کمرے میں خانم موجود تھی۔ اُسے دیکھ کے مجھے جھٹکا سا لگا۔ صرف چند دنوں میں وہ پہچانی نہیں جا رہی تھی۔ بکھرے بکھرے بال، زرد رنگت، لباس صاف مگر جا بجا شکنیں پڑی ہوئی۔ میں دروازے کے قریب ٹھٹک کے رُک گیا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ مضطربانہ میری طرف بڑھی اور اُس نے میری پیشانی کو بوسہ دیا۔ میرے ہاتھ چومے۔ میں نے اُس کے ہاتھ زور سے تھام لیے۔ "آپی! آپ کیسی ہیں؟" میں نے گھٹی ہوئی آواز میں پوچھا۔

وہ بے اختیار میرے سینے سے لگ کے سسکنے لگی۔ میرے حواس گُم ہو گئے تھے۔ "آپ نہیں جا رہی ہیں آپی؟"

"مجھے ابھی یہیں رہنا ہے۔" وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی اور جھڑک جھڑک کے رونے لگی۔

اُس سے کچھ اور پوچھنا لاحاصل تھا۔ سب کچھ میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ تمام سوالوں کا جواب مجھے مل گیا تھا۔ یہ جان کے میرا سینہ بھی پھٹنے لگا۔ اُسے تسلی دینے کے بجائے مجھے اپنے آپ کو ضبط کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ "آپ کہیں تو ہم اور رُک جائیں، میں رُک جاتا ہوں۔" میں نے بہ دقت تمام کہا۔ "آپ یہاں اکیلی رہیں گی۔"

"نہیں یاور میاں! یہ بھی ہماری گھر ہے۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میرا کوئی ایسا گھر بھی ہے۔" اُس کی آواز بین کر رہی تھی۔ "تم جاؤ، تمھارا جانا بہت ضروری ہے۔ خدا تمھیں اپنے بچھڑے ہوؤں سے ملائے۔ خدا کرے وہ سب خیریت سے ہوں۔ اُنھیں لے کے فیض آباد ہی چلے جانا اور رجّو (جہاں گیر) کا خیال رکھنا، اس سے کہنا کہ تمھاری آپی تمھارے لیے بے چین رہے گی اور جلد ہی تمھارے پاس پہنچے گی۔ نزہت سے بھی یہی کہہ دینا۔ گھر میں اور سب سے، زہرہ اور زیبان سے بھی۔"

"میں بمبئی سے واپس فیض آباد نہیں جاؤں گا۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "یہیں آ جاؤں گا۔"

"اگر میری خاطر یہاں آنا چاہتے ہو تو مت آنا۔ تمھیں وہیں جانا چاہیے۔ اتنے زمانے کے بعد بھائی بہنوں سے ملنا ہو گا۔ کچھ عرصے بھی اُن کے ساتھ نہیں رہو گے؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس نے اپنے دوپٹے سے آنسو پونچھے اور بھینچے ہوئے ہونٹوں سے بولی: "میری فکر مت کرو، میں یہاں ٹھیک رہوں گی۔" اُس نے میرے گریبان کا بٹن بند کیا، میرے بال درست کیے۔ وہ اپنی قابو یافتگی کے اظہار کی ناکام کوشش کر رہی تھی اور اُس کے سارے بدن پر ارتعاش طاری تھا۔ مجھ سے کہنے لگی: "اپنا بھی خیال رکھنا اور اب ہو سکے تو اب کہیں اور مت جانا۔"

میں سُنتا رہا۔ مجھے احساس ہو گیا تھا کہ میں جتنی دیر تک اُس کے سامنے موجود رہوں گا، اُس پر یہی اضطرابی کیفیت طاری رہے گی۔ پھر میں وہاں ایک لمحے بھی نہیں ٹھیرا۔ اُس نے بھی مجھے نہیں روکا۔ وہ میرے ساتھ دروازے کے باہر دوسرے کمرے میں آ گئی۔ باہر نکلتے ہی میری نگاہ اچانک دائیں جانب ستون کی آڑ میں کھڑی ہوئی بر جیس پر گئی۔ مجھ پر کوئی بجلی سی گری، میری آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں۔ وہ بر جیس ہی تھی۔ سادہ لباس میں ملبوس پھٹی پھٹی بھری بھری آنکھیں، چہرے پر گھٹا سی چھائی ہوئی۔ اُس نے آہستگی سے ہاتھ اُٹھا کے مجھے تسلیمات کی۔ میرا سارا جسم سُن سنا رہا تھا۔ جانے کس طرح میں نے اُس کے سلام کا جواب دیا۔ میں بے تحاشا اُس کی جانب بڑھ جانا چاہتا تھا لیکن پیروں نے ساتھ نہیں دیا۔ معاً مجھے خانم کی موجودگی کا خیال آیا اور میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ دوسرے لمحے جب میں نے نگاہ اُٹھا کے دیکھا تو وہ وہاں نہیں تھی، شاید ستون کی آڑ میں ہو گئی تھی۔ چند لمحوں تک میں بُت بنا کھڑا رہا۔ "میں یہیں واپس آؤں گا آپی! چند روز بعد ہی آنے کی کوشش کروں گا۔" میں نے سٹ پٹائی آواز میں کہا۔ وہ موجود ہو گی تو اُس نے بھی میری آواز سُن لی ہو گی۔ اس سے پہلے کہ خانم مجھ سے کچھ کہتی، میں تیز قدموں سے وہاں سے چلا آیا۔

دُھوپ ابھی اُتری نہیں تھی کہ نواب حشمت جنگ اور بڑے نواب کی موٹروں نے ہمیں راجا جان کی حویلی میں پہنچا دیا۔ ہارن کی آواز سُن کے مارنی، شامو، امیرو اور منگو فوراً باہر نکل آئے۔ اُچھلتے کودتے، شور مچاتے ہوئے اُنھوں نے چبوترے کی سیڑھیاں پھلانگیں اور دیوانہ وار ہم سے لپٹ گئے جیسے ہم طویل مسافت کے بعد کہیں سے آئے ہوں، کوئی بڑی مہم سر کر کے۔ خود مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے میں ایک عرصے بعد اُنھیں دیکھ رہا ہوں حالانکہ اُن سے رُخصت ہوئے ہمیں ایک ہفتے سے زیادہ نہیں ہوا تھا۔ موٹریں ہمیں چھوڑ کے واپس چلی گئیں۔ ...

جائے سب اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔ سب پر کسی لمبے سفر کی تھکن سوار تھی۔ گھر آ کے یہی ہوتا ہے کہ آدمی چور چور ہونے لگتا ہے۔ آباجان اور منیر علی نے شیروانیاں اُتار دیں۔ بجھل اور ہیرو نے واسکٹیں، اور اندر داخل ہوتے ہی بجھل نے مارتی کو حقہ تیار کروانے کا حکم دیا۔ عمارت کے سامنے وسیع سبزہ زار پر بید کی کرسیاں رکھی تھیں۔ اس اثنا میں دھوپ کچھ اُوپر چلی گئی تھی اور باہر کا منظر خوشگوار ہو گیا تھا۔ سب سبزے پر آ گئے۔ منگو بجھل کے پیر دبانے لگا۔ ملازم چائے لے آئے اور ساتھ میں بہت سا سامان۔ مارتی، ہجرو، شامو اور منگو اس طرح ہماری پذیرائی کر رہے تھے جیسے ہم اُن کے مہمان ہوں۔ مارتی تو پاگل سا ہو گیا تھا۔ ناچتا ناچتا پھر رہا تھا۔ کبھی میرے پاس آتا تھا اور کبھی زرداور کانتے کے پاس جاتا تھا۔ کبھی بجھل اور ہیرو کے سامنے جا کے کھڑا ہو جاتا۔

پہلے یہ سبزہ زار ایسا ہرا بھرا نہیں تھا۔ سب کچھ دُھلا دُھلا، رنگا رنگا نظر آ رہا تھا۔ چبوترے کی سیڑھیوں پر گملوں کی تعداد بھی بڑھا دی گئی تھی۔ گملوں پر تازہ تازہ سُرخ رنگ کیا گیا تھا۔ وہ چاروں ان دنوں شاید پھول پودوں ہی کا کام کرتے رہے تھے۔ حویلی کے ملازم بھی اُن سے بہت مانوس معلوم ہوتے تھے۔ اشاروں پر دوڑے دوڑے پھر رہے تھے۔ بید کی بڑی گول میز پر اُنھوں نے کھانے پینے کے سامان کا انبار لگا دیا تھا۔ سب کھانے پینے میں مصروف تھے کہ مارتی میرے پاس چلا آیا اور سبزے پر میرے قدموں کے قریب بیٹھ گیا۔ میں نے اُس کے تپاک کے جواب میں ہر بار مُسکرانے کی کوشش کی تھی اور اُسے اپنے بازوؤں میں زور سے بھینچا بھی تھا لیکن مارتی مطمئن نہیں ہوا تھا۔ چپکے سے کہنے لگا: ”کیوں رے اُستاد! ابھی تم ٹھیک تو ہے؟“

”ہاں مارتی! بالکل ٹھیک۔“ میں نے مستعدی سے جواب دیا۔

”ابھی تم اپن کو سب سے الگ لگتا ہے۔ جب سے آیا ہے اپن نوٹ کر رہا ہے۔ لگتا ہے تم ابھی ادھر کو واپس نہیں آیا۔“

”نہیں مارتی!“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”تھکن کی وجہ سے شاید تمھیں ایسا محسوس ہو رہا ہو۔“

”لگتا ہے کئی رات سے سویا بھی نہیں ہے۔“

”ہاں۔“ میں نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”وہاں نیند بہت کم آتی تھی۔“

”تم ابھی کچھ بھی نہیں لے رہا ہے؟“

”یہ چائے پی تو رہا ہوں۔“

”بولے تو کچھ اور لا دے۔ ادھر لگ ایک دم فسٹ کلاس حیدر آبادی شیرنی بناتا ہے۔ ابھی میٹھا ملا ہوا پوری بنایا ہے۔ کیا بولتا ہے اس کو؟“

وہ جوشیلے انداز میں بولا۔ ”ہاں کھی۔“

”میں نے وہاں کھائی ہیں۔“

”کھایا ہے! پھر کیسا لگا تم کو؟“ وہ اشتیاق سے بولا۔

”بہت مزے کی بناتے ہیں۔“

”ایک چیز کیا، سالا روز نیا آئٹم بناتا ہے۔ اپنا باورچی نہیں دیکھتا ہے۔ مال فسٹ اپن سوچتا ہے، اگر کچھ دن اور ادھر رہ گیا تو ایک دم کُپا ہو جائے گا۔“ وہ عجیب انداز سے منہ پھلا کر بولا۔ ”گول کُپا مافک۔“

مجھے ہنسی آ گئی۔ مارتی کچھ بھی جتن کر رہا تھا۔ میں اُس سے کس طرح کہتا کہ وہ مجھ سے ایسی باتیں نہ کرے۔ مارتی نے وہ آنکھیں نہیں دیکھی تھیں۔ میں اُسے کیا بتاتا کہ وہ آنکھیں راستے بھر میرا تعاقب کرتی رہی ہیں۔ بجریس کی بڑی بڑی ڈوبی ڈوبی آنکھیں۔ میں نے یہاں آ کے سب کچھ بھلا دینے کی کوشش کی تھی لیکن وہ آنکھیں یہاں بھی مجھ سے دُور نہیں ہوئی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بس جھانکا ہی چاہتی ہیں۔ میں ان کی طرف دیکھتا ہوں تو مجھے لرزہ سا ہونے لگتا ہے۔ مجھے یہ کیا ہو گیا تھا۔ وہ خود سامنے آئی تھی اور میں وہاں سے بھاگ آیا۔ مجھے کچھ دیر تو رُکنا چاہیے تھا۔ وہ کیا سوچتی ہو گی۔ میرے جی میں آتا تھا کہ فوراً یہاں سے واپس چلا جاؤں اور جا کے ایک بار، صرف ایک بار اُس سے ملنے کی کوشش کروں۔ میں نے مارتی سے معذرت کرنی چاہی تو وہ اور میرے پیچھے پڑ گیا۔

اندھیرا نہیں ہوا تھا لیکن سبزہ زار کے تمام قمقمے روشن کر دیے گئے تھے۔ اُس وقت وہاں سبھی موجود تھے۔ چائے کے بعد کانتے نے چاندی کی منقش ڈبیا اور چمکتا ہوا رنگین بٹوا نکالا تو سب حیران رہ گئے۔ ڈبیا میں پان بھرے ہوئے تھے۔ وہ یقیناً اُنھیں حویلی سے لایا ہو گا۔ اس سے پہلے کہ بجھل اور ہیرو کی آنکھوں میں سُرخی آتی، کانتے نے خود ہی وضاحت کر دی کہ چلتے وقت اُس نے کسی خادم سے پان کی فرمائش کی تھی۔ خادم اندر سے واپس آیا اور اُس نے یہ ڈبیا اور بٹوا اُس کے حوالے کر دیا۔ کانتے نے لوٹانا چاہا لیکن خادم نے انکار کر دیا کہ راستے میں بھی پانوں کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ کانتے نے سب کو چاندی کے ورق میں لپٹا ہوا ایک ایک پان کھلایا۔ آباجان اور منیر علی نے بھی منع نہیں کیا۔

مارتی منتظر ہی بیٹھا تھا کہ سب ذرا فراغت سے بیٹھیں گے تو وہ زبان کھولے گا۔ سب ٹانگیں پھیلائے سستا رہے تھے۔ منگو ابھی تک بجھل کے پیر دبا رہا تھا اور بجھل حقے کی نے منہ میں لگائے جانے کس خیال میں گم تھا کہ مارتی کی آواز پر سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔ مارتی نے لفظ چباتے ہوئے آباجان کو بتایا کہ اس دوران کئی آدمی اُن سے ملنے آئے تھے۔

”کیا بولتا ہے رے؟“ بجھل نے دھمکتی آواز میں پوچھا۔

مارتی سٹ پٹا گیا۔ ”تم لوگ کے جانے کے اگلے دن ہی وہ ادھر آیا۔ ایک بڑی عمر کا، دوسرا بیچ کا۔ دونوں اپن کو ٹھیک ٹھاک ہی لگتا تھا۔ دادا بولتا تھا کہ بابا سے ملنے کا ہے۔“

”کھل کے بول رے۔“ بجھل نے درشتی سے کہا۔

”میرا نام لے رہے تھے؟“ آباجان نے بے چینی سے پوچھا۔

”وہی نام جو آپ نے اُدھر ہوٹل میں لکھایا تھا۔“

”اکبر علی خان! کیا وہ ہوٹل کے آدمی تھے؟“

”اپن نے پوچھا تھا۔“ مارتی سہمی ہوئی آواز میں بولا۔ ”پر وہ لوگ بولا کہ اپن کو بابا سے ہی کام ہے۔ اپن نے پوچھا کون سا کام؟ بولا، کسی کو بولنے کا ہے۔ اپن بولا، وہ ادھر شہر میں نہیں ہے۔ آئے گا تو ایک دم بولے گا۔ دوسرے دن شام کو پھر آیا۔ تیسرے دن پھر اور لوگ آیا۔“

”اور لوگ؟“ بجھل نے تندی سے پوچھا۔ ”اور لوگ کون؟“

”وہ دوسرا تھا دادا! وہ بھی ایسا ہی بولتا تھا۔ پھر دونوں کا آنا بند ہو گیا۔ ابھی تین دن پہلے پھر ادھر کو آیا تھا، پہلے والا۔“ مارتی کے کسی لہجے میں بتایا کہ اُس نے اُن کی ٹوہ لینے کی بہت کوشش کی لیکن وہ یہی کہتے رہے کہ اُنھیں صرف آباجان سے کام ہے اور کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ وہ پھر آ جائیں گے۔ پہلے دن اُس نے چائے وغیرہ سے اُن کی تواضع کی تھی۔ اُنھوں نے اِدھر اُدھر کی باتوں کے دوران مارتی سے آباجان کی سکونت وغیرہ کے بارے میں پوچھا۔ مارتی کے بقول اُس نے کوئی واضح بات نہیں بتائی۔ دیکاجی ہوٹل کے رجسٹر میں آباجان نے اپنے متعلق جو کوائف درج کرائے تھے، یہ اُن کا خیال تھا۔ مارتی نے اُن کے سامنے کسی تشویش کے اظہار سے مکمل طور پر اجتناب کیا تھا۔ جس طرح وہ نرمی و شائستگی سے گفتگو کرتے رہے تھے، مارتی نے بھی اُن سے ویسا ہی کچھ سلوک کیا تھا۔ ہیرو کے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ دونوں کے حلیے عام حیدرآبادی لوگوں جیسے تھے اور وہ کم از کم اڈّے سے وابستہ لوگ معلوم نہیں ہوتے تھے لیکن وہ چلتے پھرتے کے آدمی نظر آتے تھے۔ تیز طرار، مفاہمت پسند اور آدمی کو باتوں میں اُڑانے والے۔ مارتی کہنے لگا۔ اُسے سادہ لباس والوں کا شک بھی ہوا تھا لیکن اُن کی وضع قطع پولیس والوں سے بہت مختلف تھی۔

سب کو چُپ سی لگ گئی تھی۔ بات اتنی سادہ نہیں تھی جتنی سادگی سے مارتی نے کہہ دی تھی۔ کوشش کے باوجود وہ لہجے کا اضطراب چھپانے میں ناکام رہا تھا۔ ہمارے آنے کے اتنی دیر بعد اُس کا زبان کھولنا ہی اُس کے اضطراب کی غمازی کرتا تھا۔ مارتی سب کی نگاہوں کا ہدف بنا ہوا تھا اور کسی مجرم کی طرح پلکیں پٹ پٹا رہا تھا۔ ہیرو نے شامو، ہجرو اور منگو سے پوچھا تو اُنھوں نے مارتی کے بیان کی تائید کے سوا کوئی نئی بات نہیں بتائی۔ دیکاجی ہوٹل میں آباجان نے جو نام درج کرایا تھا، اُس کا علم ہوٹل والوں اور نواب حشمت کے سوا کسی کو نہیں تھا۔ بعد میں بڑے نواب کی حویلی میں جانے کے بعد بھی آباجان نے اس نام میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔ بڑے نواب اور نواب حشمت جنگ ہی کے پاس سے وہ آ رہے تھے۔ اتنی بات سب کی سمجھ میں آ رہی ہو گی کہ آباجان کے اس بدلے ہوئے نام کا علم انھی تین جگہوں سے ہو سکتا ہے۔ ہوٹل والوں کا کوئی معاملہ ہوتا تو وہ مارتی سے بھی مسلسل جنبائی کر سکتے تھے کیونکہ وہ بھی آباجان کے ساتھ وہیں مقیم رہا تھا۔ مارتی کے بقول آباجان تمام ادائی کر کے چلے تھے اور اُن کے پاس نواب حشمت جنگ کی آمد و رفت کی وجہ سے یوں بھی ہوٹل میں اُنھیں محترم مہمانوں کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔ ہوٹل کے منتظمین کے لیے شاید یہ بات بھی اہمیت رکھتی ہو کہ رخصت کے وقت نواب حشمت جنگ کی گاڑی آباجان کو وہاں سے لینے آئی تھی۔ کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو حویلی میں اُن کی واپسی تک ہوٹل والے کچھ تحمل کر سکتے تھے، اور بات بھی کیا ہو سکتی تھی۔

مارتی نگاہ کا بھی اتنا کمزور نہیں ہے۔ اُسے کوئی ایسا گمان نہیں تھا کہ اُس نے ہوٹل میں آتے جاتے ہوئے اُن لوگوں کو بھی دیکھا ہو جو آباجان کو پوچھتے ہوئے آئے تھے۔ ہمارے جانے کے دوسرے دن اُن کے آنے سے ظاہر تھا کہ اُنھیں بڑے نواب کے ہاں ہماری منتقلی کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔ گویا نواب حشمت جنگ اور بڑے نواب تک اُن کی رسائی نہیں تھی لیکن ایک اور جگہ بھی تھی جہاں آباجان نے اپنا ہوٹل والا نام دہرایا تھا۔ نواب حشمت جنگ کے توسط سے یہ حویلی خریدتے وقت اُنھیں حویلی کے مالک کو بھی یہی نام بتانا چاہیے تھا۔ گو منتقلی کے کاغذات کی تکمیل ابھی نہیں ہو پائی تھی کیونکہ درمیان میں نواب حشمت جنگ جیسا صاحبِ حیثیت آدمی تھا لیکن تکمیل کا مرحلہ آ جاتا تو بھی آباجان کو اسی نام سے منتقلی کے کاغذات تیار کروانے پڑتے جس سے وہ خود کو متعارف کرا چکے تھے۔ حویلی کے سابق مالک نے حویلی کی فروخت کے لیے کئی معقول پیشکشیں ناپسندیدہ خریداروں کی وجہ سے مسترد کر دی تھیں۔ آباجان اُسے پسند آ گئے تھے۔ اس میں آباجان کی ذات کو کم، نواب حشمت جنگ کی سفارش کو زیادہ دخل تھا۔ ہو سکتا ہے کہ آنے والوں کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا ہو جو حویلی کی خریداری میں پہلے ناکام ہو چکے تھے اور اب حویلی آباجان کی تحویل میں آ جانے کے بعد وہ اُنھیں بڑی پیشکش کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ لوٹس پیلس ہو یا کوئی اور، دوسری بات میری طرح بجھل، ہیرو اور آباجان کے ذہن میں بھی کلبلا رہی ہو گی کہ آنے والوں کا مقصد اس کے سوا بھی کچھ ہو سکتا ہے۔

یہاں آتے ہوئے راستے میں تجمل نے ابا جان سے کہا تھا کہ ہم دو ایک دن قیام کے بجائے اگر فوراً روانگی کا ارادہ کر لیں تو کیا حرج ہے۔ ابا جان نے جواب میں کئی پہلوؤں پر تجمل کو توجہ دلائی تو وہ بھی چپ ہو گیا۔ ابا جان نے اس سے کہا تھا کہ انھوں نے بوجوہ یہ عجلت مناسب نہیں سمجھی۔ ان کے خیال میں روانگی کے لیے کسی جلد بازی کا اظہار اس خوش اسلوبی کے منافی تھا جس کا وہ بڑے نواب کی حویلی میں برابر مظاہرہ کرتے رہے تھے۔ وہاں سے آ جانے کے باوجود انھیں کسی بھاگ دوڑ کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے تھا جیسے بس پا بہ رکاب بیٹھے تھے، جیسے بس زنداں سے چھوٹنے کی دیر تھی۔ جو حویلی انھوں نے خریدی تھی، اس کے جواز اور بھرم کے طور پر بھی انھیں ایک دو دن وہاں ٹھہرنا چاہیے تھا۔

ابا جان کو خانم کا خیال بھی تھا جو ابھی تک بڑے نواب کی حویلی میں موجود تھی، جب تک وہ وہاں موجود ہے، دونوں نوابوں سے ربط و تعلق کی استواری ضروری ہے۔ ان پر اب تک ہمارا جو تاثر مرتب ہوا ہے بہتر ہے کہ وہی قائم رہے۔ یہ تاثر ہمارے اطمینان اور تحمل کے سبب سے تھا۔ ہمارے بارے میں ابھرنے والے تمام سوالوں کا جواب ہمارا اطمینان تھا۔ ابا جان نے تجمل سے تھکن کا عذر بھی کیا تھا، کہا تھا کہ ویسے بھی دو ایک دن آرام کے بعد ہی سفر کرنا ٹھیک رہے گا۔ وہ نواب حشمت جنگ سے آنے والی کل کے لیے ملاقات کا وقت بھی طے کر چکے تھے۔ نواب نے خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ ابا جان کے گھر والوں کے لیے چند تحائف پیش کرنا چاہتا ہے۔ ابا جان نے منع کیا تھا کہ یہ ان رسوم کا موقع نہیں ہے لیکن نواب حشمت جنگ نے انھیں قائل کر دیا تھا کہ زندوں کے لیے تو زندگی رواں ہی ہے۔ کہنے لگے اگر تجمل پہلے انھیں کوئی مشورہ دے دیتا تو وہ اسی نسبت سے بڑے نواب کی حویلی میں حیدر آباد سے اپنی بہ عجلت روانگی کا تاثر دے دیتے۔

دیر تک سب خاموش بیٹھے رہے۔ تجمل مسلسل حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ یک بارگی منھ سے ہٹا کے وہ بڑبڑاتی آواز میں ابا جان سے بولا "ادھر بڑے نواب کے پاس مہاراجا جاتے تو آپ کی بھینٹ نہیں ہوئی؟"

ابا جان کرسی سے اچھل سے گئے۔ وہ بات جو مجھے کھٹک رہی تھی، تجمل کے سر میں بھی گونج رہی تھی۔ ابا جان نواب حشمت جنگ کی وہ باتیں شاید بھول گئے تھے جو اس نے میسور کے ایک دولت مند کے متعلق بتائی تھیں۔ بڑے نواب کی حویلی میں جانے کے دوسرے دن کی بات ہے جب وہاں پہلی بار نواب حشمت جنگ سے ابا جان کا آمنا سامنا ہوا تھا اور وہ انھیں وہاں دیکھ کے ششدر رہ گیا تھا پھر اس نے فخریہ انداز میں بڑے نواب کو بتایا تھا کہ وہ نادر ہیرا ابا جان ہی کا عطیہ تھا۔ ہیرے کی قدر و قیمت کی سند کے طور پر اس نے مہاراجا دھرم ویر کا ذکر کیا تھا۔ مہاراجا کو کسی طرح یہ سن گن مل گئی تھی کہ نواب حشمت جنگ کی تحویل میں ایک بیش بہا ہیرا آیا ہے۔ مشہور ہے کہ مہاراجا دھرم ویر ہیروں کی خوشبو سونگھ لیتا ہے۔ بہرحال نواب حشمت جنگ کو اندازہ تھا کہ کس ذریعے سے مہاراجا کو ہیرے کی خبر پہنچی ہوگی۔ نواب حشمت جنگ سے ضبط نہیں ہوا تھا، اس نے اپنے ایک ہم رتبہ نواب کو کہیں یہ ہیرا دکھا دیا تھا، نواب پتھروں کی پرکھ میں ایک حیثیت رکھتا تھا، اسی جوہر شناس نے مہاراجا کے ذوق و شوق کی آگ بھڑکائی تھی، جس سے مہاراجا ایسا بے چین ہوا کہ نواب حشمت جنگ کے پاس آ کے ہیرے کی دید کے لیے اصرار کرنے لگا۔ نواب حشمت کے بقول، وہ اسے دیکھ کے گنگ رہ گیا تھا، اس کا عالم دیدنی تھا۔ اس کی آنکھوں کی خیرگی اور جلتا ہوا چہرہ دیکھ کے نواب کو بہت لطف آیا تھا۔ مہاراجا نے اسی وقت ابا جان سے متعارف کرنے کے لیے اس سے درخواست کی تھی جسے نواب ٹال گیا تھا۔ اس کے بیان کے مطابق یہیں تک بات ٹھیک تھی اور وہ اپنے مربی ابا جان کا پتہ بتا کے انھیں کسی الجھن میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ ہیروں کے شوق کے معاملے میں مہاراجا کی دیوانگی کا اسے خوب علم تھا۔

تجمل کی زبانی مہاراجا کا نام سن کے ابا جان کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ انھوں نے اقرار کیا کہ دفن کے روز تو نہیں لیکن پرسوں سوم کے روز مہاراجا دھرم ویر سے ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ "مگر محض وہ ایک نہایت رسمی ملاقات تھی۔" ابا جان نے ہلکی سی آواز میں کہا۔ "مہاراجا کو خاں صاحب نے مجھ سے متعارف کرایا تھا۔ مہاراجا نے مجھ سے ملنے کی خوشی کا رسمی اظہار کیا اور بس، اس سے کوئی اور بات نہیں کی۔"

تجمل سر ہلانے لگا۔

"آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ کیا آپ کے خیال میں آنے والے آدمیوں کا تعلق مہاراجا دھرم ویر سے تھا مگر انھیں یہاں ہماری حویلی کے متعلق..." ابا جان تذبذب سے بولے۔ "مہاراجا نے جیسا کہ نواب حشمت جنگ بتا رہے تھے کسی قسم کے اشتیاق کا اظہار نہیں کیا بلکہ اسی دن نواب حشمت جنگ کی زبانی مہاراجا کے ذکر سے اگر کوئی تکدر ذہن پر چھایا تھا تو مہاراجا سے ملاقات کے بعد وہ چھٹ گیا تھا۔ انھوں نے اشارۃً بھی اس بابت ایک لفظ نہیں کہا۔"

"وقت سیدھا نہیں تھا بابا!" تجمل نے سرد مہری سے کہا۔ "اور پتہ کھوجنا کون سا جوکھم کا کام ہے۔ نواب نہیں بول رہا تھا تو اس کا موٹر چلانے والا پورا پتہ جانتا تھا۔ ادھر کوئی اور بھی ہو سکتا ہے۔"

"ہاں، ہاں۔" ابا جان نے بے یقینی کے انداز میں کہا۔ "مگر ٹھیک ہے۔

انھیں آنے دیجیے۔ اگر یہی صورت ہے تو ہم ان سے معذرت کر لیں گے۔ جہاں تک میرا قیاس ہے، مہاراجا ایک معقول اور بردبار آدمی معلوم ہوتا ہے۔"

تجمل کو اب یہ باور کرانے سے کیا حاصل تھا کہ یہاں حویلی میں دو آدمیوں کی مسلسل آمد ہی مہاراجا کی بے چینی کی مظہر ہے اور آنے والوں کا والہانہ انداز ہی مہاراجا کی شدتِ شوق کی علامت ہے۔

"مگر یاد رہے کہ تیسری مرتبہ آنے والے آدمی دوسرے تھے۔" ابا جان کچھ توقف کے بعد بے کلی سے بولے۔

"آدمیوں کی کمی ہے ان کے پاس!" تجمل نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "اور ہو سکتا ہے کہ ان کی ڈوری کسی دوسری طرف سے کھینچی گئی ہو۔"

"دیکھ لے گا استاد، ابھی دیکھتا ہے۔ اپن کے ہوتے میں کون آتا ہے اور کیا ہوتا ہے سالا۔" ہیرو نے بظاہر بے پروائی سے کہا۔

"ایسا کیا مسئلہ ہے؟" منیر علی نرمی سے بولے۔ "کوئی ملنا چاہتا ہے تو مل لیا جائے۔ بھلا میری عقل سمجھنے سے قاصر ہے کہ اس قدر وہم و تردد کی کیا ضرورت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ حساسیت اعصاب شکنی کے سبب سے ہے۔ ہم سب کو ایک رات مکمل آرام کرنا چاہیے۔ ان کی دوبارہ آمد سے پہلے کسی قسم کی قیاس آرائی مجھے تو فضول معلوم ہوتی ہے۔"

کسی نے کوئی تبصرہ نہیں کیا تو منیر علی نے بھی چپ سادھ لی۔ بیٹھک میں خشکی بڑھ گئی تھی۔ ابھی اندھیرا اتنا گہرا نہیں ہوا تھا مگر اوس پڑنے لگی تھی۔ آٹھ بھی نہیں بجے ہوں گے۔ ہیرو کے مشورے پر سب اندر چلے آئے۔ مدّی [illegible] وہاں بیٹھے ایک دوسرے کی صورت تکتے رہے، پھر یکے بعد دیگرے اٹھ اٹھ کے باہر جانے لگے۔ میں بھی اٹھنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ مدّی بھاگتا ہوا آیا اور اس نے تیز سانسوں سے ابا جان کو بتایا کہ وہی دونوں آدمی پھر آئے ہوئے ہیں۔ ابا جان نے کوئی جواب دینے سے پہلے اضطراری نگاہوں سے تجمل کی طرف دیکھا۔ تجمل نے مدّی کو اشارہ کر دیا۔ ابا جان کرسی پر پہلو بدل رہے تھے۔ میں بھی سیدھا ہو کے بیٹھ گیا تھا۔ انھیں اندر آنے میں کوئی دیر نہیں لگی۔ ادھر مدّی باہر گیا، ادھر سیاہ شیروانیوں میں ملبوس پکی عمر اور پکی سانولی رنگت کے دو آدمی بھاری قدموں سے اندر داخل ہوئے۔ ایک لمبا چھریرے جسم کا، دوسرا اوسط قد اور گٹھے ہوئے جسم کا تھا۔ دونوں ترکی ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔ شکل و صورت سے وہ معتبر لوگ ہی نظر آ رہے تھے۔ وہ ابا جان کو نہیں پہچانتے تھے۔ اس لیے سلام کے بعد ادھر ادھر دیکھتے ہوئے انھوں نے شائستگی سے ابا جان کے متعلق پوچھا۔ اس سے پہلے کہ ابا جان کوئی جواب دیتے، تجمل نے کرخت آواز میں ان سے کہا، "کام بولو صاحب!"

چھریرے جسم کے آدمی نے مضطرب انداز میں اپنے ساتھی کی جانب نظر کی، پھر شائستگی سے بولا، "ہمیں جناب اکبر علی خاں سے کچھ کام ہے۔"

"فرمایئے۔" ابا جان نے بہ عجلت کہا، تجمل کو نہیں بولنے دیا۔

"کیا ہم اپنے معزز مطلوب ہی سے مخاطب ہیں؟"

"کہیے، کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" ابا جان نے اکھڑی ہوئی آواز میں کہا۔ "جناب سے ایک درخواست کرنی ہے۔" اس شخص نے روانی سے کہا۔

"کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

"یہیں شہر سے۔" وہ معذرت کرتے ہوئے بولا۔ "ہم اپنا تعارف کرانا تو بھول ہی گئے۔ ہم دونوں دوست بھی ہیں اور کاروباری شریک بھی۔ خاکسار کو محمد علی کہتے ہیں، میرے رفیق کا نام قطب الدین ہے۔"

"جی، جی۔" ابا جان نے اکھڑے لہجے میں کہا۔ "فرمایئے اس فقیر سے جناب کو کیا کام ہے۔ ہمیں آج رات کچھ اور مصروفیات بھی ہیں، ہو سکے تو اپنا مدعا جلد بیان کر دیجیے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے آپ کو پہلے کبھی دیکھا ہو۔"

"بلاشبہ، جناب نے ہمیں پہلے نہیں دیکھا۔" وہ شگفتگی سے بولا۔ "ہمیں افسوس ہے کہ ہم نامناسب وقت پر آ گئے۔ اگر ایسی کوئی مصروفیت ہے تو ہم کل کسی وقت آ جائیں گے۔"

"کل کا کچھ ٹھیک نہیں ہے۔" ابا جان نے سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "بہرحال ابھی اتنا وقت ہے کہ میں آپ سے بات کر سکوں، آپ فرمایئے۔"

"جی" وہ جھجکتے ہوئے بولا "کیا ہی اچھا ہو کہ ہمیں چند لمحوں کے لیے خلوت میسر آجائے۔" یہ کہتے ہی وہ ہماری جانب دیکھتے ہوئے ملامت سے بولا۔ "آپ حضرات کو یقیناً زحمت ہوگی لیکن ہمارا خیال ہے، ہم خلوت میں قبلہ سے اپنا مدعا مناسب طور پر گوش گزار کر سکتے ہیں۔"

"نہیں" تایا جان نے کوئی توقف کیے بغیر جواب دیا "اس کی ضرورت نہیں۔ ان سب کو میرا رفیق کار سمجھیے۔"

ماروی دروازے کے پاس کھڑی تھی، کالے خاں بھی آگیا تھا۔ جھل نے ہم جنوں کی طرف اشارہ کیا۔ وہ دونوں خاموشی سے چلے گئے۔ بشیر علی خود ہی اُٹھ گئے، کسی نے انھیں روکا بھی نہیں۔ جھل نے مجھے بھی اشارہ کیا تھا لیکن میں اپنی کرسی پر جما رہا۔ کمرے میں ہم چاروں ہی رہ گئے تھے، تایا جان، پیرو، جھل اور میں۔

"کچھ ایسی ہی بات ہے" گٹھے ہوئے جسم کے شخص قطب الدین نے پہلی مرتبہ زبان کھولی اور مودب لہجے میں بولا "جناب بجا فرماتے ہیں لیکن ہماری گزارشات کے بعد ہی سب کو شریک کیا جائے تو بہتر ہے۔"

"آپ بولو صاحب!" جھل نے بھی بھناتی آواز میں کہا "ہم لوگ الگ کوئی بات نہیں کرتے۔ بعد کو دوبارہ ان کے لوٹانے سے اچھا ہے کہ آپ ہی کی زبان سے ہم سن لیں۔ گھبراؤ نہیں صاحب! بولو۔"

"نہیں، نہیں، گھبرانے کی ایسی کیا بات ہے۔" لمبے آدمی محمود علی نے قدرے ترشی آمیز شائستگی سے کہا "ظاہر ہے، یہ تو جناب پر منحصر ہے کہ وہ آپ حضرات سے بعد میں مشورہ کرتے ہیں یا نہیں۔ ہماری تو غرض اتنی ہے کہ یوں ہمیں اپنا مدعا بیان کرنے میں کس حد تک سہولت ہو جائے گی۔"

"اپنے کو ساتھ سننے میں آسانی ہوگی۔" جھل نے نسبتاً اونچی آواز میں کہا "جو بولنا ہے صاحب! صاف بولو۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔" قطب الدین کی پیشانی شکن آلود ہو گئی لیکن فوراً وہ معذرتانہ انداز میں بولا "جیسا کہ ہم نے آپ کو بتایا، ہم کاروباری آدمی ہیں اور اپنی طرف سے کاروبار کے آداب و اصول کی پابندی کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ بات کچھ آگے بڑھے گی تو جناب کو خود اندازہ ہو جائے گا۔"

"بولو صاحب! کام کی بات بولو۔" جھل نے تند لہجے میں کہا۔

"جی ہاں۔" قطب الدین سنبھل کے بولا اور اپنے ساتھی محمود علی سے کہنے لگا "کیوں محمود بھائی! آپ ہی بات شروع کیجیے۔"

"بہتر ہے۔" محمود علی نے سانس لے کے کہا "اصل میں اپنے اجنبی ہونے کی رکاوٹ آڑے آتی ہے۔ ہمیں احساس ہے کہ ہمارا کوئی ریفرنس، حوالہ آپ کے سامنے نہیں ہے۔ ایسے میں ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ کسی معاملت سے پہلے آپ ہمارے بارے میں اچھی طرح چھان بین کر لیجیے۔"

"اپن لوگ ایک دم سیدھا بات مانگتا ہے۔" پیرو نے تلخی سے کہا۔

"ہماری بھی یہی خواہش ہے کہ ہم دوٹوک انداز میں بات کریں۔" محمود علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"پر آپ تو ابھی ایک ٹوک بھی پورا نہیں بول رہا۔"

میرے کان اُنھی کی طرف لگے ہوئے تھے۔ تایا جان کی آنکھیں بھی جل بجھ رہی تھیں۔ ابھی تک کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ معاملت سے اُن دونوں کی کیا مراد ہے۔ کاش وہ اس حویلی کی خریداری کے سلسلے میں آئے ہوں لیکن پھر انھیں ادھر اُدھر کی اتنی باتیں کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

پیرو کی بات سن کر دونوں ہنس پڑے۔ "کیا خوب کہا ہے آپ نے" محمود علی نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے جناب کا تعلق بمبئی شہر سے ہے۔"

"اپن بمبئی کا دادا ہے۔ نمبر ایک دادا۔ ابھی کچھ اور بتائے؟"

"نہیں جناب!" محمود نے سنجیدگی سے کہا "معاف کیجیے، آپ تو، آپ تو" اپنے ساتھی کے ٹوکنے پر وہ کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔ قطب الدین نے فوراً نرم لہجے میں کہا "میرا خیال ہے، ہمیں اصل مقصد پر آجانا چاہیے۔ میں ہی بیان کرتا ہوں۔ براہ کرم میری طرف توجہ دیجیے اور میری گزارش ہے کہ پہلے میری بات پورے طور پر سن لیجیے۔ صورت یہ ہے جناب!" وہ ایک لمحے ٹھہر کے بولا "ہم نوادر کا کاروبار کرتے ہیں۔"

میری نگاہیں بے اختیار تایا جان پر مرتکز ہوگئیں۔ ان کا چہرہ تمتما رہا تھا اور انھوں نے اپنے ہونٹ بھینچ رکھے تھے۔

قطب الدین کے لہجے میں پہلے جیسی لچک نہیں تھی۔ کہنے لگا "ہمیں اپنے ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ جناب کے پاس اعلا قسم کے نوادر موجود ہیں، خصوصاً نادر پتھروں کی شکل میں۔ ابھی سے کچھ کہنا غلط ہے لیکن ایک بار ہماری خدمات حاصل کر کے دیکھیے، ان شاء اللہ آپ کو کبھی کوئی شکایت نہ ہوگی۔ یہاں ریاست میں ہمارا کام یہی ہے کہ ادھر اُدھر سے نوادر اکٹھے کر کے صاحبِ ذوق حضرات کی خدمت میں پیش کر دیں۔ ہم اپنی اس خدمت کا معاوضہ دو صورتوں میں وصول کرتے ہیں۔ پہلی باقاعدہ خریداری کی صورت میں، اگر معاملہ ہماری بساط کے مطابق ہو تو ہم خود سودا طے کر لیتے ہیں۔ دوسری شکل، موصولہ قیمت پر مناسب اور مقررہ کمیشن کی ہے۔ یعنی ہماری کوشش سے نوادر کی جو رقم بھی وصول ہوگی، اُس میں ہمارا حصہ، جو ہمیں خوش اسلوبی سے ہمارے آپ کے مابین طے پا جائے۔ نوادر کا معاملہ ایسا نہیں ہوتا کہ ہر کسی آنے والے کے دعوے پر اعتبار کر لیا جائے۔ ہمارا تجربہ ہے کہ لوگ بہت ٹھوک بجا کے کسی مستند

اور معتبر آدمی ہی سے رابطہ قائم کرتے ہیں۔ یہاں شہزادگان، نوابین اور دیگر صاحب ثروت حضرات کی ایک بڑی فہرست ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا قابل ذکر آدمی رہ جاتا ہو جو ہم سے اور ہمارے کام سے واقف نہ ہو۔ یہ ایک صاف اور سیدھا کام ہے۔ ہماری حیثیت درمیان کے آدمی کی بھی ہے اور باقاعدہ اہل معاملہ کی بھی۔ غالباً ہم نے اپنے منشا کی وضاحت کر دی ہے۔"

"ابھی اپن کچھ بولے۔" جیسے ہی وہ چُپ ہوا، پیرو نے کہا۔

"جی ہاں، لیکن، لیکن۔" وہ ہچکچاتے ہوئے بولا "ایک بات رہی جاتی ہے۔ آپ کا شکریہ کہ آپ نے اتنی توجہ اور تحمل سے ہماری گزارش سُنی۔ نوادر کے سلسلے میں ہمیں اکثر ایسے حضرات کے پاس جانا پڑتا ہے جن سے پہلے کوئی واقفیت نہیں ہوتی۔ اُن میں قسم قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ جنھوں نے بڑی دوڑ دھوپ کے بعد کوئی کام کی چیز کھوج نکالی ہو۔ ایسے لوگ جنھیں اتفاقاً یا قسمت سے کچھ مل گیا ہو اور [illegible] عرض ہے۔" اُس نے کسمساتے اور مسکراتے ہوئے کہا "ہمیں ایسے لوگوں سے بھی واسطہ پڑتا ہے، کسی اور طرح بعض نوادر جن کے ہاتھ آ گئے ہیں۔" قطب الدین نے فوراً معذرت چاہی اور تیزی سے بولا "عرض یہ ہے کہ چیز چاہے کسی بھی ذریعے سے آئی ہو، رازداری کا خیال فطری ہے لیکن کبھی کبھی یہ احتیاط حد سے گزر جاتی ہے، غیر ضروری ہو جاتی ہے اور اچھی چیز اچھے ہاتھوں تک نہیں پہنچ پاتی۔ مثلاً کوئی چیز دیکھ کے ہم بہتر آدمی کی نشان دہی کر سکتے ہیں کہ کہاں اُس کی صحیح قیمت وصول ہوگی۔ یقین کی کوئی صورت تو بہرحال کرنی پڑتی ہے۔ ہم اپنی جانب سے بھی کہہ سکتے ہیں کہ رازداری پر ہمارے کاروبار کا دار و مدار ہے اور وہی ایک گھسی پٹی بات کہ آزمائش شرط ہے۔ آپ ہمیں صرف ایک بار موقع ضرور دیں۔"

"آپ اپنے کو کون سے لوگ میں جانتے ہو؟" جھل نے آہستگی سے کہا۔

"جناب! خدا کے لیے دل پر کوئی میل نہ لائیے۔ ہم نے تو محض تذکرۃً ایک حقیقت عرض کی تھی کہ ہمیں کیسے کیسے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا ہے اور اُن کے دل میں اپنا اعتماد قائم کرنے کے لیے ہمیں کیا جتن کرنے پڑتے ہوں گے۔ کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ہمیں ذریعہ جاننے سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ ہمارے لیے چیز کی اہمیت ہوتی ہے اور اُس شخص کی جس کی تحویل میں ہے۔ لوگوں کو دیکھتے دیکھتے اور یہ کام کرتے کرتے ہماری بھی عمریں گزر گئی ہیں۔ تھوڑی بہت آدمی کی پہچان ہو گئی ہے۔ کوئی اور بات نظر آتی تو ہم دوسری طرح بات کرتے۔"

"پھر کس طرح کا بات کرتا؟" پیرو نے تنک کے کہا۔

"وہ تو صاحب دوسرے ہی لوگ ہوتے ہیں۔ آدمی دیکھ کے بات کی جاتی ہے۔" قطب الدین کے بجائے محمود علی نے اتراتے ہوئے کہا۔

"اگر اپن بولے کہ اپن وہی دوسرا لوگ ہے۔"

"جی، جی، آپ ضرور برا مان گئے۔"

"نہیں نہیں، ابھی بولو، پھر آپ کیسا بات کرے گا؟"

"بات پہلے سے طے نہیں ہوتی جناب والا!" قطب الدین نے کہا۔

"آپ یقیناً مذاق کرتے ہیں۔" محمود علی بولا۔

"اپن ایک دم ٹھیک بولتا ہے۔"

"لگتا ہے، گلی کوئی بھٹک گئی ہے۔ رستے میں کوئی ایک بیچ والا ٹکرا گیا تھا کیا؟" جھل نے سرد لہجے میں کہا "ادھر بیچنے لینے سوا کچھ بھی نہیں ہے اور اس میں بھی اپنے کو تھوڑا شک ہے۔"

"ہم دیکھ بھال کے آئے ہیں جناب!"

"آپ اس قدر وثوق سے کیوں کہہ رہے ہیں؟" تایا جان نے برہمی سے کہا۔

"جناب! عرصہ ہو گیا ہے اس دشت کی سیاحی میں۔"

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"دیکھیے۔" وہ لجاجت سے بولا "ہمیں ایک بار کچھ ثابت کرنے کا موقع ضرور دیجیے۔"

"ہم ابھی کیا بولا، آپ ایک گلی بیچ میں چھوڑ کے آگیا ہے۔ ایدھر کس نے بھیجا ہے آپ کو؟"

"ہمارے اپنے ذرائع ہیں۔ شہر میں نوادر کی نقل و حرکت ہو، کوئی نئی چیز آئے اور ہمیں خبر نہ ہو۔"

"آپ تو اپن کو پولیس کا آدمی لگتا ہے۔"

"لعنت بھیجیے پولیس پہ حضرت۔" محمود علی نے بے ساختہ کہا۔

"پولیس میں بھی ایسا کھوجی لوگ ہوتا ہے۔"

"اسی کھوج سے ہمیں آج ریاست کے سب سے بڑے نوادر فروش کی حیثیت حاصل ہوئی ہے۔ پولیس کھوج لگا کے ہتھکڑیاں ڈال دیتی ہے۔ ہم اس کے برعکس کرتے ہیں۔ ہاں ہم سونے کی ہتھکڑی پہنا دیتے ہیں۔"

"ابھی آپ کیا پیے گا، شربت چائے یا کھانا منگوائے؟"

"شکریہ، بہت مہربانی آپ کی۔"

"نہیں نہیں، ابھی آپ بولو، آپ کی کیا خاطر کرے۔ ابھی کچھ اور نہیں آیا ہے تو ایدھر سے کچھ کھا پی کے جائے۔"

"اس کے لیے تو وقت پڑا ہے جناب! کھائیں گے، پئیں گے

بھی بلکہ جناب سے غریب خانے کو عزت بخشنے کی درخواست بھی کریں گے۔"

ابھی وہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ ملازم کو اندر داخل ہوتا دیکھ کے چپ ہو گیا۔ دونوں ملازموں نے چائے اور ناشتے کا دیگر سامان وغیرہ اُن کے سامنے کی میز پر سجا دیا۔ "یہ آپ نے کیا زحمت کی؟" قطب الدین نے خوش اطواری سے کہا۔ "یوں بھی آپ کو دیر ہو رہی ہوگی۔"

"اپن نے سوچا، ابھی آپ کو تھوڑا نمک کھلا دے۔"

"اوہ! اوہ!" قطب الدین کھلکھلانے لگا۔ "بے شک، بے شک، انشا اللہ حق ہی ادا کیا جائے گا۔ ایک ضروری بات شاید ہم کہہ نہ سکے۔ آپ کے اطمینان کے لیے عرض ہے، آپ چاہیں گے تو بڑی سے بڑی ضمانت بھی پیش کی جا سکتی ہے۔"

"دُنیا کا سب سے بڑا ضمانت ابھی اور کیا ہوئے گا؟"

"ہا ہا!" قطب الدین اُچھل گیا۔ "آپ نے کیا خوب کہا ہے۔"

"ایک بات بولے؟" پیرو نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اپن لوگ شکل سے ایسی کیا لگتا ہے؟"

"جی!" دونوں گھبرا گئے۔ "کیا فرما رہے ہیں آپ؟"

میری رگوں میں خون جل رہا تھا۔ پیرو یہ کیسی باتیں کر رہا ہے، جھل بھی اُسے نہیں ٹوکتا۔ صاف صاف بات کرتے ہوئے منہ کیوں چھوٹ رہا ہے۔ لیکن تھا، پیرو کی زبان سے کوئی اور بات نکل جاتی کہ میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہمیں اب معذرت کر لینی چاہیے۔"

"ہاں ہاں۔" جھل بس سر ہلا کے رہ گیا۔

میری دخل اندازی پر پہلی بار انھوں نے مجھے غور سے دیکھا۔ "ہمیں احساس ہے۔" محمود علی نے اپنی گھڑی ٹٹولتے ہوئے کہا۔ "ہم پھر آ جائیں گے۔ اجازت ہو تو کل آ جائیں؟"

"کل سے کیا فرق پڑے گا۔" ابا جان ترش روئی سے بولے۔ "اگر یہی کام ہے تو آپ کا آنا لاحاصل ہے۔"

"ادھر وقت اکارت کرنے سے اچھا ہے کہ آپ کوئی اور گھر جا کے دیکھو۔" جھل نے دبی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہم آپ کو کس طرح یقین دلائیں کہ آپ . . ."

"اپنے کو سارا یقین ہے پر ہم کیا بولیں۔"

"ابھی لوٹ کے آئے گا۔" پیرو چہکاتے لہجے میں بولا۔ "تو ایسا کوئی چیز کھوج کے آپ لوگ کے لیے ضرور لائے گا۔ آدمی اپن کو آپ کام کا لگتا ہے۔"

"جناب! ہم تو اس وقت کی بات کر رہے ہیں۔"

"اپن کے پاس ایک پُرانا چاقو ہے، بولے تو دکھائے؟"

"براہ خدا جناب کچھ توجہ دیجیے، کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہم یہاں یوں ہی مُنہ اٹھائے چلے آئے ہیں، ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں ہے؟ ہمیں معلوم ہے کہ آپ نے حال ہی میں کیسا مال، تجھر ریاست کے ایک بڑے آدمی کو دیا ہے۔"

"ایسا!" پیرو حیرت سے بولا۔ "پر آپ کو کیسے پتہ لگا؟"

"یہ ہماری روزی کماتے ہیں جناب!" محمود علی کی آواز کچھ لڑکھڑا گئی تھی۔ "بتائیے کیا ایسا نہیں ہے؟"

"ہے، ایک دم ہے۔ اپن جھوٹ نہیں بولے گا۔ پر یہ سالا کس نے آپ کو بولا؟"

"بس یہی ہم سے نہ پوچھیے۔ رازداری ہی پر ہمارے کام، ہماری کامیابی کا انحصار ہے۔ از راہِ کرم یہ ہم سے نہ پوچھیے۔"

"نہیں، آپ بولو، قسم سے اپن کسی سے نہیں بولے گا۔"

"نہیں جناب! ہمیں مجبور نہ کیجیے۔"

"ٹھیک ہے! اپن بھی مجبور ہے۔"

"ویسے تو ہم کسی کا بھی نام لے سکتے ہیں مگر اس سے نہ آپ کو کچھ حاصل ہوگا، نہ ہمیں۔"

"اپن سوچتا ہے، ابھی اپن نے کسی کو کچھ دیا تو سالا کوئی بیچ میں ٹانگ اڑانے والا کون ہوتا ہے۔" پیرو کی آواز بھرنے لگی۔

"قطعاً نہیں۔" محمود علی نے عاجزانہ انداز میں کہا۔ "یہ تو آپ کا اختیار ہے، آپ کچھ لٹا دیں اور رتھول سمجھ کے لٹا ہی دیا۔ ہماری پیش کش کا مقصد آپ کے معاملات میں دخل دینا نہیں ہے۔ ہم تو ایک مختلف بات کر رہے ہیں۔ شاید جناب نے غور نہیں کیا۔"

"اور ایدر اپن سے کر بولا: ایدر آپ بے کار آیا ہے۔ سمجھا، ایک دم بے کار مخول کرتے۔"

"ہمارا خیال ہے، آپ کو سوچنے کے لیے کچھ وقت کی ضرورت ہے۔ کوئی بات نہیں۔" محمود علی متانت سے بولا۔

"آپ کیا بولتا ہے؟" پیرو نے بھڑکتے لہجے میں کہا۔ "ایک بڑی کو کچھ دینے کا مطلب ہے کہ اپن دُکان لگا کے بیٹھا ہے۔ اپن ایدر مٹھی میں بھرا بیٹھا ہے کہ اُس کو دیا ہے تو آپ کو بھی دے گا۔ اپن سے آپ یہ بولانگتا ہے کہ واپس لے کے آپ کے آگے ڈال دے، ایسا!"

دونوں مضطرب نظروں سے پیرو کو دیکھتے رہے پھر اچانک اُٹھ گئے۔ اُن کے اُٹھنے کے انداز میں جتنی تیزی تھی، آواز میں نہیں تھی۔ قطب الدین نے زیر لبی سے زحمت کی معذرت چاہی۔ اُنھوں نے نمک پاروں کے چند دانوں اور چائے پر اکتفا کیا تھا۔ جانے سے پہلے اُنھوں نے سب سے ہاتھ

ملایا۔ محمود علی شستہ سی آواز میں بولا۔ "ہم ایک بار پھر آئیں گے۔"

"اپن کیا بولے۔" پیرو نے مُنہ بنا کے کہا۔ "آؤ ضرور آؤ، بار بار آؤ۔ اپن ایدر ہی ہے پر ایک بات دھیان سے سُن لو۔ لوٹ کے بھی بولے گا تو ویسا ہی اُلٹا جائے گا۔"

دونوں کے ہونٹ پھڑک کے رہ گئے۔ اُن کے ساتھ دروازے سے میں بھی باہر نکل آیا تھا۔ چبوترے تک خاموشی رہی۔ سیڑھیاں اُترتے اُترتے قطب الدین ٹھہر گیا اور دبے ہوئے لہجے میں کہنے لگا۔ "ایک بات زبان پر آ کے رہ جاتی ہے۔ بہرحال ہمارا فرض ہے کہ گوش گزار کر دیں۔ یہ ریاست ہے، یہاں کے رنگ ڈھنگ ذرا مختلف ہیں۔ اگر واقعی کوئی ایسی چیز آپ کے پاس ہے تو احتیاط رکھیے گا۔"

پیرو اُس کے سامنے آ گیا۔ "اپن نہیں سمجھا؟"

"مراد یہ کہ جناب ایک سے ایک بڑا ٹھگ یہاں پڑا ہے۔" قطب الدین نے بل کھاتی آواز میں کہا۔ "اور ایک سے ایک شوقین، مطلب باز، گرگے اُن کے ادھر اُدھر بھٹکتے ہی رہتے ہیں۔ آپ یہاں نو وارد ہیں۔ برنائے احتیاط عرض ہے کہ فیصلہ کرنا ہو تو زیادہ دیر نہ لگائیں۔ چرچا کچھ کم نہیں ہے۔"

"ابھی ایدر آپ کو کس نے بھیجا ہے؟" پیرو نے ترش سی آواز میں پوچھا۔

"نہیں جناب!" وہ جلدی سے بولا۔ "یہ بدگمانی نہ کیجیے۔"

"پھر آپ ایسا ڈر کیوں لگا رہا ہے؟"

"شاید اس لیے کہ ہماری اُمید نہیں ٹوٹی ہے۔"

"ایک دم گھٹے کا ڈرامہ لگتا ہے۔"

دونوں کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے آگ سی بھڑکی لیکن دوسرے ہی لمحے محمود علی نے سنبھل کے کہا۔ "جو آپ مناسب سمجھیں! فی الحال ہم آپ کے گھر میں ہیں۔"

"ہاں قسم ایدر بھی ایسا ہی ہے۔ آپ لوگ گھر میں آیا ہے اپن کو بار بار یہی دھیان سالا اٹکتا رہتا ہے۔"

"ہماری حیثیت طلب گار کی سی ہے اس لیے ہم آپ سے کوئی بحث نہیں کریں گے لیکن یقین کیجیے کہ جرح کے لیے ہمارے پاس شہادتوں کی کمی نہیں ہے۔"

"نہیں نہیں، ابھی آپ سب بول کے جاؤ۔"

محمود علی نے پیرو کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے تھپکی دی اور مسکراتے، لجاتے لہجے میں بولا۔ "اس کا یہ وقت نہیں ہے۔ آپ تو ناراض ہونے لگے۔ میں آپ سے اپنی اور اپنے ساتھی کی کسی بھی تلخ نوائی کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ ہمیں معاف فرما دیجیے۔"

"آپ کیسا آدمی ہے؟" پیرو نے بے بسی سے کہا۔

"کسی وقت بھی آپ کو ہماری ضرورت پڑ سکتی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہ خوشگوار فضا قائم رہے۔" محمود علی عاجزی سے بولا۔ "آپ نے وقت دیا، ہماری گزارش سنی۔ اس کا بہت بہت شکریہ۔ انشا اللہ پھر ملاقات ہوگی۔" یہ کہتے ہی وہ قطب الدین کا ہاتھ تھام کے نیچے اُتر گیا۔ پیرو آگے بڑھ کے کچھ کہنا چاہتا تھا کہ جھل کے اشارے پر ٹھہر گیا۔

"شاید اب نہیں آئے جھل بھائی!" کمرے میں واپس آ کے پیرو تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ہاں دادا! ہو سکتا ہے۔" جھل کی آواز میں یقین نہیں تھا۔

"اپن نے تو بہت کوشش کیا جھل بھائی!"

"اور کیا بول سکتے تھے دادا!"

"میں آپ سے متفق ہوں۔" ابا جان نے پیرو سے کہا۔ "گمان یہی ہے کہ اب انھیں نہیں آنا چاہیے۔ آپ نے انھیں کوئی رائے قائم کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اگر وہ کوئی رائے لے کے گئے ہیں تو وہ اُن کی دانست میں مایوس کُن ہی ہو سکتی ہے۔ میں نے اسی لیے درمیان میں اتنا دخل نہیں دیا تھا۔"

"پر کچھ ٹھیک نہیں ہے بابا!"

اُن کی باتیں سُن کے مجھے احساس ہوا کہ میں نے اچھا ہی کیا جو خاموش بیٹھا رہا۔ مجھے یہی حیرت تھی کہ جھل پیرو کی یہ طول بیانی، فضول گوئی کیوں برداشت کر رہا ہے۔ ابا جان ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔ وہ لوگ بہت منتشر رائے لے کے گئے ہوں گے۔ ابا جان اور جھل فوراً سمجھ گئے، وہ صاف اور سیدھی بات جانے کیوں میرے دماغ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں تو کئی بار پیرو کو ٹوکتے ٹوکتے رہ گیا تھا۔

"ابھی یہ کیدھر سے آ سکتا ہے؟" پیرو نے تردد سے پوچھا۔

"کوئی نواب راجا ہی ہوگا۔" جھل نے تھوڑا گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

"اُسی مہاراجا کی طرف ابھی تمھارا دھیان جاتا ہے؟"

"اور بھی ہو سکتا ہے دادا!"

"ہاں اپن بھی کچھ یہی سوچتا ہے جھل بھائی!" پیرو منمناتے ہوئے بولا۔ "کبھی اپن کے سر میں ایک دم اندھیرا بھر جاتا ہے۔ اپن کے من میں ایک اور بات آتا ہے۔ سوچتا ہے تو اپن کا سر گھوم جاتا ہے۔"

"کیا دادا؟" جھل نے سر اُٹھا کے پوچھا۔

"کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟" ابا جان نے تجسس سے کہا۔

"کچھ نہیں، اپن ابھی کچھ نہیں بولے گا۔"

"بتائیے نا؟"

"کیا ہوئے بابا؟" پیرو نگاہیں چرانے لگا۔

"کیا بات ہے دادا؟" بجھل نے چونک کے پوچھا۔

پیرو چپ رہا۔ جب ابا جان نے بہت اصرار کیا تو اُس نے سر جھکا کے بمشکل تمام اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ ابا جان گُنگ ہو گئے۔ بجھل بھی اُسے گھورنے لگا۔ مجھے بھی پیرو کی صحیح الدماغی پر شبہ ہونے لگا تھا۔ پیرو نے ہکلاتی ہوئی زبان سے نواب حشمت جنگ کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اُس کا قیاس تھا کہ کہیں یہ آدمی نواب حشمت جنگ کی طرف سے نہ بھیجے گئے ہوں۔ ابا جان نے شد و مد سے تردید کی تو پیرو شرمسار سا ہونے لگا۔ ندامت زدہ لہجے میں بولا کہ اُسے خود بھی یقین نہیں ہے۔ کاش یہ اُس کا وہم ہی ہو لیکن اُس نے آدمی کے اتنے چہرے، اتنے رُوپ دیکھے ہیں کہ معدودے چند لوگوں کے سوا اب اُسے مشکل سے کسی شخص پر اعتبار آتا ہے۔ ابا جان کسی حد تک برافروختہ ہو گئے تھے۔ کہنے لگے کہ یہ کیسے ممکن ہے۔ انھوں نے پیرو کو نواب حشمت جنگ کی ایک ایک بات یاد دلائی۔ اُس کی عزت و تکریم، اُس کی جاں گزاریاں اور رخصت کے وقت اُس کی آنکھوں میں نمی وغیرہ وغیرہ گنوا گئے کہ پھر ہماری عدم موجودگی میں یہاں ہمارے متلاشیوں کی آمد کا کیا جواز ہے۔ یہاں سے ہمارے جانے کے پہلے دن نہیں تو دوسرے دن نواب حشمت جنگ کو علم ہو گیا تھا کہ ہم بڑے نواب کی حویلی میں ہیں۔ اُسے اپنے مربیوں کے ساتھ اس ہیرپھیر کی کیا ضرورت ہے۔ کہیں تو کسی موقع پر اُس کے رویے سے اس کھوٹ کی جھلک نظر آتی۔ ابا جان نے پیرو سے کہا کہ انھوں نے نواب حشمت جنگ کے ساتھ اُس سے زیادہ وقت گزارا ہے۔ بجھل اور پیرو کی عدم موجودگی میں بھی تو وہ گھنٹوں اُس کے ساتھ رہے ہیں۔ وہ پیرو کو اُس کی ایک ایک بات بتاتے رہے۔ پیرو نے اُن سے کوئی تکرار نہیں کی بلکہ اُس نے اُن سے معافی مانگی کہ یہ محض اُس کا گمان تھا اور کچھ نہیں۔ یوں ہی اُس کے دماغ میں ایک بات آئی اور اُس کے مُنہ سے نکل گئی ورنہ وہ خود جھجک رہا تھا۔ جو سوال میں اُس سے کرنے والا تھا وہی بات ابا جان نے اُس سے پوچھی کہ آخر کوئی تو شہادت اس وہم کی بنیاد بنی ہوگی؟ پیرو کوئی جواب نہ دے سکا۔ مجھے پیرو پر حیرت ہو رہی تھی۔ گویا منیر علی نے غلط اندازہ نہیں لگایا تھا کہ اب پیرو پر اعصاب شکنی طاری ہے۔ پیرو کو شاید ہم سب سے زیادہ آرام کی ضرورت تھی۔ اُسے اپنے گھر سے نکلے عرصہ ہو گیا تھا۔ اب گھر اتنا دور بھی نہیں رہا تھا۔ ایک رات کی مسافت اُس کی بیٹی، بیوی اور اُس کے درمیان حائل تھی۔ مگر یہ رات نہیں گزرتی تھی۔

پیرو اپنے وہم کی وجہ کا جواب نہیں دے سکا تھا یا وہ بابا کی خاطر جواب دینا نہیں چاہتا تھا۔ ابا جان کی دلیلوں کے سامنے اُسے گھٹا گھٹا دیکھ کے یہ خیال اچانک میرے ذہن میں کوندا تھا اور میرے سینے میں جلتی ہوئی گئی تھی۔ میں نے بجھل کی جانب دیکھا۔ اُس نے پیرو سے ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ پیرو واقعی کوئی بیان ہونے والی بات نہیں کہہ رہا تھا۔ کوئی بعید نہ تھا کہ اس طرح نواب حشمت جنگ ہمارے بارے میں وہ کچھ جاننا چاہتا ہو جو ہم سے ربط و تعلق کی اس فضا میں جاننا ممکن نہیں رہا تھا۔ وہ کھرا اور بے باک، وہ لحاظ اور مروت والا سہی، مگر نواب حشمت جنگ کی نگرانی بھی ہو! یہی کرتا اگر اُس کی حیثیت ریاست کے ایک ادنیٰ سے بھی ادنیٰ اور ایک با ہوش آدمی کی بھی۔ ہم تمام وقت تو اُس کے سامنے نہیں رہے تھے۔ ہم سے الگ ہو کے تو اُس نے سارا وقت اپنے سامنے گزارا ہے۔ مجھے اندھیرے کو جیسے روشنی کے رستے مل رہے تھے۔ ریاست کے ایک اہم منصب دار کی جستجو غیر منطقی نہیں تھی۔ یہ لوگ وارد ہوئے اور جو اُس کے اتنے قریب آ گئے ہیں، کون ہیں، کیا مقصد رکھتے ہیں؟ دیکھا جی ہوٹل میں ابا جان کا قیام، اُس کے پاس کسی غرض کے بغیر اُن کی آمد اور ایک بیش بہا ہیرے کا حفیہ طور پر بہ عجلت خریدا جانا۔ ابا جان کا اپنے بارے میں کچھ بتانے کے سلسلے میں محتاط رہنا۔ پھر اپنے عم زاد بھائی بڑے نواب کی حویلی میں ہماری موجودگی اور خانم سے متعلق، نازکی بازار سے وابستگی کے بارے میں اُسے پہلے سے علم ہوگا اور شاید بڑے نواب سے اُسے یہ بھی معلوم ہو گیا ہو کہ ابا جان اور منیر علی کے ساتھ گوگل بازار کے اڈے پر باقاعدہ آوارہ گردی کرتے رہے ہیں۔ منیر علی اُن کی چاقو زنی کا تماشا دیکھا گیا ہے۔ منیر علی اور ابا جان سے بجھل، پیرو اور کالے وغیرہ کی گہری رفاقت بھی نواب حشمت جنگ کے لیے کئی لحاظ سے حیرت و تجسس کا باعث ہوگی۔ وہ نادر ہیرا اُس نے قبول تو کر لیا تھا کیونکہ ابا جان نے انکار کی کوئی گنجائش نہیں رہنے دی تھی لیکن اس شرفِ قبولیت کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اُس کا ذہن ابا جان کی اس خسروانہ مروت کی غرض و غایت کے سلسلے میں اُلجھتا نہ ہو۔ کہیں یہ تحفہ آئندہ اُس کے رُتبے کے لیے کسی زیاں یا کسی رُسوائی کا سبب نہ بن جائے؟ کہیں اس داد و دہش کے پیچھے ابا جان کا کوئی اور ارادہ نہ چھپا ہو؟

ابا جان نے اُس کی وکالت کرتے ہوئے پیرو سے کہا تھا کہ جب نواب حشمت اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا کہ ہم بڑی حویلی میں ہیں تو دوسرے دن اور گزشتہ کل یہاں میری تلاش میں آنے والے آدمیوں

کا اُس کی طرف سے آنے کا کیا جواز ہے۔ دوسرے دن اُسے اُن آدمیوں کو روک لینا چاہیے تھا۔ پیرو ابا جان کو جواب نہیں دے سکا تھا حالانکہ جواب صاف تھا کہ پھر اُن کی آمد اور ضروری ہو گئی تھی۔ اسی طرح تو نواب حشمت جنگ اپنی بابت ہمارے دلوں میں اُبھرنے والے ہر شبہے کا امکان ختم کر سکتا تھا۔ ایک طرف اُسے ہمارے بارے میں کوئی نتیجہ اخذ کرنے یا ایک اطمینان حاصل کرنے کی بے چینی ہوگی، دوسری طرف اُسے ابا جان سے جڑنے والے تعلق کی پاس داری کا خیال بھی ہونا چاہیے۔ اُس نے بڑے نواب کی حویلی میں ہمیں دیکھنے کے بعد اور اس سے پہلے ابا جان کے ساتھ جس وارفتگی اور تعلقِ خاطر کا اظہار کیا تھا وہ محض ظاہرداری نہیں تھی۔ ظاہرداری ہمیں ضرور محسوس ہو جاتی۔ یہی تو ابا جان پیرو کو باور کرا رہے تھے۔ ہمارے لیے اُس کے یہی احساسات ہوں گے جن کا وہ برملا اظہار کرتا رہا تھا لیکن ان احساسات کے لیے کسی تائید، کسی یقین کی ضرورت اُسے ہر لمحے محسوس ہوتی ہوگی۔ بڑے نواب کی حویلی میں اُس نے نازکی کا اتنا خیال رکھا تھا کہ ہمارے باہمی رشتے جاننے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ صرف میرے اور ابا جان کے رشتے کا اُسے علم ہوا تھا۔ ابا جان نے باقی سب کو اپنے رفقائے کار کے طور پر متعارف کرایا ہوگا۔ یہ ایک نہایت تشنہ تعارف تھا۔ اس تشنگی کا احساس گو اُس نے ہمیں نہیں ہونے دیا تھا لیکن تشنگی تو اپنی جگہ تھی۔ اُس کے عم زاد بھائی نواب عالم تاب کے لیے ہماری طرف سے دوسرا بڑا عطیہ خانم تھی۔ حویلی میں خانم کی آمد اتنا بڑا حادثہ تھی کہ پھر ہم سے کچھ سننے، جاننے، پوچھنے کے لیے ایک جرأت لازم تھی، ایک سنگ دلانہ جرأت۔ پیرو نے ابا جان کو یہی اشارہ کرنا چاہا تھا کہ بہ صورتِ دیگر نواب حشمت جنگ کے پاس ہمارے سلسلے میں اپنے سر کی دُھند دُور کرنے کا یہی چارہ رہ گیا تھا کہ ہمیں شائبہ تک نہ ہو۔ اُسے کسی نتیجے پر پہنچنے تک اس نزاکت کا بہر طور خیال رکھنا چاہیے تھا۔ یقیناً اُس کی خواہش ہوگی کہ سارا تاثر یوں ہی قائم رہے۔ یہ تو ابا جان بھی اچھی طرح سمجھتے ہوں گے۔ اُس کی یہ مصلحت بجائے خود اضطراب کی علامت ہے گویا اُسے اندیشہ تھا کہ مبادا ہمارے پاس معقول جواب نہ ہوں اور اُسے ہمارے سامنے اور ہمیں اُس کے سامنے کسی اذیت ناک مرحلے سے دوچار نہ ہونا پڑے۔

بڑے نواب کی حویلی میں خانم کی آمد نے نواب حشمت جنگ کے ذہن میں رینگنے والے اَن گنت سوالوں کے آگے دیوار سی کھڑی کر دی تھی۔ ظاہر ہے، سوالات ختم نہیں ہو گئے تھے بلکہ اور گہرے ہو گئے ہوں گے۔ شاید اسی لیے نواب نے ہمارے سامنے بطورِ خاص مہاراجا دھرم ویر کا ذکر کیا تھا۔ ہو سکتا ہے، اِن پتھروں سے خود اُس کی رغبت مہاراجا سے کم نہ ہو اور وہ اپنے آدمی بھیج کے ابا جان کے دوسرے ہیروں کی ٹوہ لینا چاہتا ہو۔ ایک ہیرا قبول کر لینے کے بعد اس سلسلے میں مزید گفتگو بھی ممکن نہیں رہی تھی۔ ابا جان خود بتا چکے تھے کہ مہاراجا دھرم ویر نے ان سے ملنے کے بعد کوئی خاص اشتیاق ظاہر نہیں کیا تھا۔ اُن کے خیال میں وہ ایک رسمی ملاقات تھی۔

پیرو نے کچھ نہیں کہا۔ ابا جان نے بجھل سے پوچھا کہ کیا اس قدر رسم و راہ کے بعد نواب حشمت جنگ کی طرف سے اس قسم کی بدگمانی کا امکان ہے؟ بجھل ہنکاری بھر کے رہ گیا۔ ابا جان بھی چپ ہو گئے۔ نو بج چکے تھے۔ کالے، شامو، جمرو وغیرہ میں سے کوئی نہیں لوٹا تھا۔ کمرے میں حبس زدہ سی خاموشی طاری تھی۔ ملازم نے آ کے رات کے کھانے کے لیے پوچھا۔ سبھی نے انکار کر دیا تاہم ابا جان نے اُسے لیموں کا شربت لانے کا حکم دیا۔ چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ ملازم آ گیا۔ لیموں کے شربت میں عرقِ گلاب کی آمیزش کی گئی تھی۔ نہایت خوش ذائقہ شربت تھا۔ میں نے بھی ایک گلاس پیا۔ شربت پینے کے دوران بھی وہ ایک دوسرے سے بے خبر خاموش بیٹھے رہے۔ میں باہر جانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ دفعتاً کالے اور مارٹی نے اندر داخل ہو کے اطلاع دی کہ ایک بڑی موٹر میں کوئی آدمی ابا جان سے ملنے آیا ہے۔

ابا جان کو جیسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا۔ وہ کرسی پر پہلو بدلنے لگے۔ "کون ہے؟" انھوں نے ہذیانی انداز میں پوچھا۔

"اپنے کو کوئی مہاراجا بولتا ہے۔" کالے نے جواب دیا۔

"مہاراجا! مہاراجا دھرم ویر؟"

"ہاں، ایسا ہی نام بولا ہے اُس نے۔"

"مہاراجا اس وقت آئے ہیں؟ تم نے کیا کہا؟"

کالے نے بتایا کہ اُس نے اپنے طور پر کہہ دیا ہے کہ ابا جان شاید سو گئے ہیں لیکن جواب میں مہاراجا نے کہا کہ بہتر ہے، ایک بار اندر جا کے دیکھ لیجیے۔

ابا جان کھڑے ہو گئے اور پیرو کی طرف دیکھ کے پوچھنے لگے۔ "کیا جواب دیں؟"

"ابھی بُلا کے دیکھتا ہے بابا! کیوں بجھل بھائی؟" پیرو نے کسمساتے ہوئے کہا۔

"[illegible] ہے۔ اس وقت منع ہی کر دیں۔" ابا جان نیم ہذیانی انداز میں بولے۔ "کالے تو سونے کا کہہ ہی چکا ہے۔"

"اب نشا ہی دو بابا!" بجھل کی آواز بدلی ہوئی تھی۔

"ہمیں آپ کی مرضی۔" ابا جان نے تذبذب سے کہا۔ "یہی مناسب ہی ہے۔" دوسرے لمحے انھوں نے کانتے سے کہا کہ مہاراجا کو عزت سے اندر لے آئے۔

"ابھی سب لوگ چلتا ہے۔" ہیرو کے بولنے پر ابا جان کو خیال آیا۔ انھوں نے کانتے کو آواز دے کے مہمان خانے کی ہدایت کی۔ جمیل بھی اُٹھ گیا تھا۔ ہم چاروں تیز قدموں سے باہر نکلے تھے۔ ابا جان پر سراسیمگی سی چھائی ہوئی تھی مگر دروازے سے گزرتے وقت وہ ہیرو کو جتانا نہیں بھولے کہ "دیکھا آپ نے، ہمیں نے کیا کہا تھا!"

چبوترے کے باہر سیاہ موٹر کھڑی تھی جو شخص کرسی کے باہر سائبان میں کرسی پر بیٹھا تھا وہی مہاراجا ہمیر ویر ہوگا۔ وہ تن و توش ہی سے مہاراجا لگتا تھا۔ چوڑی دار پاجامے اور شیروانی میں ملبوس۔ شیروانی پر شانوں سے گزرتی ہوئی سلکی شال پڑی تھی۔ سر پر پگڑی اور سامنے پگڑی کے عین وسط میں ہیروں سے جڑا ہوا ایک تمغہ نما طلائی زیور آویزاں تھا۔ پچپن کے قریب عمر، درمیانہ قد، بھاری بھرکم جسم، بھرا ہوا چہرہ، داڑھی چڑھی مونچھیں، گلے میں موتیوں کا ہار پڑا ہوا تھا۔ سانولی رنگت کے باوجود چہرہ دمک رہا تھا۔ ابا جان لپکتے ہوئے اُس کے پاس پہنچے۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں ہیرے کی مانند دمکنے لگیں۔ "ہمیں احساس ہے کہ ہم بے وقت آئے ہیں۔ ہمیں اطلاع دے کے آنا چاہیے تھا لیکن بس اچانک ارادہ ہو گیا۔"

"یقین نہیں آتا کہ مہاراجا غریب خانے پر قدم رنجہ ہیں۔ جناب والا طلب فرما لیتے۔" ابا جان نے اپنے لہجے کی لرزیدگی دور کرنے کی پوری کوشش کی۔

"ہم نے سوچا، اس تکلف کی کیا ضرورت ہے۔ اِدھر دکن میں آپ کی حیثیت مہمان کی ہے۔ ہمیں کو پہلے آنا چاہیے تھا۔" مہاراجا نے تمکنت سے کہا۔ "یوں کہیے کہ ہمارا اشتیاق ہمیں کھینچ لایا۔"

"زہے نصیب۔" ابا جان خوش خلقی سے بولے۔ "مگر اب ہم مہمان کہاں، آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہم نے یہاں گھر بنا لیا ہے۔"

"ہمیں معلوم ہو گیا تھا۔" مہاراجا نے کھل کھلا کے کہا۔ "ہمارے لیے خوشی کی بات ہے کہ شمال سے ایک اور عزت مند گھرانا دکن آ کے بس گیا ہے۔ غالباً آپ کا میسور کی طرف کبھی جانا نہیں ہوا۔ پھر آپ وہیں رہنے کا ارادہ کرتے۔ ریاست حیدر آباد کے دوست ہم سے خفا ہو جاتے ہیں جب ہم ان سے کہتے ہیں کہ یہ تو میسور کے آگے بیابان ہے۔"

"ایک مرتبہ اتفاق ہوا ہے مگر سرسری۔" ابا جان نے کہا۔

"جنوبی ہند سارا کا سارا سرسبز ہے لیکن میسور اور بنگلور کی تو بات ہی اور ہے۔"

"آپ نے دیکھا ہے؟" مہاراجا جوشیلے لہجے میں بولا۔

"دیکھنے کی طرح نہیں دیکھا۔ ایک ضروری کام سے جانا ہوا تھا۔ چند روز قیام رہا لیکن ایک اندازہ تو ہو ہی جاتا ہے۔"

"اس بار آپ ہمارے مہمان بن کے آئیں تو ہم آپ کو دکھائیں کہ اس دیس پر قدرت کتنی مہربان ہے۔"

"ناچیز کے لیے اس سے بڑی عزت کیا ہوگی۔" ابا جان نے سعادت مندی سے جواب دیا۔ ہیرو کے اشارے پر انھوں نے معذرت خواہ لہجے میں مہاراجا سے اندر چلنے کی درخواست کی۔ مہاراجا پہلے ہی اس توجہ کا منتظر تھا۔ ابا جان نے ہاتھ آگے بڑھایا تو وہ چھڑی ٹیکتے آگے بڑھ گیا۔ حویلی کا خاص کمرہ کھول دیا گیا تھا۔ یہ آرائش و زیبائش کے اعتبار سے حویلی کے دوسرے تمام کمروں سے مختلف تھا۔ ہمارے داخل ہونے سے پہلے ملازموں نے روشنیاں جلا دی تھیں۔ دیواروں پر بیلوں اور پھول پتیوں کی شکل میں نصب شیشوں کی وجہ سے کمرہ کسی شیش محل جیسا ہو گیا تھا۔ ساری چھت رنگ برنگی قندیلوں سے جھلملا رہی تھی۔ مہاراجا سامنے کے صوفے پر آ کے بیٹھ گیا۔ جمیل، ہیرو، ابا جان اور میرے سوا کوئی اور اندر نہیں آیا تھا۔

"کیا خوب صورت حویلی ہے۔ ہمیں یاد پڑتا ہے۔ ہم پہلے بھی یہاں آ چکے ہیں۔" مہاراجا نے ستائشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ نے اچھی جگہ منتخب کی ہے۔"

"قسمت سے مل گئی۔" ابا جان انکسار سے بولے۔ "لیکن آپ کو یہاں کا پتہ کس طرح معلوم ہوا؟"

"ہاں۔" مہاراجا نے ہنستے ہوئے کہا۔ "وہ جو ایک شاعر نے کہا ہے، کیا حسب حال کہا ہے۔ بس ایک صدق طلب شرط ہے چنانچہ ہم نے منزل کھوج ہی لی۔"

"ضرور نواب حشمت جنگ صاحب نے بتایا ہوگا۔" ابا جان نے ہنستے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہمارے اُن کے قدیم خاندانی مراسم ہیں۔" مہاراجا شگفتگی سے بولا۔ "وہ ہمارا بہت خیال رکھتے ہیں لیکن انھوں نے ہمیں نہیں بتایا۔ ہم جانتے تھے کہ وہ ہمیں اتنی جلدی نہیں بتائیں گے۔ ہمارے صبر کا امتحان لیں گے۔ ہمیں صبر نہیں تھا سو ہم نے اُنھی کے ذرائع آزمائے اور آخر کامیاب ہو گئے۔"

"یہ کوئی ایسا راز بھی نہیں تھا۔" ابا جان کے لہجے میں کسی قدر ترشی کی آمیزش ہو گئی تھی۔ "آپ سے اُس روز تو نواب عالم آباد مرحوم کے سوم میں نیاز حاصل ہوا ہی تھا۔ جناب والا اشارہ فرما دیتے۔"

"ہم نے وہ موقع مناسب نہیں سمجھا۔" مہاراجا نے دھیمی آواز میں کہا۔ "لیکن آپ یقین کیجیے، ہم نے اس دن بہت ضبط کیا۔"

"نیاز مند کو حیرت ہو رہی ہے۔" ابا جان اضطراب آمیز وضاحت سے بولے۔ "اس کے لیے مہاراجا کا اشتیاق باعثِ عزت و مسرت ہے لیکن ساتھ ہی کسی حد تک باعثِ تشویش بھی ہے۔ تشویش اس امر کی کہ کہیں والا مرتبت نے فقیر کے متعلق اس کی بساط سے زیادہ نہ سن لیا ہو۔ بہرحال، کھانے کا وقت ہے، جناب والا سے درخواست ہے کہ پہلے دعوت شیراز تناول فرمائیں۔"

"ہمیں افسوس ہے۔" مہاراجا پشیمانی سے بولا۔ "ہم کھانے کے بعد ہی نکلے تھے لیکن کیا، کیا آپ حضرات نے ۔ ۔ ۔ ؟"

"یوں سمجھیے کہ آپ کا انتظار تھا۔" ابا جان نے مسکرا کے کہا۔

"اوہ!" مہاراجا مسرت سے بولا۔ "ہمیں اندازہ تھا کہ ہم کن اہل دل صاحبان کے پاس جا رہے ہیں۔ شاید اسی اعتماد میں ہم نے اطلاع اور وقت کا ایسا خیال نہیں کیا۔ ارادہ کیا اور آ گئے۔"

ابا جان نے پھر اُس کا شکریہ ادا کیا اور کہنے لگے: "ہمیں مہاراجا کے ذوق و شوق کا علم ہو گیا تھا۔ اگر ہم یہ کہیں تو شاید غلط نہ ہوگا کہ مہاراجا کے اوصاف سن سن کے ہمیں خود باریابی کی بے تابی تھی۔"

"یقیناً یقیناً نواب حشمت جنگ کی کارستانی ہوگی۔" مہاراجا کی گول آنکھوں میں روشنی بھر گئی۔ "مگر انھوں نے کتنا کہا ہوگا۔ یہ اُن کی نوازش ہے کہ انھوں نے ہمیں اس غیر معمولی ہیرے کے دیدار سے مشرف کیا۔ وہ دنیا کے نادر ہیروں میں سے ایک ہے۔ ایسے ہیرے ہم نے زندگی میں بہت کم دیکھے ہیں۔ اُس کا نظارہ کر کے ہم سے برداشت کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ ہم نے اُن سے بہت سے سوال کیے۔ یہ جانتے کے باوجود کہ وہ ایسی آسانی سے ہمیں سب کچھ نہیں بتا دیں گے۔ ہوا بھی یہی۔ نواب صاحب کو ہماری کمزوری کا اچھی طرح علم ہے۔ وہ ٹال مٹول کرتے گویا ہمیں ستاتے رہے، ہم سے لطف لیتے رہے۔ اُن کی بے نیازی نے ہمیں اور مشتاق کر دیا۔"

"نواب صاحب قبلہ نے کیا فرمایا آپ سے؟"

"کچھ بتایا ہو تو کہیں۔ ہم نے پوچھا، کون ایسا سخی ہے؟ اس مرد قلندر کا کہاں قیام ہے؟ ہمیں دیدار نہ کرائیے گا؟ بولے کہ جانے والد محترم کے ایک دوست ہیں۔ طبعاً گوشہ نشین ہیں۔ زمانے بعد یاترا کو آئے تھے، ہمارے لیے یہ تحفہ لائے ہیں۔ یہ بتا کے فرمایا کہ سر دست ملاقات مشکل ہے کیونکہ انھیں واپسی کی جلدی ہے۔ البتہ دوبارہ آنے کو کہہ رہے تھے، اس پر ہم آپ سے ضرور ملوائیں گے اور اب بھی اُن سے ذکر کر کے دیکھیں گے۔ ممکن ہے اسی مرتبہ کوئی صورت نکل آئے۔ مگر اسی دوران اُن کے خاندان میں یہ المناک سانحہ ہو گیا اور ہم اُن سے کچھ نہیں کہہ سکے۔"

"انھوں نے سب درست ہی فرمایا۔" ابا جان نے آہستگی سے کہا۔ وہ مخاطب مہاراجا سے تھے لیکن اُن کی نگاہیں ہیرو کے چہرے پر منڈلا رہی تھیں۔

"اُن کا فرمانا اپنی جگہ درست ہے مگر اس طرف ہم اپنے قرار کا کیا کرتے؟" مہاراجا جذباتی آواز میں بولا۔ "آخر ہم نے یہی فیصلہ کیا کہ ہم خود ایک کوشش کر کے دیکھتے ہیں۔"

"ایسا بھی کیا جناب والا؟" ابا جان خفیف سے ہو گئے۔ "ہم مہاراجا کی دل چسپی سے نا آشنا نہیں تھے لیکن ہمیں دل چسپی کی اس شدت کا ذرا بھی گمان ہوتا تو ہم خود حاضر ہو جاتے۔"

"ہم کیا عرض کریں۔ زندگی اُنھی پتھروں کو پرکھتے گزر گئی ہے۔ نواب حشمت جنگ نے چیز ہی ایسی دکھائی تھی کہ ہماری آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ کیا بجلی، تڑپتا ہوا پتھر ہے۔ کیا آب و تاب، رنگ روپ ہے۔ ہمیں اُس دن حسد کی حد تک نواب حشمت جنگ پر رشک آیا۔ وہ ہم سے چھوٹے ہیں اور ایک چھوٹے کی حیثیت سے ہمارا

کرتے ہیں۔ ہمیں اپنا پاس بھی لازم تھا ورنہ جی چاہتا تھا کہ اُن سے چھین لیں۔"

ابا جان نے افسوس کا اظہار کیا۔ "وہ یہ کہہ سکتے تھے کہ اگر اُن کی ملاقات مہاراجا سے پہلے ہو جاتی تو وہ یہ ہیرا اُن کی نذر کر دیتے۔"

"ہمیں یقین ہے، ایسا ہی ہوتا لیکن ایسا ہوا تو نہیں۔" مہاراجا نے بے قراری سے کہا۔ "ہم اسی لیے آپ کے پاس آئے ہیں کہ آپ سے اُس ہیرے کی بابت کچھ جان سکیں اور اگر اب بھی کوئی گنجائش ہو تو آپ سے درخواست کر سکیں۔"

"کیسی گنجائش؟" ابا جان تعجب سے بولے۔

"یہی کہ وہ ہیرا کسی طور ہمیں دست یاب ہو جائے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے! وہ نذر کیا جا چکا ہے۔"

"ہم اس حقیقت سے واقف ہیں لیکن نواب حشمت جنگ سے زیادہ ہم خود کو اس کا مستحق سمجھتے ہیں۔ آپ ہی کوئی صورت نکالیے۔ سمجھیے کہ ہم یہاں آپ کے در پر سوالی بن کے آئے ہیں۔"

"آپ کیا فرما رہے ہیں؟"

"ہم کسی ریاست کے والی نہیں لیکن اس کے سوا جو کچھ بھی ہمارے پاس ہے، ہم اُسے آپ کے اختیار پر چھوڑ دیتے ہیں کہ آپ جو چاہیں ہم اُسے ترک کر دیں گے۔ پلٹ کے اُس جانب نہیں دیکھیں گے۔"

"جناب والا کے علم میں ہے کہ ہم نے یہ ہیرا تحفتاً نواب صاحب کی خدمت میں پیش کیا ہے۔" ابا جان کی آواز اُکھڑی ہوئی تھی۔

"اپنی طلب کا جنون ظاہر کرنے کے لیے ہمارے پاس مال و دولت کی اس پیش کش کے سوا کیا رہ جاتا ہے۔ کوئی اور نقش قائم کرنے کا ہمیں وقت ہی کہاں ملا ہے۔ ہم کہنا چاہتے ہیں کہ اپنی طلب کی بنیاد پر حق ہمارا بنتا ہے۔"

"مگر مہاراجا! یہ سب بعد از وقت ہے۔" ابا جان نے شکستہ لہجے میں کہا۔ "اب یہ چیز ہمارے پاس نہیں ہے۔"

"آپ اُسے واپس بھی لے سکتے ہیں۔"

"یہ جرأت کرنے سے پہلے ہم اپنی زبان قلم کر لیں گے۔"

"ہمیں اسی جواب کی توقع تھی۔" مہاراجا نے ہتھیلی [illegible] کہا۔ "لیکن پھر ہمارے لیے کیا حکم ہے؟"

ابا جان اس بات کا کیا جواب دے سکتے تھے۔ چند لمحوں تک کشمکش و پنج میں پڑے رہے۔ پھر بولے "بہتر ہوگا کہ آپ اس سلسلے میں نواب صاحب ہی سے بات کریں۔ اب یہ اُنھی کی ملک ہے۔ ہمارا کوئی حق نہیں رہتا۔ ہم اسی دن بالکلیہ دست بردار ہو گئے تھے جب ہم نے آتے ہی بصد خوشی نواب صاحب قبلہ کے ہاتھوں میں منتقل کیا تھا۔ آپ کا حق ہم دل سے تسلیم مگر آپ ہی فرمائیے، اب کس طرح ہم اُن کے سامنے اس سلسلے میں لب کشائی کر سکتے ہیں؟"

"آپ نہیں کر سکتے۔ ہم جانتے ہیں یہ آپ کے لیے کتنا مشکل ہے لیکن کیا آپ ہمیں اس گھر سے خالی ہاتھ واپس کر دیں گے؟"

"جی، جی۔" ابا جان کے ہونٹ پھڑپھڑا کے رہ گئے۔ ہم نے پہلے تحمل کی جانب پھر ہیرو کی جانب دیکھا۔ دونوں بُت کی طرح ساکت بیٹھے رہے۔

"کیا ہم بھی نواب حشمت جنگ کی طرح آپ کے متعلق خاطر بھی نہیں ہو سکتے؟" مہاراجا نے بے اختیارانہ لہجے میں کہا۔

"کیوں نہیں! کیوں نہیں!" ابا جان تیزی سے بولے۔ "ہمارے لیے سعادت ہے مگر کہیں آپ کا یہ خیال تو نہیں کہ ہمارے پاس اس نوع کے دوسرے نوادر؟ . . ."

"ازراہِ نوازش پہلے ہماری تشفی کر دیجیے۔" مہاراجا نے اُن کی بات کاٹ کے تیزی سے کہا۔ "یہ ہمارا خیال نہیں، یقین ہے۔ یہی یقین آپ کے دروازے پر کھینچ لایا ہے۔ یہی تو ہم کہنا چاہتے ہیں۔ جو شخص ایک چھوٹے سے نواب کو محض ایک پرانی ایذا دینے کی گرد پڑی ہوئی ناسازی کی تدبیر کے لیے ایسی بیش قیمت سوغات نذر کر سکتا ہے، اُس کے اقبال و حشم کا کوئی کیا تصور کر سکتا ہے۔"

ابا جان نے درمیان میں دخل دینا چاہا لیکن مہاراجا نے اُن سے معذرت کر لی اور کہنے لگا۔ "ہم نے آپ سے عرض کیا ہے کہ نواب حشمت جنگ کے خاندان سے ہمارے مراسم کی نوعیت کیا ہے۔ اُن کے والد مرحوم کے ساتھ ایک عمر کی رفاقت رہی ہے اور یہی سے نہیں قربت کا یہ سلسلہ ہمارے دادا جی کے زمانے سے جاری ہے۔ ہمارا آبائی وطن جیسور ہے لیکن یہ ریاست ہمارا دوسرا گھر ہے۔ نواب حشمت کی والدہ ہم سے پردہ نہیں کرتیں اور ہمیں اپنے ہی گھر کے ایک فرد کا درجہ دیتی ہیں۔ دونوں خاندان ہمیشہ ایک دوسرے کی خوشی اور غم میں شریک رہے ہیں۔ ہمیں حیرت ہے کہ نواب صاحب کے خاندان سے آپ کے قدیم روابط کا ہمیں کوئی علم کیوں نہیں ہے۔ شمالی ہندوستان میں جہاں جہاں اُن کے سلسلے پھیلے ہوئے ہیں، ہم سب کی نشان دہی کر سکتے ہیں اور اپنے نواب حشمت جنگ، کیا آپ سمجھتے ہیں، ہم اُن کا لہجہ، اُن کی آنکھیں، اُن کا چہرہ نہیں پہچانتے۔ آپ کو نہیں معلوم، وہ ہمارے سامنے آپ کے اپنے قدیم تعلق کا ذکر کرتے ہوئے کیسے متذبذب نظر آ رہے تھے۔"

"یہ امر فطری ہے کیونکہ ہمارا تعلق اُن کے والد مرحوم سے تھا۔" ابا جان کی آواز میں لرزش آ گئی تھی۔

"وہ ایک مرحوم دوست کے فرزند دل بند کو ایک غیر معمولی چیز کی قدر گزاری جاتی ہے۔ یہ پیش کش کوئی ایسا ہی شخص کر سکتا ہے جو اپنے آپ سے بیزار ہو گیا ہو اور فنا کے درجے پر فائز ہو۔ یا کوئی ایسا شخص جس کے انبار میں ایک پتھر کے کم ہو جانے سے کوئی فرق نہ پڑتا ہو یا جسے ان پتھروں کی قدر و قیمت کا کوئی احساس نہ ہو اور اس کا امکان نہیں ہے کیوں کہ نواب حشمت جنگ جیسے صاحب حیثیت اور جوہر شناس کو وہی پتھر پیش کیا جا سکتا ہے جس کی قدر و قیمت کا اچھی طرح تعین کر لیا گیا ہو۔ ان پتھروں کی پہچان نہ ہر کس و ناکس کو ہو سکتی ہے، نہ ہر کس و ناکس اس کی حفاظت کر سکتا ہے۔ ان کے لیے تو کوئی اہلِ نظر ہی چاہیے۔"

ابا جان کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔ اُنھوں نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ مہاراجا کو گھورتے رہے اور میری توقع کے خلاف ٹھہری ہوئی آواز میں بولے: "پھر جناب والا کس نتیجے پر پہنچے؟"

"ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ ہمیں آپ کے پاس چلنا چاہیے۔"

"ایسی صورت میں، آپ کو کم و بیش یہی اندازے قائم کرنے چاہیے تھے تاہم غالباً یہ ضروری نہیں کہ ہم آپ کے سامنے وضاحت پیش کریں۔"

"مطلق نہیں۔" مہاراجا نے بے ساختہ کہا۔ "ہم تو محض اپنی اُلجھنیں بیان کر رہے تھے۔ کیسے کیسے سوال اس دوران ہمارے دماغ میں منڈلاتے رہے ہیں۔"

"معاف کیجیے، اس کی وجہ آپ کی لاعلمی ہو سکتی ہے۔ لاعلمی کی اُلجھن۔ کوئی شبہ نہیں کہ نواب صاحب قبلہ سے آپ کے مراسم قدیم ہیں لیکن ہمارا گمان ہے، ابھی آپ اُس خانوادے سے متعلق بہت سے حقائق سے ناآشنا ہیں۔ بہرحال ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہم نواب صاحب سے اپنے ربط و تعلق کی سند آپ کی خدمت میں پیش کریں مگر کیا واقعی ایسی کوئی جواب دہی یا ثبوت و شواہد ہم پر فرض ہیں؟"

"نہیں نہیں، آپ نے بہت آگے کی بات کہہ دی۔" مہاراجا کے تحمل میں سر مو فرق نہ آیا، نہ اس کے لہجے کی فصاحت میں کمی ہوئی۔ وہ شائبہ تک نہ ہو رہا تھا کہ اس کا تعلق ریاست جیسور سے ہے اور اس کی مادری زبان کوئی اور ہو سکتی ہے۔ مہاراجا نے ہم تینوں کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا تھا جیسے ہم وہاں موجود ہی نہ ہوں۔ اس نے ابا جان سے تخلیے یا خلوت کی خواہش بھی ظاہر نہیں کی تھی۔ ہنستے ہوئے بولا۔ "ہم ثبوت و شواہد کے لیے نہیں آئے، نہ ہمارا یہ کام ہے۔ ہماری بے چینی ایک تو ان پتھروں سے ازلی دوستی کے سبب تھی، دوسرے نواب حشمت جنگ سے ہمارے تعلق کا تقاضا تھا کہ ہم اُن کی حیثیت کے تحفظ کا خیال رکھیں۔ آپ درست فرماتے ہیں۔ اس اضطراب کی وجہ ہماری لاعلمی ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے پہلوؤں پر بھی احباب نے ہماری توجہ مبذول کرائی تھی۔ دیگر امور پر ہمیں خود بھی نگاہ رکھنی چاہیے تھی۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ جناب نے براہِ راست نواب حشمت جنگ کے پاس جانے کے بجائے ہوٹل میں قیام کیا تھا۔ دلکاجی ہوٹل میں اور نواب صاحب سے اُن کے دفتر میں ملنے کی کوشش کی تھی جہاں اپنی مصروفیت کے سبب نواب صاحب نے انکار کر دیا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ نواب صاحب نے گھر پہ ملاقات کا وقت یہ کہہ کر دیا تھا۔ گھر پہ ہی ملاقات ہوئی۔ بعد ازاں ہوٹل ہی میں جناب کا قیام رہا۔"

مہاراجا کو یہ ساری باتیں نواب کے معتمدِ خاص یا ڈرائیور وغیرہ سے معلوم ہو سکتی تھیں۔ ابا جان کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ "اطلاع دینے والے نے یہ بھی آپ کے گوش گزار کیا ہوگا کہ نواب صاحب قبلہ نے ہم سے گھر پر قیام کے لیے بے پناہ اصرار کیا تھا، ہم ہی نے انکار کر دیا کیوں کہ ہمارے ساتھ اور لوگ بھی تھے جن کا نواب صاحب کے ساتھ کوئی علاقہ نہیں تھا۔" ابا جان کی آواز ترش ہو رہی تھی۔ اُنھیں اس صراحت کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے چھپتی نگاہوں سے تحمل کی جانب دیکھا کہ وہ ابا جان کو روکے۔ جواب میں تحمل نے پلکیں موند لیں اور اشاروں اشاروں میں مجھے تحمل کی تلقین کی مگر میری رگوں میں خون ابل رہا تھا۔ ابا جان کہنے لگے: "ظاہر ہے، ایک زمانے بعد ہمارا ریاست کی طرف آنا ہوا تھا۔ ہمارا واسطہ نواب صاحب کے والد مرحوم سے تھا اور ہمیں کوئی اندازہ نہیں تھا کہ اُنھیں والدِ مرحوم کی رواداری کس حد تک ورثے میں ملی ہے۔"

"اور جناب! سن ہمیں تو یہاں تک بتایا گیا کہ آپ نے ہوٹل میں قیام کے کئی دن بعد نواب حشمت جنگ کے دفتر کا رخ کیا تھا۔"

"ہم اُن کی طرف سے مطمئن ہوئے بغیر کس طرح اُن کے دفتر کا رخ کر سکتے تھے، اور بھی بہت سی ناگفتنی مانع ہو سکتی ہے۔" ابا جان کے لہجے میں تلخی نمایاں تھی۔ اکھڑی ہوئی آواز میں بولے۔ "مگر جناب ان باتوں سے کیا حاصل۔ جناب والا کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"کچھ نہیں۔" مہاراجا نے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔ "ہم نے تو سب کچھ اپنی فکر مندی کے اسباب کے طور پہ عرض کیا ہے۔ اس بات

میں ہماری جانب سے یہ تردد و تشویش غیر حقیقی نہیں تھی ہم آپ سے کیا عرض کریں۔ اس کے سوا بھی جانے کتنی باتیں ہمارے علم میں آئی تھیں مگر ان کی تفصیل فضول ہے؟"

"اور کیا؟" ابا جان سے ضبط نہیں ہوا۔ انھوں نے مجسّس سی آواز میں مہاراجا سے پوچھا۔

"چھوڑیے بھی۔" مہاراجا نے بے نیازی سے کہا۔ "اصل میں ہم آپ کو بتائیں کہ ہماری توجہ کا مرکز و محور نواب حشمت جنگ کو آپ کا دیا ہوا عطیہ ہی رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ دوسرے امور ذیلی ہیں۔ پتھروں سے شغل کرتے کرتے سر میں دھوپ اتر آئی ہے۔ ان کے تعاقب میں ہمیں کیسے کیسے عجیب تجربوں سے دوچار ہونا پڑا ہے یہ بھی جانے دیں۔ داستانیں سنانے پر آئیں تو برس بیت جائیں۔ اچھی چیز کے لیے ہم نے کہاں کہاں دشت پیمائی نہیں کی۔ اب کچھ ایسا ہو گیا ہے کہ پتھر ہمیں اپنی طرف بلاتے ہیں۔ وہ دیواروں کے پار ہوں تو ہماری رگ پھڑکنے لگتی ہے۔ لیکن یہاں آنے کا ارادہ ہم نے محض اس کی خواہش ہی میں نہیں کیا ہے۔ مناسب تھا کہ ہم پہلے گرد و پیش کے مختلف زاویوں کا بھی تجزیہ کر لیں۔ تجزیے سے گویا شگون مل گیا، دیگر باتیں بعد کی ہیں۔ ہم آپ سے درخواست گزار ہیں۔ ہمارے اطمینانِ قلب کے لیے بتایئے کہ یہ ناقابلِ فراموش ہیرا آپ تک کس طرح منتقل ہوا؟ ہو سکے تو ہماری یہ وحشت دور کر دیجیے۔"

"بخدا ہمیں حیرت ہو رہی ہے۔" ابا جان نے نسبتاً پُرسکون آواز میں کہا۔ "آپ کا تجسس دیکھ کے ہمیں کچھ کھونے کا احساس ہو رہا ہے۔ اس ہیرے کی قیمت و عظمت کا تھوڑا بہت اندازہ ہمیں بھی تھا لیکن اتنا نہیں جتنا آپ کے اشتیاق سے ہوا ہے۔ بے شک اس ضمن میں آپ کی نگاہ مستند ہے۔ ہم اس بارے میں اتنا کچھ جانتے تو ممکن ہے کوئی دوسرا فیصلہ کرتے اور اسے زیادہ مطلوب و مشتاق ہاتھوں کی نذر کرتے۔ یقین جانیے ہم وہ ہیرا آپ کی خدمت میں پیش کر دیتے مگر اب یہ ذکر ہی بے معنی ہے۔ دی ہوئی چیز کا ملال ہمارے مسلک میں نازیبا ہے جب کہ اس میں صد فی صد ہماری خوشی کو دخل تھا۔ نواب صاحب نے ہم پر کوئی جبر نہیں کیا تھا۔ رہی آپ کے تجربے کی بات اور دیگر امور پر نگاہ کی تو ہمیں نہیں معلوم، ان سے آپ کی کیا مراد ہے۔ بہرحال آپ سے اتنا عرض ہے کہ باقی امور کا تعلق کسی طور بھی اس پیش کش سے نہیں ہے۔ بہتر ہوگا کہ ان پر توجہ نہ دی جائے۔ بین السطور میں بھی آپ نے بہت کچھ فرمایا ہے۔ ان سب کا ایک ہی جواب ہو سکتا تھا کہ ہم اپنی مرضی و منشا میں آزاد ہیں، مختارِ کل ہیں لیکن ہر لمحے آپ کی ذاتِ گرامی پیشِ نظر رہی۔ اس کا احترام ملحوظ ہے۔ اسی لیے ہم خود کو بے بس اور مجبور محسوس کرتے ہیں۔"

ابا جان کی آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔ پہلی مرتبہ ان کے لہجے میں یہ تنبیہ نظر آئی تھی۔ اتنی دیر میں جیسے انھوں نے کوئی فیصلہ کر لیا ہو، جیسے کسی نتیجے پر پہنچ گئے ہوں یا انھیں اب کوئی اور صورت نظر نہ آ رہی ہو۔ یہ شکست خوردگی کی بھی علامت ہو سکتی تھی۔ دو آدمی پہلے آ چکے تھے۔ اب مہاراجا آ گیا تھا۔ ابھی تک کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ آدمی مہاراجا کے کارندے تھے یا کسی اور کے۔ جنجھل اور ہیرے کی خاموشی ابا جان کے دو ٹوک انداز کی تائید ہی ہو سکتی تھی۔ اب نتائج کچھ بھی برآمد ہوں۔ آدمی پہلو تہی ایک حد تک ہی کر سکتا ہے۔ اس اثنا میں ملازم نے چائے اور کھانے پینے کا سامان لا کے رکھ دیا تھا۔ مہاراجا نے چائے پر قناعت کی اور خاموش بیٹھا رہا۔ ابا جان نے اس سے نرم لہجے میں کہا۔ "مہاراجا کے سکونِ قلب کی خاطر عرض ہے کہ ہمیں یہ ہیرا ورثے میں ملا تھا۔ والدِ گرامی کے پاس کہاں سے آیا تھا؟ اس کے متعلق ہم یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن اغلب ہے کہ انھیں اپنے آبا و اجداد سے ورثے میں ملا ہو گا۔ یہاں ریاست میں زندگی کے آخری دن گزارنے کا ارادہ ہے۔ والدِ گرامی کا ارشاد تھا کہ نواب صاحب حشمت جنگ کے خانوادے سے تجدیدِ مراسم کی صورت میں یہاں زندگی ہمارے لیے آسان ہو جائے گی۔ نئی جگہ گھر بنانے اور معززینِ شہر سے تعارف حاصل کرنے سے کئی ضروری مسائل آڑے نہیں آئیں گے۔"

ابا جان نے بڑے اعتماد لہجے میں کہا۔ وہ بڑا کچھ کہہ سکتے تھے۔ مہاراجا کرسی پر سیدھا ہو گیا تھا اور توجہ سے سن رہا تھا۔ ابا جان نے اس سے کہا۔ "آپ نے غور فرمایا؟ ہیرا نواب صاحب سے اپنی رفاقت کی نشانی کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ یہاں آنے کے بعد ہمیں ایک مضبوط و مستحکم اور اقبال مند گھرانے کا تحفظ حاصل رہے۔ ہمارے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ ایک پتھر کیا حیثیت رکھتا ہے۔ پتھر تو پتھر ہی ہوتا ہے۔ ہمارے پاس نہ ہوا، ہمارے کسی محترم، کسی عزیز کے پاس ہوا۔ آپ نے بھی دیگر امور کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان کے جواب میں یہ حویلی کافی ہے۔ ہم نے یہاں یہ حویلی خریدی ہے اور ایک دن دو دن کی بات نہیں۔ ہم یہاں مستقل سکونت کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہم یہاں موجود ہیں اور آپ بھی یہیں ہیں۔ بلاشبہ نواب صاحب قبلہ کے مانند ہمیں آپ کے سلوک کی بھی قدم قدم پر ضرورت پڑے گی۔ اس کے سوا۔" ابا جان تھکی ہوئی آواز میں بولے۔ "مزید ہم آپ سے اور کیا عرض کریں۔"

"ہم نے سُنا ہوا سب محفوظ کر لیا ہے۔" مہاراجا نے کسی قدر وحشت

لہجے میں کہا۔ پہلی بار اس کے چہرے پر لکیریں ابھری تھیں۔ "ہمارے لیے یہ بات اتنی اہم نہیں کہ آپ نے ایک دُور افتادہ تنہا سا کو ایک بیش قیمت پتھر سے نواز دیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ہم اس سے کیوں محروم رہے اور اس سے زیادہ یہ کہ ہم اس کے متعلق اتنا کچھ کیوں نہیں جان پا رہے ہیں۔ اس کا وجود ہیروں سے متعلق ہمارے علم کے لیے ایک آزمائش، ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہمارے لیے یہ ایک علمی اور تحقیقی مسئلہ ہے۔ ہم زندگی بھر پتھروں کے طالبِ علم رہے ہیں۔ ہم بعض پتھروں کے لیے کسی پولیس والے یا کسی عدالت کا درجہ رکھتے ہیں۔ پتھروں سے دوستی کم ہی لوگوں کو راس آتی ہے لیکن ہمارا ان کا معاملہ اب دوستی کی حد سے گزر گیا ہے۔ یہ عشق کی منزل ہے۔ ہم نے ان کی نسلوں اور شاخوں کی درجہ بندی کی ہے۔ ان کے باقاعدہ خاندان ہوتے ہیں، شجرے، تاریخ اور ان کے اپنے کردار ہوتے ہیں۔ یہ کچھ غلط نہیں کہ پتھروں میں سیاروں کی سی خصوصیات ہوتی ہیں۔ عجب نہیں کہ وہ سیاروں ہی کی زمینوں کی سوغات ہوں۔ ازراہِ کرم ہمیں تفصیل بتایئے کہ آپ اس بے بہا پتھر کے بارے میں اور کیا کیا جانتے ہیں؟ ہماری علمی پیاس کے لیے، ہماری سیری کے لیے ذہن پر زور دے کر یاد کیجیے۔ شاید اسی طرح ہمیں کچھ قرار آ جائے۔"

"ہمیں اس سے زیادہ کچھ نہیں معلوم۔" ابا جان نے جھجکتے لہجے میں کہا۔ "والدِ مرحوم نے اسے سپرد کرتے وقت ہدایت کی تھی کہ اگر تم اس کی مناسب حفاظت نہ کر سکو تو کسی صاحبِ نظر، کسی صاحبِ دل کو پیش کر دینا اور کچھ یہ بھی یاد پڑتا ہے، انھوں نے ہمیں اس کی قیمت لینے سے منع کیا تھا۔"

"قیمت لینے سے منع کیا تھا؟" مہاراجا اُچھل کے بولا، دوسرے ہی لمحے وہ بجھ کر رہ گیا۔ "اور کیا فرمایا تھا انھوں نے؟"

"اور کچھ نہیں۔" ابا جان نے بظاہر سادگی سے کہا۔ "مگر جنابِ والا! کیا آپ ہمیں نہیں بتائیں گے کہ آخر وہ پتھر کون سی خصوصیت سے ممیّز و مشرف تھا۔ مہاراجا جیسے جوہر شناس اتنے بے چین ہیں۔ ہماری اطلاع کے مطابق ریاست کے بعض دوسرے نوابین بھی فکرمند ہو گئے ہیں۔"

"یہاں کوئی بھی اتنا نہیں جانتا۔ اُن کی بے چینی نمائشی ہے، حرص و ہوس، حسد کی ہے۔" مہاراجا تند لہجے میں بولا۔ "یہ صرف ہمیں معلوم ہے کہ آپ نے کیسا نادر پتھر نواب حشمت جنگ کو عطا کیا ہے۔ اس کی اپنی ایک تاریخ ہے اور اگر ہمارا قیاس درست ہے تو اس کی ایک طویل اور شاندار تاریخ ہے۔"

"مناسب ہو تو کچھ ہمیں بھی بتایئے ہرچند کہ اب یہ غیر ضروری ہے۔" ابا جان نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔

"کیا بتائیں۔" مہاراجا اضطراری انداز میں بولا۔ "ابھی ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ یہ صدیوں سے گم شدہ ایک پتھر ہے۔ صدیوں سے اس کی تلاش جاری ہے اور یہ صدیوں کی گردشوں کے بعد نمودار ہوا ہے۔ اشوکا کے زمانے سے بھی اس کا تعلق ہو سکتا ہے۔ آپ نے اس کی ساخت پر غور نہیں کیا۔ اس کا ایک حصہ کٹا ہوا ہے جیسے کوئی بڑا پتھر دو لخت کر دیا گیا ہو یا کسی حادثے کے سبب ایسا ہو گیا ہو۔ کٹا ہوا حصہ تراشا نہیں گیا ہے حالانکہ ایسا ہو سکتا تھا۔ اس کی آب و تاب بالکل ترو تازہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے امینوں کو اس کی حفاظت کا پورا احساس تھا۔ ہمیں اس کا دوسرا حصہ بھی دیکھنے کا اعزاز حاصل ہوا ہے۔"

"دوسرا حصہ!" ابا جان نے حیرت سے کہا۔ "وہ کہاں ہے؟"

"وہ برطانیہ میں ہے۔"

ابا جان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ انھوں نے پھر کچھ نہیں پوچھا۔ گھٹی ہوئی آواز میں بولے۔ "کاش ہم آپ کو کچھ اور بتا سکتے۔"

"بہرحال، ہماری درخواست ہے کہ اپنی یادیں کریدنے کی کوشش کیجیے۔ ہم نواب حشمت جنگ سے کہیں گے کہ وہ کم از کم ہمیں اس کا مطالعہ کرتے رہنے کی خاص اجازت عطا فرما دیں۔ ممکن ہے، اس طرح ہم کوئی کڑی ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جائیں۔"

"ہمیں یہاں سے کچھ عرصے کے لیے جانا ہے۔ کوشش کریں گے کہ اس کی بابت کوئی اور سراغ مل سکے۔ آپ سے سب کچھ جان کے ہمیں بھی بے کلی سی ہو گئی ہے۔"

"یہ ایک نہایت عمدہ بات ہو گی۔" مہاراجا نے سر اٹھا کر کہا۔ "ورنہ ہم اپنے طور پر تو جستجو کرتے ہی رہیں گے۔ آپ کو دیگر امور والی بات ناگوار گزری تھی۔ ہمارا تجربہ ہے کہ ادھر ادھر کی ایسی جزئیات، ایسی تانوں بانوں سے گوہرِ مقصود تک رسائی سہل ہوتی ہے۔ پتھروں کی مالک شخصیات کا بھی ہمیں خوب تجربہ ہے۔ بڑے تو یہ لوگ ہوتے ہیں اور متضاد رویوں کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ایک صورتِ حال میں ہر ایک کا ردِعمل جدا جدا ہوتا ہے۔ ہمارا کام پہلے ان کے رویوں اور ردِعمل کا تعین ہوتا ہے پھر اسی نسبت سے ہم اپنا طرزِ عمل طے کرتے ہیں۔ ان میں ایک خصوصیت مشترک بھی ملتی ہے کہ وہ آسانی سے پردے نہیں ہٹاتے۔ بعض تو کسی کیمیاگر کی طرح دوسرے کی شرکت گناہ سمجھتے ہیں۔ سو ہمیں کبھی کبھی ایک شکاری کی طرح ان کا تعاقب کرنا پڑتا ہے۔"

"ہمارے لیے آپ نے کون سا طرزِ عمل طے کیا ہے؟" ابا جان نے

ہنس کے کہا۔ اُن کی ہنسی سے مصنوعی پن صاف عیاں تھا۔

"ہم آپ سے سچ کہیں۔ آپ کی ہر دلیل ہمیں تسلیم ہے لیکن وہ جو ایک مصرع ہے، ہر طبیعت اِدھر نہیں آتی۔ ہمارا یقین ابھی تک متزلزل نہیں ہوا کہ ہم ایک غلط جگہ آ گئے ہیں۔ لیکن یہ شاید ہماری ہی کوئی کوتاہی ہے کہ اپنا اعتماد قائم نہ کر سکے۔ ہمیں شبہ ہے کہ آپ ہم پر اعتبار نہیں کر رہے ہیں۔ ہم اپنے بارے میں صرف اتنا کہیں گے کہ ہمارا خون آمیزش سے پاک ہے۔ ہمیں اس کے خالص ہونے پر فخر ہے۔ جہاں تک سوداگری کی بات ہے، ہم ایک بہترین سوداگر بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ ہمارا سینہ بے شمار رازوں اور امانتوں کا امین ہے۔ اسے خود ستائی پر محمول نہ کیجیے لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہم میں رفاقت کا حق ادا کرنے کی اعلا ترین صلاحیت ہے۔ اور جہاں تک آزمائش اور چیلنج کا تعلق ہے، ہم خندہ پیشانی سے ہر وقت اس کے لیے تیار رہتے ہیں۔ چیلنج قبول کرنا ہمارا مشغلہ ہے۔ اپنے تمام اوصاف کے باوجود ہم بہرحال ایک انسان ہیں اور انسان کی کچھ حدود ہوتی ہیں۔"

ابا جان اُس کی صورت دیکھا کیے پھر بھرّائی آواز میں بولے "ان کلمات کے جواب میں ہمارے پاس آپ کے لیے احترام اور عزت کا اظہار ہے۔ ہمیں اپنی رفاقت کے طلب گاروں ہی میں سمجھیے۔ اجازت ہو تو ہم آپ سے عرض کریں کہ ہم بہت بے وصف لوگ ہیں۔ آپ آئے تو صحیح جگہ ہیں مگر غلط تصور میں۔ آدمی بھی بہت انمول ہوتے ہیں۔"

مہاراجا چند لمحے بے سدھ سا بیٹھا رہا پھر دفعتاً کرسی سے اُٹھ گیا۔

"کیوں، کیوں جناب والا! آپ اُٹھ کیوں گئے؟" ابا جان نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کیا ہماری زبان سے کوئی ناگوار خاطر...؟"

"نہیں، نہیں! آپ کا بے حد شکریہ۔ آپ نے اتنا وقت دیا۔ ہم کھانے اور آرام کے وقت حارج ہوئے تھے۔" مہاراجا سنجیدگی سے بولا۔ "آپ سے دوبارہ مل کے خوشی ہوئی۔ امید ہے جلد ہی پھر ملاقات ہو گی۔"

"ہم حاضر ہوں گے۔" ابا جان نے بے تابی سے کہا۔

"کب تک یہاں سے جانے کا ارادہ ہے؟"

"ابھی کچھ طے نہیں ہے لیکن جلد ہی۔" ابا جان نے ہچکچاہٹ سے کہا۔

"ابھی شاید دیر لگے۔" جنگل نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔ مہاراجا نے گھوم کے اُس کی طرف غور سے دیکھا اور مسکرا کے رہ گیا۔

"واقعی ہیں۔ آپ ہمیں مہمانی کے لیے کچھ وقت دیں گے۔" دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے وہ بولا۔

"ضرور ضرور، یہ تو ہمارے لیے عزت ہے۔" ابا جان نے کہا۔

مہاراجا کمرے سے نکل کے چبوترے پر آ گیا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا سامنے کھڑی ہوئی موٹر میں بیٹھ گیا۔

کالے اور مارٹی کمرے کے باہر ہی ٹہلا کیے تھے۔ وہ مہاراجا کے جاتے ہی لپکتے ہوئے ہمارے پاس آ گئے۔ کالے بہت بے قرار نظر آ رہا تھا۔ اُس سے ایک لمحے بھی چپ نہ رہا گیا، آتے ہی جنگل سے پوچھنے لگا "سب ٹھیک تو ہے استاد؟"

"ہاں رے!" جنگل نے مسکراتے لہجے میں جواب دیا۔

"کون تھا یہ؟"

"کوئی بے تاج کا بچا۔"

کالے ہنسنے لگا۔ جنگل نے اُسے گھور کے دیکھا تو اُس کا سارا جسم بل کھا گیا۔ اچھا ہوا، کالے اُس وقت جنگل کے سامنے سے ہٹ گیا۔ اسی دوران پیرو جنگل کی کمر پہ ہاتھ رکھ کے آگے بڑھ گیا۔

میرا خیال تھا، کمرے میں واپس آ کے ابا جان پیرو سے ضرور پوچھیں گے کہ اب اُس کی کیا رائے ہے لیکن وہ کرسی پر سر جھکائے بیٹھے رہے۔ انھوں نے کسی سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ ممکن ہے مہاراجا کی باتیں سن کے اب انھیں ملال ہو رہا ہو کہ انھوں نے نواب حشمت جنگ کو پیش کرنے میں ایسی عجلت کیوں کی۔ اُن کے پاس تھیلی میں اور بھی ہیرے تھے۔ ہو سکتا ہے سوچ رہے ہوں کہ انھوں نے کوئی دوسرا، دو درام کم وزن والا پتھر کیوں نہ منتخب کر لیا۔ مارٹی اور کالے بھی ہمارے پیچھے پیچھے اندر آ گئے تھے۔ تھوڑی دیر میں شامو اور جبرو بھی چپکے سے آ کے بیٹھ گئے۔ اُن کے اضافے کے باوجود کمرے پر چھائے ہوئے سناٹے میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ بہت دیر بعد پیرو کی آواز نے یہ خاموشی توڑی۔ جو سوال ابا جان کو پیرو سے کرنا چاہیے تھا، وہ پیرو نے جنگل سے کیا۔ "ابھی کیا بولتا ہے جنگل بھائی؟"

"کیا بولیں دادا!" جنگل نے حقے کا کش لیتے ہوئے کہا۔

"ابھی ٹھیک سے گیا ہے نا وہ راجا کا بچہ؟"

"دکھائی تو ایسا ہی پڑتا تھا دادا۔"

"ہاں قسم! اپن تم کو دیکھ کے رہ جاتا تھا۔" پیرو کھل کے بولا۔

"لگتا ہے، ادھر کچھ دن اور رہ گیا تو سب بھول جائے گا یہ زبان، ابھی تو پیرا ابھی سب اٹک کے رہ جاتا ہے جنگل بھائی! اپن اور دو روٹ کے آدھا بھی نہیں رہے گا۔"

"اپنا بھی کچھ یہی ہے دادا۔"

"استاد!" کالے دبی دبی آواز سے بیچ میں بولا۔ "ابھی تم کو ایک

بات بولنا تھی!"

"لگتا ہے کہ تیری پھر کھجلی اُٹھی ہے؟"

"قسم سے استاد! منہ کی بات چھین لی۔ کمر کیا سے سیدھی ہوئی، بھتّائے دن بھی گئے ہو گئے۔" کالے تیز لہجے میں بولا۔ "بعد کو تو من میں آئے کر لینا، پر پہلے اپنی بات ذرا دھیان سے سن لو۔"

"کیا ہے دادا؟" پیرو نے نرمی سے پوچھا۔

"دادا!" کالے نے دبی آواز میں کہا۔ "ابھی ہم لوگ باہر تھوڑی ہوا کھانے کو نکلے تھے، اُدھر اپنے کو شبہ ہے کہ آدمی لگے ہوئے ہیں۔"

جنگل کی تند نظریں اُس پر مرکوز ہو گئیں۔ "کیا بولتا ہے؟"

"ہاں استاد۔" کالے نے نگاہیں چرا کے بولا۔ "مارٹی سے پوچھو، اِدھر کوئی کسی دولا سے اُن کو چکر کھاتے دیکھ رہا ہے۔"

ابا جان بھی چونک پڑے۔ "کیا کہہ رہے ہو کالے؟"

"ہاں بابا! اپنے کو ایک نہیں، اِدھر کئی آدمی پر شبہ ہے۔"

"تم نے اپن کو پہلے کیوں نہیں بولا ماسٹر؟" پیرو نے جھنجھلائے لہجے میں مارٹی سے پوچھا۔

"اپن بولنے ہی کو تھا۔" مارٹی نے سراسیمگی سے کہا۔ "اپن سوچا، ابھی تم تھوڑا ایزی ہو جاؤ۔ ایک دم سب تھکا ہوا لگتا تھا۔"

"ماسٹر! تم ایک دم اُلّو کا پٹھا ہے۔" پیرو کو ابا جان کا بھی خیال نہ رہا۔ وہ مارٹی کو گالیاں دینے لگا۔

"ذرا صبر سے۔" ابا جان نے دھڑکتی آواز میں کہا اور مارٹی سے پوچھا "تمھیں کیسے شبہ ہوا؟ کتنے آدمی ہیں؟ کب سے وہ انھیں دیکھ رہا ہے؟" مارٹی نے جھجکتی زبان میں انھیں بتایا کہ وہ کوئی چار روز سے انھیں دیکھ رہا ہے۔ ابھی وہ ٹھیک طرح تین آدمیوں کی نشان دہی کر پایا ہے۔ اُن کی ڈیوٹیاں بدلتی رہتی ہیں۔ ایک تو دن بھر نکڑ پر واقع پان اور بیڑیوں کی واحد دکان کے ارد گرد منڈلاتا رہتا ہے۔ اُس نے بتایا کہ انھوں نے چوں کہ کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی اس لیے وہ بھی چپ رہا۔ اُسے ہم لوگوں کی واپسی کا انتظار تھا۔

مارٹی کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ پیرو اُٹھ گیا۔ "اپن کے ساتھ چل ماسٹر! اپن بھی اُس کو دیکھنا مانگتا ہے۔"

جنگل بھی اُٹھ گیا۔ ابا جان بھی ہمارے ساتھ باہر آنا چاہتے تھے لیکن پیرو نے انھیں روک دیا۔ مارٹی اور شامو بھی اُن کی وجہ سے ٹھہر گئے۔ مختصر یہ کہ جنگل، پیرو اور کالے باہر نکلے۔

رات کے گیارہ بجے ہوں گے۔ دوسری حویلیوں کی روش کے مطابق اونچے فصیل نما دالان کے ایک پٹ میں کھڑکی جیسا ایک دروازہ بھی بنا ہوا تھا — چوکی دار نے وہی کھول دیا۔ باہر نکلتے ہی کالے نے سامنے کی طرف اشارہ کیا۔ ہم نے بھی دیکھ لیا تھا۔ سڑک کے اُس پار سامنے والی حویلی کے میدان میں ایک ٹھیلے والا موجود ہے۔ آگے بڑھنے کے بجائے ہم اردگرد کا جائزہ لینے کے لیے کچھ دیر تک وہیں کھڑے رہے۔ حویلی کے آگے گزرنے والی سڑک دروازے سے کچھ فاصلے پر تھی۔ یہ سڑک دونوں طرف سے گھِرے ہوئے ایک میدان کے بیچ سے گزرتی تھی۔ میدان میں کہیں کہیں درخت اور جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں اور ہر جانب خاموشی طاری تھی۔ نکڑ پر پان اور بیڑیوں کی دکان بھی بند ہو گئی تھی۔ یہ سارا علاقہ بڑے بڑے مکانات، کوٹھیوں اور حویلیوں پر مشتمل تھا۔ رات کو ویسے بھی یہاں سکوت چھا جاتا ہو گا۔ سڑک پر نصب کھمبوں کی قطار کے علاوہ مکانات کے جلتے قمقموں نے یہاں سے وہاں تک سڑک روشن کر رکھی تھی لیکن درختوں کی وجہ سے سڑک پر روشنی دھبوں کی شکل میں پڑ رہی تھی۔

آج رات کو اس جگہ ٹھیلے والے کی موجودگی بے سبب نہیں ہو سکتی تھی۔ اس پر کاربائیڈ کا مشعل نما چراغ روشن تھا اور رنگ برنگ پھلوں کا ڈھیر اور گنڈیریاں وغیرہ دور سے صاف نظر آ رہی تھیں۔ دو آدمی ٹھیلے والے کے پاس کھڑے تھے۔ اُن کا رخ ہماری طرف نہیں تھا۔ پھر ٹھیلے والے نے ہی اشارہ کیا ہو گا، ابھی وہ دونوں تیزی سے پلٹ پڑے۔ عین اسی لمحے ٹھیلے والے نے ہانک لگائی۔ اُدھر سے سائیکل کی گھنٹی کی آواز آئی۔ ٹھیلے پر کھڑے ہوئے دونوں میں سے ایک آگے بڑھ گیا اور سائیکل سوار ہماری جانب سرسری انداز میں دیکھتا ہوا ٹھیلے والے کے پاس جا کے ٹھہر گیا۔ پیرو کی ہدایت کے مطابق ہم لوگ دائیں طرف نکڑ کے راستے پر چل دیے تھے۔ وہ دونوں بھی ہماری مخالف سمت نکل گئے۔ کچھ دور جانے کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ کالے ٹھیک کہہ رہا تھا۔ سڑک پر سائیکلوں کی گھنٹیوں کی آواز بڑھ گئی تھی اور ٹھیلے والے کی ہانک بھی۔ نکڑ تک ہمارے پہنچتے پہنچتے دو سائیکل سوار اِدھر سے اُدھر تیزی سے گزر گئے تھے۔ رات میں اُن کی پہچان مشکل تھی۔ سردی کی خنکی کی حد تک تھی لیکن ایک سائیکل سوار نے جسم پر چادر لپیٹ رکھی تھی، دوسرا اوورکوٹ جیسے کسی لباس میں ملبوس تھا۔ نکڑ اصل میں ایک چوراہا تھا۔ اس کے بائیں طرف کی سڑک پر کچھ آگے جا کے ایک چھوٹا سا بازار تھا۔ وہاں ہوٹل، مٹھائی اور پان کی دکانیں شاید کھلی ہوئی تھیں۔ اب تک تیز روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ ہم اُس طرف نہیں گئے بلکہ نکڑ سے دائیں طرف اپنی حویلی کی چار دیواری کی طرف مڑ گئے۔ ہماری حویلی کی چار دیواری اور پڑوس کی دوسری حویلی کی چار دیواری کے درمیان ایک کشادہ اور غیر آباد گلی تھی۔ یہاں بے تحاشا جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں اور گہرا اندھیرا غالب تھا۔ اس جگہ آسانی سے کئی آدمی چھپ سکتے تھے لیکن ہم اُن کی تلاش میں نہیں گئے کیوں کہ وہاں اُن کے چھپنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔

تانگے، دو موٹریں، ایک سائیکل رکشا، کئی سائیکل سوار اور چند پیدل آدمی بھی سڑک پر گزرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک پر شبہ کیا جا سکتا تھا۔ حویلی کے صدر دروازے کے سامنے والی سڑک آگے دونوں جانب دور تک چلی گئی تھی۔ ادھر اُدھر دوسری بستیوں تک جانے کے لیے یہی ایک عام راستہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں ابھی تک آمد و رفت جاری تھی۔ ہم بھی اس سڑک سے گزرتے ہوئے جیسے نواب کی حویلی سے واپس آئے تھے۔

جہاں ہماری حویلی کی چار دیواری ختم ہوتی تھی وہاں سے چند گز آگے جا کے کالتے رک گیا اور مجھ سے سرگوشی میں پوچھنے لگا۔ "دیکھا لاڈلے؟"

"دیکھ رہا ہوں۔" میں نے خشکی سے جواب دیا۔

"تو کیا سمجھتا ہے ان لوگوں کا کیا مطلب ہے؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"کوئی تو مطلب ہوگا لاڈلے!"

"ابھی تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ حویلی آنے جانے والوں پر اور ہماری نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ ان کا کوئی اور مقصد ہوتا تو وہ راستے میں روکنے ٹوکنے کی ضرور کوشش کرتے۔"

کالتے مجھ سے ایسے پوچھ رہا تھا جیسے ساری باتوں کے جواب مجھے معلوم ہوں۔ ہم دوبارہ سڑک پر آ گئے۔ ہم دونوں ہی چوکنا تھے۔ چلتے وقت مارنی نے چپکے سے چاقو میرے حوالے کر دیا تھا اور میں نے واسکٹ کی اندرونی جیب میں ڈال لیا تھا۔ سگرٹ سے واپسی کے راستے میں کالتے نے مجھ سے پوچھا کہ اگر میری مرضی ہو تو وہ کسی کو روک کے دیکھے۔ میری کچھ عقل میں نہیں آ رہا تھا۔ اتنے میں ایک سائیکل سوار سگریٹ پھونکتا ہمارے قریب سے گزرا۔ میں کالتے سے کہنے والا تھا کہ کسی کو روکنے ٹوکنے سے پہلے بہتر ہے میرا اور جمیل سے مشورہ کر لیا جائے مگر کالتے نے سائیکل سوار کو آواز دے دی۔ آواز سننے کے باوجود وہ فوراً نہیں رکا۔ اس کا فیصلہ اس نے کچھ دور جا کے کیا۔ سائیکل ٹھہرا کے اس نے ہماری طرف دیکھا اور گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "کیا بات ہے؟"

کالتے نے اس سے جلتا ہوا سگریٹ مانگا اور اپنی جیب سے بیڑی کا بنڈل نکال لیا۔ سائیکل سوار نے سگریٹ کے بجائے ہیں ٹونٹوں کے ماچس کالتے کے آگے کر دی۔ میں نے اچھی طرح اس کا چہرہ دیکھ لیا تھا۔ اس کی عمر تیس اور پچپن کے درمیان ہوگی۔ رنگت سیاہ تھی اور آنکھیں گہری گہری۔ نہ وہ اڈے کا آدمی معلوم ہوتا تھا، نہ پولیس سے اس کا تعلق ہو سکتا تھا۔ ماچس دیتے ہوئے بھی اس کے انداز میں گھبراہٹ تھی۔ کالتے نے ایک تیلی جلا کے دانستہ بجھا دی تھی۔ دوسری تیلی سے بھی اس نے یہی سلوک کیا اور منہ بناتے ہوئے کہنے لگا۔ "سردی بڑھنے لگی ہے۔" سائیکل سوار چپ رہا۔ کالتے نے تیسری تیلی جلا کے بیڑی سلگائی اور اس کا شکریہ ادا کیے بغیر اس کو واپس کر دی۔ "ادھر قریب کوئی پان بیڑی کی دکان ہوگی استاد؟" کالتے نے اس سے پوچھا۔ سائیکل سوار نے چند لمحوں کی جھجک کے بعد جواب دیا کہ کچھ فاصلے پر پل کے برابر والی دکان کھلی ہے۔

"آپ کیا وہاں ہی لگ کے آ رہے ہو؟"

سائیکل سوار کالتے کے غیر متوقع سوال پر جھکا کر بولا۔ "ہاں ہاں۔" پھر فوراً اس نے ترمیم کی اور خالص حیدرآبادی لہجے میں بولا۔ "نئیں بابا، اپن ایسے ہی اپنے کام کو جاتے ہیں۔"

مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں کالتے کے ذہن میں کچھ اور نہ سما جائے اور وہ اس پر ہاتھ نہ چھوڑ بیٹھے۔ کوئی منزل ہی کام دکھاتی پڑ رہا ہے۔ کالتے طنزیہ انداز میں اس سے بولا۔ "تو ایسے کیسے باہر نکلے ہو بابا!"

روشنی اتنی زیادہ نہیں تھی لیکن اس کے چہرے کے نقش و نگار آسانی سے دیکھے جا سکتے تھے۔ کوئی اور ہوتا تو کالتے کے اس انداز بیان پر اس سے الجھ پڑتا۔ اس شخص کی آنکھوں سے بے چینی ہویدا ہونے لگی تھی جیسے وہ رسی تڑا کے بھاگ جانے کی فکر میں ہو۔ کالتے نے اسے گھٹنے کے لیے پراسرار نظروں سے مجھے دیکھا۔ وہ میرے اشارے کا منتظر تھا۔ میں نے آنکھوں آنکھوں میں اسے منع کرنا چاہا۔ کالتے کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کے گریبان پر ہاتھ ڈال کے اسے سائیکل سے نیچے گھسیٹ لے۔ "کوئی ایسی ویسی بات ہو تو ایمان سے اپنے کو بولو۔" کالتے آنکھ مار کے بولا۔

"آپ کیا آ کیا بول رہے ہو حضرت؟" اس شخص نے عاجزی سے کہا۔

"سچی بولیں، اپنے کو کچھ کالا لگ رہا ہے پہلوان!"

"کیسا کالا حضرت!"

اس شخص نے بڑبڑاتے ہوئے پیڈل پر پاؤں مار کے بھاگنا چاہا لیکن کالتے نے پہلے ہی سائیکل کا ہینڈل تھام رکھا تھا۔ سائیکل لہرا کے رہ گئی۔

"ایسی جلدی بھی کیا ہے۔"

"ہم کو جانے دو حضرت۔" وہ احتجاج کرتے ہوئے بولا۔

"کس کو ادھر روکا ہے۔" کالتے نے ڈھٹائی سے کہا۔

"ہم کو معاف کرو صاحب!" سائیکل سوار نے منت کی۔

"کاہے کی معافی؟"

"ہم کو دیر ہو رہی ہے۔"

"ادھر جانے کا ہے؟"

"ہم بولے حضرت، ہم گھر کو جا رہے ہیں۔"

"ہمیں تو پوچھ رہے ہیں استاد، کوئی مال وال کا چکر ہے، کچھ اور؟"

"نئیں حضرت۔" وہ بری طرح سٹپٹا گیا۔ "آپ کیا سمجھ رہے ہو؟"

"پھر کوئی پولیس چھم رہی ہے ادھر کیا؟"

"آپ کیا بولتے ہو حضرت؟" وہ بدحواسی سے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا جیسے کسی طرف سے اسے مدد کی توقع ہو۔

"کدھر رہتے ہو تم؟"

"ادھر، ہم یہیں قریب رہتے ہیں۔"

"قریب کدھر؟"

"اس طرف پیچھے گلی میں۔"

"پھر ادھر تمہاری ماں کے یار رہتے ہیں کیا؟" کالتے نے جان بوجھ کے رکیک بات کی۔ سائیکل سوار کی آنکھوں میں چنگاریاں سی بھڑک اٹھی تھیں لیکن دوسرے ہی لمحے بجھ گئیں۔ "کیوں ناحق کیوں خفا ہو گئے؟ ایسا کیا ہے کیا؟"

"آپ کو ضرور کوئی دھوکا ہو گیا ہے حضرت۔"

"پھر تم اپنے کو دیکھ کے آتا کیوں اتنا گھبرا گیا ہے؟"

"نئیں یارا صاحب! ایچی کوئی غلطی دیکھی ہے آپ نے! ہم جیسے سادے آدمی، غریب آدمی ہیں۔" وہ گھگھیا کے بولا۔ اس سے صحیح طرح بات بھی نہیں ہو رہی تھی۔

"وہ تو ہم بھی دیکھ رہے ہیں، تم کتنے نیچے اوپر ہے۔ دھوکا تم کو ہو رہا ہے سور کی اولاد!" میں نے کالتے کا ہاتھ دبا کے اسے روکا۔ کالتے بھٹکا جا رہا تھا۔ ہمیں اپنی جانب سے کوئی پیش قدمی نہیں کرنی چاہیے تھی حالانکہ کالتے کی طرح میرا بھی جی یہی چاہتا تھا کہ اسے سائیکل سے نیچے گھسیٹ لوں۔ کالتے نے جھٹکا دے کے سائیکل کا ہینڈل چھوڑ دیا۔ "ہم اپنے کو تھوڑا قسمت کا تیز لگتا ہے۔ پر اپنے کو دوبارہ ادھر دکھائی دیا تو زبان سے بات نہیں کریں گے۔ جتنا تم زمین سے اوپر ہے نا، اتنا ہی نیچے ہو جائے گا۔"

اس نے کالتے سے کچھ نہیں کہا۔ پیڈل پر پاؤں مارا اور آناً فاناً ہماری نظروں سے دور ہونے لگا۔ اُدھر سامنے سے ایک پیدل شخص بھی تیزی سے اسی کی طرف آ رہا تھا۔ دونوں کا آمنا سامنا ہوا لیکن پیدل شخص کے ٹھہر جانے اور آواز دینے کے باوجود سائیکل سوار کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ گھنٹی بجاتا اس کے پاس سے گزر گیا۔ اس موقع پر گھنٹی کوئی اشارہ بھی ہو سکتی تھی۔ کالتے مجھ سے راستے پوچھنے لگا۔ میرا دماغ خود کام نہیں کر رہا تھا۔ میں اس سے کیا کہتا۔ بہرحال اب اس میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ کالتے نے ٹھیک آدمی پر ہاتھ ڈالا تھا۔ اسے دیکھ کے یہ تجزیہ کرنا بھی دشوار نہیں تھا کہ اس کے دوسرے ساتھی بھی اسی جیسے ہوں گے اور ان کی حیثیت تعمیل کرنے والوں کی ہے، حکم دینے والے دوسرے ہیں۔ حکم دینے والوں نے سردست انھیں صرف حویلی کی نگرانی کے لیے کہا ہے۔ مگر اس نگرانی سے حاصل کیا ہے؟ اس طرح وہ کون سا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ میں جتنا اپنے ذہن پر اصلاح کرنے کی کوشش کرتا تھا وہ اتنا ہی دھندلا جاتا تھا۔ اس سے بہتر تھا کہ ہم جیسے نواب کی حویلی میں ٹھہرے رہتے اور وہیں سے اپنے سفر کو روانہ ہو جاتے۔ ہماری نقل و حرکت اور حویلی میں ہمارے یہاں آنے جانے والوں کو نظر میں رکھنے کے لیے یہ چند لوگ تعینات کیے گئے ہیں تو آگے جلد از جلد اطلاع پہنچانے کا بھی معقول انتظام کیا گیا ہوگا۔ ممکن ہے کیوں، وہ حویلی کے باہر بھی ہمارا تعاقب کا ارادہ رکھتے ہوں گے۔ لہٰذا پھر ان کی تعداد بھی زیادہ ہونی چاہیے۔ اطلاعات پہنچانے اور تعاقب کرنے کے لیے ان کے پاس تیز رفتار سواریوں کا بھی انتظام ہونا چاہیے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ قریب ہی کسی مکان سے ان کا رابطہ ہو جہاں سے دوسرا حکم فوراً جاری کیا جا سکے۔ یہاں سب جیسے جیسے کالونیات ہیں، بعض گھروں میں ٹیلی فون بھی ہوں گے۔ سائیکلیں تو ان کے پاس موجود ہیں، رات کے وقت پیدل نکلنے کی صورت میں انھیں سائیکل کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ میرے ذہن میں طرح طرح کے اندیشے بھی ابھر رہے تھے۔

پیدل شخص بھی ہمارے قریب آ گیا تھا۔ کالتے کے اندر آگ سی لگی تھی۔ میرا ہاتھ دبا کے سرگوشی میں بولا۔ "کیا بولتے لاڈلے! ابھی اس کو بھی دیکھیں، کیسے دانت کا ہے؟"

وہ شخص چلتے چلتے دوسری جانب ہمارے مقابل سڑک کے کنارے ہو گیا تھا۔ قد کا لمبا، چادر کندھے پر ڈالے ہوئے، چہرہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ کالتے کی بازپرس کے بعد سائیکل سوار کا حویلی کے گرد دوبارہ دکھائی دینے کا امکان نہیں رہا تھا۔ اس دوسرے شخص کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جا سکتا تھا۔ میرا بھی یہی جی چاہ رہا تھا لیکن میں نے کالتے کو روک دیا۔ یوں ہم بہ آسانی ان سے ان کے آقا کا نام معلوم کر سکتے تھے۔ آسانی سے نہیں تو ایک کوشش ضرور کی جا سکتی تھی۔ میرے پاس بھی چاقو تھا، کالتے کے پاس بھی ہوگا اور اس کی نوبت بھی نہ آتی۔ کالتے بے اختیار پر جز بز ہونے لگا۔ جمیل اور میرا بھی یہی کچھ جاننے کے لیے باہر نکلے تھے۔ ان کی مشاورت کے بغیر میں خود کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ دونوں کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ ہم واپس حویلی کی طرف اٹھتے رہے۔ اسی اثنا میں پیدل شخص آگے نکل گیا۔ ہم نے مڑ کے دو ایک بار اسے دیکھا۔ وہ سیدھا ہی چلتا رہا مگر موڑ پر جا کے اس نے پشت کے بائیں جانب ایک اچٹتی نگاہ ڈالی ضرور تھی اور بازار جانے والے راستے کی طرف مڑ گیا۔ "لاڈلے!" کالتے بے قراری سے بولا۔ "ادھر اپنے ہاتھوں بہت کھجلی ہو رہی ہے۔ اپنے کو اُن کی گنتی زیادہ نہیں لگتی۔"

"ذرا صبر کرو، جمیل بھائی کو واپس آنے دو۔"

بولا "آپ ایک دم سب ٹھیک بول رہے ہو۔ ابھی کچھ ایسا ہی کر ہو
گا پرا ادھر ایک کیلا نواب حشمت نواب کا اولاد نہیں ہے۔ ادھر گلی گلی
آگے پیچھے ایک سے ایک مستی باز راجا نواب لوگ پڑا ہے۔ اپن کو لگتا
ہے، بات ابھی دور دور تک پہنچ گیا ہے۔"

"لیکن صاف بات ہے۔ میرا جی نہیں چاہتا کہ اس طرح یہاں
سے چلا جاؤں۔" ابا جان نے تلخ لہجے میں کہا۔

"اس میں جی چاہنے نہ چاہنے کا بات نہیں ہے۔"

"کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں یہاں سے جا کے سکون سے رہوں گا اور اس
کی کیا ضمانت ہے کہ میرے جانے کے بعد وہ لوگ آپ سے باز پرس نہیں کریں
گے۔ انھیں معلوم ہے کہ مجھ تک پہنچنے کا واحد ذریعہ آپ ہی لوگ ہو سکتے ہیں
وہ آپ کے لیے قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی کر سکتے ہیں۔"

"اپن کا بات چھوڑو۔ اپن کے لیے کچھ نو انیس ہوگا۔ وہ لوگ اپنا
سے کچھ نہیں جان سکتا اور جانے کے لیے زور دے گا تو اپن اُن کو ریاست
سے باہر بھیج جائے گا اور اس کے بعد دیکھے گا۔ اکیلے میں اپن ان کو
اچھی طرح بھگت سکتا ہے۔ سامنے آپ نہیں رہو گے تو وہ لوگ بھی ابھی
جم کے اپنے آڑ سے نہیں آئے گا۔ ادھر اپن کا پہلا کام یہی ہوگا کہ کسی
طرح ریاست سے باہر نکل جائے۔ ابھی کچھ سمجھ میں آیا بابا!" پیرو نے
نسبتاً اونچی آواز میں ابا جان سے کہا اور کہنے لگا "اپن کو پتہ ہے، ابھی
آپ ابھی کچھ بولو گے پر اپن بھی آپ سے کچھ جان کے بول رہا ہے
مال قسم۔ اپن کو تم ابھی بہت اچھا ہوا لگتا ہے۔"

ابا جان چپ بیٹھے رہے۔ اُن کی پیشانی پر بے شمار شکنیں پڑی
ہوئی تھیں۔ کمرے میں تجمّل اور منیر علی کے سوا سبھی موجود تھے۔ خاصی
دیر بعد ابا جان نے زبان کھولی اور تھکی آواز میں بولے "ہمیں امید کا
دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ رات گزر رہی ہے اب دیر کیا گئی وہ
گئی ہے۔ ایسا ہی ہے تو پھر کل صبح نواب عشرت جنگ یا بڑے نواب کے
ہاں دوبارہ منتقل ہو سکتے ہیں۔ وہاں یقیناً یہاں جیسی صورتِ حال نہیں ہو
گی۔ بہتر ہے کہ اب ہم وہیں سے روانہ ہوں۔ اپنی دوبارہ آمد کا عذر پیش کرنا
ہمارے لیے ایسا دشوار نہیں ہوگا۔"

تجمّل اور پیرو نے پھر اُن سے کچھ نہیں کہا۔ ملازم نے تجمّل کے لیے
تازہ حقّہ لا کے رکھ دیا تھا۔ کمرے میں سلگتے ہوئے تمباکو کی کڑوی میٹھی
خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ایک بجنے کے قریب تھا۔ سب جاگ رہے تھے اور
اس طرح مستعد بیٹھے تھے جیسے انھیں ابھی ابھی کہیں جانا ہو۔ کسی کی آنکھوں
میں نیند کی رمق تک نہیں تھی۔ زورا کی کسی جماہی پر ابا جان نے اُس سے آرام
کے لیے بستر پر جانے کو کہا بھی تھا لیکن وہ وہاں سے نہیں اُٹھا۔ [illegible]

پیرو ملازم کسی تاخیر کے بغیر چائے لے آیا تھا۔ اس وقت سب نشست پر کون
بیٹھے ہنس بول رہے تھے کہ تجمّل کی آواز پر سبھی چونک پڑے۔
تجمّل نے ابا جان سے پوچھا تھا کہ پتھروں کی پوٹلی انھوں نے کہاں محفوظ
کی ہے۔

"وہ ... وہ میرے پاس ہے۔" ابا جان نے بے خیالی سے جواب دیا۔

"ادھر اندر ہی ہے کیا؟"

"ہاں ہاں۔" ابا جان نے گھبرائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

تجمّل نے اُن سے کہا کہ پوٹلی اُس کے حوالے کر دی جائے۔ ابا جان
سمیت سبھی حیرانی سے اُس کا منہ تکنے لگے۔ چند لمحوں کے تذبذب کے بعد
ابا جان اپنی کرسی سے اٹھ گئے اور ایک لفظ کہے بغیر کمرے سے نکل گئے۔
دوسرے منٹ میں وہ واپس آئے تو اُن کے ہاتھ میں ایک مخمل کی تھیلی تھی۔ اس
میں سے پتھر کھنکنے کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ ابا جان نے پیرو دادا پر پڑھے
والی گرد اور قمیص کے اندر بٹے سے تجمّل کے اندر انھیں دوہرے کپڑے میں
میں محفوظ کر دیا ہوگا۔ یہ پرانی طرز کی کوئی زیادہ بڑی تھیلی نہیں تھی۔ تجمّل
نے اُسے کھولے بغیر ہاتھ میں لے کے اسے تولا۔ اُس کا وزن کچھ زیادہ معلوم
نہیں ہو رہا تھا۔ ابا جان نے تخمینی طور سے چلتے ہوئے چند منتخب ہیرے ہی
ساتھ لیے تھے۔ تجمّل نے تھیلی کھول کے نہیں دیکھی اور پیرو کو اشارہ کر کے ذرا
کھڑا ہو گیا۔ وہ دونوں کمرے سے چلے گئے۔ ہم سب خاموش بیٹھے اُن کا انتظار
کرتے رہے۔ تجمّل اور پیرو کو واپس آنے میں دیر ہو گئی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ
دونوں تھیلی باہر سبزہ زار میں کسی ایسی جگہ محفوظ کر کے آئے ہیں جہاں آسانی
سے کسی کی نگاہ نہ پڑ سکے۔

اسے احتیاط ہی کہنا چاہیے تھا لیکن یہ بے سبب تو نہ ہوگی۔ اس
سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ تجمّل کے ذہن میں کیسے کیسے خدشے سر ابھار
رہے ہیں۔ تجمّل اور پیرو واپس آ کے دوبارہ اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ کسی نے
اُن سے کوئی سوال نہیں کیا۔ دریا اعتراض کیا کہ بظاہر یہ احتیاط حد سے سوا
نظر آتی ہے۔ لیکن تو وہ کچھ نہیں بول رہے تھے۔ وہ اُن کے چہروں پر لکھا تھا
میری طرح اُن سب کے جسم بھی بندھے ہوئے۔ بگڑتے ہوئے معلوم ہوتے
تھے۔ سب بتوں کے مانند بے سدھ بیٹھے تھے۔ وقت رینگ رینگ کے
گزر رہا تھا۔ مجھے یہ رات بھی ختم نہ ہوگی۔ میرا دل بہت گھبرا رہا تھا۔ مجھ
سے وہاں زیادہ دیر نہ بیٹھا گیا۔ گھڑی نے ڈیڑھ کا گھنٹہ بجایا تھا کہ میں
انگڑائی لے کے اٹھ کر باہر آ گیا۔ میرے اٹھنے کی دیر تھی کہ لوگ بھی میرے پیچھے
گئے۔ مارٹی اور زورا بھی چپ چاپ سوار اور صغرا بھی۔ ہم راہ داری سے گزرتے
ہوئے دالان تک آ گئے۔ سامنے حویلی کا سبزہ زار اور اطراف میں چھوٹا سا
باغیچہ سوا تھا۔ حویلی کی بیشتر روشنیاں بجھ چکی تھیں۔ صحت والا حصہ

دروازہ بھی درختوں اور درمیان کے اندھیرے کی وجہ سے چھپ گیا تھا
ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔ اور گرد سیر شورات چھائی ہوئی تھی اور خنکی پہلے سے
بہت بڑھی ہوئی تھی یا اس لیے زیادہ محسوس ہو رہی تھی کہ ہم گرم کمرے
سے اٹھ کے آئے تھے۔ آسمان بادلوں سے گھرا ہوا تھا۔ ہم باہر کھلی
تازہ ہوا میں ٹہلتے رہے۔ تھوڑی ہی دیر میں ہمیں سردی سی محسوس
ہونے لگی۔ پھر مارٹی کے کہنے پر ہم نچلی منزل کے ایک کشادہ کمرے میں چلے
گئے۔ دروازے کے مقابل وسط میں برابر برابر دو بڑی مسہریاں بچھی تھیں۔
مارٹی بتانے لگا کہ اتنی بڑی حویلی اور اتنے بڑے کمروں میں رہتے رہتے وہ
کتنا اکتا گیا تھا۔ مارٹی ادھر اُدھر کی باتیں کر کے ہمیں بہلانے کی کوشش کر رہا
تھا۔ سب ہوں ہاں کرتے رہے۔ کسی کا جی دوسرے سے بات کرنے کو
نہیں چاہ رہا تھا یا کسی کے پاس کہنے کے لیے شاید کچھ نہیں رہ گیا تھا۔

پھر مارٹی اور کاشف پہلے خاموش ہی پڑ گئے۔ زورا میرے ساتھ
مسہری پر آ گیا تھا، اور گہری گہری سانسیں بھر رہا تھا۔ ابا جان کا یہ مشورہ
خالی از عمل نہیں ہے کہ ہم کل صبح بڑے نواب کی حویلی میں چلے جائیں اور
اب وہیں سے روانہ ہوں، اگلی دوپہر یا سہ پہر جیسا بھی مناسب ہو۔ خانم کی موجودگی
کی وجہ سے ہم کسی وقت بھی وہاں جا سکتے ہیں۔ ہماری دوبارہ آمد کچھ ایسی
محسوس نہیں کی جائے گی بلکہ بڑا نواب تو اور خوش ہوگا۔ وہاں جانے سے
معاملے کی نوعیت بڑی حد تک بدل جائے گی۔ بڑی بیگم بھی بہت حیران ہوں گی
اور یقیناً بہت خوش بھی۔ چلتے وقت اُن کی روتی ہوئی آنکھیں یہی کچھ تو کہہ
رہی تھیں۔ اُسے دیکھے ہوئے پورا ایک دن بھی نہیں گزرا مگر معلوم ہوتا ہے
جیسے زمانہ بیت گیا ہو۔ اس طرح مجھے بھی ایک موقع مل جائے گا اپنا بوجھ دُور
کرنے کا۔ وہ سب کچھ کہنے کا جو میں اُس سے کہہ نہیں سکا تھا اور جو مجھے کہنا
چاہیے تھا۔ یوں آدمی کس کا دکھ کیا بانٹ سکتا ہے مگر کبھی تسلی تشفی کے دو بول
بھی بہت ہوتے ہیں۔ آدمی انھیں سننے کا منتظر رہتا ہے۔ وہ مجھ سے نہ جانے
کیا کچھ سننے کی توقع کر رہی ہوگی۔ جو لوگ ریشم اور پھولوں کے
مانند ہیں اُن کا احساس بھی تو پھولوں جیسا ہوگا۔ شیشے جیسا ذرا سی ٹھیس
سے اُسے کوئی ٹھیس نہ پہنچی ہو؟ اب کے شاید پہلے جیسا نہ ہو۔ میں اپنے آپ
کو سنبھالے رکھوں گا اور حویلی میں جاتے ہی اُس سے ملنے کی کوشش کروں گا
ابا جان جانے کس وقت روانگی کا ارادہ کریں۔ ممکن ہے اس بار چھوٹی بیگم
سے بھی ملنے کی کوئی صورت نکل آئے۔ اس مرتبہ مجھے موقع مل گیا تو
اُن سے کہوں گا کہ ہم تو اپنے دکھ کا اظہار بھی نہیں کر سکتے، ہمیں اُن سے کچھ
کم دکھ نہیں ہے لیکن کوئی کیا کر سکتا ہے۔ ایک کی زندگی دوسرے کو مل جایا
کرتی تو ہم میں سے کوئی اس میں بھی بخل نہ کرتا۔ موت کا قرض آدمی خود ادا کرتا
ہے۔ منیر علی کے بقول یہ تو باری باری کا معاملہ ہے۔ اور وہ جو کسی بزرگ نے

کہا ہے کہ کون سا گھر ایسا ہے جہاں موت نہ آئی ہو، جہاں رات نہ آئی ہو کسی
کو کیا اندازہ تھا کہ فرشتہ تو یہ تماشا ہے۔ میں اُن سے کہوں گا کہ ذرا ہماری
طرف بھی غور کرو۔ ہم کس کے پاس جائیں، کسے جا کے بتائیں کہ ہم نے کیا کیا
وقت گزارا ہے۔ ہم تو اب تک سزا کاٹ رہے ہیں۔ سب ہی جلنے کی تو
لکڑیاں ہیں۔ ہم کیا کیا دہرائیں۔

مارٹی نے روشنی دھیمی کر دی تھی اور کمرے کی فضا خواب ناک ہو گئی
تھی۔ سب ادھر اُدھر لیٹ گئے تھے۔ کمرے میں اُن کی سانسوں کی آواز گونج
رہی تھی۔ میں نے بھی آنکھیں بند کرنے کی کوشش کی لیکن مجھے گھبراہٹ ہونے لگی۔
کھلی آنکھیں کسی حد تک آدمی کی تابع رہتی ہیں۔ جیسے ہی آنکھیں بند کرتا تھا
وہ نہ جانے کہاں کہاں بھٹکنے لگتی تھیں۔ وہ رات کا آخری پہر ہوگا۔ میں نے
گھڑی نہیں دیکھی تھی لیکن میرا اندازہ یہی تھا کہ یک لخت مجھے اپنے کانوں پر
وہم ہوا۔ مجھے تعجب ہوا تھا کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا ہے۔ دوسرے لمحے
میں بستر پر اچھل کے بیٹھ گیا۔ کمرے کے باہر سے تیز تیز چاپ مجھے صاف
سنائی دی تھی۔ میں نے زورا کی طرف دیکھا، وہ بھی اٹھ کے بیٹھ گیا تھا اور
ایک ثانیے میں وہ سبھی اٹھے ہوئے تھے۔ کوئی بڑی طرح بھاگ دوڑ رہا
رہے تھے۔ میں اور زورا فوراً مسہری سے اُتر گئے۔ زورا دروازے کی جانب
بڑھ گیا تھا کہ کاشف نے اُسے روک لیا۔ "ٹھہرو دادا!" کاشف نے سرگوشی
میں کہا۔ "باہر کوئی ایک آدمی نہیں ہے۔" ابھی ہم ان چاپوں کی نوعیت سمجھنے
کی کوشش کر رہے تھے کہ ایک جھٹکے سے دروازہ کھلا اور ڈھاٹے باندھے
ہوئے دو آدمی آناً فاناً اندر داخل ہوئے۔ اس سے پہلے کہ ہم میں سے کوئی
آگے بڑھ کے اُن پر جھپٹتا، انھوں نے بندوقیں ہمارے آگے کر دیں۔ اُن دونوں
کے پیچھے بھی اور آدمی تھے جو تمنچے تانے ہوئے تھے۔ انھوں نے اندر
آتے ہی ہمیں ایک طرف کھڑے ہو جانے اور کوئی حرکت نہ کرنے کا حکم دیا۔
سات آدمیوں کے بعد کوئی اور اندر داخل نہیں ہوا۔ دو دروازے پر کھڑے
رہے، باقی پانچ اندر کمرے میں پھیل گئے۔ اُن کی تعمیل کرنے کے سوا کوئی چارہ
نہیں تھا کیوں کہ انھوں نے ایک پل کی مہلت بھی نہیں دی تھی۔ ہم سب
بائیں جانب کی خالی دیوار کے ساتھ برابر برابر کھڑے ہو گئے۔ کم روشنی
کے باوجود اُن کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ سر تا پا کپڑوں میں لپٹے
ہوئے تھے۔ صرف آنکھیں کھلی تھیں اور پیشانی کا کچھ حصہ۔ کاٹھی کے
اعتبار سے وہ تندرست و توانا ہی معلوم ہوتے تھے۔ قد میں اُن کے تقریباً
اوسط تھے۔ یہ چیزیں پہلی ہی نظر میں دیکھ لینا ضروری ہے لیکن سرِدست
اس سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ کسی جانب کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اُن کی بندوقیں
اور تمنچے ہر طرف سے ہمیں نشانہ بنائے ہوئے تھے اور اُن کے تیوروں سے
ظاہر تھا کہ ہماری کسی حرکت پر وہ گولی چلانے سے دریغ نہیں کریں گے۔

پاس اپنی جان کا فیصلہ کرنے کا ہے۔ جھتے سے ہم کو مل گئے تو چلے جاؤ گے ورنہ ادھر ایک آدمی بھی زندہ نہیں رہے گا۔ اچھی بات زیادہ لمبی نہیں ہے۔ سمجھ میں نہ آیا ہو تو ایک بار دوبارہ بول دیں۔" اس کی آواز لفظ بہ لفظ تیز ہوتی گئی۔

"اچھی طرح سمجھ آ رہی ہے۔" مقبل نے تحمل سے کہا۔ "ادھر تمہارا خدا گٹن کے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ پھر کسی کو دھوکہ ہوا ہے۔ پھر کوئی مخبری ہو گیا ہے۔ رشاہ مرے جب ادھر آئے ہیں ایک سے ایک ٹھگ کی بستی باز منہ سے چلا رہے ہیں۔ بڑے بڑے نواب راجا لوگ۔ اونچی اونچی بولی لگانے کو ہوتے تھے۔ دھن دولت بھی ساتھ لاتے تھے۔ ان در ہم کچھ نہیں رہے تو تم کو کیا دے سکیں گے؟"

"وہ لوگاں دھن دولت کو لاتے تھے۔ ہم جان کی بات کرتے ہیں۔"

"پر سودا کا ہے کا کر رہے ہو!"

"لگتا ہے، پھر تمہارا نمبر ہی آگیا ہے۔"

"آگیا ہے تو اس کو کون روک سکتا ہے رے۔"

"ابھی تم ہم کو پورا نہیں پہچانتے۔" وہ جھنکتی آواز میں بولا۔

"پورا پہچان رہے ہیں مائی باپ! اوپر سے نیچے تک دیکھ رہے ہیں کہ تم کون سے وقت آئے ہو منہ پہ پردہ ڈال کے۔ ادھر تم کتنے آدمی لے کے آئے ہو۔ سب کے ہاتھ میں ہتھیار ہے۔ دکھانے کو دبانے سے آدمی کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔ ایسا ہی ہے نا!"

"تم اپنے آپ کے ساتھ مسخری کر رہے ہو۔"

"دیسی فوت کے ہم تمہارے لیے بولیں گے تو تم کچھ اور خفا ہو جاؤ گے۔" مقبل نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "رستہ پوچھ کے آئے تھے سردارا! ادھر اپنے پیچھے تو صرف لکی ہیں۔"

"ہم بھی غلط جگہ ہاتھ نہیں رکھتے۔" وہ درشتی سے بولا۔ "اور ہم تم جیسے لوگاں کو خوب دیکھتے ہیں۔" اس کی آواز بھڑکنے لگی تھی جھنجھلا کے کہنے لگا۔ "تم ایسے نہیں مانو گے تو ہم کو دس رستے اور بھی آتے ہیں۔ ابھی ٹھیک ہے کہ سیدھی طرح مال نکال دو۔ اپنے پاس زیادہ ٹیم نہیں ہے۔"

"تم تو وقت خود کھوٹا کر رہے ہو۔ اپنی بات دھیان سے نہیں سنی کیا! ادھر برابر میں اس سے اونچی اور بڑی حویلیاں کوٹھیاں ہیں۔ ایک رات میں اگلی پچھلی ساری کسر نکل جائے گی۔ ادھر اتنے بکھڑوں کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ہم مسافر لوگ کے پاس کیا دھرا ہے لوٹ کے بھی آئے تو ہاں۔ پھر ایک جتن اور کر لیا۔ شاید پھر خالی ہاتھ نہ جاؤ۔" مقبل کے لہجے میں نرمی آ گئی تھی۔ ایک تیرتے رنگ کے وہ نسبتاً دھیمی آواز میں بولا۔ "ابھی کچھ چائے پانی پینا ہو تو بولو۔"

"مال کہاں ہے؟" اس نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں تھا۔ دہاڑتا ہوا بولا۔ "ہم دوسری بات سننے کو نہیں آئے۔"

"مال کے بارے میں نے بول دیا ہے۔ دوسری سننی نہیں پسند ہے تو دیر کا ہے کی ہے۔ گولی چلاؤ یا پھر ادھر سے چلے جاؤ۔ کون سی بولی سمجھتے ہو؟"

"گولی کبھی بھی نہیں ہے تم نے! یہ حسرتاں بھی ابھی پوری کر لیں گے۔ پر ہم کو شبہ ہے کہ یہ تمہارا آخری جواب ہے۔"

"پھر تمہارے سر کی قسم کھائیں کیا!"

مجھے ڈر تھا کہ ہیرو، ابا جان یا منیر علی میں سے کوئی درمیان میں نہ بول پڑے لیکن شاید وہ سمجھ گئے تھے کہ اس طرح کی باتوں سے مقبل کی کیا مراد ہے۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ بندوقوں اور تمنچوں سے زیادہ ہم اُن کی نگاہوں کے حصار میں تھے۔ ہتھیاروں کے ساتھ نگاہ کی مستعدی شرط ہے۔ یقیناً وہ گولی چلانے اور ہم سب کو ختم کرنے کے شوق میں نہیں آئے تھے لیکن کسی بھی لمحے اُن کا کوئی ساتھی اپنے ہوش گم کر سکتا تھا۔ تو ان سب کا ایک جیسا نہیں ہوتا۔

پہلی بار مقبل سے مخاطب شخص کسی قدر متذبذب نظر آیا۔ اپنے ساتھیوں پر ایک نظر ڈالتا ہوا وہ دو قدم اور آگے بڑھ آیا تاہم اس کا ہمارا درمیانی فاصلہ کم نہیں تھا۔ اس نے اپنے پیچھے کھڑے ہوئے آدمیوں کو آگے آنے کے لیے ہاتھ ہلایا۔ وہ حکم سننے کے لیے بے تاب تھے۔ اتنی تیزی سے اُس کے قریب آئے جیسے ذرا بھی دیر ہو گئی تو قیامت آجائے گی۔ اُن کے سرغنے نے دوسرا حکم دینے میں اتنی ہی تاخیر کی۔ اس کی نگاہیں باری باری ہم سب پر منڈلاتی رہیں اور ابا جان پر آکے جم گئیں۔ اس نے انگلی اٹھا کے انھیں اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ ابا جان کا چہرہ سفید ہو گیا تھا۔ میں نے معاً مقبل کی جانب دیکھا مگر وہ بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ ابا جان نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ سرغنہ نے اپنے دو ساتھیوں کو ہدایت کی کہ وہ انھیں اُس کے پاس کھینچ لائیں۔ دو آدمی ادھر اُدھر سے بندوق تانے ہوئے اُن کی جانب دوڑ پڑے میرے جسم میں خون جم گیا۔ وہ شخص بالکل وحشی معلوم ہوتا تھا۔ میرے جی میں آتا تھا کہ میں جھپٹ کے اس کی گردن دبوچ لوں لیکن میں اپنا جسم جکڑے کھڑا رہا۔ ادھر ہیرو نے سختی سے میرا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ میں آخری لمحے تک اپنی جانب سے محتاط ہی رہنا چاہیے تھا۔ جانے کہاں سے ابا جان میں استقامت آ گئی تھی۔ کوئی بعید نہ تھا کہ وہ ابا جان کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیتے مگر وہ خود

بڑھے اور کسی مجرم کی طرح اُس شخص کے سامنے جاکے کھڑے ہو گئے۔ پہلے وہ انھیں سر تا پا گھورتا رہا پھر بھنچی ہوئی آواز میں بولا۔ "کیوں بڑے میاں! ہم کو تم کچھ سمجھ دار آدمی لگتے ہو۔ ہم کو بولو کہ چیز کہاں ہیں؟"

"میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ آپ لوگوں کو کوئی بہت بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔" مجھے حیرت ہوئی کہ ابا جان کی آواز میں لرزیدگی نہیں تھی۔

"تو تم بھی ایسا ہی بولتے ہو۔" وہ مضحکہ خیزی سے بولا۔ "پر ہم کو مال چاہیے۔ مال ادھر ہی ہے۔ تمہارا وقت ویسے بھی زیادہ دور نہیں ہے۔ لگتا ہے، تم نے ابھی جانے کا سوچ لیا ہے۔"

"ضرور آپ کو کسی نے بہکایا ہے۔" ابا جان نے رُکی رُکی آواز میں کہا۔ "زندگی سے بڑی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ یہ سودا ہمارے لیے نیا؟ لیکن نہیں ہے لیکن ہمارے پاس کوئی چیز ہو تو جواب دیں۔ فیصلہ نہیں، آپ کو کرنا ہے۔ رہا موت کا خوف، تو یہ اُن لوگوں کو ہوتا ہے جو زندگی کو قائم و دائم سمجھتے ہیں۔ اگر یوں ہی لکھی ہے تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔"

"تم، تم سب ہم کو ایک نمبر حرامی لگتے ہو۔" وہ ایک دم آپے سے باہر ہو گیا اور اس نے ابا جان کا گریبان پکڑ لیا۔

میری آنکھوں میں اندھیرا اُتر آیا تھا۔ میں نے اُس پر جست لگانی چاہی تھی لیکن ہیرو نے اپنے دونوں ہاتھ میری کمر میں ڈال کے مجھے جکڑ لیا۔ "ابھی تھوڑا صبر کر راجا! تجھ کو اپنا قسم، تھوڑا ٹھیر جا اپن بھی دیکھ رہا ہے۔" اُس نے سرگوشی میں مجھ سے التجا کی۔

میری آنکھوں کے سامنے اُس شخص نے ابا جان کا گریبان پکڑ کے انھیں جھنجھوڑنا شروع کر دیا۔ اُن کا کُرتا پھٹ گیا تھا۔ اندر بنڈی کے بٹن بھی ٹوٹ گئے تھے۔ کہنے لگا۔ "ہم تم کو بتائیں گے کہ موت کیا ہوتی ہے اور تمہارے لیے کیسی لکھی ہے۔ تمہاری عمر دیکھ کے سالا ہاتھ روکتے ہیں۔ ابھی تمہارے کپڑے اتروا کے منتر ان پر سائیں گے تو تم کو آگے پیچھے کا سب یاد آ جائے گا۔ ہم ابھی بولے تھے نا کہ ہم کو دس رستاں اور آتے ہیں۔ تم سمجھتا ہے کہ ہم تم کو گولی کی سیدھی موت دیں گے تمہارے ساتھ ——"

یہ دیکھ کے کاشتے بڑھ گیا مگر مارتی اور جمرو نے اُسے روک لیا۔ وہ اُسے زور زور سے گالیاں بکنے لگا۔ ابا جان سے ہٹ کے اس شخص کی توجہ یکایک کاشتے کی طرف مبذول ہو گئی۔ اس پر وحشت طاری ہو گئی تھی۔ بھناتے ہوئے لہجے میں ابا جان سے پوچھنے لگا کہ یہ کتے کی اولاد تمہارا کیا لگتا ہے۔ ابا جان نے جواب نہیں دیا۔ اُس نے طیش میں آکے ایک جھٹکے سے اُن کا سینہ ننگا کر دیا۔ ابا جان کا کرتا دامن تک پھٹ گیا۔ بٹن ٹوٹ جانے سے بنڈی بھی کھل گئی۔

"بوڑھے آدمی پر ہاتھ اُٹھاتا ہے سالا زنخا، اُلّو کا پٹھا!" کاشتے کے جو منہ میں آ رہا تھا وہ بکے جا رہا تھا۔ سارے اُٹھائی گیروں نے بے اختیار اپنی بندوقوں اور تمنچوں کا رُخ اُس کی طرف کر دیا تھا۔ کاشتے کے بجائے کوئی اور شخص ہوتا تو یہ لوگ اُن پر ٹوٹ پڑنے کا تھا۔ کاشتے نے اپنا سینہ خود چاک کر دیا۔ اور چلا چلا کے سرغنے سے بولا "لے چلا گولی!" ساتھ ہی وہ بُری طرح گالیاں بھی بکتا جا رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا وہ اپنے اوسان کھو چکا ہے۔ جمرو اور مارتی مسلسل اُسے روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ شامو نے اُس کی کمر پکڑ رکھی تھی۔ کاشتے اُن تینوں کے قبضے سے نکلنے کے لیے زور کر رہا تھا۔ سرغنہ نے ابا جان کے گریبان سے ہاتھ ہٹا لیا اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ کاشتے کو پکڑ کے اُس کے پاس لے آئیں۔ یہ سنتے ہی دو کے بجائے چار آدمی کاشتے کی طرف لپک پڑے۔ انھیں اپنی جانب بڑھتا دیکھ کے مارتی، جمرو اور شامو بوکھلا گئے تھے۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہو گا کہ وہ کاشتے کو اپنے بازوؤں میں جکڑے رکھیں یا آزاد کر دیں لیکن پھر اُن کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی کیونکہ دوسری صورت میں کاشتے کو زیادہ زک پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ اُن کے ہاتھوں سے چھوٹ کر کاشتے کہیں اور طرف جانے کے بجائے اپنی جگہ سینہ تانے کھڑا رہا جیسے اُسے حملہ آور آدمیوں کا انتظار ہو۔ اتنی دیر میں وہ چاروں اُس تک پہنچ چکے تھے۔ کاشتے کو یوں غیر متوقع طور پر آمادہ دیکھ کے وہ کچھ گڑبڑا سے گئے۔ اور اُن کے جھپٹنے کی شدت میں بھی کمی آگئی تاہم انھوں نے دونوں جانب سے کاشتے کے شانے اس طرح پکڑ لیے جیسے وہ بہت مشکل سے اُن کے قبضے میں آیا ہو یا اگر گرفت ذرا سی کمزور رہی تو وہ کسی طرف بھاگ کھڑا ہو گا۔ کاشتے نے فرش پر تھوک کے سرغنہ کو ایک اور گالی دی، ماں کی گالی۔ جانے اُس کے دماغ میں کیا سمایا تھا۔ ہم سب اپنی اپنی جگہوں پر سُن کھڑے تھے۔ کسی اور کے دخل دینے کا کچھ حاصل نہ تھا۔ کاشتے کو کوئی احساس نہیں تھا کہ وہ گولی بھی چلا سکتے ہیں۔ اُن کے پاس ہتھیاروں کی کمی ہے، نہ آدمیوں کی۔ مقبل اور ہیرو نے اپنے ہونٹوں پر مہر لگا لی تھی۔ زبانی طور پر اور کیا بھی کیا جا سکتا تھا۔ دلیل تو دلیل کے جواب میں دی جاتی ہے۔ وہ لوگ ایک بات چاہتے تھے کہ کسی طرح ہم ہیروں کی موجودگی کا اقرار کر لیں۔ اگر صورت حال دوسری ہوتی؟ واقعی ہمارے پاس ہیرے نہ ہوتے تو بھی ہم انھیں کچھ اسی طرح تو یقین دلاتے اور وہ اگر اپنی اس روش پر قائم رہتے؟ کاشتے کو چاروں آدمی پکڑ کے سردار کے پاس لے گئے اور قریب پہنچ کے انھوں نے اُس کی گردن، کمر اور بازو اس طرح اپنے شکنجے میں کس لیے کر

کانٹے کے لیے جنبش کرنا بھی آسان نہیں رہا۔ سرغنہ اباجان کی طرف سے منہ موڑ کے کانٹے کے سامنے ہو گیا۔ اس وقت اباجان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید ایک موقع نکل آتا۔ اباجان تو ٹک ٹک کھڑے تھے۔ پھٹے ہوئے کرتے میں ان کا حلیہ دیکھا نہیں جاتا تھا۔

سرغنہ کی آنکھوں سے چنگاریاں سی نکل رہی تھیں۔ اس نے کانٹے کی گردن پر ہتھیار رکھ دیا اور نیچے کی جانب سے اس کی ٹھوڑی پر پوری طاقت سے مکا مارا۔ کانٹے کا منہ بھی جھنجھنا گیا ہوگا۔ اس نے بھی ایک پل کی دیر نہیں کی۔ جواب میں اپنے جسم کو تھوڑا سا جھٹک گیا۔ پھر پورے زور سے اوپر اچھلا۔ چاروں آدمی اس کی جھونک ہی میں گرتے گرتے بچے۔ کانٹے نے اچھل کے سرغنہ کے پیٹ میں لات ماری۔ وہ پیٹ پکڑے ہوئے دہرا ہو گیا۔ اس کے پیر ڈگمگا گئے تھے۔ وہ بیٹھ کے بل فرش پر گرتا مگر سنبھل گیا۔ پیچھے سے ایک آدمی نے اسی وقت کانٹے کے ارد گرد کھڑے ہوئے لوگوں کو نعرہ لگانے کے انداز میں تنبیہ کی کہ اپنی حفاظت کا خیال رکھیں۔ وہ بندوق کا نشانہ لیے تیار کھڑا تھا۔ کانٹے کی طرح اس کا خون بھی کچھ زیادہ ہی گرم معلوم ہوتا تھا۔ وہ گولی چلا سکتا تھا کیونکہ اس کے تیور ایسے ہی تھے لیکن عین وقت پر سرغنہ نے جلدی سے ہاتھ اوپر اٹھا کے اسے روک دیا۔

"ابھی نہیں۔ ہم کو پتہ ہے یہ سب سے پہلے جانا چاہتا ہے پر ہم اس کو سب سے آخر میں بھیجیں گے۔ ابھی ہم اس کے کل پرزاں ٹھیک کریں گے۔ ہم کو یہ سب سے اچھا ہوا لگتا ہے۔" وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولا اور کانٹے کے پاس آ کے اس نے دوبارہ اس کی کنپٹی پر مکے کی بھرپور ضرب لگائی۔ اس مرتبہ کانٹے کو اچھل کے اس کے پیٹ پر لات مارنے کا موقع نہیں مل سکا۔ اسے جکڑنے والے چاروں آدمی پہلے سے زیادہ مستعد تھے۔ دو اس کے شانے پکڑے ہوئے تھے، ایک نے اس کی گردن اور ایک نے کمر قابو میں کر رکھی تھی۔

کانٹے کو یوں بے بس دیکھ کے اس کی دہشت کم نہیں ہوئی بلکہ کچھ اور فزوں ہو گئی۔ اس نے اپنا تمنچا پٹی میں اڑس لیا اور پے در پے کانٹے کے منہ اور سینے پر ضربیں لگائیں۔ کانٹے اسے اور اشتعال دلا رہا تھا۔ اسے جانے کتنی گالیاں ازبر تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ دونوں اپنے ہوش و حواس کھو چکے ہیں۔ مسلسل ضربوں سے کانٹے کے ہونٹ پھٹ گئے تھے۔ کانٹے کے لیے یہ چوٹیں بے شک کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھیں۔ بچپن سے وہ ان کا عادی تھا۔ اتنا تو بابا جنس نے بھی اسے مارا تھا لیکن کانٹے کو موقع محل کا بھی کچھ خیال رکھنا چاہیے تھا۔ ایک دو آدمی نہتے ہی کے سامنے پورا جچتا تھا۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ اب اس آدمی کی توجہ اباجان کی طرف سے یک سر ہٹ گئی تھی۔ گو اباجان ابھی تک اس کے پاس ہی کھڑے تھے اور اس نے انھیں اپنی جگہ واپس جانے کا کوئی حکم نہیں دیا تھا۔ ممکن ہے، کانٹے یہی سب کچھ دیکھ کے آگے بڑھا ہو۔ پھر وہ یقیناً اب بھی اسی کوشش میں ہے۔ اتنی دیر تک یہ بات میری عقل میں کیوں نہیں آئی تھی۔ ظاہر ہے، کانٹے نے اچانک بے وجہ تو شور مچانا شروع نہیں کر دیا تھا۔ وہ ہم سب کی طرح خاموش گزارہ کرتا تو ان ضربوں سے محفوظ رہتا۔ اس کی جگہ تو مجھے ہونا چاہیے تھا۔ مجھے اپنا وجود اپنی نظروں میں بہت حقیر لگ رہا تھا۔ کانٹے نے جیسے مجھے کوئی گالی دی ہو مگر اب پچھتاوے سے کیا ہوتا۔ میں نے ارادہ بھی کیا کہ کانٹے کی طرح شور مچانا شروع کر دوں۔ اس طرح سرغنہ کی توجہ اس کی طرف سے ہٹ کے مجھ پر مبذول ہو جائے گی۔ مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا لیکن میں ارادہ باندھتا اور دزدیدہ نظروں سے سب کچھ دیکھتا رہا۔ مجھ سے ایک قدم بھی نہ بڑھایا جا سکا۔ یہ بعد از وقت تھا۔

سرغنہ ہر ضرب کے بعد کانٹے سے ہیروں کے بارے میں پوچھتا تھا۔ کانٹے ہر بار گالی میں اسے جواب دیتا تھا۔ کمرے میں خنکی کے باوجود دونوں پسینے پسینے ہو گئے تھے اور کانٹے کے پسینے میں تو خون بھی شامل تھا۔ یہاں تک کہ سرغنہ تھکا تھکا دکھائی دینے لگا۔ کانٹے اگر چپ ہو جاتا تو وہ بھی رک جاتا لیکن کانٹے کو ضد سی ہو گئی تھی۔ وہ اس سے کہہ رہا تھا "گیدڑ کی اولاد! اپنے ان کھلونوں اور چڑی ماروں کو ہٹا کے دیکھ، پھر تجھ کو بتاتا ہوں، کس کو پہلے جانا ہے۔"

اباجان سے ضبط نہیں ہوا۔ انھوں نے کانٹے سے التجا کی کہ وہ اپنی زبان قابو میں رکھے۔ ادھر انھوں نے عاجزانہ لہجے میں سرغنہ کو مخاطب کیا: "جناب! میری بات سنیے۔ خدا کے لیے یہ فساد ختم کیجیے۔ اس سے کچھ حاصل نہیں۔ آپ یقین کیجیے، ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ ہوتا تو اتنی اذیت اور ذلت کون برداشت کرتا۔ میں آپ سے منت کرتا ہوں کہ ہماری بات مان لیں۔ جو کچھ یہاں ہمارے پاس ہے، سب آپ لے جائیے۔ ہمیں کسی چیز سے سروکار نہیں۔ ہمارے پاس کچھ نقدی ہے اور اور اتنی کم نہیں ہے۔ ہم وہ آپ کے حوالے کرتے ہیں۔"

اس کا ہاتھ یکایک رک گیا۔ اباجان کی مداخلت سے اسے سانس لینے کی کچھ مہلت مل گئی تھی اور کانٹے کے ساتھ مزید محنت سے بچنے کا ایک جواز بھی فراہم ہو گیا تھا۔ اب تک اس پر حقیقت اچھی طرح واضح ہو چکی ہوگی کہ کانٹے کی زبان اس کی ضربوں سے رکنے والی نہیں ہے اور اس طرح اسے اپنے ساتھیوں کے سامنے خفت

کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ وہ اباجان کی طرف پلٹ پڑا اور یوں ظاہر کیا کہ اباجان کو فراموش کر کے اس سے کوئی چوک ہو گئی ہو۔ "ہاں بڈھے!" وہ کسی قدر اکھڑی ہوئی سانسوں سے کانٹے کو ماں کی گالی دیتے ہوئے بولا "ہم تو اس کے جھگڑے میں تجھ کو بھول ہی گئے تھے۔ اس کو ہم بعد میں دیکھیں گے۔ تو ابھی کیا بولتا ہے؟"

اس کا لہجہ ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ اباجان نے تحمل سے کام لیا اور التجائی لہجے میں وہی تکرار کی۔

"تو پھر ہم یہاں سے چلے جائیں؟" وہ چھچھورے پن سے بولا۔

"آپ کا یہ فیصلہ ہم دونوں کے حق میں بہتر ہوگا۔" اباجان نے نرمی سے کہا۔ "ہمارے آپ کے درمیان کوئی پرانی عداوت یا مخاصمت نہیں ہے۔ ہم نے آپ کا کبھی کچھ نہیں بگاڑا۔"

اباجان کی داد و فریاد کا یہ اثر ہوا کہ اس نے ان کی داڑھی پکڑ لی اور رعونت سے کہنے لگا "تو تم ایسے ہی رٹان لگاتا رہے گا۔"

اباجان نے اس سے کہا کہ پھر وہ اس کا مطالبہ کہاں سے پورا کریں۔ یہ سن کے اس نے انھیں ایک بے ہودہ گالی دی اور ان کی داڑھی پکڑ کے ہم کو جھٹکے دینے لگا۔ "ہم کو صرف نقدی پہ ٹرخانے گا؟ وہ بھی لے کے جائیں گے پر ہیروں کے ساتھ، سمجھا۔"

میں ہیرو کو پیچھے کی جانب دھکا دے کے اس دہشتی کی طرف جھپٹا لیکن ہیرو کو پہلے سے اندازہ تھا۔ میں اس کے بازو سے چھوٹ کے اور ایک قدم آگے نکل آیا۔ ہیرو نے اپنی ٹانگ اڑا کے مجھے گرا دیا پھر جتنی دیر میں میں فرش سے اٹھا، زورا اور ہیرو نے مجھے پیچھے سے پکڑ لیا۔ ہیرو مجھے سمجھانے لگا۔ اس کی باتیں مجھے زہر لگ رہی تھیں۔ میرے سارے جسم میں آگ سی لگی ہوئی تھی۔ سب کچھ میرے سامنے ہو رہا تھا اور میں کھڑا دیکھ رہا تھا۔ حیف ہے کہ بہ صورت دیگر میری زندگی کو خطرہ لاحق تھا۔ اس آزار سے تو موت ہی بہتر تھی۔ میں نے ایک مرتبہ پھر ہیرو اور زورا کے تسلط سے نکلنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ سرغنہ نے مجھے اپنی طرف جھپٹتے دیکھ لیا تھا۔ اس کی بھڑکی ہوئی آنکھیں مجھ پر مرکوز ہو گئی تھیں۔ وہ پچکارتے لہجے میں بولا "آنے دو، آنے دو۔ اس کتے کے بچے کو بھی آنے دو۔ اب ہم پہلے تجھی کو دیکھیں گا؟ کتنے دانت نکلے ہیں تو نے؟"

میں اسے ضرور کوئی جواب دیتا مگر اباجان کی طرف دیکھ کے میری زبان ٹھٹھر کے رہ گئی۔ انھوں نے اشاروں اشاروں میں مجھے صبر و سکون کی تلقین کرنی چاہی۔ ادھر کانٹے نے پھر شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ سارا کمرہ اس کی چیخ پکار سے گونج رہا تھا۔ سرغنہ مجھ پر زیادہ توجہ نہ دے سکا۔ کانٹے کے شور سے وہ پھر برہم سا ہو گیا۔ کانٹے کی گالیاں اس کے کانوں میں قینچی کے جیسے چل رہی تھیں۔ وہ ہیجانی انداز میں کانٹے کو خاموش کرنے کے لیے اس کی جانب بڑھا لیکن اس کے مقابل جا کے ٹھہر گیا۔ چند لمحے سوچتا رہا، پھر اس نے اپنے چاروں ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ کانٹے کو برابر کے کمرے میں لے جائیں اور جب تک اس کی زبان نہ تھمے، اسے مارتے رہیں۔ بعد میں وہ ہم سے نمٹ کے خود اسے دیکھے گا۔

"حرام زادے! ادھر تیری متیا مری ہے کیا!" کانٹے زہریلی ہنسی ہنستے ہوئے بولا "اپنے کو یہ تیرے جیسا مال تھوڑے پڑ گئے۔" کانٹے ان کے بازوؤں سے نکلنے کے لیے پورا زور صرف کر رہا تھا۔ وہ پچھاڑیں کھا رہا تھا جیسے کسی پاگل پر قابو پانے میں دشواری آتی ہے۔ ان چاروں نے اپنی بندوقیں کندھوں سے لٹکا لی تھیں اور تمنچے پیٹیوں میں رکھ لیے تھے۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے وہ پوری طرح اسے دبوچے ہوئے تھے اور کانٹے کی پچھاڑوں کی جھونک میں ادھر سے ادھر ہو جاتے تھے لیکن وہ کانٹے سے لپٹے رہے۔ کانٹے نفوں میں ان سے الجھ رہا تھا۔ آخر وہ کامیاب ہوئے اور اسے کھینچتے، گھسیٹتے ہوئے کمرے سے لے گئے۔ ان چاروں کے جانے سے سرغنہ سمیت چار آدمی کمرے میں رہ گئے۔ دو دروازے پر موجود تھے۔ ان میں سے ایک اندر آ گیا۔ دروازے پر رہ جانے والے دوسرے آدمی کا رخ بھی ہماری جانب تھا کمرے میں سکوت ہو گیا۔ کانٹے کے جاتے ہی سرغنہ پھر اباجان کی طرف آیا اور جھڑکتے لہجے میں ان سے بولا "ہاں بڈھے!" اس نے اباجان کے سر کے بال پکڑ لیے اور جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا "کچھ ٹھکانا آیا یا ابھی اور ٹھیک کریں؟"

اباجان کے ہونٹوں پر لفظ سسک کے رہ گئے۔ ان کی حالت دیکھ کے یک بارگی مجھے تجربہ ہوا کہ اب کچھ دیر کی بات ہے، اباجان اقرار کر لیں گے۔ یہی بہتر تھا۔ اس ذلت کے سامنے ہیرے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ اباجان کے پاس ہیروں کی کمی نہیں ہے۔ چند خرچ ہو جانے سے ان کے خزانے پر کیا فرق پڑے گا۔ سمجھ لیں کہ جنت کے زیر زمیں معبد کا ایک اور ستون نہ کھودا جا سکا اور گرد و پیش سے اتنا کچھ برآمد نہ ہوتا تو وہ کیا کرتے۔ کوئی دولت آدمی سے بڑی نہیں ہوتی اور آدمی عزت کے بغیر کچھ نہیں ہے۔ اباجان کی آنکھیں خوف و دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ ان کے نتھنوں اور ہونٹوں پر لرزہ سا طاری تھا۔ وہ یقیناً کوئی فیصلہ کر رہے تھے، کبھی میری جانب ان کی نظریں

نگاہیں اٹھتی تھیں، کبھی جمیل کی جانب اور کبھی وہ سر غنہ کی طرف دیکھتے
تھے۔ اُس نے اُن کے سر کو متعدد جھٹکے دیے۔ گو ابا جان نے اُف
تک نہیں کی تھی لیکن اُن کے چہرے سے اندرونی اضطراب صاف
جھلک رہا تھا۔ میں نے ایک لمحے میں کتنی بار ارادہ کیا کہ ابا جان اگر
اقبال کرتے ہوئے جھجک رہے ہیں تو میں خود سر غنہ سے کہہ دوں کہ
ہیرے یہیں ہیں، اسی حویلی میں موجود ہیں۔ مگر میں نے خود کو روک لیا۔
مجھے توقع تھی کہ چند لمحوں میں ابا جان خود اس تھیلے پر آ جائیں گے ورنہ
جمیل اور پیرو میں سے کوئی بول اُٹھے گا۔ وہ تینوں ایک دوسرے کو
دیکھتے رہے۔ معلوم نہیں اُن کے ذہن میں کیا تھا۔ کیا ابھی تک وہ
یہ آس لگائے ہوئے تھے کہ جلد یا بدیر سر غنہ مایوس ہو کے واپس چلا
جائے گا، یہ محض اس کی گیدڑ بھبکیاں ہیں، ہمارے ہیروں کے سوا کسی
اور بات سے سروکار نہیں۔ رات ختم ہونے میں بھی اب اتنا وقت نہیں
رہ گیا ہے۔ اگر یہی بات پیرو، جمیل یا ابا جان کے ذہن میں تھی تو یہ ان
کی خوش فہمی تھی۔ ابھی دیر میں انھیں اس کے متعلق کوئی اندازہ نہیں ہو سکا
تھا کہ وہ کتنا اُجڈ اور جنگلی ہے۔ لگتا ہے کہیں بھی بندہ نہیں ہے، اسے
تو بات کرنا بھی نہیں آتا۔ اس سے اب کچھ بھی بعید نہ تھا۔ جانے کس وقت
اُس کے من میں کیا سما جائے۔

بہرحال میں نے طے کر لیا تھا کہ وہ تینوں مزید خاموش رہے
تو میں اُسے بتا دوں گا۔ چاہے بعد میں پیرو اور جمیل مجھ سے کتنے ہی
ناراض ہو جائیں مگر بروقت مجھے ہوش آ گیا۔ میری زبان ہلتے ہلتے رہ
گئی۔ یکایک مجھے خیال آیا کہ میں اُسے کیا بتا سکوں گا۔ صرف یہی کہ
ہیرے حویلی میں ہیں۔ سر غنہ کے اس سوال کا جواب میرے پاس کیا ہے
کہ وہ حویلی کے کون سے گوشے میں چھپائے گئے ہیں۔ یہ تو ابا جان بھی
نہیں جانتے۔ رات کو ابا جان سے تھیلی لے کے صرف پیرو اور جمیل باہر
گئے تھے۔ یہ وہی جانتے ہیں کہ انھوں نے تھیلی کہاں محفوظ کی ہے۔ اُن
کے سوا کوئی کچھ نہیں جانتا۔ کمرے میں واپس آ کے انھوں نے کسی کو کچھ
نہیں بتایا تھا، نہ کسی نے اُن سے یہ پوچھنا ضروری سمجھا تھا۔ میرا گمان
ہے کہ وہ سبزہ زار کی طرف گئے تھے اور انھوں نے تھیلی کسی درخت،
گملے، جھنڈ یا جھاڑی میں کسی ایسی جگہ چھپائی ہو گی جہاں کسی کو شک
نہ ہو سکے مگر یہ میرا گمان ہی تھا۔ میں اُن کے پیچھے پیچھے نہیں گیا تھا۔
پورے یقین سے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے، انھیں عمارت
ہی میں کوئی اور محفوظ جگہ مل گئی ہو۔ سو میرے اس انکشاف سے کون سی مشکل
دور ہو سکتی تھی۔ باقی تو سب اُنھی پر منحصر تھا۔ شاید ابا جان کی خاموشی کی
بھی یہی وجہ تھی کہ جمیل اور پیرو کے تائیدی اشارے کے بغیر یہ اعتراف
بے معنی تھا۔ وہ بھی اتنا ہی بتا پاتے جتنا میں۔

مگر جمیل اور پیرو کیوں یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ انھیں تو ایسی
چیزوں سے کبھی رغبت نہیں رہی۔ تبت سے واپسی پر فیض آباد میں
ابا جان نے اشارۃً انھیں پیش کش کی تھی کہ اگر وہ پسند کریں تو تبت
سے لائے ہوئے زیورات تقسیم کر لیں۔ جمیل چاہتا تو اُن سے بھی کچھ لے
سکتا تھا۔ ابا جان کچھ نہ بولتے لیکن صرف جمیل ہی نے نہیں، اُن سب
نے ابا جان کی پیش کش ہنسی میں ٹال دی تھی۔ پھر جمیل کو یہ کیا ہو گیا تھا۔
اب اُسے کون سی توقع تھی، کس معجزے کی امید۔ اس انتظار میں تو کوئی
بھی ناقابلِ تلافی نقصان ہو سکتا تھا۔ اُسے کاٹنے کا کبھی احساس نہیں
تھا کہ اب کس حال میں لوٹے گا۔ جتنی دیر ہو رہی ہے، کاٹنے کے لیے
اتنا ہی بُرا ہو رہا ہے۔ میرے دست و بازو اینٹھے جا رہے تھے۔ سر غنہ
نے ابا جان کو ہدف بنا رکھا تھا۔ ابا جان کا حلیہ خاص طور پر اُس کے
ذہن نشین کرا دیا گیا ہو گا کیونکہ اُس نے ہم میں سے انھی کو منتخب کیا تھا، یا
وہ اس گمان میں تھا کہ ہم زیادہ دیر تک ایک بوڑھے آدمی پر ستم برداشت
نہیں کر پائیں گے۔ یہی ہوا، منیر علی چپ نہ رہ سکے۔ سر غنہ نے ابا جان
کے پیٹ پر سکے کی ضرب لگائی تو منیر علی چیخنے لگے: "اے ظالمو! کچھ
تو خدا کا خوف کرو، اتنے بزرگ آدمی پر ہاتھ اُٹھاتے ہو۔ خدا کے
لیے رحم کرو۔ خدا تمھیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔" منیر علی کی فریادی
آواز پر وہ شخص اور برہم ہو گیا اور اُس نے پھر انداز میں انھیں متنبہ کیا
کہ اپنی زبان کو لگام دیے دیوار سے لگے کھڑے رہیں ورنہ وہ ابا جان
کی جگہ انھیں لٹائے گا۔ اُس نے اُن سے اور بھی بہت کچھ کہا جو منیر علی
نے پہلے کبھی نہیں سنا ہو گا۔ انھوں نے اپنا منہ چھپا لیا تھا اور بچوں
کے مانند ہچکیوں سے رونے لگے تھے۔ پیرو اور جمیل چپ دیکھا کیے۔
کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب انھیں اور کون سا نظارہ مقصود
ہے۔ میرے سینے میں یکایک آگ سی بھڑک گئی تھی اور میرا دماغ
بالکل ماؤف ہوا جا رہا تھا۔ کس لمحے تو مجھے کچھ بھی دکھائی سنائی نہیں
دیتا تھا۔ پیرو اور زورا مجھے ابھی تک جکڑے ہوئے تھے۔ میں پرندہ
اُن کی گرفت میں بچے جیسی سکت نہیں تھی۔ سر غنہ ابا جان کے پیٹ میں
مکے مار رہا تھا۔ ابا جان کو شدید تکلیف محسوس ہو رہی ہو گی، وہ اپنا پیٹ
پکڑے دُہرے ہوئے جا رہے تھے۔ میں نے متعدد بار نظروں سے جمیل
کی جانب دیکھا، وہ گہری سانس بھر کے رہ گیا۔ اُس کے سوجے ہوئے
چہرے پر بے شمار گرہیں اُبھری ہوئی تھیں، اور اُس وقت مجھے احساس
ہوا کہ جمیل کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہیں۔ وہ بھی اُسے کیا اور کتنا بتا
سکتا ہے۔ ہیروں کی موجودگی کے اعتراف کا مطلب تو یہ ہے کہ ابا جان

کی حویلی کی طرف منتقل ہوتی نگاہوں کو اُن کے شک کی سند مل جائے۔ سردست وہ ہیروں کی تحصیل سے کے ہوئے جائیں گے۔ لیکن بعد کی کیا ضمانت ہے کہ انہیں بھیجنے والوں کو قرار آجائے گا، وہ اسی پر اکتفا کریں گے اور اس کے بعد شہر کے دروازوں پر کھڑے ہوئے نگران ہماری جانب سے آنکھیں بند کرلیں گے۔ ہیروں کے حصول کے بعد تو اُن کا تجسس اور بڑھ سکتا ہے اور وہ ہمارے پیچھے طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کر سکتے ہیں۔ نہ معلوم، تحصیل ہیں اور کون سے ایسے نادر ہیرے ہیں جو ہیروں کی پرکھ رکھنے والوں کو اضطراب میں مبتلا کردیں۔ ہمارا اقبال، اقبال جرم کے مترادف بھی تو ہو سکتا ہے۔ کیا یہ نہ سوچا جاتا کہ ان لوگوں کی ریاست میں آمد اور موجودگی پہلے ہی مشتبہ ہے۔ ان لوگوں کی طرف سے یہ اقبال کیا گیا ہے۔ سلسلے ملانے والے تو دُور تک سلسلے ملائیں گے۔ سب سے پہلے تو انہیں بازار کے اڈّے سے ہماری دلچسپی کا علم ہو گا تو ہو سکتا ہے، پہلے سے ہو۔ ہمارا سارا شجرہ جانے بغیر، ہمارے بارے میں ہر طرح سے مطمئن ہوئے بغیر وہ ہمیں یہاں سے کیوں جانے دیں گے۔ یہ اعتراف تو اپنی طرف مزید توجہ دلانے کے مصداق ہو گا۔ اسی زمین پر مزاحمت زیادہ کامیاب ہوتی ہے جہاں آدمی کی جڑیں ہوں۔ یہاں ہر شخص راجوں، نوابوں کی عملداری ہے وہ واسطے آدمی بھیج سکتے ہیں۔ صرف شک پر اتنا بڑا قدم اٹھا سکتے ہیں، ایک ہیرے کے لیے اُن کی بے چینی کا یہ عالم ہے تو اب ہماری تحویل سے دستیاب ہونے والے ہیرے دیکھے تو اُن کی نیندیں حرام ہو جائیں گی۔ شاد کام ہونے کے بعد تو اُن کی سرکشی کو اور توانائی ملے گی۔ اُن میں اتنی استطاعت اور ایسی دہشت ہے کہ ہم جہاں جہاں جائیں اُن کے آدمی ہمارا سایہ بنے پھرتے رہیں۔ مغل کی خاموشی کا سبب یہی اندیشے ہوں گے۔ ہمیں ایک ہی وقت نہیں ٹالنا، آنے والے وقت کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ آنے والے دنوں کے تحفظ کے لیے ہمیں آخری لمحے تک انکار ہی کرتے رہنا تھا۔ یوں اپنی پسپائی کا اعتراف تو آخری لمحے میں بھی کیا جا سکتا تھا۔

میرے سر میں جیسے بہت سی گرہیں کھل گئی تھیں۔ اس کے سوا اور کیا صورت ہے کہ ہم سرغنہ کو یقین دلانے کے لیے یہ منظر دیکھتے رہیں۔ چاہے ابا جان کا لباس تار تار ہو جائے اور سرغنہ کی ضربوں سے وہ نیم جاں ہو جائیں۔ ابا جان بھی اچھی طرح یہی کچھ سمجھ رہے تھے اسی لیے اس قدر استقامت سے یہ انکار جمیں رہے تھے۔ اب یہی تھا کہ کانٹے کے مانند ہم میں سے کوئی مل جائے

سرغنہ کی توجہ ابا جان کی طرف سے دوبارہ ہٹادے اور تھوڑی دیر کے لیے انہیں سکون مل جائے۔ ابا جان پٹتے تو پٹتے رہے لیکن اُس کے سوالوں کا جواب دیتے رہے۔ وہی سوال وہی جواب۔ پھر ہم ابا جان نے خاموشی اختیار کرلی۔ اُن کے سکوت اور ان کے عزم سے اتنا ضرور ہو کہ سرغنہ کا ہاتھ رُکنے لگا اور اُس پر کسی حد تک جھنجھلاہٹ طاری ہو گئی تاہم جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آجائے یا اپنے منصب کا خیال آجائے، چند لمحوں کے تذبذب و تردد کے بعد وہ چونک پڑا اور اُس نے فیصلہ کن لہجے میں ابا جان سے وہی تکرار کی۔ ابا جان کی خاموشی پر وہ اور گرجنے لگا۔ "سالا گونگا ہو گیا ہے۔ بڈھے!"

"ہم آپ سے کس طرح کہیں۔" ابا جان نے بے چارگی سے کہا۔ "یہاں ہمارے پاس کوئی چیز نہیں ہے۔ ہم آپ کو اور کس طرح اطمینان دلائیں۔"

"وہ تو اب ہم خود کریں گے۔ ادھر کا کونا کونا چھنوائیں گے پھر تم سے پوچھیں گے، اور دیکھو، ہم بولے دیتے ہیں، سالا مال یہاں نکل آیا تو تم میں سے ایک کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"ادھر کچھ نہیں ہے۔" بہت دیر بعد مغل نے زبان کھولی۔ اُس کی زبان اٹک رہی تھی۔ "اپنی بات کا یقین کرو۔ اتنی بڑی حویلی میں اِدھر اُدھر کھو گے۔ ہم قسم کھائے دیتے ہیں، تلاشی سے کچھ نہیں نکلے گا۔ بےکار اپنا وقت کھوٹا کرو گے۔ ادھر کچھ ہوتا تو ہم تم کو اتنی دیر بھی نہ روکتے۔"

"ادھر کچھ نہیں ہے؟" سرغنہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

"نہیں ہے سردار۔" مغل نے دبی زبان سے کہا۔ "کتنی بار بولیں۔"

"مال ادھر ہی ہے۔" وہ بپھر کے بولا۔ "پہلے اگر تم ہماری بات سالا سیدھے سبھاؤ مان لیتے تو ہم تمہاری جان معاف کر دیتے پر اب تم کو سیدھا جہنم تک بھیج کے جائیں گے۔ ہم یہاں دیواراں، زمیناں ایک دم سب کھود کے ڈال دیں گے۔"

"ہم نے بول دیا ہے، آگے تمہاری مرضی۔" مغل نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "اور اگر ادھر سے کچھ نہ نکلا تو تم ہم کو کیا دو گے؟"

وہ سٹ پٹا سا گیا۔ جواب میں اُس نے مغل کو گالی دی۔ مغل نے اُسے پھر تلاشی سے باز رکھنا اور یقین دلانا چاہا کہ اس تگ و دو سے کوئی فائدہ نہیں لیکن وہ نہ مانا۔ مغل کے اصرار سے اُسے مشکوک ہو جانا چاہیے تھا۔ ادھر ہیرو نے بھی چڑ چڑاتے لفظوں میں اُسے یہی باور کرانے کی کوشش کی۔ یا تو وہ جان بوجھ کے اُس کے تجسس کو ہوا دے رہے تھے یا مغل اور ہیرو ہیروں کی تحصیل کی غرض سے لا کر رکھ آئے تھے مگر

اُن سے اس چوک کا امکان نہیں تھا۔ ہیرو کی دخل اندازی نے مہمیز کا کام کیا۔ سرغنہ نے اُسے جھڑک دیا۔ ہیرو تلملا کے رہ گیا۔

"ٹھیک ہے سردار۔" مغل نے شکست خوردہ سے لہجے میں کہا۔ "ایسا ہی ہے تو جاکے دیکھ لو۔ سارے کونے کھدرے اچھی طرح ٹٹول لو۔ چھپانے کو ادھر نہ جگہ کی کمی ہے، نہ چیز کی۔ دیواراں ہیں، چولھا ہے، دیا، پیچھے الماری، مسہری، کرسی۔" مغل نے متعدد چیزوں کے نام لیے اور بولا۔ "جہاں جی کرے، جا کے دیکھ لو۔"

"اصل جگہ کا نام بھی بولو۔"

"اصل جگہ!" مغل نے ترشی سے کہا۔ "کون سی اصل جگہ؟"

"وہی جہاں تم نے سالا مال دبا کے رکھا ہے۔"

"تمہارے من میں شک جم گیا ہے، اپنے کو پتہ نہیں، وہ ابھی ہم کیسے نکالیں۔ لیکن جو من میں آئے کر لینا پر پہلے تھوڑی اپنی بات ذرا دھیان سے سن لو۔ ہم نے تم کو سب صاف صاف بول دیا ہے۔ لگتا ہے تم نے کچھ بھی دھیان نہیں دیا۔ ہم کو تو بے تکرار یا ہے کہ تمہارے پاس بندوق بھی ہے، تمنچا بھی، آدمی بھی کتنا کہیں ہے۔ اتنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ایک بندوق دس کو جام کر لیتی ہے اور تمنچا تو سالا پورا جادو ہے۔ کھٹکا دبتے ہی آدمی ادھر سے اُدھر ہو جاتا ہے۔ اپنے باپ نے پہلے ہی ہم کو بولا تھا کہ ہیرے سالے جان سے بڑے نہیں ہوتے۔ ہم کو معلوم ہے، تمہارا ایک اشارہ اپنی جان کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ تم سمجھتے ہو، اپنے کو کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا ایسے ہی تو آنکھیں اندھیرے میں بھی دیکھ لیتی ہیں۔ اس کے بعد بھی تم تلاشی لینا چاہتے ہو تو شوق سے لو۔"

مغل نے ایک ایک لفظ سنبھل سنبھل کے بولا تھا۔ سرغنہ نے غور سے سنا بھی تھا لیکن تلاشی کے ذکر پر وہ برافروختہ ہوا اور تیزی سے بولا۔ "تلاشی ہم ضرور لیں گے۔"

"کیا کرے گا سردار! ایک دم بے کار ہوئے گا۔" ہیرو نے تیزی سے کہا۔ "اپن کی بات ابھی مان لو۔"

سرغنہ نے دروازے پر کھڑے ہوئے آدمی کو فوراً اشارہ کیا۔ وہ دوڑتا ہوا اندر آیا تو سرغنہ نے کڑک آواز میں حکم دیا کہ عمارت کی ایک ایک جگہ کی تلاشی لی جائے اور کسی چیز کا خیال نہ کیا جائے چاہے کچھ بھی توڑنا پڑے۔ ہمیں سنانے کے لیے توڑنے پھوڑنے کے لفظ پر اُس نے خاص زور دیا تھا۔ ہم میں سے کسی نے احتجاج نہیں کیا پھر اس نے کمرے میں موجود چار آدمیوں [illegible] کی جانب انگلی اٹھا کے ہدایت کی کہ وہ بھی باہر چلا جائے۔ وہ دونوں دروازے پر

پہنچ گئے تھے۔ اُس کی آواز پر رُک گئے۔ اُس نے انہیں جلد سے جلد اپنا کام نمٹانے اور اس کے لیے دو دو تین تین آدمیوں کے گروہ بنانے کی تاکید کی۔ ابھی اُس کی ہدایتیں جاری تھیں کہ ہیرو نے جھجکتے ہوئے اُسے ٹوکا۔ "بولے تو اپن بھی ساتھ چلا جائے سردار؟ ان کو تھوڑا آسانی ہو جائے گا۔ کام میں آتا دیری نہیں ہوئیں گا۔"

سرغنہ نے گھورتی نگاہوں سے اُسے دیکھا۔ دروازے سے نکلتے ہوئے آدمی ہیرو کی آواز سن کے ٹھہر گئے تھے۔ سرغنہ نے چیختے ہوئے انہیں سرزنش کی۔ اُن کے جانے کے بعد کمرے میں اس وقت چار آدمی رہ گئے۔ چند لمحوں تک وہ بہت مضطرب نظر آیا اور کمرے میں چاروں طرف نظر ڈالتے ہوئے اُس نے ایک اور آدمی کو تلاشی کے لیے باہر جانے کو کہا۔ اُسے احساس تھا کہ وقت زوال پر ہے۔ جتنے زیادہ آدمی باہر ہوں گے، اتنی ہی جلد کام مکمل کریں گے۔ اُسے شامل کرکے اب کمرے میں اُن کی تعداد تین رہ گئی تھی۔ نفری کم ہو جانے پر وہ کچھ زیادہ ہی چوکنا اور تیار ہو گیا تھا۔ اس کے باقی دونوں ساتھیوں کی بھی یہی کیفیت تھی۔ ایک دروازے کی طرف جا کے، دوسرا اُس کے بالکل مخالف، دونوں ہوشیار ہو کے کھڑے ہو گئے تھے۔ اُن دونوں کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔ سرغنہ کے ہاتھ میں تمنچا تھا۔ اُس نے ابا جان کو شانے سے پکڑ کے گھسیٹ لیا۔ اُس وقت اُس کی حالت ایسی اضطراری تھی کہ ایک ذرا سی بدگمان آہٹ پر گولی چلا دے گا۔ اُس کی نگاہیں مسلسل ہم پر منڈلا رہی تھیں مغل اور ہیرو شانے لٹکائے سہمے کھڑے تھے۔ یقیناً وہ اُسے اپنی طرف سے اطمینان دلانا چاہتے تھے۔ میری رگیں اُس وقت پھڑک رہی تھیں۔

دیر تک خاموشی طاری رہی۔ سرغنہ نے اس دوران ابا جان سے بھی کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ اُس نے انہیں ہمارے درمیان واپس بھیجا۔ انہیں اپنے قریب رکھنے میں اُس کی مصلحت سمجھ میں آتی تھی۔

"سردار! سردار!" کمرے میں یکایک ہیرو کی گھٹی گھٹی آواز گونجی۔ سرغنہ بڑبڑا سا گیا۔ اُس نے جھٹ اپنا تمنچا ہیرو پر تان لیا۔ "اپن ابھی ایک بات بولے؟" ہیرو نے، چکچکاتے ہکلاتے کہا۔

سرغنہ کا منہ بگڑ گیا۔ ابھی اُس نے اجازت نہیں دی تھی کہ ہیرو اُسی لہجے میں بولا۔ "ابھی تھوڑا بیٹھنے کی اجازت دو سالا کھڑے کھڑے ٹانگ کھوتا پڑا ہے۔"

"سیدھی طرح کھڑے رہو۔" سرغنہ نے گرج کے کہا۔

"وہ تو اپن، ابھی تم جوتے تو ایک پیر پر بھی کھڑا ہو جاتے گا۔ تم ابھی ادر ایک بادشاہ کے ماتک ہے، تو حکم دے گا، کرے گا۔ پر اپن کا مطلب ہے جب تک تمھارا لوگ ایدر لوٹ کے آتا ہے۔ اپن ذرا سر کھیتی ہے، قسم سے اپن کئی دن سے ٹھیک سے سویا بھی نئیں ہے۔ ابھی ایدر دن بعد گھر کا صورت دیکھا تھا تو تم آ گیا۔"

"تھوڑی دیر اور صبر کرو۔" سرغنہ نے درشتی سے کہا۔ "ہم تم کو پورے آرام سے سُلا کے جائیں گے۔"

"تو تم جو بتاتے، ابھی سب ٹھیک ہے۔" پیرو دبے ہوئے لہجے میں بولا۔ "پر ابھی بابا کو تو ایدر بھیج دو۔ اس کے بڑھاپے پر ترس کھاؤ۔"

"ہم نے..... ہم نے بہت خیال کیا ہے اس کا۔" سرغنہ نے قریب کھڑے ہوئے ابا جان کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "پر اس نے اپنا ......" ابا جان نے سر جھکا لیا۔ سرغنہ کہنا چاہتا ہوگا کہ ابا جان نے اس کا کوئی خیال نہیں کیا لیکن اس کے بجائے جانے کہاں سے اس کے سینے میں چھپا ہوا غبار عود کر آیا اور اس نے اپنی جگہ سے اچک کے تمنچا ایک ہاتھ میں سنبھالے سنبھالے ان کے گال پر طمانچہ مارا۔ ابا جان کا جسم ہل کے رہ گیا۔

"نئیں نئیں سردار! اپن ایسا نئیں بولا۔" پیرو نے لجاجت سے کہا۔ "تمھارا آدمی جب تک لوٹ کے نئیں آتے، تم کو ایسا نئیں کرنا چاہیے۔"

سرغنہ اور بپھر گیا۔ پیرو نے جیسے اُسے شہ دے دی ہو۔ اس نے ابا جان کو ایک سانس میں کئی طمانچے مارے۔

"ابھی بہت ہو گیا۔" پیرو کی آواز بھرا گئی تھی۔ "یہ تمھارا باپ برابر ہے۔" پیرو جیسے رو کے رہا تھا، ابھی تک روکے ہوئے تھا اور خود اس سے الجھ رہا تھا۔ تندی سے بولا۔ "ابھی اس کو چھوڑ دو سردار۔"

"ہاں۔" سرغنہ نے سر ہلاتے ہوئے زہر بھرے لہجے میں کہا۔ "اِسس کو چھوڑ دیں۔ تم سبھی کو کیوں نہ چھوڑ دیں کتنے، ہم کو اس طرح نقصان ہوئے گا۔"

"اپن ابھی تم سے بنتی کیا ہے۔"

"ہم شروع میں تم سے کیا مغزاں مارتے تھے اور ان سے بات کیے تھے۔ پر تم نشہ ہو گیا تھا سالا۔" وہ بھڑکتی آواز میں بولا اور کہنے لگا۔ "ہم ایک بار پھر بولتے ہیں، ابھی ٹائم ہے، ہم کو مال کی جگہ بول دو۔ ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔" اس دوران بھی ابا جان پر اس کی دست درازی جاری رہی۔

"ابھی بابا کو چھوڑ دو سردار!" پیرو کی آواز پھٹی ہوئی تھی۔

"اب ایک لفظ بھی آگے بولا تو ہم تمنچا چلا دیں گے۔" اس نے دھاڑتے ہوئے پیرو کو حکم دیا کہ وہ اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑا رہے۔ ساتھ ہی اس کی نظروں میں تیزی آ گئی۔

ابا جان سے اپنے پیروں پر کھڑا ابھی نہیں ہوا جا رہا تھا۔ ان کی ناک سے خون بہنے لگا تھا۔ میرے ہاتھ پیر کانپ رہے تھے۔ ابا جان کی عینک فرش پر گر گئی تھی۔ میرے اختیار میں اب کچھ نہیں رہا تھا لیکن اس سے پہلے کہ میں روتا اور پیرو کو کوئی جسمانی ضرر پہنچا کے ان کے شکنجے سے آزاد ہوتا، پیرو ہذیانی انداز میں چیخنے لگا۔

"ٹھیرو، ٹھیر جاؤ۔ اپن بولتا ہے۔" اس نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ "اپن تم کو بولتا ہے ابھی تجوری کیدر ہے۔ کس کے پاس ہے۔"

سرغنہ اچھل پڑا۔ ابا جان پر اس کا اٹھا ہوا ہاتھ درمیان ہی میں ساکت رہ گیا۔

بجّن کی آنکھیں بھی پھیل گئیں۔ اس نے مڑ کے حیرت سے دادا کو دیکھا۔ "دادا! تم ہوش میں تو ہو؟" وہ مضطرب لہجے میں بولا۔ "کیا بولتے ہو تم؟"

"اپن کو معاف کر دو بجّن بھائی! اپن زیادہ دیر کی ایسا نئیں دیکھ سکتا۔ اپن کو معاف کرو۔"

"نہیں دادا! نہیں۔" بجّن نے مضطرب آواز میں کہا۔ "تم کیا بول سکتے ہو۔"

"ابھی کچھ فائدہ نہیں۔" اپنے بابا سے نظریں چراتے پیرو آنکھیں چراتے ہوئے بولا۔ "اپن ابھی سب بول دے گا۔"

"دادا!" بجّن نے تلخی سے کہا۔

سرغنہ حیرت بھری نظروں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس نے تمنچے کا رخ فوراً بجّن کی طرف کر دیا۔ "تم اب ایک دم خاموش رہو گے۔ بالکل خاموش۔ اب ہم ذرا بھی دیر نئیں کریں گے۔" وہ بوکھلائے ہوئے لہجے میں پیرو سے مخاطب ہوا۔ "ہاں، کیا بولتے تم؟ کیا بولے؟ ہم سب کو چھوڑ دیں گے، سب کو۔ ہم کو تجوری کے سوا کچھ نئیں چاہیے۔ نقدی بھی چھوڑ دیں گے۔ جلدی سے ہم کو بولو۔" اس کی آواز سنسنا رہی تھی۔

"پہلے بابا کو ایدر بھیج دو۔"

"اس کو بھی بھیج دیں گے، پر پہلے تم بولو۔"

"پہلے تم بابا کو اپنے پاس بھیج دو۔" پیرو نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

"ہم اس کا اچار نئیں ڈالتے سالا۔"

"اپن بھی اس ٹیم تک زبان نئیں کھولے گا جب تک....."

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" سرغنہ نے مفاہمانہ انداز میں کہا اور کوئی مزاحمت کیے بغیر ابا جان کو بے رخی سے ہماری طرف دھکیل دیا۔ "اب جلدی بولو، ہم پھر نئیں سننے کے۔ بتاؤ مال کاں ہے؟"

"مال حویلی میں ہے۔" پیرو نے گہری سانس بھر کے کہا۔

"وہ تو ہم کو پتہ ہے، پر حویلی میں کاں؟"

پیرو نے جواب دینے کے بجائے سراسیمہ نظروں سے بجّن کی جانب دیکھا اور چپ رہا۔

"تم اس کی طرف کیا دیکھتے ہو۔" سرغنہ نے اشتعال سے کہا۔ بجّن کی سرخ آنکھیں پیرو پر جمی ہوئی تھیں۔ پیرو کبھی اسے دیکھتا، کبھی سرغنہ کو۔ "مال ایدر ہی ہے۔" اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ سرغنہ دیوانہ ہو گیا۔ "ایدر کاں؟ سالے! تو ہمارے ساتھ مذاق کرتا ہے۔"

"نئیں نئیں۔" پیرو کی آواز حلق میں پھنس رہی تھی۔

"پھر تمھاری بولتی کیوں بند ہو گئی؟"

پیرو بجّن کی طرف دیکھ کے اور بل کھا کے رہ گیا۔

"دادا!" بجّن نے برہمی سے کہا۔ "تمھارا سر پھر گیا ہے۔" بجّن کے بولنے پر سرغنہ اپنے رہے سہے ہوش و حواس بھی کھونے لگا۔ وہ دیوانہ وار اس کی طرف جھپٹا مگر عین اس کے قریب پہنچ کے اسے کچھ خیال آیا اور اس نے دہکتی آواز میں بجّن سے کہا کہ وہ ہم لوگوں کے درمیان سے ہٹ کے آگے آ جائے۔ بجّن ساکت کھڑا رہا۔ سرغنہ نے تمنچا اس کے سامنے کر دیا اور کہنے لگا کہ وہ چند لمحے اور انتظار کرے گا۔ بجّن کو حرکت کرنی ہی تھی۔ جیسے کوئی شخص مقتل کی طرف جاتا ہو، بجّن آہستہ قدموں سے اس کی جانب بڑھنے لگا۔ کمرے پر سناٹا چھا گیا۔ سرغنہ الٹے قدموں اور پیچھے ہو گیا۔ وہ دونوں آدمی اپنی بندوقوں کا رخ بار بار بدلتے تھے۔ بجّن ہم سے چند گز کی دوری پر بائیں جانب کی دیوار کے آگے کھڑا ہو گیا۔ دیوار سے اس کا فاصلہ دو گز سے زیادہ نہیں تھا۔ قریب ہی آتش دان تھا اور آتش دان کے اس طرف دو مسہریاں برابر برابر لگی ہوئی تھیں۔ ان کے آگے وہ دونوں آدمی تھے۔ بجّن کے آنے پر انھوں نے درمیانی فاصلہ اور کم کر لیا۔ سرغنہ کو بجّن کی یہ جگہ پسند نہیں آئی۔ اس نے اسے اور آگے آنے کا حکم دیا۔ بجّن نے تعمیل میں چون چرا نہیں کی۔ سر جھکائے اس کے سامنے جا کے کھڑا ہو گیا۔ اب اس کی پشت ہمارے سامنے تھی، جبکہ سرغنہ کے سامنے تھا۔ کچھ دیر تک سرغنہ بجّن کے جسم کے گرد اس طرح تمنچا لہراتا رہا جیسے اس کی بوٹیاں کتر رہا ہو۔ تمنچے پر اس کی انگلیوں کی سختی سے اس کی اضطراری حالت کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ "اب ..... اب تم بولو گے۔" شدتِ غضب سے اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

"ہم کیا بولیں؟" بجّن نے آہستگی سے کہا۔

"مال کے بارے میں بولو۔"

"ہم کو کچھ پتہ نہیں۔" بجّن تلخ لہجے میں بولا۔ "اس سے پوچھو جس نے تم کو بتانے کا بولا ہے۔"

"تو اس کو روکتا تھا کھسیانی کے! تو اِن سب کا ذمہ دار ہے۔ ابھی ہم پہلے تجھی کو بھگتاتے ہیں۔" اس نے بے قابو ہو کے تمنچے والا ہاتھ اٹھا دیا۔ سب دم بخود کھڑے دیکھتے رہے۔ بجّن نے اپنے گال پر اس کا طمانچہ کھا لیا اور کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی۔ اس سے سرغنہ کا حوصلہ اور بڑھ گیا۔ اس نے دوبارہ ہاتھ اٹھایا، ایکا ایک پیرو چلانے لگا۔ "ابھی اس کو کچھ مت بولو۔ اپن سب بولے دیتا ہے۔ اپنا کچھ نئیں چھپائے گا۔ مال ایدر اوپر کے ......"

پیرو کی آواز پر سرغنہ کی نگاہ لازماً اس کی جانب مبذول ہو جانی چاہیے تھی۔ جیسے ہی اس نے پیرو کو دیکھا، بجّن نے بجلی کے اس کے تمنچے پر ترچھے ہاتھ سے ضرب لگائی۔ سرغنہ کے ہاتھ سے تمنچا چھوٹ کے فرش پر گر گیا۔ پیرو کی آواز پر اس کے ساتھیوں کی بندوقوں کا رخ بھی بے اختیار پیرو کی طرف ہو گیا تھا۔ بجّن کے لیے یہ لمحہ بہت تھا۔ ضرب پڑنے اور تمنچا گرنے پر سرغنہ سنبھل نہیں رہا تھا۔ اس نے پلٹ کے بجّن کو دیکھا اور دوسرے ہی لمحے اسے تمنچے کی طرف جھپٹنا چاہیے تھا لیکن بجّن نے لپک جھپٹ کے پیچھے سے اس کے بازو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیے اور ناگہاں اسے لیے لیے الٹے قدموں دیوار کی طرف ہٹنے لگا۔

اس کے دونوں ساتھی بھی اس ناگہانی افتاد پر بوکھلا گئے تھے۔ ان کی توجہ پیرو کی جانب ہوئی ہی تھی کہ انھوں نے سرغنہ کی چیخ اور تمنچا گرنے کی آواز سنی۔ پھر چشم زدن میں انھوں نے پلٹ کے بندوقوں کا رخ بجّن کی جانب کیا۔ بجّن نے سرغنہ کو جکڑ لیا تھا۔ اب نشانے پر ان کے سامنے بجّن کے بجائے سرغنہ تھا۔ بجّن اس کے جسم کی دیوار کے پیچھے محفوظ تھا۔ میں، پیرو، زرینا، جمرو، شامو، گنگو، مارلی، اب کسی سے بھی ایک پل کی چوک نہیں ہونی چاہیے تھی۔ بجّن کو گولی مار دینے اور اس کے قبضے سے اپنے سردار کو آزاد

گرانے کے لیے اُن دونوں کی نگاہیں بالکلیہ اُس کی طرف مبذول ہو گئی تھیں کہ اُدھر سے اُن کے درمیان میں پڑے ہوئے مجھ پر جست لگانے کا بھی خیال آ گیا تھا تاہم مجھ پہ بندوق اٹھانے یا کھینچنے پر قبضہ کرنے کے فیصلے میں انھیں ایک لمحاتی تامل لازم تھا۔ اُدھر مجھل کے کھینچنے کی گرفت سے سرغزہ بلبلانے لگا۔ اُن کی توجہ اس طرف بھی منتشر ہوئی۔ انھوں نے مجھ پر بندوق اٹھائی تھی مگر اس جانب سے شامو اور جمرو کے بڑھنے کی آہٹ بھی اُن کے کانوں میں پہنچی ہوگی۔ تمنچا کسی طور ہماری تحویل میں نہیں جانا چاہیے تھا۔ وہ دونوں پھر اسی کی طرف لپک پڑے۔ پھر وہ اُسے فرش سے اٹھانے کے لیے جھکے ہی تھے کہ مارتی، زورا، جمرو اور شامو نے انھیں مہلت نہیں دی۔ میرے جست لگاتے ہی وہ پیچھے سے اور اطراف سے اتنی تیزی کے ساتھ آئے کہ اُن دونوں کو سنبھلنے کا کوئی موقع نہ ملا۔ میں نے اس اثنا میں تمنچا فرش سے اُچک لیا۔ شامو تیزی سے جھکتا ہوا آیا اور سامنے آئے ایک آدمی کی بندوق کی نال پکڑ کے سیدھا اوپر ہو گیا۔ یہ شامو کی غلطی تھی اُس نے زیادہ پھرتی دکھائی، بندوق چل گئی۔ کمرے میں زور کا دھماکا ہوا اور گولی چھت میں پیوست ہو کے رہ گئی۔ اُس کی آواز عمارت میں دوسری جگہوں پر بھی گئی ہوگی۔

مجھل نے فوراً سرغزہ کے گھیرے سے اپنے بازو نکالے، اُس کو جھٹکنے کے انداز میں ایک طرف کر دیا۔ ... دروازے کی جانب بھاگا مگر وہاں پیرو موجود تھا۔ یہ دیکھ کے ... نے کمرے کی دوسری جانب رُخ کیا۔ میں اس پر تمنچا چلا دیتا لیکن مجھل نے تیزی سے میرے پاس آ کے تمنچے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ میرے جی میں آئی ابھی گولی چلا کے ہی تمنچا اُس کے حوالے کروں۔ تب میرے سامنے زورا نے سرغزہ کو پکڑ لیا تھا۔ زورا نے اُس کی پسلیوں پر پے در پے شدید ضربیں لگائیں۔ میں نے تمنچا مجھل کو دے دیا۔

دونوں آدمیوں کو ایک کونے میں کھڑا کر دیا گیا۔ اُن کی بندوقیں مارتی اور شامو کے پاس تھیں۔ شامو نے اپنی بندوق پیرو کے حوالے کر دی۔ جمرو، مارتی، ننگو اور شامو اُن تینوں سے نمٹنے کے لیے بے قرار ہو رہے تھے۔ پیرو نے انھیں روکا۔ کسی وقت بھی اُن کے ساتھی کمرے کی طرف لوٹ سکتے تھے اور اُن کی تعداد کم نہیں تھی۔ مجھل نے باہر جانے اور کانٹے کو دیکھنے کے لیے کہا لیکن وہ ... بلا کے رہ گیا۔ ہمیں صحیح طرح سانس لینے کی بھی فرصت نہیں ملی تھی کہ باہر راہ داری میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں آئیں۔ پیرو کے اشارے پر کسی تاخیر کے بغیر مارتی اور شامو دروازے کے اس طرف آڑ میں ہو گئے۔ دوسری طرف جمرو اور زورا کھڑے ہو گئے۔ اس طرح یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ دروازے کے سامنے سے ہٹ کر ہم سب جلد از جلد اِدھر اُدھر کی دیواروں سے چپک جائیں۔ گو ضروری نہیں تھا کہ آنے والے اسی تیزی اور وحشت سے اندر داخل ہوں تو ہماری توقع تھی۔ گولی چلنے کی آواز اگر اُن تک پہنچ گئی تھی تو انھیں پھونک پھونک کر ہی اندر قدم رکھنا چاہیے تھا۔ چاپوں سے آنے والوں کی تعداد زیادہ نہیں معلوم ہوتی تھی۔ زورا نے اشارہ کیا کہ کیوں نہ ہم دروازے سے نکل کے راہ داری میں اچانک اُن کے سامنے پہنچ جائیں۔ اس طرح وہ یقیناً متزلزل ہو جائیں گے۔ بے شک، یہ بھی ایک صورت تھی لیکن ہماری توقع کے خلاف اگر وہ حوصلہ برقرار رکھتے تو ناچار ہمیں بے دریغ گولیاں چلانی پڑتیں۔ رات کے سناٹے میں دُور دُور تک آوازیں جاتیں اور حویلی کے مختلف کمروں میں اُن کے تلاشی لینے والے ساتھیوں تک بھی ضرور پہنچتیں۔ ذرا سا وقت مل جاتا تو اور کئی ... بھی نکل آتیں۔ باہر راہ داری میں ستونوں کے علاوہ کئی ... سی ایسی جگہیں تھیں جن کی آڑ میں ہم اُن کا انتظار کر سکتے تھے اور اُن کے کچھ آگے نکل جانے پر ہم عقب سے برآمد ہوتے تو انھیں کوئی حکم دینے کی پوزیشن میں ہوتے۔ وقت ملتا تو ہم میں سے کوئی ایک اُن کا حلیہ بنا کے کمرے کے دروازے پر کھڑا ہو جاتا تاکہ وہ اطمینان سے اندر آتے رہیں۔ اُن کی وضع قطع اختیار کرنا ایسا مشکل نہیں تھا۔ آنکھوں اور پیشانی کے سوا اُن سب کے چہرے ڈھکے ہوئے تھے۔ وہ اتنی آسانی سے شناخت نہیں کر سکتے تھے مگر اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ہم اندر کمرے ہی میں اُن کا انتظار کریں۔ گولی کی آواز سننے کے باوجود اُن کے ایک ساتھ آنے کا امکان نہیں تھا کیونکہ وہ حویلی میں مختلف ٹولیوں میں بٹے تھے۔ یہ اطمینان بھی کم نہیں تھا کہ وہ ٹولیوں میں آئیں گے۔ ہم نے خیال رکھا تھا کہ باہر سے دیکھنے پر کمرے میں انھیں سامنے کچھ نظر نہ آئے۔ اس صورت میں وہ کمرے کے اطراف کا جائزہ لینے کے لیے اندر ضرور جھانکیں گے۔ اُن کے ہاتھوں میں اٹھی ہوئی بندوقیں ... لیکن تبھی اُن کے جھانکتے ہوئے سروں کے ساتھ ہی پہلے اندر ... تھیں۔

مارتی نے اپنی بندوق ننگو کی طرف اُچھال دی تھی تاکہ اُس کے دونوں ہاتھ آزاد رہیں اور بندوق کسی اُلجھن کا سبب نہ بن سکے۔ وہ اور زورا دروازے کے دونوں اطراف سے

لگے تھے۔ اُن کے برابر شامو اور جمرو۔ آپا جان، منبر علی اور تینوں ملازم، دروازے کے ساتھ والی دیوار کے دائیں جانب کونے میں کھڑے تھے۔ بائیں جانب کے دوسرے کونے میں ان تینوں آدمیوں کو ننگو بندوق کی زد پر لیے ہوئے تھا۔ اس کے قریب مجھل دیوار سے کچھ ہٹ کے تمنچا تانے کھڑا تھا اور اُس کے مقابل، دوسری طرف پیرو بندوق لیے کھڑا تھا۔ میں پیرو کے نزدیک تھا۔ اس دیر میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ روشنی بھی انھیں باہر سے نظر آ رہی ہو گی لیکن ایسی خاموشی نہیں ہونی چاہیے تھی۔ یہ سناٹا انھیں مشتبہ کر سکتا تھا۔ یہی ہوا، دروازے کے قریب اُن کی چاپیں یک لخت ٹھٹھر گئیں۔ ہم سانس روکے کھڑے تھے۔ ہماری ذرا سی چوک سے سب کچھ خواب کی طرح بکھر سکتا تھا۔ تین آدمیوں کے سوا اُن کے سارے آدمی باہر تھے اور سب کے سب مسلح۔ بہرحال حالات پر مارتی، زورا پر تولے کھڑے تھے۔ اُن کی آمد اس طرح شروع ہوئی کہ پہلے اُن کی بندوقوں کی نالیں اندر آئیں۔ مارتی اور زورا نے توقف کیا۔ ہو سکتا ہے، اس توقف کے لیے پیرو نے انھیں کوئی اشارہ کیا ہو۔ بندوقوں کے ساتھ آنے والوں کے سروں کا اندر آنا بھی لازم تھا۔ مارتی اور زورا کے لحاظ تاک سے نالیں اور اندر ہو جائیں۔ انھیں خاص طور پر یہ خیال بھی رکھنا تھا کہ نالوں کا رُخ عین سامنے کی جانب رہے جہاں کوئی نہیں تھا یا نیچے فرش یا اوپر چھت کی جانب۔

وہ دروازے پر تھے۔ یہ سوچ کر میرا ماتھا ٹھنکا کہ اگر اُن میں سے ایک اندر آیا یا اگر اُن کی تعداد تین ہوئی اور ایک باہر رہ گیا یا وہ چار بھی ہو سکتے تھے۔ دروازے سے بیک وقت دو آدمی اندر آ سکتے تھے۔ شاید مجھل کے ذہن میں بھی یہی خدشہ ابھرا تھا۔ وہ دوڑ کے مارتی کے پاس دروازے کے قریب چپک گیا۔ اس سے زیادہ سوچنے کے لیے اُسے وقت ہی کتنا ملا تھا۔ میرا دماغ جانے کہاں کہاں بھٹک رہا تھا۔ میں بھول گیا کہ یہ بات مجھل اور پیرو کو بھی، سبھی کے ذہنوں میں ہو گی کہ آنے والوں کی تعداد دو سے زیادہ ہو سکتی ہے۔ اُن کی تعداد کتنی بھی ہو، کمرے میں رہتے ہوئے ہمارے پاس اور طریقہ بھی کیا تھا۔ مجھل عین وقت پر اس لیے نہیں جھکا کہ اُس کے ذہن میں اُن کی گنتی کا کوئی اندیشہ اچانک جاگ اٹھا اور اس طرح وہ دروازے کے قریب رہ کے باہر رہ جانے والوں کا فوراً تعاقب کر سکتا تھا۔ وہ اپنی چاپوں کی گونج سے انھیں اندر آنے سے پہلے روکنا چاہتا تھا اور چونکہ وہ اُن کی نظروں سے اوجھل اندر ہی اندر مارتی کے پاس آیا تھا اس لیے دروازے پر آنے والوں کا اندر کمرے کے متعلق تجسس و تردد فطری امر تھا لہٰذا دوسرے ہی لمحے اُن کے سر اندر تھے اور قدم بھی۔ مارتی اور زورا تاک میں تھے۔ دونوں اتنی پھرتی سے اُن پر جھپٹے کہ وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدم وہیں رکے جاتے۔ مارتی اور زورا نے جست لگائی اور پوری طاقت سے اُن کے سر پیچھے کو کر کے انھیں گھسیٹتے ہوئے دُور چلے گئے۔ اُن کی بندوقیں اُن کے جسموں تلے دب گئیں۔ اس عالم میں تو اُن کا سنبھلنا مشکل تھا۔ مارتی اور زورا کے پیچھے ایک ثانیے کے وقفے سے جمرو اور شامو بھی ... تھے۔ ... ایک تیسرا آدمی بھی تھا۔

مارتی اور زورا دروازے سے ہٹے تو مجھل نے اُن کی طرف ایک نگاہ دیکھنے کا وقت بھی ضائع نہیں کیا۔ فوراً باہر کی طرف بھاگا۔ پیرو نے اُس کی پیروی کی۔ ابھی لمحوں میں باہر آ گیا۔ مجھل نے چند قدم ہی دوڑ کے جا لیا۔ تیسرا آدمی اپنے دو ساتھیوں کو اس صورتِ حال سے دوچار دیکھ کے یا تو اُن کی مدد کے لیے اندر آ سکتا تھا یا اُلٹے قدموں بھاگ جاتا۔ اس نے دونوں کام کیے۔ پہلے وہ اندر آنا چاہتا تھا پھر مجھل کو آتا دیکھ کے بھاگ کھڑا ہوا۔ اگر وہ سیدھا بھاگتا چلا جاتا تو اُس کے بچاؤ کی کوئی صورت نہ تھی لیکن بھاگتے بھاگتے اس نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔ مجھل اس سے گنتی کے قدموں کی دوری پر تھا۔ مجھل کے ہاتھ میں تمنچا بھی اُس نے دیکھ لیا ہوگا۔ مگر وہ خود بندوق اٹھائے ہوئے تھا۔ تیز تیار کے ساتھ حواس و اعصاب کی یکجائی اور درستی شرط ہے۔ مجھل کے پیچھے اُس نے مجھے اور پیرو کو بھی دیکھ لیا تھا اور تب سے دفاع کی ٹھان لی ہوگی۔ مقابلے پر آمادہ ہونے میں ایک ہی پل کا وقفہ تو چاہیے۔ مجھل اُس کے سر پہ پہنچ چکا تھا۔ وہ بندوق کے ساتھ اپنی جگہ جم کے رہ گیا۔ مجھل نے اُس سے کچھ کہا نہیں لیکن مجھل کا ارادہ شاید اُس نے بھانپ لیا تھا کہ دوسری صورت میں وہ تمنچا ہی چلائے گا، اُسے فرار نہیں ہونے دے گا۔ اُس میں کم از کم اتنا ہوش باقی تھا۔

اُس کی بندوق میں نے لے لی۔ ہم ابھی کمرے میں نہیں جا سکے تھے کہ حویلیوں سے مزید آدمیوں کی آہٹیں سنائی دیں۔ پیرو دروازے کے قریب تھا۔ میری سمجھ میں یہی آیا کہ اُسے پیرو کی طرف دھکیل دوں۔ میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ کے زور سے جھٹکا دے کے اُسے دھکیلا۔ پیرو نے دو قدم آگے آ کے اُس کے کرتے پر

لات ماری۔ وہ دروازے کے اندر جا کے گرا۔ پیرو سامنے تھا تو بھی وہ دروازے ہی سے ٹکرایا۔ اندر سے کسی نے جھٹ اسے کھینچ لیا۔ پیرو بھی اندر چلا گیا۔ ہمارے پاس اندر جانے کا وقت نہیں رہا تھا۔ چنانچہ مجھل دروازے کے مقابل شمر کی اوٹ میں ہو گیا۔ میں نے ایک سے دوسرے شمر کا سہارا لے لیا۔ مجھل کی نسبت یہ جگہ زیادہ محفوظ تھی۔ پیرو کی ٹھوکر اور دروازے کے فرش سے ٹکرانے کی وجہ سے اس شخص نے آکر یا شور مچا دیا تھا اس لیے سیڑھیوں سے آنے والوں کی رفتار میں تیزی آ گئی تھی۔ انھوں نے سیڑھیاں اتر کے احتیاطاً راہ داری میں ادھر اُدھر ضرور دیکھا ہوگا۔ جب انھیں کوئی نظر نہیں آیا تو وہ سیدھے کھلے دروازے کی طرف لپکے۔ وہ بھی تین تھے۔ وہ دروازے میں داخل ہونا ہی چاہتے تھے کہ مجھل نے دھیمی آواز میں انھیں ٹھہرنے کا حکم دیا۔ وہ اندر جاتے جاتے ٹھٹک گئے۔ پھر انھوں نے پلٹ کے دیکھا، مجھل اور میں تمنچا اور بندوق تانے اُن کے سامنے کھڑے تھے۔ حیال کی ایک لمحے بعد وہ سنبھلے تو کمرے کے اندر پیچھے سے جمرو اور شامو نے اُن کی گردنوں میں اپنے بازوؤں کا پھندا ڈال دیا اور اسی حالت میں اُلٹے قدموں انھیں اندر کھینچ لیا مگر تیسرا آدمی اُن کی زد پر نہیں آ سکا تھا۔ وہ اُن دونوں کے پیچھے تھا۔ اپنے دو ساتھیوں کی چیخوں اور کراہوں پر اس نے ہمارے سامنے سے مڑ کے دروازے کی طرف نگاہ کی۔ میں نے فوراً اس پر بندوق کھینچ ماری۔ مگر اتنی جلدی میں اس تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ یہی ہو سکتا تھا کہ بندوق کی بٹ سے اس کے سر کو نشانہ بناؤں۔ اتنی دیر میں وہ ہٹ گیا۔ بندوق اس کی کنپٹی پر جا کے لگی اور ٹھیک بیٹھی۔ وہ چکرا گیا۔ میں بندوق پھینک کے اس کی طرف لپکا لیکن میرے پہنچنے تک وہ اپنی مستعدی تقریباً کھو چکا تھا۔

پھر میں اور مجھل باہر ہی کھڑے رہے۔ پیرو بھی وہیں آ گیا تھا۔ بار بار مجھے کانتے کا خیال آتا اور میرا دل ڈوبنے لگتا۔ کچھ نہیں معلوم تھا کہ وہ اسے کون سے کمرے میں لے گئے ہیں۔ میں مجھل کو دوبارہ ٹوکنا چاہتا تھا لیکن یہ سوچ کے چپ رہا کہ مجھل کو اس کی فکر مجھ سے زیادہ ہوگی۔ ویسے بھی ہمیں ابھی یہاں سے نہیں ہٹنا چاہیے تھا۔ یہی تدبیر مناسب تھی جو ابھی اندر بھیجے جانے والے تین آدمیوں پر آزمائی گئی تھی۔ ہم تینوں مختلف کھمبوں کی آڑ میں کھڑے تھے اور ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ مجھل نے اسی دوران اشارۃً مجھ سے کہا کہ میں بندوق کے گھوڑے پر انگلیاں ڈھیلی رکھوں۔ مجھل کو اس تلقین کی ضرورت نہیں تھی۔ اتنی بات تو کسی حد تک میں بھی جانتا تھا۔

آخری تین آدمیوں کے کمرے میں جانے کے بعد ایک شور اٹھا تھا مگر اچھا ہوا جلد ختم ہو گیا۔ ہم کھمبوں کی اوٹ میں سے انتظار کرتے رہے۔ لمحے گزرتے گئے۔ راہ داری میں کسی جانب سے کوئی آہٹ نہیں اُبھری۔ ایک ایک پل ہمارے لیے بھاری تھا۔ چار پانچ منٹ ہمیں ساکت کھڑے ہوئے گزرے ہوں گے کہ راہ داری میں دائیں طرف سے آہٹیں گونجیں۔ پیرو اور مجھل نے بھی سنی ہوں گی مگر کوئی ایک آدمی ہو سکتا تھا۔ اس کی دبی ہوئی چاپیں بھی دوسروں سے مختلف تھیں۔ ایک مرتبہ اُٹھ کے معدوم ہو گئیں۔ چند ثانیے بعد چاپیں دوبارہ اُبھریں تو پہلے سے زیادہ واضح اور قریب تھیں۔ ضرور کوئی چھپ کے اس طرف آ رہا تھا۔ یکایک پیرو کی مضطرب سرگوشی راہ داری کے در و بام میں سرسرائی
"دادا! یہ تم ہو!"

میں نے شمر کی اوٹ سے سر نکال کے دیکھا تو میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ کانتے تھا۔ پھر میں اپنی جگہ نہ ٹھہر سکا۔ چند قدموں کا فاصلہ بجلی کی طرح طے ہوا۔ میں نے جب تک اُسے ہاتھوں سے ٹٹول کے اچھی طرح دیکھ نہ لیا، مجھے یقین نہیں آیا۔ مجھے جانے کیسے کیسے وہم آ رہے تھے۔ وہ کانتے ہی تھا۔ اس کے چہرے، شانے اور ہاتھوں سے خون بہہ رہا تھا۔ کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے۔ بکھرے بال، سارا چہرہ سوجا ہوا، خون میں لتھڑا ہوا لیکن اس کی آنکھوں میں خوف کے بجائے روشنی کی جھری ہوئی تھی۔ وہ اپنے پیروں سے چلتا ہوا آیا تھا اور اپنے پیروں ہی پر قائم تھا۔ اس کے کندھوں سے دو بندوقیں لٹک رہی تھیں اور ہاتھوں میں دو تمنچے دبے تھے۔ میں نے اُسے بازوؤں میں بھینچ لیا۔
"وہ لوگ کدھر ہے؟" پیرو نے بے تابانہ اس سے پوچھا۔
"کمرے میں بند کر کے آیا ہوں حرام کے جنوں کو۔"
"ابھی کون سے کمرے میں ہے؟"
کانتے نے اس کمرے کی طرف اشارہ کیا جہاں سے وہ لوگ مجھے، کانتے، زورا، جمرو، شامو اور مارتی کو یہاں لائے تھے۔
"وہ سالا اُدر زیادہ شور تو نہیں کریں گا؟"
"دیر لگے گی دادا!" کانتے نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔ کانتے سے مزید کچھ پوچھنے کا محل نہیں تھا۔ پیرو نے مجھ

سے کہا کہ اُسے اندر کے کمرے میں لے جاؤں۔
"ہم کو ادھر ہی رکھو دادا!" کانتے نے منمناتے ہوئے کہا۔
"تم کو جیسا بولا ہے، ویسا کرو۔"
کانتے ٹھیر نہیں پا رہا تھا۔ اُسے کوئی جواب دینے کے بجائے پیرو نے تیکھے لہجے میں مجھ سے کہا کہ اُسے جلد از جلد اندر دروازے تک پہنچا دوں۔ پیرو ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ راہ داری میں تادیر ہمارا یوں کھڑا رہنا مناسب نہیں تھا۔ کانتے کو بھی اپنے پیروں پر اپنے دریدہ جسم کا اتنا بوجھ نہیں ڈالنا چاہیے تھا۔ میں اُسے اندر لے آیا۔ کانتے کو دیکھ کے سبھی اُچھل پڑے اور چیخنے لگے۔ جامو، شامو، مارتی اور منیر علی اس کے گرد جمع ہو گئے۔ کانتے ہی نے انھیں ٹوکا۔ میں خود اُسے وہاں سے ہٹا کے بعجلت اس کونے میں لے آیا جہاں ابا جان اور تینوں ملازم تھے۔ میں نے اس کے کندھے سے بندوقیں اُتاریں اور ایک تمنچا اپنے پاس رکھ لیا۔ آستین سے میں نے اس کا منھ صاف کرنے کی کوشش کی۔ خون ابھی تک چھلک رہا تھا۔ انھوں نے ضرور اس کا چہرہ نوچا کھسوٹا ہوگا۔ یہ ناخنوں ہی کے کھرونچے ہو سکتے تھے۔ کانتے کو بہت تکلیف ہو رہی ہوگی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے لیے کیا کروں، کون سا مرہم لاؤں کہ اس کے زخم فی الفور مندمل ہو جائیں۔ جی چاہتا تھا کہ اُسے اپنے سینے میں بھینچے رکھوں، اس کی پیشانی، اس کے گالوں کو خوب پیار کروں۔ ننگو اور زورا، سرفراز اور اس کے ساتھیوں کو سنبھالے ہوئے تھے۔ کانتے کو دیکھ کے اُن لوگوں کی آنکھیں بھی چھلک گئیں۔ میں نے باہر جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ پیرو اور مجھل وہاں موجود ہی تھے۔ ادھر جمرو، شامو اور مارتی دوبارہ دروازے کے برابر دیوار کے ساتھ چپک کے کھڑے ہو گئے تھے۔ کانتے کا خون روکنے کے لیے منیر علی نے اپنا کرتا پھاڑ دیا اور اپنے حاجیوں والے سر کے رومال سے اس کے زخم صاف کرنے لگے۔ کانتے مسلسل اُٹھنے کی ضد کر رہا تھا۔ مان ہی نہیں رہا تھا۔ آخر ابا جان کو اُٹھنا پڑا۔ تب کہیں وہ چپ ہوا۔ کانتے کی آمد پر ابا جان جیسے بیدار ہو گئے تھے ورنہ وہ ننگے فرش پر کونے میں دیوار سے ٹیک لگائے گم سم بیٹھے تھے۔ کانتے اُٹھنے کی اتنی ضد کر رہا تھا مگر بیٹھتے ہی کراہنے اور بے سُدھ سا ہونے لگا۔ منیر علی نے اُسے فرش پر لٹا دیا اور اس کا سر اپنے زانوؤں پر رکھ لیا۔ وہ کبھی اس کا سر دباتے، کبھی بالوں میں انگلیاں پھیرتے۔ اُن کی تھپکیوں سے کانتے پر غشی طاری ہو جانی چاہیے تھی لیکن اس نے آنکھیں بند نہیں کیں۔ وہ ابھی تک اپنے آپ سے لڑ رہا تھا۔ اتنے میں راہ داری سے پھر چاپوں کی گونج سنائی دی۔ سب نے ایک دوسرے کو مستعد رہنے کے لیے اشارے کیے۔ میں بھی تمنچے کا رُخ دروازے کی سمت کیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ باہر مجھل اور پیرو کو انھیں روکنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ دو ہی تھے۔ وہ دونوں سیدھے اندر آ گئے۔ جمرو اور شامو تیار کھڑے تھے۔ انھوں نے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ وہ ان پر ٹوٹ پڑے۔

کمرے میں اُن لوگوں کی تعداد گیارہ ہو گئی۔ چار آدمی کانتے بند کر کے آیا تھا۔ اب چند ہی آدمی باہر رہ گئے ہوں گے اور اگر وہ عمارت کے باہر نگرانی پر ہوئے تو انھیں قابو میں کرنا ایسا آسان نہیں تھا۔ آخری دو آدمیوں کے بعد مجھل اور پیرو اندر آ گئے اور انھوں نے اپنی جگہوں پر زورا اور جمرو کو باہر بھیج دیا۔ اندر آتے ہی مجھل نے شامو کو ہدایت کی کہ وہ اُن لوگوں کے چہروں سے ڈھاٹے نوچ لے۔ شامو کے پیچھے ننگو بندوق لیے کھڑا تھا اور مجھل کے تمنچے کا رُخ بھی اُنھی کی طرف تھا۔ پہلے شخص نے کسی قدر مزاحمت کی۔ شامو نے اُچھل کے اتنی طاقت سے اس کے پیٹ پر ہاتھ کی ضرب لگائی کہ اُس کی آواز بھی نہ نکل سکی۔ شامو نے اس کے گلے میں انگلیاں گڑو دیں۔ وہ بری طرح ہانپنے لگا۔ باقی دوسرے آدمیوں کے لیے شامو کو یہ زحمت نہیں کرنی پڑی۔ کنارے پر کھڑا ہوا امر غالباً آخری آدمی تھا جس نے خود ڈھاٹا اُتارا۔ اُس کی شکل و صورت میرے تصور سے اتنی مختلف نہیں تھی اور تقریباً سبھی کی۔ اُن میں بیشتر کے رنگ صاف تھے۔ گورے اور پختہ رنگ۔ سب تیس سے چالیس کے لگ بھگ ہوں گے۔ ایک شخص کی چھوٹی سی داڑھی بھی تھی۔ باقی سب کی چھوٹی بڑی مونچھیں تھیں۔ اڈّوں سے اُن کا دور کا بھی تعلق نہیں ہوگا۔ وہ شہر کے رہنے والے معلوم ہوتے تھے۔ اُن کے چہرے کھردرے اور سخت تھے، بدن گٹھے ہوئے، قد اوسط یا پست، اپنی مخصوص وضع قطع اور طور طریق سے سب کسی ایک قبیلے یا گروہ کے افراد لگتے تھے۔ شورہ پشتی جن کا پیشہ ہو، عجب نہ تھا کہ وہ کسی رئیس کی جاگیر میں اسی کام پر ملازم ہوں یا باقاعدہ ڈکیت ہوں اور ان کی خدمات کسی راجا یا نواب نے حاصل کی ہوں۔
مجھل اور پیرو لمحوں تک اُن کے چہرے دیکھا کیے۔ پیرو بار بار پہلو بدلتا اور مجھل کی طرف دیکھتا۔ کمرے میں عجب بوجھل سا سکوت چھایا ہوا تھا۔ سب منتظر تھے کہ مجھل اُن کے متعلق کیا فیصلہ کرتا ہے۔

زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ "ابھی اور کتنے رہتے ہیں؟" معاً فضل کی آواز کمرے میں گونجی۔ اُس نے سرغنہ کی طرف مڑ کر کے پوچھا تھا۔ سرغنہ نے سنی ان سنی کر دی۔ کسی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ "ہم نے بولا ہے کہ ابھی باہر اور کتنے رہ گئے ہیں؟" فضل نے اونچی آواز میں دہرایا۔

سرغنہ کی پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئیں۔ جواب دینے کے لیے اُس کے ہونٹ پھڑپھڑائے تھے لیکن پھر اُس نے خاموشی ہی مناسب سمجھی۔

"ابھی یہ جانگلی لوگ ایسا کیسے بولے گا فضل بھائی!" پیرو نے کمی سے کہا اور لپک کے سرغنہ کے روبرو جا کے کھڑا ہو گیا۔ اُس نے اپنی بندوق اُتار کے میری طرف پھینک دی تھی۔

پیرو شاید سوچ رہا تھا کہ سرغنہ پر کون سی ضرب لگائے کہ فضل نے اُس سے کہا۔ "ٹھیک ہے دادا! ابھی اس کو تھوڑا سانس لینے دو۔ ادھر دوسرے لوگ کر... ہیں۔ اس کو کتھا ہی دیکھیں گے۔"

کس قدر تذبذب کے بعد فضل کی بات پیرو کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ سرغنہ کے سامنے سے ہٹ کے اُس کے برابر کھڑے ہوئے آدمی کے مقابل ہو گیا اور وہی سوال دہرایا۔ وہ شخص بے قراری سے سرغنہ کی طرف دیکھنے لگا۔ پیرو نے اُس کے بال پکڑ کے اُسے آگے کی طرف کھینچ لیا۔ میری نگاہ اُس وقت جانے کس طرف بھٹک گئی تھی۔ میں نے بس اُس شخص کو چیخ مارتے سنا اور اُس کے قدم زمین سے اکھڑتے دیکھے۔ وہ فرش پر گر گیا۔ پھر وہ اُٹھ کے بھاگنا چاہتا ہی تھا کہ پیرو نے اُس کے سر پہ ٹھوکر ماری۔ اُس کے منہ سے عجیب بے ہنگم آوازیں نکلنے لگیں اور اُس کا سارا جسم فرش پر پھڑکنے لگا۔ پیرو کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اُسے ٹھوکریں مارتا رہے۔ پیرو کے چہرے پر خون جیسے دہک رہا تھا۔ ہاتھ پیر اکڑے ہوئے سے تھے۔ اُس نے بال پکڑ کے اُسے فرش سے اُٹھایا اور سرغنہ کی طرف دھکیل دیا۔ سرغنہ اور اُس کے ساتھیوں نے اُسے سنبھالا۔

جیسے ہی پیرو دوسرے آدمیوں کی طرف بڑھا، سرغنہ حلق آواز میں بولا۔ "ہم بتاتے ہیں، ہم بتاتے ہیں۔" اُس نے مزید توقف کے بغیر بتایا کہ اُس کے ساتھ چودہ آدمی تھے۔ پیرو نے استفسار کیا کہ باقی آدمی کہاں کہاں تعینات کیے گئے ہیں؟ سرغنہ نے کسی قدر تامل کیا۔ پیرو نے اُس کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا اور اس سے پہلے کہ اس پر ہاتھ اُٹھاتا، وہ بول پڑا کہ دو آدمی بھی عمارت سامنے موجود ہیں۔ باقی پانچ عمارت کی چوکسی پر ہیں۔ وہ فصیلوں کے باہر ہیں۔

پیرو اُس سے کہنا چاہتا تھا کہ اگر اُس نے ذرا بھی غلط بیانی کی تو...... مگر اُس کی بات ادھوری رہ گئی۔ فضل نے شامو کو تاکید کی کہ وہ ان سب کی تلاشی لے۔

"تلاشی کیسا فضل بھائی!" پیرو نے بھڑک کے کہا۔ "اپن ابھی ان کا کپڑا ہی اُتار لیتا ہے نا۔ دیکھتا ہے سالا کتنا پڑھ پڑھ کے آیا ہے۔"

شامو نے پہلے آدمی کی کمر سے بندھی ہوئی کارتوسوں کی پیٹی اُتار لی۔ اُس کی جیبوں سے بھی چند کارتوس برآمد ہوئے۔ پیرو بھی شامو کا ساتھ دینے لگا۔ تیسرے آدمی نے کچھ ہیر پھیر کی۔ شامو نے پیچھے سے اپنی بندوق کی بٹ اُس کی ٹھوڑی پر ماری۔ اُس کے کئی دانت ٹوٹ گئے ہوں گے۔ آنکھیں تو پہلے ہی اُبل پڑی تھیں۔ اُس کے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک تمنچا بھی نکلا۔ دونوں نے چند منٹوں میں اُن کے کوٹوں سے چھپی ہوئی کارتوسوں کی پیٹیاں، مختلف جیبوں میں پڑے ہوئے کارتوس، دو تمنچے اور جسم سے منسلک ہوئے چاقوؤں کے علاوہ اُن کے تین چاقو بھی برآمد کر لیے تھے۔ اگر سرغنہ کے بیان کے مطابق اُس کے دو ساتھی واقعی عمارت میں موجود تھے تو وہ دو وجوہ سے یہاں نہیں آ سکے تھے۔ یا تو وہ ابھی تک تلاش میں ہوں گے یا انھیں شروع ہی سے عمارت کے کسی حصے میں پاسبانی کے لیے تعینات کیا گیا ہوگا۔ چنانچہ اُن کے یہاں آنے کا امکان نہیں تھا۔ ان کے سروں پر کسی کھٹکے کے بغیر ہمارا پہنچ جانا آسان تھا۔ بہر حال ہمارے لیے کم از کم ان دو تک رسائی حاصل کرنا ضروری تھا۔ کسی طور بھی انھیں یہاں اپنے ساتھیوں کے ساتھ شامل ہونا چاہیے تھا۔

فضل نے کچھ دیر انتظار کیا۔ اس دوران وہ سرگوشیوں میں پیرو سے کچھ کہتا سنتا رہا۔ کوئی مشورہ کر رہا ہوگا۔ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ اس وقت وہ کیسی کش مکش سے دوچار ہوگا۔ اُن سے کوئی رعایت نہیں کی جا سکتی تھی۔ خود انھوں نے اپنے لیے کوئی گوشہ نہیں چھوڑا تھا۔ اُن کے بارے میں فضل نے ہم میں سے کسی سے کچھ نہیں پوچھا۔ شاید اس لیے کہ اُسے ہمارا جواب معلوم تھا۔ سب کا ایک ہی جواب ہوتا اور وہ ہماری آنکھوں میں، ہمارے چہروں پر لکھا ہوا تھا۔ صبح ابھی دُور تھی لیکن لمحہ بہ لمحہ قریب آ رہی تھی۔ فضل اور پیرو کو اُن کے متعلق جلد کوئی فیصلہ کرنا تھا۔ فضل نے ... عمارت میں موجود دو آدمیوں کی ممکنہ واپسی کا انتظار کیا تھا۔ اُسے اپنے خون کی حدت کم کرنے کے لیے اس وقفے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہوگی۔ وہ پانچ آدمی بھی

اُس کی آنکھوں میں کھٹک رہے ہوں گے جن کے متعلق بتایا گیا تھا کہ عمارت کے اطراف یعنی فصیلوں کے اندر نگرانی کے لیے متعین ہیں۔ وہ سب کے سب مسلح ہوں گے اور اپنے ساتھیوں کی جلد واپسی کے منتظر۔ فضل نے شامو سے کہا کہ وہ سرغنہ کو اُس کے ساتھیوں کے درمیان سے الگ کر لے۔ اُس نے مزید دو آدمیوں پر انگلی اُٹھائی۔ شامو نے انھیں بھی سرغنہ کے ساتھ باہر کھینچ لیا۔ کسی تاخیر کے بغیر وہ اُن تینوں کو لے کے دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔ فضل اور پیرو نے مجھے کوئی اشارہ نہیں کیا۔ انھوں نے میری طرف دیکھا ہی نہیں تھا لیکن جیسے ہی وہ سرغنہ اور اُس کے ساتھیوں کو بندوقوں کی زد میں لیے دروازے سے باہر نکلے، میں بھی اُن کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ راہداری میں آ کے پیرو ٹھیر گیا اور اُس نے سرغنہ کا شانہ تھام کے کہا۔ "سنو، گیدڑ کی اولاد! اپن کی بات بھی پورا دھیان سے سنو!"

پیرو نے اُس سے کہا کہ کہیں وہ دونوں آدمی فوراً درکار ہیں جو سرغنہ کی اطلاع کے مطابق اندر عمارت میں کہیں ہیں۔ سرغنہ جواب میں کہہ سکتا تھا کہ وہ تلاشی کے لیے گئے ہیں مگر اُس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ صرف اپنے تیوروں سے لاعلمی ظاہر کی۔ پیرو نے اُس سے دوبارہ نہیں پوچھا۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کے اُس کے جبڑوں پر پوری شدت سے تھپڑیاں ماریں۔ سرغنہ کی آنکھوں میں اندھیرا اُبھر آیا ہوگا۔ پیرو نے اُس کی گدی پکڑ لی۔ سرغنہ اپنا سر پکڑے ہوئے تھا اور بات کرنا بھی اُس کے لیے مشکل ہو گیا تھا۔ اُس نے ہذیانی انداز میں راہداری سے باہر دالان جانے والے راستے کی طرف ہاتھ اُٹھایا۔ گویا میرا قیاس درست تھا۔ وہ دونوں عمارت کے اندرونی حصے میں مامور کیے گئے تھے اور تلاشی کے لیے نہیں نکلے تھے ورنہ وہ اپنے دوسرے ساتھیوں کے مانند اب تک کمرے میں آ جاتے۔ اب ہم راہداری میں کھل کے نقل و حرکت کر سکتے تھے۔ فضل اور پیرو نے پھر بھی احتیاط کی۔ اُن کی نگاہیں ہر طرف منڈلا رہی تھیں۔ وہ چال میں بھی محتاط تھے۔ سرغنہ کے بارے میں بھی فرض کیا جا سکتا تھا کہ اُس نے کوئی فریب تو نہیں کیا۔ گو وہ اس کے نتائج سے بھی اچھی طرح آگاہ ہوگا۔ راہداری کے اختتام پر دالان کی طرف جانے والا راستہ آگے جا کے مڑ جاتا تھا۔ فاصلہ کچھ زیادہ نہیں تھا۔ پیرو سرغنہ کی گدی پکڑے پکڑے اُس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ سرغنہ کے ساتھیوں پر کسی دیوانے لمحے کے تحت ... کے آثار بظاہر نظر نہیں آتے تھے تاہم میں اور فضل اُن پر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔

دالان میں داخل ہونے کے لیے محراب نما راستہ کھلا ہوا تھا۔ یہ بالا انھوں نے کسی اور طرف سے اندر آ کے کھولا ہوگا یا ملازم یہ بند کرنا بھول گئے تھے۔ ممکن ہے بند ہی نہ کیا جاتا ہو۔ بہر حال عمارت میں داخلے کے یہ ایک ہی راستہ نہیں تھا۔ پیچھے سے بھی راستے تھے اور ادھر اُدھر بنے ہوئے مختلف کمروں کے دروازے بھی دالان میں کھلتے تھے۔ ہم رات کو بیٹھک کے دروازے ہی سے دالان میں آئے تھے۔ ڈاکوؤں کے متعلق کہہ سکتے ہیں کہ عمارت میں گھسنے کے بعد پہلے وہ واپسی کے لیے مختلف راستوں کی طرف سے اطمینان کر لیتے ہیں۔ راہداری کا ہر راستہ سیدھا اور آسان تھا۔ انھوں نے حفظ ماتقدم کے طور پر اسے کھلا رکھا ہوگا۔ حویلی کے مختلف راستوں سے آگہی کے لیے، ہو سکتا ہے انھوں نے کسی ملازم سے بھی مدد لی ہو۔ سب سے پہلے ملازم ہی انھیں ٹکرائے ہوں گے یا انھوں نے سب سے پہلے ابھی تک پہنچنے کی جستجو کی ہوگی۔ اندر کمرے میں ابا جان کے قریب موجود ایک ملازم کا شکستہ حال بتا رہا تھا کہ سب سے زیادہ وہی اُن کے جبر کا ہدف رہا ہے۔ اب تک اُس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔

پیرو فوراً ہی دروازے سے باہر نہیں نکلا۔ اندر ہی ایک قدم پیچھے رُک گیا۔ اُس طرف روشنی کی مدھم جھلکی پڑ رہی تھی لیکن یہ دالان میں روشنی کم نہیں تھی۔ پیرو نے بڑبڑاتے ہونٹوں سے سرغنہ کو کوئی حکم دیا تھا۔ یقیناً اُن لوگوں نے واپسی کے وقت ایک دوسرے کو تنبیہ کرنے یا کسی ہنگامی ضرورت کے وقت انھیں انتباہ کرنے کے لیے کچھ اشارے مقرر یا تجویز کیے ہوں گے۔ پیرو نے یہی کہا ہوگا۔ سرغنہ نے کچھ تذبذب کیا۔ پیرو نے اُس کی گدی پر چٹکی کی گرفت اور سخت کی۔ سرغنہ کھڑے کھڑے پیر پٹخنے لگا۔ دالان کے سکوت میں اُس کی کراہوں سے ارتعاش سا ہو گیا تھا۔ باہر سے کسی کے ادھر اُدھر لپکنے کی آہٹیں سنائی دیں۔ یہ آوازیں اُن کے ارد گرد موجود آدمیوں کی بے چینی ہو جانا چاہیے تھا۔ گمان تھا کہ جس میں وہ اب بھی آ سکتے ہیں مگر وہ نہیں آئے۔ پیرو دوبارہ سرغنہ کو اذیت میں مبتلا کر سکتا تھا۔ پیرو ہی کچھ سوچ رہا ہوگا کہ دفعتاً سرغنہ کے ساتھیوں میں سے ایک نے سنسناتی ہوئی آواز میں پکارا۔ "خیری ہے نا بجے؟" جواب میں چاپیں ہم سے کچھ اور قریب ہو گئیں۔ وہ کوئی ایک ہی آدمی ہو سکتا تھا۔ آواز کی سمت کے تعین میں اسے کوئی الجھن پیش نہ آنی چاہیے تھی اور اب یقیناً اسے راہداری کے محرابی دروازے کا جائزہ ضرور لینا چاہیے تھا۔ یہی ہوا۔ میں اور فضل پہلے چند قدم کے

فاصلے پر پہلے ہی اندھیرے کی اوٹ میں ہو گئے تھے۔ دونوں ایک ساتھ کیونکہ اندھیرا ایک ہی طرف تھا اور دوسری طرف کوئی آڑ نہیں تھی۔ وہ ایک ہی آدمی تھا۔ سب سے پہلے اس کی نظر اپنے تینوں ساتھیوں پر پڑی جن کے چہرے کھنچے ہوئے تھے اور بندوقیں ہاتھ میں نہیں تھیں۔ "اسے بولو کہ بندوق پھینک دے۔" پیرو نے مرغزے سے انھیں حکم دیا۔

آنے والے شخص نے بھی سن لیا۔ اس نے دہشت زدہ انداز میں اپنے ساتھیوں کو دیکھا۔ مرغزہ سر جھکا کے رہ گیا۔ اس کے دونوں ساتھیوں نے بھی یہی کیا لیکن نووارد کے لیے اتنی جلد بندوق چھوڑ دینے کا فیصلہ دشوار تھا۔ وہ کچھ پیچھے ہٹ گیا۔ "اس کو بولو کہ بس ایک کھٹکے کی دیر ہے۔" پیرو نے درشتی سے کہا۔ وہ شخص بندوق تانے پیرو کو نشانہ لینے کے لیے پھڑکنے لگا۔ اس کی یہ حرکت توقع کے مطابق تھی۔ فوری ردعمل کا یہ مرحلہ گزرنے کے بعد اس کی سمجھ میں آنا چاہیے تھا کہ وہ نشانہ صرف اپنے ساتھیوں کا لے سکتا ہے اور یہ بھی کہ اس کے ساتھی کس مشکل میں گرفتار ہیں مگر وہ کچھ زیادہ معصوم ہوتا تھا یا اس کی قوت ارادی مضبوط تھی۔ اس نے پیرو کے حکم کی تعمیل نہیں کی۔ میں اور تجمل پیچھے ہونے کی وجہ سے اس پر جھپٹ نہیں سکتے تھے۔ میں نے کمرے میں اس کے ساتھیوں کی جیب سے برآمد ہونے والا چاقو پاس رکھ لیا تھا۔ میں اس جگہ سے اس کے پیروں یا ہاتھ کا نشانہ لے سکتا تھا مگر احتیاط لازم تھی ایسا نہ ہو کہ بدحواسی میں اس سے بندوق چل جائے۔ ترچھے کھڑے ہونے کی وجہ سے نشانہ بھی بہت ٹھیک کے لینا پڑتا۔ نشانہ چوک بھی سکتا تھا کیونکہ اسے قرار نہیں تھا۔ ہم کسی چوک کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ ہاں ایک اور تدبیر بھی تھی کہ میں اپنی جگہ کے بجائے پیرو اور ان تینوں کی عین پشت پر تیزی سے آ کے نشانہ لوں لیکن اس میں پھر ادا کسی قسم کا شور نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ باہر کی جانب تھا۔ شور سے عمارت کے اطراف بکھرے ہوئے ان کے دوسرے مسلح ساتھیوں کے کان کھڑے ہو جاتے ورنہ پھر تمنچا چلانے میں کیا قباحت تھی۔ پیرو کسی کے بھی اس پر پیچھے سے نشانہ لے سکتا تھا۔

پیرو نے ایک بار پھر اسے حکم دیا۔ وہ اور پیچھے ہٹ گیا۔ اس سے کچھ بعید نہ تھا کہ سامنے ہی سے ہٹ جائے یا اپنے باہر والے ساتھیوں کو مطلع کرنے کی نادانی کر بیٹھے یا کسی جانب بھاگ جانے کا سودا اس کے دماغ میں سما جائے۔ اس کو ایک ساتھی نہیں، تین ساتھی ہتھیار کے بغیر بےبسی کی حالت میں سامنے کھڑے تھے اور وہ دیکھ رہا تھا۔ پیرو کو اس کی مخبوط الحواسی کا احساس ہو گیا تھا۔ اس نے مرغزے کے گھٹنے پر ایڑی ماری اُدھر اُس نے اُس کی گدی پر پہلے ہی چھچی دھر رکھی تھی۔ مرغزہ بلبلا پڑا۔ پیرو کو جلد ہی کچھ کرنا تھا۔ مرغزے کو مزید سوچنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی تھی۔ سامنے کھڑے ہوئے شخص کی آنکھیں کچھ اور باہر نکل آئی تھیں۔ گویا اسے اتنی دیر بعد صورت حال کا اندازہ ہوا تھا۔ مرغزہ اور اس کے دونوں ساتھیوں کے چہرے ہماری جانب نہیں تھے۔ ہم نہیں دیکھ سکے کہ انھوں نے اسے کیا اشارہ کیا تھا۔ ان کی نگاہوں نے التجا ہی کی ہوگی جبھی اس نے جھجکتے ہوئے بندوق ان کے آگے پھینک دی۔ میں اور تجمل اسی موقع کے منتظر تھے۔ دونوں ساتھ ہی تیزی کے ساتھ اندھیرے کی اوٹ سے نکلے۔ میں نے جھپٹ کے اس کی بندوق اٹھائی۔ تجمل نے اس کا بازو دبوچ لیا۔ ہمیں نکلا دیکھ کے وہ بے اختیار بھاگ کھڑا ہوا تھا لیکن دالان کی روشنی میں لٹے ہوئے ہاتھوں میں دبا ہوا تمنچا نظر آ گیا ہوگا۔ وہ خود ٹھٹک گیا۔

"دوسرا کدھر ہے؟" پیرو نے ایک لمحے بھی توقف نہیں کیا۔ مرغزے نے بھی تامل نہیں کیا۔ اس نے حویلی کی پشت کی جانب اشارہ کر دیا۔ اُدھر زنان خانے کا حصہ تھا۔ ہمیں اندر راہداری کا سارا راستہ عبور کرنا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ واپس ہوتے ہوئے زنانے کا دروازہ بند کرتا جاؤں۔ تجمل نے توجہ نہیں دی۔ ہم تیز قدموں سے انھیں ساتھ لیے راہداری طے کرنے لگے۔ درمیان میں وہ کمرہ بھی پڑتا تھا۔ جہاں شامو، مارتی، آپا جان وغیرہ اور ان کے آدمی موجود تھے۔ کمرے کے تھموں کی آڑ میں جبرو اور زورا مستعد کھڑے تھے۔ تجمل نے ان سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ شخص بھی ہمارے ساتھ ساتھ آ رہا تھا جس پر ابھی قابو پایا گیا تھا۔ اس مرتبہ تجمل اور میں پیرو اور ان چاروں سے کچھ آگے نکل آئے۔ پیرو قدرتاً ان کے پیچھے رہ گیا تھا۔ یہ کوئی مناسب بات نہیں تھی لیکن کوئی عمل کرنے سے پہلے وہ اپنے آگے چند گز کی دوری پر ہماری موجودگی نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔

اس طرف بھی زنان خانے میں ویسا ہی دروازہ بنا ہوا تھا جیسا مردانے کے دالان میں کھلتا تھا۔ یہاں روشنی زیادہ نہیں تھی۔ اندر اندھیرے کی اوٹ بھی دروازے سے کچھ دور تھی۔ ہم یہاں خود کو چھپاتے تو پیرو کو دروازے سے اور پیچھے ٹھہرنا پڑتا۔ پیرو نے پھر دروازے سے قریب ہونے کے لیے ہم سے آگے جانے کا فیصلہ کیا۔ کچھ وہی کیفیت تھی جو دالان کے دوسرے سرے کے مردانے دروازے پر تھی۔ اس بار بھی مرغزے کے ساتھیوں میں سے ایک نے اسے پکارا۔ اب کے اس نے صرف ایک آدمی کا نام

لیا تھا جسے کاجا کہیں قریب ہی کھڑا تھا۔ وہ فوراً نمودار ہو گیا۔ ابھی وہ دروازے کے سامنے نہیں آیا تھا کہ اسے پکارتے وقت ہی تجمل نے ارادہ بدل دیا تھا۔ آخری لمحے میں ہم اندھیرے سے نکل کر ان چاروں کے پیچھے آ گئے تھے۔ یعنی اس پر پہلے تو وہی حیرت طاری ہوئی۔ اس کے نظر آتے ہی پیرو نے مرغزے سے کہا "اس کو بولو کہ سارے پٹھان پالتو اپن کے پاس ہیں۔ اب امید اب کچھ بھی نہیں رہا ہے۔" پیرو کو اپنا حکم دہرانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ کاجا زیادہ زود حس، معاملہ فہم اور نظر کا تیز ثابت ہوا۔ ایک ہی نگاہ میں سارا معاملہ بھانپ گیا۔ آدمی آدمی میں فرق ہوتا ہے۔ کچھ یوں بھی اسے فیصلہ کرنے میں آسانی ہوئی ہوگی کہ اُدھر دوسرے دالان میں تعینات اس کا ساتھی خیری نامی شخص بھی ان میں شامل تھا۔ اپنے ساتھیوں کے شانہ بشانہ اس نے ہمارے چہرے بھی خوب دیکھ لیے تھے۔ ہم نے اپنے چہرے اس سے چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ کھٹکا دبانے کی آہٹ پر ہم اس کے ساتھیوں کی دیواروں میں اوجھل ہو جائیں گے۔

صبح اور قریب ہو گئی تھی لیکن اندھیرا گہرا تھا۔ وہ سترہ کے سترہ وہاں موجود تھے۔ جبرو اور زورا ان چاروں کو بھی یہاں لے آئے تھے جنھیں کالے کمرے میں بند کر کے آیا تھا۔ ان میں سے دو کی حالت نہایت ابتر تھی۔ بھیروں خون میں ڈوبی ہوئی کٹے پھٹے چہرے کبھی شانے دباتے، کبھی پیٹ پکڑتے تھے۔ کالتے نے ان کے سروں کو بھی زخمی کیا تھا۔ کالتے کو اس وقت ہوش ہی کہاں ہوگا کہ وہ ان پر ضربیں لگانے میں احتیاط برتتا۔ اسے جیسے بھی موقع ملا ہوگا۔ اس نے اندھا دھند ان پر بندوق گھمائی ہوگی جو ایک لاٹھی اس کے پاس تھی۔

تجمل، پیرو، شامو، مارتی ان کے مقابل چند قدموں کے فاصلے پر کھڑے تھے۔ جبرو اور زورا کو تجمل نے راہداری میں واپس بھیج دیا تھا۔ اس طرف سے ابھی چوکنا ہی رہنا چاہیے تھا۔ اندر کمرے میں سب کی نظریں تجمل اور پیرو پر جمی ہوئی تھیں۔ دونوں خاموش کھڑے رہے۔ ہمارے پیچھے بیٹھے ہوئے آپا جان اور میر علی بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ کالتے بھی اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کمرے میں موت کا سا سکوت چھا گیا تھا۔ انھوں نے بھی اپنی کراہیں سینوں میں گھونٹ لی تھیں۔ سب بتوں کے مانند منجمد کھڑے تھے۔ دیر ہو گئی تو پیرو نے دبی ہوئی آواز میں تجمل کو ٹوکا "ابھی ان کا کیا بنانے کا تجمل بھائی؟"

تجمل نے ایک لمبی سانس کھینچی۔ "ہاں دادا!" تجمل کی آنکھ ابھی جل رہی تھی۔ "ابھی ان سے پوچھو یہ حرامی کے تم کیا بولتے ہیں؟"

"یہ سالا ابھی کیا بولے گا تجمل بھائی! ادھر باہر مٹی زیادہ سخت نہیں ہے۔ بولے تو اپن ابھی ان کا ایک ساتھ قبر بنا دے۔ سویرا ہونے سے پہلے اپن سب کو ایدھر علاقے کے گھورے پہ بھی پھینک کے آ سکتا ہے۔"

"اچھا ستا دو ٹھیک بولتے ہیں دادا!" شامو خاموش نہ رہا گیا۔ وہ غصے سے لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ "ابھی انھی سے پوچھو دادا! بعد میں ان سور کے بچوں کو کوئی شکایت نہ ہو۔"

"شکایت بولنے کو ابھی یہ سب بچ گیا رہے۔"

"اس نے بابا پر ہاتھ اٹھایا تھا دادا! اپن کو حکم کرو تو ابھی اس کا دونوں ہاتھ کاٹ دے؟" مارتی تلملاتے لہجے میں بولا۔ تجمل سنا رہا اور اس نے مرغزے کو مخاطب کر کے پوچھا "کیا نام ہے رے تیرا؟" مرغزہ پلکیں پٹپٹا کے رہ گیا۔ تجمل نے اس کے جواب کا انتظار بھی نہیں کیا۔ بوجھل آواز میں بولا "جانے دے، نام تو تو نے خود نہیں رکھا ہوگا۔"

"معاف کر دو نواب صاحب!" ان میں سے کنارے پر کھڑا ہوا ایک آدمی گڑگڑایا۔ "ہم کو معافی دے دو، بڑی غلطی ہو گئی ہے حضور نواب!"

"اپن کو ابھی نواب بولتا ہے تجمل بھائی!" پیرو زہرخند سے بولا۔ "سالا کیسا مداری ہے۔ ابھی معافی کو بولتا ہے۔"

"آپ کے بچوں کو خدا کا واسطہ" ایک دوسرا آدمی عاجزی سے بولا۔

"اب خدا کو بیچ میں لاتا ہے" پیرو نے پھنکارتی آواز میں کہا۔ "معاف کرو کہ تم جانتے تھے یہی بولتا ہے تم؟"

وہ شخص ہیجانی انداز میں سر ہلانے لگا۔

"تلاشی سے پہلے پورا تم سنے؟"

"ہم کو معلوم ہو گیا ہے، یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔" وہ التجا آمیز لہجے میں بولا۔ "اب ہم کو کچھ نہیں چاہیے سرکار!"

"ابھی کیدھر سے آیا تھا تم؟" پیرو نے اس سے پوچھا۔

"کہیں سے بھی نہیں۔ ہم خود آئے تھے سرکار!" وہ ہاتھ جوڑ کے گھگھیایا۔ "ہم بالکل اندھے ہو گئے تھے۔"

"اور ابھی تم کیا سمجھتا ہے؟ اپن کو ابھی بھی تم اندھا ہی لگتا ہے۔ ابھی تمھارا آنکھ نکال کے باہر کرے گا تو سالا تم کو ایک

دم پورا دکھائی دے گا۔"
"ہم قسم کھاتے ہیں، ہم کو کسی نے نہیں بھیجا تھا۔"
"پھر چھترے کا جان کا دی سیدھا اوپر سے ہوا تھا تم کو...! ایسا ہی نا؟" پیرو نے دھاڑتے ہوئے پوچھا۔ "اور وہ پٹھا، سالا! گرگٹ کا..... " پیرو سے خود کو روکا نہیں گیا۔ وہ مغلظات سنانے لگا۔ اُس کی آنکھوں سے چنگاریاں لپک رہی تھیں۔ مجمل کو کسی طرح اُس کے ہاتھ سے تمنچا لے لینا چاہیے تھا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اگر اُن میں سے کسی نے پھر کوئی چبلا پن کیا تو پیرو کو سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔

"اپنے کو ایسی جلدی نہیں ہے دادا!" مجمل کے چہرے پر ابھی آگ بھڑک رہی تھی۔ پیشانی سکڑی ہوئی، نتھنے پھولے ہوئے تاہم اُس نے ہاتھ اٹھا کے پیرو کو روکا اور دھیمے لہجے میں اُسے سمجھانے کی کوشش کی: "یہ بے چینگے نام تو کوئی بھی بول سکتے ہیں۔ پر اپنے کو جان سے کیا کرنا ہے۔ ابھی سامنے اپنے ہی جھٹکے کے لیے آنے ہیں کسی راجے نواب کے تھوکے۔ اپنے کو پہلے اصلی کو دیکھنا ہے۔ پیچھے والے اپنے پالتوؤں کو کھوجتے ادھر ضرور پلٹیں گے۔ گندا خون ویسے زور نہیں مارتا۔ پر چھترے بھی تو اُن کے پاس نہیں پہنچے۔ اُس کے لیے اُن کو اس طرف آنا چاہیے۔ اُن لوگوں سے تب بات کریں گے۔ ابھی پہلے ان کا بولو دادا!"

"کیا بولے مجمل بھائی!" پیرو اونا اکھڑ گیا۔ ہنسی ہوئی آواز میں بولا: "ابھی ہو سکے تو انھیں اِدھر کمرے سے نکل جانے کا حکم کر دو۔ اپن ان کو زیادہ دیری....." پیرو کے حلق میں جیسے کوئی چیز اٹک گئی تھی۔ مجمل کی طرف ایک نظر دیکھ کے وہ دُکھی سے بولا: "اپن ابھی زیادہ دیری نہیں ٹھیر سکتا۔"

"ہاں استاد!" میرے دائیں طرف کھڑا ہوا شامو بھی بھرے لہجے میں بولا: "اپنے کو بس تھوڑی دیر کُھلا چھوڑ دو۔ پھر دو منٹ میں آ کے کر دیں گے!"

"ہم..... ہم آپ لوگوں کو مارنے کا ارادہ نہیں کیے تھے۔" وہی شخص ہکلاتے ہوئے جلدی جلدی اونچی آواز میں بولا جس نے سب سے پہلے زبان کھولی تھی۔ "ہم صرف چھترے کے لیے آئے تھے۔ یہ ہتھیار اُس بندوقچی کو خالی دکھاوے کے لیے لائے تھے۔ ہم کسی کو مارنا نہیں چاہتے تھے۔ ہم کبھی کسی کا جان نہیں لیے نواب حضور! ہم غریب لوگ ہیں۔ ہماری بات کا یقین کرو، جھوٹ بولیں تو اولاد سے جائیں۔"

"ان میں یہ سب سے بڑا کتا ہے استاد!" شامو بھنا کے بولا۔ "سنتے ہو تم؟ یہ حرامی اب کیا بولتا ہے۔ اپنے کو مار دیتے تو سالا کچھ بھی نہیں آ جاتا۔ سامنے بابا کی خواری دیکھنے کو تو ترستے، یہ سب سوچ کا بچھو اور دہ کے لیے ہوتا ہے۔ بابا پر ہاتھ اُٹھاتے ہوئے ان زندگی کے تینوں میں سے کسی کو یہ دھیان نہیں آیا کہ وہ بھی ہم لوگ کے کوئی ہو سکتے ہیں۔" شامو کی آواز بھرانے لگی۔

مجمل نے پیرو کو کوئی جواب دیا نہ شامو کی دخل اندازی پر اُسے خاموشی کی تلقین کی۔ وہ چپ کھڑا اب کچھ دیکھتا اور سنتا رہا۔ شامو کی مداخلت اُسے اور اُلجھانے کے مترادف تھی۔ شامو اُس کی جگہ ہوتا تب اُسے کچھ اندازہ ہوتا کہ اُن کے متعلق کوئی فیصلہ کرنا ایسا آسان نہیں ہے۔ صبح میں اب کچھ ہی دیر رہ گئی تھی۔ مجمل کو اُن کے بارے میں فوراً کوئی حکم سنانا تھا مگر کیا حکم؟ وہی جو شامو کہہ رہا تھا یا جس کا اشارہ پیرو نے کیا تھا؟ خود اُس کا جی بھی اُنھی کی ہم نوائی کر رہا ہو گا مگر اس طرح کوئی فیصلہ کیسے کیا جا سکتا تھا۔ انھیں سخت سے سخت جسمانی اذیت بھی دی جا سکتی تھی۔ اُن سب کو اُنھی کے ہتھیاروں سے نیست و نابود بھی کیا جا سکتا تھا مگر کلیجے کی ٹھنڈک اور آپا جان پر کی گئی دست درازی کی تلافی یوں ممکن ہوتی تو مجمل کو اتنی دیر نہ لگتی۔ آنے والی گھڑیوں کی ضمانت بھی کسی فیصلے سے مشروط ہونی چاہیے تھی۔ پیرو اور شامو کو اُسے یاد دلانے کی ضرورت نہیں تھی۔ مجمل بھی اس کمرے میں موجود تھا اور اُس کی یادداشت اُن سے کمزور نہیں تھی۔ سرغنے کے ہاتھ سے کیا ہوا تماچہ اُس کے گال پر اب تک لگ رہا ہو گا۔ اُن کے اس طرح بے بس ہو جانے کا یہ مطلب نہیں تھا کہ سامنے بس وہی ہیں۔ مجمل کو دیوار کے پیچھے بھی نگاہ رکھنی تھی۔ کوئی ایسا فیصلہ ہونا چاہیے تھا جو اُن کی واپسی کی منتظر دیوار کے پیچھے کھڑے ہوئے لوگوں کو بھی قابلِ قبول ہو اور دیوار کے پیچھے سبزہ زار میں چھپے ہوئے پانچ ادھیڑ (?) کے باہر قیمت اُن کے وردی ہی نہیں تھے۔ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ اُن سانپوں کے بچے آ دوڑی راستے رو جاتے۔ یا تو وہ اُلٹے قدموں بھاگ کھڑے ہوتے یا اپنے ساتھیوں کی تلاش میں عمارت کے اندر داخل ہونے کا ارادہ کرتے۔ وہاں راہداری میں جمرو اور زورا اُن کا انتظار کر رہے تھے۔ مجمل کی نگاہ اُنھی سات پر نہیں ہو گی بلکہ اُن دونوں پر بھی ہو گی جو نہ جانے کتنی دیواروں اور دوریوں کے پیچھے تھے۔

سرغنہ اور اُس کے ساتھی جیسے کسی عدالت میں فیصلہ سننے کے لیے مضطرب کھڑے تھے۔ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں لیکن اُن دونوں کے سوا کسی اور نے مجمل سے عاجزی بھی نہیں کی۔ شاید اُن سب ہماری جانب سے کسی رعایت سے [illegible] ہو چکے تھے یا اُن کے خیال میں اُن کی خاموشی بجائے خود ندامت کا اظہار تھی۔ سرغنہ بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ کم از کم اُسے اپنے متعلق کوئی خوش فہمی نہیں ہونی چاہیے تھی لیکن اُس کی حالت قطعاً اُس شخص جیسی نہیں تھی جو اپنا نوشتہ پڑھ چکا ہو اور کوئی دلیل، کوئی جواز اور سوچنے کے لیے کچھ بھی نہ رہ گیا۔ ایسا نہیں معلوم ہوتا تھا کہ کوئی اور چارہ نہ ہونے کی صورت میں اُس کے اندر غیرت، خودداری، بے نیازی اور استغنا کا کوئی احساس بیدار ہو گیا ہے۔ اُس کی کیفیت اُس شخص سے مشابہ تھی جس پر کسی اچانک حادثے کے سبب سکتہ سا طاری ہو گیا ہو۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے صورتِ حال سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر وہ سب پیرو سے قیاس تھے۔ اُس کے دل و دماغ پر کسی بھی کیفیت کا غلبہ ہو سکتا ہے۔ وہ ذرا اتنا پرسکون تھا نہ اپنے ساتھیوں کی نسبت اُس کے چہرے پر غیر معمولی ہیجان نظر آتا تھا۔ وہ مزید پتھر ہوتا جا رہا تھا۔

کافی دیر بعد مجمل کے جسم میں جنبش ہوئی۔ اُس نے بھاری آواز میں پیرو کو مخاطب کیا: "دادا! اپنا خیال ہے کہ پولیس کو بلا لیا جائے۔"

"مجھے اپنے کانوں پر دھوکا ہوا! پولیس کو؟" پیرو نے چونک کے کہا۔

"ہاں پولیس کو!" مجمل سپاٹ لہجے میں بولا: "ابھی وردی ان سے ٹھیک طرح بات کرے گی۔"

"تم کیا بول رہا ہے مجمل بھائی؟"

"دوسرے کے گھر میں بے ہتھیار اوزار کے ساتھ گھسنا بھی اتنی سہنے کو دیکھ کے وردی والوں کے دیدے اُلٹ جائیں گے۔"

"پولیس بھی کس کا ہے مجمل بھائی! ابھی کوٹھی ہو تو ٹھیل (?) والوں کا ہے سالا۔ اور اُن کے ہاتھوں دے کے ابھی کون سا....." پیرو نے بے بسی سے کہا اور عجیب نظروں سے مجمل کا چہرہ دیکھنے لگا جیسے مجمل نے کوئی بہت اوکھی بات کہہ دی ہو۔

"ابھی اتنا چرپٹ بھی نہیں ہوا دادا! اپنے کو بھی شہر کے رستے تھوڑے بہت آتے ہیں۔ کون سا کھڑ کو یا ہے۔ تھانا، کچہری، عدالت کی اِدھر بھی کمائی نہیں ہے۔ دروازوں پر اُن کے نام ایسے ہی کالے نہیں لکھے گئے ہوں گے اور اِدھر نہیں تو اُدھر ٹیشن کے رستے میں بادشاہ سلامت کی کوٹھی بھی پڑتی ہے۔" پیرو کو حیران و پریشان دیکھ کے اُس نے آہستگی سے کہا: "ذرا دھیان سے اپنی بات سنو دادا!"

"بہت بہت دھیان سے سن رہا ہے مجمل بھائی!" پیرو نے طنزیہ لہجے میں کہا اور تنک کے بولا: "پر لگتا ہے تم ابھی ایک دم دھیان سے نہیں بول رہا ہے۔"

مجمل کے لہجے میں بھی تندی آگئی: "بعد کو پولیس ایکٹ بھی ہو سکتی ہے دادا! اپنا کام ابھی ختم ہو جاتا ہے۔ آگے اب اُن کا شروع ہو رہا ہے۔ اپنے کو اُدھر زیادہ بولنے کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی اور ہم ایسے ہاتھ شاید نہیں تھما دیں گے۔ رسید کرا کے ایک پٹی تھما (?) گی۔ اپنا خیال ہے اُدھر ہی یہ زیادہ ٹھیک رہیں گے۔ ابھی وردی سب آگا پیچھا ان سے اُگلوا لیں گے۔ کون سے کھونٹے پر بندھے ہیں اور ڈوری کدھر تک جاتی ہے۔ کس کا راتب ان میں زور کرتا ہے۔ شہر کے لوگوں میں بھی تھوڑا چرچا ہو کہ اُدھر سے ملاکھڑ کو بجتے ہیں اور کون ان سب سے بڑا گرا ہک ہے۔ اور جو گلی ہاتھ آئی رہی تو کمائی سالی بُری نہیں ہو گی۔ سمجھ رہے ہو دادا؟"

"برابر سمجھ رہا ہے مجمل بھائی!" پیرو نے جھنجھلاتے ہوئے کہا: "ابھی اپن کیا بولے۔ ابھی تمھارا حکم ہے تو ٹھیک ہے۔ لگتا ہے تم پولیس کو ایک دم بھول گیا ہے۔ ابھی اپن سے کچھ پوچھتا ہے تو..." پیرو نے نہایت درشت لہجے میں اُس سے کہا: "یہ ہمارے مجرم ہیں، ان سے ہمی کو نمٹنا چاہیے۔ پولیس تو اپنی اکھاڑ پچھاڑ میں لگ جائے گی۔ تھوڑی دیر چرچا ہو گا پھر سب بھول جائیں گے۔" پیرو نے انھیں پولیس کی تحویل میں دینے سے صاف انکار کر دیا۔

مجمل نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی کہ اگر پولیس کے لیے یہ چشم دید شہادت بھی کم ہے اور پیرو کے خیال میں اِس کے باوجود پولیس جیل دعوت سے کام لے گی اور اِدھر اُدھر کے دباؤ میں آ جائے گی تو کیوں نہ وہ انھیں یہاں روک کے ابھی اسی وقت سیدھے گنگ کوٹھی کا رُخ کریں جہاں ریاست کا والی تلاش کر رہا ہے؟ وہیں جا کے زیرِ دفعہ (?) پھر پولیس اپنا کام مستعدی سے انجام دے گی۔

"تم ضرور اپن سے ٹھٹھول کرتا ہے مجمل بھائی!" پیرو نے چڑچڑاہٹ سے کہا۔ "تم کیسے بولتا ہے؟"

"اپنے کو ابھی یہی کہانی دیتا ہے دادا!"

"تو ایسا بولو، بولو کہ تمھارا یہی حکم ہے۔"

"ہاں دادا!" مجمل نے زیرِ لب کہا۔ "اپنی یہی رائے ہے۔"

"پر اپن کا ایک دم نہیں ہے۔ اب بھی..... اب بھی مجمل بھائی! اپن بولتا ہے....." پیرو نے پھٹی پھٹی آواز میں کہا کہ بہتر ہے مجمل دوسرے کمرے میں جا کے کچھ دیر آرام کر لے۔ پھر شاید اُس کی سمجھ

میں آ جائے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ مجھے حیرت ہوئی اُس نے کسی جھجک کے بغیر مُغل کی ذہنی حالت پر تشویش کا اظہار کیا اور کہنے لگا ”اپن کے پاس ابھی ایسا فالتو ٹیم نہیں ہے کہ روز تھانے کچہری جا کے سالا حاضری بھرے گا۔“ پیرو تحقیر آمیز لہجے میں بولا۔ ”اپن ان کو ابھی دیکھے گا۔“

مجھے اندیشہ ہونے لگا کہیں اُن کے درمیان اس تکرار سے کوئی گرہ نہ پڑ جائے۔ ہر چند کہ اس کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا تاہم وہ دونوں ایک دوسرے کی بات نہیں سمجھ رہے تھے پیرو کے لہجے میں مُغل کے لیے ذرا بھی مروت نہیں رہی تھی۔ میں نے دخل دینے کا ارادہ کیا تھا مگر میں اُن سے کیا کہتا۔ دونوں ہی اپنی جگہ کسی حد تک ٹھیک تھے۔

”ہم ہاتھ جوڑ کے بولتے ہیں حضرت! دوبارہ کبھی ایسا نہیں ہوگا۔ ہم کو معاف کر دو سرکار!“ ایک تیسرا آدمی گڑگڑا کے بولا۔ وہ مُغل کے برابر کھڑا تھا۔ رقت سے اُس کی بھیگی ہوئی آنکھوں نے کچھ مگر چپ رہا۔ گویا بیٹنے والے کو اُس کی تائید حاصل تھی۔ وہ شخص بکھرے ہوئے لہجے میں ماں باپ، خدا رسول کی قسمیں کھانے اور اپنے بال بچوں کا واسطہ دینے لگا اور بولا کہ وہ ہمیشہ کے لیے ہماری غلامی میں آنے کو تیار رہیں۔ یہ اور اسی قسم کی کئی بے سروپا باتیں۔ اُسے خود بھی احساس نہیں تھا کہ وہ کیا بک رہا ہے اور اس کا ہذیان کس حد تک ہم پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ بہرحال اس سے یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ پولیس کے چکر میں پھنسنا اپنے لیے زیادہ مہلک سمجھتے ہیں۔

ابھی وہ یہ واویلا کر ہی رہا تھا کہ پیرو نے جھپٹ کے اُس کا گریبان پکڑ لیا۔ ”حرام زادے! تم ابھی معافی کا رٹا لگاتا ہے۔ اپن تم کو معاف کرنے گا؟ اپن کو تم نے کیا سمجھا ہے؟ ایک دم اُلّو کا پٹھا؟“ پیرو نے پھنکارتے ہوئے اُسے آگے کھینچ کے بے تحاشا مارنا شروع کر دیا۔ چند لمحوں میں پیرو نے اُس پر اتنی ضربیں لگائیں کہ اُس کی چیخ پکار تک بند ہو گئی۔ کسی نے پیرو کو نہیں روکا۔ مُغل بھی خاموش کھڑا رہا۔ غصے میں پیرو کے منہ سے کف جاری ہو گیا تھا۔ معلوم نہیں اُس کے ذہن میں کیا تھا۔ سویرا بھی والا تھا اور صرف ایک نہیں ستر آدمی سامنے تھے۔ پیرو ایک ہی سے اُلجھا ہوا تھا۔ ”اپن ان سب کو ابھی ادھر ہی ٹھوکے گا اور اکھا دفن نہیں کریں گا۔“ مارتے مارتے وہ ہانپنے لگا تھا۔

”واہ! واہ!“ پیرو کا [illegible] آواز میں لے گو کاتے ”شیر جاؤ واہ واہ اپنے کو استاد کا بات بھی ٹھیک لگتا ہے۔ پولیس میں ان کا تختہ ہو جائے گا۔ اوپر سے بھی پھینکے گی تو پولیس سالی ....“

پیرو پر دیوانگی طاری تھی۔ وہ شامو پر بگڑنے لگا۔ اُس نے شامو کو بھی گالی دی اور بولا کہ اگر اُس نے اپنی زبان بند نہ کی تو وہ اُسے بھی اُن لوگوں کے ساتھ کھڑا کر دے گا۔ ادھر بابا بھی موجود ہیں۔ ”شامو نے اٹکتی زبان سے کہنے کی کوشش کی ”استاد کی بات تم کو نہیں جچتی تو ابھی بابا سے ہی پوچھ لو۔“

پیرو کا ہاتھ رک گیا۔ اُس نے پلٹ کے مضطرب نظروں سے ابا جان کو دیکھا اور لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں پوچھنے لگا۔ ”ہاں بابا! ابھی تمھی بولو! اصل مجرم یہ تھانے کا ہی ہے؟“

ابا جان گُم سُم کھڑے رہے۔ پیرو نے پھر تیکھی آواز میں پوچھا ”کیا ان کتے کمینوں کو پولیس کے حوالے کر دے؟ تم ان کو ایسا جانے دے گا؟“ ابا جان کے تذبذب پر اُس نے تیز و تند لہجے میں انھیں اطمینان دلایا کہ اگر اُن کی مرضی بھی یہی ہے تو وہ سامنے سے ہٹ جائے گا۔

ابا جان کی وحشت زدہ نظریں مُغل پر منڈلانے لگیں۔ مُغل نے جواب میں انھیں کوئی اشارہ نہیں کیا تھا۔ ابا جان کے ہونٹ پھڑکتے رہے، وہ کچھ کہہ نہ سکے۔ میر علی اُن سے کچھ فاصلے پر کھڑے تھے انھوں نے ابا جان کے پاس آ کے اور اُن کی کمر پر ہاتھ رکھ کے سرگوشی کے انداز میں کوئی آیت پڑھی۔ ابا جان کے شکستہ جسم میں ایک ثانیے کے لیے لہر سی اُٹھی، مگر دوسرے ہی لمحے وہ اور نڈھال اور شکست خوردہ نظر آنے لگے۔ مُغل کے سوا سب کی نگاہیں اُنھی پر لگی ہوئی تھیں۔ یکایک میر علی دبی آواز میں بولے ”ممکن ہو تو انھیں معاف کر دو پیرو بھائی!“

پیرو اُن کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ ”تم ..... تم کیا بولتے ہے صاحب!“ وہ ہکلایا پھر گرجتے ہوئے منہ سے کہنے لگا ”اپن ابھی بابا سے پوچھتا ہے۔“ ابا جان بے سدھ کھڑے رہے۔ پیرو نے پھر اونچی آواز میں اُن سے دوبارہ پوچھا۔ ابا جان پر کئی رنگ آئے گزر گئے انھوں نے سر جھکا کے بمشکل اتنا کہا ”ہاں بھائی! شاید یہی مناسب ہے۔“ اُن کی آواز جیسے کہیں دور سے آ رہی تھی۔

● ●